سیرت امیر المومنین

حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام

حصّہ دوم

تالیف

علامہ مفتی جعفر حسین اعلی اللہ مقامہٗ

سیرت امیر المومنین

حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام

حصہ دوم

تالیف

علامہ مفتی جعفر حسین اعلی اللہ مقامہ

ناشر

امامیہ پبلیکیشنز ۳۵ حیدر روڈ لاہور

فون نمبر ۷۲۲۸۶۲۲

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب:- سیرت امیرالمومنینؑ (حصہ دوم)
مصنف:- علامہ مفتی جعفر حسین علی اللہ مقامہ و ارفع درجہ
طابع:- معراج دین پرنٹر مچھلی منڈی لاہور
کمپوزر:- بی سٹار کمپوزر۔ فون نمبر 7466488
ناشر:- امامیہ پبلیکیشنز
بار سوم مارچ 2000ء
تعداد:-

ملنے کا پتہ

العصر اسلامک بک سنٹر

۳۵۔ حیدر روڈ اسلام پورہ لاہور۔ فون نمبر 7248642

فہرست

عرض ناشر

عرصہ دراز سے ہماری یہ خواہش تھی کہ سیرت امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ سلام کا دوسرا حصہ قارئین کی نذر کریں۔جس سے نہ صرف علامہ مفتی جعفر حسین اعلی مقامہ کی روح کو یک گونہ سکون حاصل ہو بلکہ ان کی محنت شاقہ سے اردو کے قالب میں ڈھلنے والا عظیم شاہکار "کلام امام' امام الکلام" کا مصداق ادب کا خزینہ' علم و حکمت کا گنجینہ' فصاحت و بلاغت کا بحر بیکراں' منبع رشد و ہدایت' ظلمتوں کی گھٹا ٹوپ اندھیری راتوں میں مشعل راہ ہدایت' علوم و معارف کا گراں بہا سرمایا' حکمت و اخلاق کا سرچشمہ' عامتہ الناس کی علمی و ادبی تشنگی کو دور کرنے کا باعث ہو۔مگر چند ناگزیر وجوہات کی بناء پر ہم اپنے اس خواب کو شرمندہ تعبیر نہ کر سکے۔ مگر اب تائید ایزد متعال سے اس قابل ہوئے ہیں کہ اس علمی و ادبی شاہکار کو زیور طباعت سے آراستہ و پیراستہ کر کے آپ تک پہنچا سکیں۔ہماری دعا ہے کہ علامہ مفتی جعفر حسین قبلہ اعلی اللہ مقامہ کا یہ صدقہ جاریہ ان کی بلندی درجات کا باعث ہو اور رب ذوالجلال انہیں جوار اعلی علیین میں جگہ مرحمت فرمائے (آمین ثم آمین)

سرکار علامہ مفتی صاحب سیرت امیرالمومنین علیہ السلام حصہ اول کے افتتاحیہ میں اس کتاب کو ضبط تحریر میں لانے کے مقصد کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں۔

"امیرالمومنین علیہ السلام نے ایک طرف علم کی سرپرستی سے نوع انسان کے کارواں کو آگے بڑھایا اور دوسری طرف عمل کے وہ روشن نمونے پیش کئے جو ہر منزل میں چراغ راہ کا کام دیتے اور زندگی کی اعلی قدروں سے روشناس کرتے ہیں۔ضرورت ہے کہ آپ کی زندگی اور اس کے روشن آثار کی پیروی کی جائے تاکہ آپ کے افکار و نظریات سے روشنی حاصل کی جائے اور آپ کی ہدایات و تعلیمات پر عمل کی راہیں متعین کی جائیں اور مادہ پرست ذہنیت کی شکست' اخلاقی و روحانی قدروں کے ارتقاء اور اسلامی تصورات کے احیاء کے لئے اس مصلح اعظم کی تابناک زندگی کے نقوش کو مشعل راہ بنایا جائے اور ان کے اصول زندگی کی غیر متزلزل بنیادوں پر معاشرہ کی تشکیل و تعمیر کی جائے۔تاکہ انفرادی و اجتماعی زندگی دینی تقاضوں سے ہم آہنگ اور

اخلاقی رفعتوں سے ہمکنار ہو سکے۔

اسی مقصد کے پیش نظر آپ کی سیرت و زندگی کے یہ تحریری نقوش پیش کئے جا رہے ہیں۔ ان میں نہ رنگ آمیزی سے کام لیا گیا ہے نہ مبالغہ آفرینی سے، نہ ان میں ناروا عصبیت کارفرما ہے اور نہ بیجا جذبہ داری۔ بلکہ حقائق و واقعات اور تاریخی مسلمات کی روشنی میں انہیں اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ آپ کی زندگی و سیرت کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑ سکے۔ تاریخی واقعات کو تاریخ ہی کی زبان میں دہرایا گیا ہے اور انہیں غلط رنگ دینے یا مسخ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے، اور اختلافی مسائل کو صرف تجزیہ تاریخ و نقد روایت تک محدود رکھا گیا ہے اور حتی الامکان باہم آویزیوں سے ذبح کر دینے کی کوشش کی گئی ہے۔"

ادارہ ان تمام معاونین کا کہ جن کی شب و روز کی محنت، لگن اور جستجو نے اس کار کٹھن کو آسان بنایا ہے تہہ دل سے ممنون احسان ہے، خصوصی طور پر جناب سید سجاد حسین نقوی صاحب کا کہ جنہوں نے پروف ریڈنگ جیسے مشکل مرحلہ میں نہ صرف ہماری رہنمائی فرمائی بلکہ کمال دلچسپی لیتے ہوئے زیر نظر کتاب کے تمام پروف بذات خود پڑھے۔ ادارہ ان کی صحت اور جملہ توفیقات میں اضافہ کے لئے دست بدعا ہے۔

ہم ان تمام احباب کے بھی مشکور و ممنون ہیں کہ جو وقتاً" فوقتاً" کتب کے معیار کو بہتر بنانے کے سلسلہ میں اپنی بیش قیمت آراء سے نوازتے رہتے ہیں اور ہماری حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔ ہم ہر طرح کی مثبت تنقید کو کھلے دل و دماغ کے ساتھ قبول کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار اور منتظر رہتے ہیں۔ امید ہے کہ قارئین اپنے اس جذبہ کو جاری رکھتے ہوئے ہمارے ساتھ دست تعاون بڑھاتے رہیں گے۔

ادارہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و کفی والصلواہ علی محمد المصطفی ولہ الاصفیاء

انسانی شخصیت کی تعمیر و تشکیل انسان کی جسمانی ساخت' ذہنی شعور' فکری ارتقاء اور اخلاقی و روحانی اقدار سے وابستہ ہے۔ انہی جسمی و نفسی صفات کے آئینہ میں اس کی شخصیت کے خدوخال کو دیکھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔ جہاں تک جسمی صفات کا تعلق ہے انہیں آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے مگر نفسی و روحی صفات مشاہدہ کے حدود سے باہر ہیں۔ انہیں صرف آثار سے پہچانا جاسکتا ہے۔ اگرچہ تمام انسان جسمانی اعتبار سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں مگر ان میں بعض افراد اپنی غیر معمولی قوتوں اور فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے اتنے ارفع مقام پر فائز ہوتے ہیں کہ ان کی صفات و خصوصیاتِ عام انسانوں کے تصور کی گرفت میں نہیں آتیں۔ اس لیے کہ انسان اسی صفت کا صحیح تعین کر سکتا ہے جو خود اس کے اندر پائی جاتی ہو مگر اس سے ملتی جلتی ہوئی صفت سے متصف نہیں ہو گا تو جس طرح کیف و سرور اور درد و الم ایسے کیفیات کو ان سے دو چار ہوئے بغیر سمجھا نہیں جاسکتا اسی طرح صفات نفسیہ کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکے گا اور نہ ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکے گا مگر انسان کتنا بھی روشن فکر اور یگانۂ روزگار کیوں نہ ہو وہ تمام صفات و کمالات اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتا کہ ہر صفت کو سمجھ سکے اور ہر کمال کو پرکھ سکے بلکہ ایک کمال میں انتہائی بلندی پر ہو گا تو دوسرے کمالات کے اعتبار سے پستی میں نظر آئے گا یا پہلے کمال کے مقابلہ میں نمایاں مقام حاصل نہ کر سکے گا کیونکہ انسان اپنی قوت و توانائی کو ایک آدھ درجہ ہی پر مرکوز کر کے عملی سرگرمیاں جاری رکھ سکتا اور ارتقائی مدارج طے کر سکتا ہے اور اگر قوت و استعداد کو مختلف کمالات کے حصول میں صرف کرے گا تو قوت و توانائی بٹ جائے گی اور نتیجۃً ہر جنبہ ناقص و ناتمام رہے گا اور کسی صفت کو بھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچاسکے گا۔

مولائے کائنات امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی شخصیت اس اعتبار سے منفرد و یگانہ ہے کہ ان میں وہ تمام فضائل و کمالات جو نہ کسی میں یکجا ہوئے اور نہ ہوں گے پوری آب و تاب کے ساتھ آپ کے اندر جمع تھے یہ اوصاف اپنے تنوع اور تباین کے اعتبار سے انسانی فہم سے بالاتر ہیں اس لیے کہ نہ وہ اجتماعی صورت میں کہیں نظر آتے ہیں اور نہ متضاد صفتوں کے نشوونما پانے اور ان میں ربط و ہم آہنگی پیدا کرنے کی صلاحیت ہر ایک میں ہوتی ہے کہ کوئی نمونہ و مثال سامنے رکھ کر ان کے نفسی صفات و معنوی خصوصیات کو سمجھا جاسکے البتہ مظاہر و آثار سے ان صفات کی ہلکی سی جھلک دیکھی جاسکتی ہے چنانچہ آپ کی متنوع پر رنگ اور گوناگوں کمالات سے آراستہ شخصیت پر جتنی مرتبہ نظر کی جائے کمال و فضائل کے مختلف گوشے نظروں کے سامنے ابھرتے اور عمل و کردار کے جوہر نکھرتے چلے آتے ہیں۔ گو دیکھنے میں آپ ایک شخصیت تھے مگر مختلف صفات و کمالات کے اعتبار سے متعدد شخصیتوں کا مجموعہ تھے اور اس ایک ذات میں تمام محاسن و فضائل اپنی پوری دلآویزیوں کے ساتھ سمٹ کر جمع ہو گئے تھے اور یہی وہ طغرائے

امتیاز ہے جس نے آپ کی بو قلموں شخصیت کو رفعت انسانی کا شاہکار اور کمالات و محاسن کے پھولوں کا گلدستہ صد رنگ و چمن صد بہار بنادیا ہے۔ آپ رونق دہ بزم آب و گل بھی تھے اور جلوہ فراز عالم انوار بھی، علم وعرفان کا زریں صحیفہ بھی تھے اور حسن کردار کا ورق زرنگار بھی۔ مسند قضا پر مشکل گتھیوں کے گرہ کشا بھی تھے اور محراب عبادت میں عابد شب زندہ دار بھی۔ سخاوت میں فرد فرید بھی تھے اور شجاعت میں یکتائے روزگار بھی۔ انشاء و تفنن کلام کے سرچشمہ بھی تھے اور خطابت وبیان کے قلزم زخار بھی۔ ادبیات و فنون عربیہ کے گنج شائگاں بھی تھے اور علم کلام و فلسفہ الٰہیات کے خزینہ دار بھی۔ قرآن کے جامع اور پہلے مفسر بھی تھے اور دنیائے اسلام کے اولین مصنف و قلمکار بھی۔ امن و آشتی کے پیغامبر بھی تھے اور دشمنان دین سے برسر پیکار بھی، زینت افزائے عرشہ خلافت بھی تھے اور اقلیم ولایت کے تاجدار بھی، مشکل کشائے عالم بھی تھے اور نیرنگی زمانہ سے دو چار بھی، آلام حیات پر خندہ زن بھی تھے اور رات کے اتھاہ سناٹوں میں اشکبار بھی۔ برق شعلہ ساماں بھی تھے اور ساون کی ہلکی پھوار بھی، چلچلاتی دھوپ بھی تھے اور شجر سایہ دار بھی، ہوائے تند کا تھپیڑا بھی تھے اور نسیم سبک رفتار بھی، جلالی قدرت کا آئینہ بھی تھے اور جمالی فطرت کا سنگھار بھی **اشدء علی الکفار** کی عملی تصویر بھی تھے اور **رحماء بینھم** کا مثالی کردار بھی،غرض جس صفت کمال پر نظر کی جائے وہ اس جامع اضداد ذات میں موجود ملے گی۔

ان متضاد صفات کے اجتماع اور ان کے ناقابل فہم امتزاج نے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے اور جوں جوں آپ کی کتاب زندگی کے نقوش پر نظر کی جاتی ہے حیرت و استعجاب میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے یوں تو دنیا میں ہزاروں انسانوں نے فضائل و کمالات کی کڑی منزلیں طے کیں اور ہر جادہ کمال پر اپنے نشانات قدم چھوڑے مگر جامعیت و ہمہ گیری کے اعتبار سے آپ کی شخصیت اتنی بلندوبالا ہے کہ قدآور شخصیتیں بھی ان کے سامنے پست نظر آتی ہیں اور ان کی عظمت کے نقوش اتنے روشن ہیں کہ زمان و مکان کے طویل فاصلوں کے باوجود ان کی تابندگی سے آنکھوں میں خیرگی آجاتی ہے۔ اگرچہ اموی فرمانرواؤں اور ان کے ہواخواہوں نے تمام وسائل بروئے کار لاکر ان نقوش کو دھندلاہٹوں کی دبیز تہوں میں چھپانے کی کوشش کی مگر اس آفتاب عظمت و جلال کی جگمگاہٹوں پر پردہ ڈالنے میں کامیاب نہ ہو سکے اور آپ ان کی باطل کوشیوں کے باوجود کعبہ ارادت و قبلہ عقیدت بن کر رہے اور دنیا نے بلا امتیاز عقیدہ و مذہب انہیں اپنی عقیدتوں میں مرتکز اور ضمیر کی گہرائیوں میں جاگزیں پایا۔ چنانچہ آپ کی بلندیٔ فکر و عمل نے غیر مسلم افراد کے ذہنوں کو بھی متاثر کیا اور انہوں نے آپ کی علمی و ادبی رفعت اور دینی و سیاسی بصیرت پر بلند پایہ مقالے اور مبسوط کتابیں لکھ کر خراج تحسین ادا کیا جن میں میخائیل نعیمہ، جورج جرداق، پولس سلامہ، عبدالمسیح انصاکی استاد فواد فرم البستانی اور روکس ابن زائد العزیزی کے نام سرفہرست ہیں اور مسلمانوں نے بھی خواہ وہ کسی فرقہ و گروہ سے تعلق رکھتے ہوں کسی نہ کسی اعتبار سے ان سے عقیدت و نیاز مندی کا اظہار ضروری سمجھا۔ اہل تشیع تو شیعۂ علی کہلاتے اور انہیں جانشین رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و خلیفہ منصوص سمجھتے ہی ہیں اہلسنت کے نزدیک بھی وہ صحابہ کبار، عشرہ مبشرہ اور خلفاء راشدین میں شامل ہیں۔ صوفیاء و اہل طریقت کے پیشوا شبلی جنید

بغدادی معروف کرخی' سری سقطی ابویزید بسطامی وغیرہ سلسلہ تصوف کی کڑیاں ان سے ملاتے اور قادریہ' چشتیہ' سہروردیہ' شاذیہ' اویسیہ وغیرہ انہی کے سرچشمہ ولایت سے اپنی تشنگی بجھاتے ہیں۔ قرائے سبعہ میں سے اکثروبیشتر انہی کی قراءت پر اعتماد کرتے اور مفسرین ان کی تفسیری افادیت کو تفسیر کا گران بہار سرمایہ سمجھتے ہیں۔ محدثین ان کے سلسلہ روایت کو صحت عرشیہ کی سند قرار دیتے اور فقہاء استنباط و احکام میں ان کے اقوال سے رہبری و راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ متکلمین ان کے کلامی مباحثہ پر علم کلام کی عمارت کھڑی کرتے اور قضاۃ ان کے فیصلوں سے فصل خصومات کے اصول سیکھتے ہیں۔ علماء اخلاق اخلاقی قدروں کے درس اور کردار سازی کے سبق ان کے حکیمانہ کلمات میں تلاش کرتے اور فصحاء و ادباء ان کے چمن زار بلاغت کے سدا بہار پھولوں سے معانی و بیان کے گلدستے سجاتے ہیں۔

نہ دانم آں گل رعنا چہ رنگ و بو دارد   کہ مرغ ہر چمنے گفتگوئے او دارد

اس کار گاہ عالم میں پیغمبر اکرمؐ کے علاوہ اتنی وسیع النظر اور جامع علوم شخصیت کہیں نظر نہیں آتی جس کی فکری و نظری تجلیوں اور علمی و تحقیقی کرنوں سے ہر دبستان فکر و جہان دانش نے روشنی حاصل کی ہو۔ نظر و فکر کی کتنی راہیں تھیں جو آپ کی بدولت کھلیں اور علم و تحقیق کے کتنے مخفی گوشے تھے جو آپ نے بے نقاب کئے۔ آج دنیا میں جہاں جہاں علم و حکمت کی شمعیں روشن اور فکر و دانش کے چراغ فروزاں نظر آتے ہیں وہ اسی قندیل درخشاں کی تابندگیوں کا کرشمہ اور اسی مشعل ضوفشاں کی درخشندگیوں کا پرتو ہے۔

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتو آں   ہر کجا مے نگری انجمنے ساختہ اند

امیرالمومنین علیہ السلام نے ملت اسلامیہ کو ایک عظیم علمی سرمایہ دیا جو توحید و خدا شناسی' علم کلام و فلسفہ الہیات اور رموز دین و اسرار احکام کا خزینہ عامرہ ہے بلکہ اسلامی علوم کا شاید ہی کوئی شعبہ ایسا ہو جس کا سلسلہ آپ تک منتہٰی نہ ہوتا ہو اور شاید ہی کوئی مکتب فکر ایسا ہو جس نے آپ کی ذہنی توانائی و فکری رہنمائی سے بالواسطہ یا بلاواسطہ استفادہ نہ کیا ہو۔ آپ نے علمی دقائق کی گرہ کشائی کی' فکر و فن کے چراغ روشن کئے اور علم کی ہر شاخ کی آبیاری کا سامان کیا۔ قرآن کی جمع آوری کے ساتھ اس کے متعلقہ علوم قراءت تجوید' اعراب' رسم الخط اور تفسیر و تدوین کی طرف رہنمائی فرمائی۔ حدیث کی اقسام اور رواۃ کے اصناف پر روشنی ڈالی۔ استنباط احکام کے قواعد منضبط کئے۔ الہیات' طبیعیات اور ریاضیات کی خشک سرزمین کو اپنے افادات کی بارش سے سیراب کیا تہذیب' اخلاق' تدبیر منزل اور سیاست مدن کے حدود قائم کئے۔ حکمت نظریہ و حکمت علمیہ کے تفصیلی خاکے ترتیب دیئے بلاغت کے اسلوب وضع کئے نحوی قواعد کی بنیاد رکھی اور فلسفیانہ حقائق میں ادبیت کو سمو کر خیالات کے اظہار کا نیا سانچہ ایجاد کیا۔ بلا شبہ دنیائے اسلام میں جو تخلیقی سوتے پھوٹے اور مسلمانوں نے جو تحقیقی کارنامے انجام دیے وہ نتیجہ ہے آپ کی علمی سرپرستی کا۔ آپ نے علمی تحریک کو فروغ دے کر مسلمانوں میں تحقیقی ذوق پیدا کیا اور انہیں غلبہ و جستجو اور تعقل و تفکر کی راہ پر لگایا۔ اگر آپ علوم و معارف کے نشر میں سرگرم عمل نہ ہوتے تو مسلمان فتوحات کے نشہ میں

کھو کر علم و ہنر سے بیگانہ رہتے اور جہانبانی و کشور کشائی ہی کو اپنی منزل آخر قرار دے لیتے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے ایک طرف علم کی ترقی و تکمیل کی راہیں ہموار کیں اور دوسری طرف عملی زندگی کے خدوخال نکھارے اور سنوارے اور ایسے کردار ساز اور اخلاق آموز درس دیے جو شخصی و اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہیں یہ اخلاقی تعلیمات صرف قول و گفتار تک محدود نہ ہوتے تھے بلکہ ان کی تائید کے لئے عملی نمونے بھی ساتھ ساتھ پیش کر دیتے تھے کیونکہ انسان قول سے اس حد تک متاثر نہیں ہوتا جس حد تک عمل کی خاموش زبان سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ غرض حضرتؑ نے اپنے علم و عمل سے وہ شمعیں روشن کیں جن کی چھوٹ ہمیشہ جہالت کی گزر گاہوں میں روشنی پھیلاتی اور تاریک گوشوں کو منور کرتی رہے گی۔

امیرالمومنین علیہ السلام کی تابناک زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان کے علمی و عملی کارناموں پر روشنی ڈالنے کے لئے بڑی وسعت نظر کی ضرورت ہے اور اس موضوع پر وہی افراد قلم اٹھا سکتے ہیں جو علوم و فنون کے مختلف گوشوں سے آشنا ہوں چہ جائیکہ مجھ ایسا بے بضاعت و کوتاہ نظر قلم اٹھائے اور اس سے عہدہ برآ ہو سکے۔
کہ بدانم ہمی کہ نادانم

بایں ہمہ اللہ کی توفیق و تائید پر بھروسا کرتے ہوئے اس وادی میں قدم رکھنے کی جرأت کی ہے اور مختلف کتابوں کی ورق گردانی سے جو مواد فراہم کر سکا اسے ان صفات پر چپکا دیا ہے۔ امید ہے کہ اہل نظر میری لغزشوں اور فروگزاشتوں کو بشری تقاضا اور انسانی فطرت کا لازمہ سمجھ کر دامن عفو و درگزر میں جگہ دیں گے۔

ومن اللہ استمد التوفیق وارجو الصواب

امیرالمومنین علیہ السلام کا علمی مقام

کسی مذہب و ملت نے علم کو اتنی اہمیت نہیں دی جتنی اہمیت اسلام نے دی ہے اسلام مین علم کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ اس کے عقائد و نظریات کی بنیاد ہی علم پر ہے اس نے علم کو نور و روشنی اور جہل کو تاریکی و کورنگاہی سے تعبیر کر کے ضیاء و روشنی میں راہ و منزل کے متعین کرنے کی دعوت دی ہے اور جہل کے اندھیروں میں سرگرداں رہنے کی مذمت کی ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

افمن جعلنا لہ نورا یمشی بہ فی النا س کمن مثلہ فی الظلمات لیس بخارج منہا

کیا وہ شخص جس کے لیے ہم نے نور قرار دیا جس کی روشنی میں وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے اس کے مانند ہو سکتا ہے جو اندھیروں میں بھٹک رہا ہو اور نکلنے کی کوئی راہ نہ پاتا ہو۔

پیغمبر اکرمؐ نے جن کی بعثت کا مقصد اولین، کتاب و حکمت کی تعلیم تھا، علم سے وابستگی کا ذوق پیدا کیا اور ہر اسلامی فرد پر طلب علم کا فریضہ عائد کر کے علمی ترقی کی راہیں ہموار کیں چنانچہ آپؐ کا ارشاد ہے :۔

طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم الا ان اللہ یحب بغاۃ العلم

ہر مسلمان پر علم کا حاصل کرنا واجب ہے اور اللہ علم حاصل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس سے صرف دینی و اخلاقی علوم ہی مراد نہیں ہیں بلکہ ہر وہ علم اس میں داخل ہے جو آثار قدرت و اسرار کائنات کو بے نقاب کر کے مظاہر فطرت کی طرف رہنمائی کرے اور خدا شناسی کی منزل تک پہنچائے۔ بلاشبہ اس منزل تک رسائی کا واحد ذریعہ علم ہے۔ اسی سے کائنات کی باریکیاں کھلتی اور اس میں چھپی ہوئی حکمتیں ظاہر ہوتی ہیں جن سے خالق کے وجود اور اس کے کمال حکمت پر دلیل لائی جاتی اور یقین و اعتقاد میں پختگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے **وبالعلم یعرف اللہ ویوحد** علم ہی سے اللہ اور اس کی یکتائی کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تمام علوم و معارف کا سرچشمہ تھے۔ آپ ہی سے علم کے سوتے پھوٹے اور آپ ہی کے تربیت یافتہ علم و کمال کی بلندیوں پر فائز ہوئے۔ لیکن جس طرح ایک استاد کے شاگرد برابر نہیں ہوتے اسی طرح وہ افراد جنہوں نے آپ سے تعلیم و تربیت پائی وہ علمی اعتبار سے ایک سطح پر نہ تھے اور نہ ہو سکتے تھے۔ اس لئے کہ نہ ہر ایک کی استعداد و قوت فہم یکساں تھی اور نہ ہر ایک کو درسگاہ نبوت سے استفادہ علمی کے یکساں مواقع حاصل ہوئے۔

حضرت علی علیہ السلام کا یہ امتیازی وصف ہے کہ ایک طرف ذہن رسا اور غیر معمولی فہم و ذکا کے مالک تھے اور دوسری طرف رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اتصال اور قرب کا جو شرف انہیں حاصل رہا وہ کسی ایک کو حاصل نہ تھا اور خلوت و جلوت میں استفادہ علمی کے جتنے مواقع انہیں ملے وہ کسی ایک کو میسر نہ آسکے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ صحابہ میں کوئی بھی آپ کے علمی مرتبہ تک نہ پہنچ سکا امام فخرالدین رازی تحریر کرتے ہیں۔

ان علیا کان اعلم الصحابہ و اما ابو بکر فانہ انما اتصل بخد متہ علیہ السلام فی زمان الکبر و ایضا ماکان یصل الی خد متہ فی الیوم واللیلتہ الازمانا یسیرا اما علی فانہ اتصل بخد متہ فی زمان الصغرو قد قیل العلم فی الصغر کا لنقش فی الحجرو العلم فی الکبر کالنقش فی اخلو (اربعین ص ۴۶۶)

حضرت علی علیہ السلام صحابہ میں سب سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ رہے ابوبکر تو انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچنے کا موقع بڑی عمر میں ملا اور یوں بھی شب و روز میں انہیں تھوڑا ہی وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں باریابی کا ملتا تھا مگر حضرت علی علیہ السلام بچپنے ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وابستہ ہو گئے تھے اور عام مقولہ ہے کہ جو علم بچپنے میں سیکھا جاتا ہے وہ پتھر کی لکیر ہوتا ہے اور بڑھاپے میں سیکھا ہوا سبق ایسا ہوتا ہے جیسے ریت پر کھنچی ہوئی لکیریں۔

حضرت علی علیہ السلام نے دبستان رسالت میں تعلیم و تربیت پائی۔ نبوت کی تجلیوں سے آئینہ دل و دماغ پر جلا کی اور اس مرتبہ علمی پر فائز ہوئے کہ علم و حکمت کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جو آپ کی نظروں سے اوجھل رہا ہو اور حقائق و معارف کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو آپ پر منکشف نہ ہوا ہو۔ قرن اولیٰ اور اس کے بعد کے ادوار میں ایک فرد بھی ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا جو علم میں آپ کا ہمپایہ ہو۔ عبدالملک ابن ابی سلمان کہتے ہیں کہ

قلت لعطاء اکان فی اصحاب محمد صلی اللہ علیہ و الہ وسلم احد اعلم من علی قال لا واللہ لا اعلمہ (استیعاب، ج ۳، ص ۴۰)

میں نے عطاء سے پوچھا کہ کیا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ میں علی علیہ السلام سے بڑھ کر کوئی عالم تھا کہا خدا کی قسم میں نہیں جانتا کہ ان سے بڑھ کر کوئی عالم ہو۔

حضرت کا علمی امتیاز و تفوق اتنا نمایاں تھا کہ مخالف و موافق دونوں اس کے معترف رہے اور کسی کو اس سے انکار کی جرات نہ ہو سکی۔ چنانچہ ایک شخص نے معاویہ ابن ابی سفیان سے ایک مسئلہ دریافت کرنا چاہا۔ معاویہ نے کہا کہ مجھ سے پوچھنے کے بجائے علی علیہ السلام سے پوچھو وہ مجھ سے زیادہ علم رکھتے ہیں اس نے کہا کہ میں آپ ہی سے

پوچھنا چاہتا ہوں معاویہ نے کہا،

و یحک کرھتہ رجلا کان رسول اللہ یغرہ بالعلم غرا و قد کان اکابر الصحابتہ یعترفون لہ بذا لک (فتح القدیر، ج ۳، ص ۴۶)

افسوس ہے کہ تم اس شخص سے پوچھنا ناپسند کرتے ہو جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوری طرح علم بھر دیا تھا اور جس کی علمی برتری کا اکابر صحابہ تک اعتراف کرتے رہے ہیں

صحابہ کبار نہ صرف آپ کی علمی برتری کے معترف تھے بلکہ پیش آئند مسائل میں انہی کی طرف رجوع کرتے اور آپ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلوں کو بڑی آسانی سے حل کر دیتے تھے۔ حضرت عمر کو بھی کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہوتا تو آپ سے رہنمائی حاصل کرتے اور اگر کوئی حکم دے چکے ہوتے اور حضرت علی علیہ السلام اس کے خلاف رائے دیتے تو اپنے فیصلہ میں تبدیلی کر کے علانیہ کہتے

لولا علی لھلک عمر (ریاض النضرہ، ج ۲، ص ۲۵۶)

اگر علی علیہ السلام نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو چکا ہوتا۔

حضرت عمر امیرالمومنین علیہ السلام کے تلمذ ابن عباس سے بھی علمی رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ شیوخ بدر کے ہمراہ ان کے ہاں آیا جایا کرتے تھے انہی شیوخ میں سے بعض نے ان سے کہا کہ ابن عباس جوان ہیں انہیں آپ کے ہاں آنا چاہئے نہ یہ کہ آپ ان کے ہاں جائیں۔ حضرت عمر نے ابن عباس اور ان شیوخ کو اپنے ہاں بلایا اور ان سے بعض آیات کی تفسیر دریافت کی ان میں سے بعض خاموش رہے اور بعض نے لاعلمی کا اظہار کیا آخر ابن عباس نے آیات کی تفسیر بیان کی اور کسی کے لئے بولنے کی گنجائش نہ چھوڑی۔ حضرت عمر نے ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا

انہ من قد علمتم (ذخائر العقبی ص ۲۲۸)

اب تمہیں ان کے مرتبہ کا علم ہوا ہوگا۔

اس اعلیٰ علمی دستگاہ کے باوجود ابن عباس حضرت علی علیہ السلام کے آگے زانوائے تلمذ تہ کرتے تھے آپ کے علمی فیضان سے بہرہ یاب ہوتے تھے اور اکثر کہا کرتے تھے

وما علمی و علم اصحاب محمد فی علم علی الا کقطرہ فی سبعتہ ابحر (مناقب)

میرے اور اصحاب پیغمبر کے علم کو علی علیہ السلام کے علم سے وہی نسبت ہے جو ایک قطرہ کو سات سمندروں سے ہوتی ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام جس مرتبہ علمی پر فائز تھے اس مرتبہ پر نہ کوئی فائز ہوا اور نہ آئندہ ہو گا۔ شیخ الرئیس ابن سینا اس امر کی شہادت دیتے ہوئے کہتے ہیں

كان علی من العلوم فی الحول الذی لا تحلق الیہ البشر (الامام علی "عزیزی")

حضرت علی علیہ السلام علوم میں اس بلند مقام پر فائز تھے کہ انسان کی قوت پرواز اس تک پہنچنے سے قاصر ہے۔

حضرت کے علمی تفوق کی یہ ایک روشن دلیل ہے کہ تاریخ و سیر کی کوئی کتاب یہ نہیں بتاتی کہ آپ نے کسی مسئلہ کے جواب میں، وہ امور دینیہ سے متعلق ہو یا مسائل عقلیہ سے، ریاضی سے متعلق ہو یا ہیئت سے، فلسفہ سے متعلق ہو یا کلام سے، طبیعات سے، متعلق ہو یا الہیات سے عجز و درماندگی کا اظہار کیا ہو یا غور و فکر کی ضرورت پڑی ہو یا کسی سے پوچھنے کی احتیاج محسوس کی ہو بلکہ جب بھی کوئی ایسا مسئلہ آپ کے سامنے پیش ہوتا جس کے جواب سے دوسرے عاجز و درماندہ ہوتے تو آپ اس آسانی سے اسے حل کر دیتے گویا کوئی پیش پا افتادہ بات ہو اور اس کی نوبت ہی نہ آتی کہ یہ کہتے کہ مجھے سوچنے کا موقع دیا جائے یا کسی اور سے دریافت کیا جائے۔ ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ ایک موقع پر حضرت عمر نے امیرالمومنین علیہ السلام سے کہا کہ یا ابا الحسن علیہ السلام آپ سے جب بھی کوئی مسئلہ پوچھا جاتا ہے یا کسی قضیہ کا حل دریافت کیا جاتا ہے تو آپ فوراً اس کا جواب دے دیتے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ آپ فکر و تامل کے بعد جواب دیا کریں۔ حضرت نے اپنا ہاتھ کھول کر ان کے سامنے کیا اور پوچھا کہ اس میں کتنی انگلیاں ہیں کہا پانچ۔ فرمایا تم غور و فکر اور سوچ بچار سے کام لینے کے بجائے فوراً کیوں بول اٹھے۔ کہا کہ اس میں غور و فکر کی ضرورت ہی کیا تھی فرمایا کہ جس طرح انگلیوں کے شمار میں تمہیں غور و فکر کی ضرورت پیش نہیں آئی اسی طرح تمام حقائق و مطالب میرے سامنے واضح و آشکارا ہیں اور کسی مرحلہ پر مجھے سوچ بچار کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

تاریخ شاہد ہے کہ عوام سے لے کر مسند نشینان خلافت تک آپ کے سرچشمہ علم سے سیرابی کے محتاج رہے اور انہیں جب بھی کسی مشکل مسئلہ میں الجھن پیدا ہوتی تو آپ کے در پر دستک دیتے اور آپ بغیر کسی ذہنی دباؤ کے اس الجھن کو دور کر دیتے۔ آپ کے اس علمی استغناء پر نظر کرتے ہوئے خلیل ابن احمد خراہیدی نے کتنا حقیقت کو لئے ہوئے یہ جملہ کہا ہے۔

استغنائہ عن الکل و احتیاج الکل الیہ دلیل علی انہ امام الکل (تاسیس الشیعہ)

آپ کا دوسروں سے بے نیاز ہونا اور تمام لوگوں کا اپنی احتیاج کو ان سے وابستہ کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ آپ امام کل ہیں۔

حضرت کا علم صرف قرآن و سنت اور اسلام کے اوامر و نواہی تک محدود نہ تھا بلکہ آسمانی کتب اور سابقہ ملل و ادیان کے تعلیمات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے چنانچہ آپ منبر پر فرمایا کرتے تھے

لو کسرت الی الو ساده ثم جلسته علیها لقضیت بین اهل التوریت بتوراتهم و بین اهل الا نجیل بانجیلهم و بین اهل الزبور بزبورهم و بین اهل الفرقان بفرقانهم (مطالب السئول ص ۸۹)

اگر میرے لئے مسند بچھا دی جاتی تو میں اہل تورات میں تورات کی رو سے اہل انجیل میں انجیل کی رو سے اہل زبور میں زبور کی رو سے اور اہل قرآن میں قرآن کی رو سے فیصلے کرتا۔

حضرت کے سینہ میں علم کا قلزم زخار موجزن تھا۔ جو ابر باراں کی صورت میں برستا۔ پیاسوں کو ڈھونڈتا اور خشک زمینوں کو سیراب کرتا تھا۔ چنانچہ آپ اپنے صدر مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کرتے تھے

ھا ان ھھنا لعلما جما لو اصبت لہ حملتہ (نہج البلاغہ)

میرے سینہ میں علم کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ کاش مجھے ایسے افراد مل جاتے! جنہیں میں اس علم کا امین بناتا!

آپ فراز منبر پر بلند ہو شگان علم کو پکارتے اور دعوت عام دیتے کہ **سلونی قبل ان تفقدونی** "جو پوچھنا ہو میری زندگی میں مجھ سے پوچھ لو" پوچھنے والے اپنی ذہنی پرواز کے مطابق پوچھتے رہے اور بقدر وسعت ظرف جواب حاصل کرتے رہے۔ یہ دعویٰ آپ کے لئے مخصوص ہے اور آپ کی زندگی میں اور آپ کے بعد کسی کو یہ دعویٰ کرنے کی جرائت نہ ہو سکی اور اگر کسی نے دعویٰ کیا بھی تو اسے خفت و شرمساری سے دوچار ہونا پڑا۔ سعید ابن مسیب کہتے ہیں

ما کان احد من الناس یقول سلونی غیر علی ابن ابی طالب (استیعاب، ج ۳، ص ۴۰)

لوگوں میں سے کسی ایک نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ مجھ سے جو چاہو پوچھ لو سوائے علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے

امیرالمومنین علیہ السلام کا علمی ارتقاء قدرت کے فیضان اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا ورنہ اس دور میں کہ جب عربوں کا علم، ایام عرب، انساب عرب، گھوڑوں کی اصل و نسل اور قیافہ شناسی تک محدود تھا ان علمی و فلسفی اور طبیعاتی و ماوراءالطبیعیاتی مسائل پر لب کشائی نہ کی جا سکتی تھی جو اکثر آپ کے خطبات و بیانات کا موضوع رہے ہیں۔ ان علمی و فنی مطالب کے ساتھ ادبی اسلوب بیان نے کلام کو اور جاذب و پرکشش بنا دیا ہے کہ کلام خدا و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کوئی کلام اثر آفرینی میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور ان پر ایسے اچھوتے انداز میں روشنی ڈالی ہے کہ جواہر کلام کے پرکھنے والے نقش حیرت بن کر رہ گئے ہیں۔

علم الہیات

علم الہیات سے مراد وہ علم ہے جو صانع عالم کے وجود' اس کے صفات اور ان امور سے بحث کرتا ہے جو ذات الہی سے متعلق ہوتے ہیں۔ اسلام میں ہستی باری کا اقرار اور اس کی یکتائی کا اعتراف اصل اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی عقیدہ پر دوسرے عقائد کا دارومدار اور تمام اعمال کی صحت کا انحصار ہے۔ اسی اہمیت کی بنا پر علماء اسلام نے اسے خصوصی توجہ کا مرکز قرار دیا۔ اس پر سیر حاصل بحثیں کیں اور تحقیقی و استدلالی کتابیں تحریر میں لائے اگرچہ ان سب کی کاوشیں قابل قدر ہیں مگر حضرت علی علیہ السلام وہ حکیم عالم اسلام ہیں جنہوں نے سب سے پہلے مسائل الہیہ میں عقلی و فلسفی استدلال کی طرح ڈالی۔ دقیق گتھیوں کو آسان لفظوں میں سلجھایا اور ایک ایک مسئلہ پر ایسے لطیف انداز میں روشنی ڈالی کہ اس سے بہتر پیرایہ بیان و طرز استدلال ممکن نہیں ہے آپ نے الہیاتی حقائق کے ان گوشوں کو بے نقاب کیا جو متکلمین کی نظروں سے اوجھل اور حکماء و فلاسفہ کی فکری و ذہنی پرواز سے بلند تر تھے۔ اگرچہ حکماء یونان' سقراط' افلاطون اور ارسطو نے الہیاتی و مابعد الطبیعیاتی مسائل پر بحث کی ہے اور فطرت کی داخلی شہادت اور حادث کے لئے موجد کی ضرورت سے ایک ایسی ہستی کا اثبات کیا ہے جو تغیرو تبدل سے بری' ہر اعتبار سے کامل و اکمل اور کائنات کی محرک اول و سرچشمۂ وجود ہے مگر حضرت کے کلمات خودشناسی وحدت ذات عینیت صفات اور تنزیہ و تقدیس کے سلسلہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے اور اس کثرت سے حقائق و مطالب لئے ہوئے ہیں کہ قدیم حکماء و فلاسفہ کے کلام کو صرف ان کے مبادیات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور علماء اسلام نے انتہائی کد و کاوش سے جو الہیاتی مباحث مدون کئے وہ بھی آپ کے افادات سے سرمو آگے نہیں بڑھ سکے اور ہر پھر کر انہی مطالب کے گرد گردش کرتے ہیں جو آپ نے اپنے خطبات اور مختلف سوالوں کے جوابات میں بیان فرمائے۔ علم الہدی سید مرتضیٰ تحریر کرتے ہیں۔

اعلم ان اصول التوحید والعدل ماخوذہ من کلام امیرالمومنین وخطبہ فانھا تتضمن من ذلک مالا زیادہ علیہ ولا غایتہ وراء ومن تامل الماثور فی ذلک من کلامہ علم ان جمیع ما اسھب المتکلون من بعد فی تصنیفہ و جمعہ انما ھو تفصیل تعلک الجمل و شرح تعلک الاصول۔ (غرر و درر)

تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ توحید و عدل کے اصول امیرالمومنین علیہ السلام کے کلمات و خطبات سے ماخوذ ہیں کیونکہ وہ تمام الہیاتی مطالب پر حاوی ہیں ان میں نہ اضافہ ممکن ہے اور نہ ان سے آگے کوئی حد ہے۔ چنانچہ جو شخص آپ کے کلام پر نظر کرے وہ جان لے گا کہ آپ کے بعد متکلمین نے جن تفصیلی مباحث کی تالیف و تدوین کی وہ آپ ہی کے بیان کردہ مجملات کی تفصیل اور آپ ہی کے پیش کردہ اصول کی

تشریح وتوضیح ہیں۔

حضرت کے ان خطبات و جوابات میں مسائل بھی ہیں اور دلائل بھی' حقیقت بھی ہے اور ادبیت بھی' فلسفہ بھی ہے اور حسن اسلوب بھی' ہر شبہ کا جواب بھی ہے اور ہر اعتراض کا رد بھی۔ آپ نے وحدت کو کثرت کی آمیزش سے پاک و صاف کر کے توحید کے خدوخال کو نکھارا۔ ذات و صفات کے تفرقہ کو باطل ثابت کر کے دوئی کے تصور کو مٹایا اور رویت بصری' حلول و اتحاد' تمثیل و تشبیہ' احتیاج و ترکیب اور تفصیل و تجیم ایسے غلط نظریات کی دلائل سے رد فرمائی اور مشککین کے شکوک و شبہات کا ازالہ فرمایا۔ غرض خدا شناسی کی منزل میں آپ کے ارشادات ایک دلیل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں جو ایک ان دیکھی ہستی کے کمال ذات و صفات کی طرف رہنمائی کرتے اور خیالات و افکار کو زندقہ و الحاد کے دھندلکوں میں بھٹکنے سے بچا لے جاتے ہیں۔

ذیل میں الہیات کے سلسلہ میں آپ کے چند ارشادات مختصر تشریح کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں جو اسلام کے صحیح تعلیمات کے آئینہ دار اور مذاہب عالم کے عقیدہ الوہیت کے مقابلہ میں اسلامی عقیدہ الوہیت کی برتری کا واضح ثبوت ہیں۔

خدا شناسی کے درجات

خدا شناسی کے چند درجے ہیں جنہیں امیرالمومنین علیہ السلام نے ذیل کے کلمات میں بیان فرمایا ہے۔

اول الدین معرفتہ و کمال معرفتہ التصدیق بہ و کمال التصدیق بہ توحیدہ و کمال توحیدہ الاخلاص لہ و کمال الاخلاص لہ نفی الصفات عنہ
(نہج البلاغہ)

دین کی ابتداء اس کی معرفت ہے کمال معرفت اس کی تصدیق ہے اور کمال تصدیق توحید ہے اور کمال توحید تنزیہہ و اخلاص ہے اور کمال تنزیہہ و اخلاص یہ ہے کہ اس سے صفتوں کی نفی کی جائے۔

پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں ایک ان دیکھی اور غیر محسوس ہستی کا تصور پیدا ہو۔ یہ تصور کیوں پیدا ہوتا ہے اس کے بارے میں دو نظریئے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ یہ تصور معاشرہ و ماحول کی پیداوار ہے اور خاندانی ورثہ کے طور پر ایک ذہن سے دوسرے ذہن کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ چنانچہ اہل مذہب میں پلنے بڑھنے والا بچہ اپنے دل و دماغ کو خدا کے تصور سے خالی نہیں رکھ سکتا اور دین و مذہب سے بیگانہ لوگوں میں آنکھ کھولنے والا بچہ خدا کے تصور سے دور رہتا ہے اور اسی راہ پر چلتا ہے جس راہ پر اپنے گردوپیش کے لوگوں کو چلتا دیکھتا ہے اور دوسرا نظریہ یہ ہے کہ جب انسان نے اس کارگاہ ہستی میں آنکھ کھولی تو کچھ چیزوں کو مفید پایا اور کچھ چیزوں کو نقصان دہ! جن چیزوں کو مفید سمجھا انہیں حاصل کرنے کے اسباب و ذرائع تلاش کئے اور جن چیزوں کو نقصان دہ سمجھا ان سے بچنے کا سامان کیا۔ مگر اس نے دیکھا کہ یہ اسباب و ذرائع بے نتیجہ بھی ثابت ہوتے ہیں اور کامیابی کے اسباب مہیا ہونے کے باوجود کامیابی نہیں ہوتی اور رنج و تکلیف سے بچاؤ کے سامان کے باوجود مصیبت سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ اس ناکامی و نامرادی نے اسے حوادث زمانہ کے آگے ہتھیار ڈالنے اور اپنی کمزوری و بے بسی کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا۔ جب اس نے اپنے کو عاجز و درماندہ پایا تو اس احساس درماندگی کے نتیجہ میں اس کے ذہن میں یہ تصور پیدا ہوا کہ اس عالم میں کچھ بالا دست طاقتیں کارفرما ہیں جو اس کے ارادوں پر حاوی اور کائنات کے خشک و تر پر حکمران ہیں۔ وہی تکلیف و راحت فقر و امارت اور مرض و صحت پر اختیار رکھتی ہیں اور وہی دنیا میں پیش آنے والے وقائع و حوادث کی ذمہ دار ہیں۔ ان طاقتوں کو دیوتاؤں کا نام دیا گیا اور مختلف حوادث کے مختلف دیوتا مان لئے گئے۔ ان دیوتاؤں میں سوریہ (سورج) وایو (ہوا) اور اگنی (آگ) بھی شامل ہیں۔

جب انسانی شعور نے اور ارتقائی منزلیں طے کیں تو اس نے دیکھا کہ اگرچہ مختلف دیوتا مختلف امور سرانجام دیتے ہیں۔ مگر ان کے کاموں میں ایک نظم و ضبط اور ربط و تسلسل پایا جاتا ہے، جس میں کبھی خلل رونما نہیں ہوتا۔ سطح سمندر سے بخارات اٹھتے ہیں تو بارش برستی ہے اور بارش برستی ہے تو کھیتیاں ہری بھری ہوتی ہیں۔ اگر بارش

برسانے والے دیوتا اور کھیتیاں اگانے والے دیوتا میں اتحاد و یکجہتی نہ ہوتی تو ہو سکتا تھا کہ بخارات اٹھتے اور بارش نہ ہوتی یا بارش ہوتی اور کھیتیاں ہری نہ ہوتیں۔ اس نظم و ہم آہنگی سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان دیوتاؤں پر بھی ایک بڑا دیوتا حکومت کرتا ہو گا جو انہیں ادھر سے ادھر نہیں ہونے دیتا۔ اس سے ایک ان دیکھی ہستی کا تصور پیدا کر لیا گیا جو پرمیشر اور خدا کہی جاتی ہے۔ انسان دیوتاؤں کے آگے جھکنے کا خوگر تو تھا ہی اس نے ان دیکھے پرمیشر کے سامنے بھی سر خم ہو گیا اور دیوتاؤں سے وابستگی برقرار رکھتے ہوئے اس سے بھی تصوراتی رشتہ جوڑ لیا بہر حال یہ تصور اہل مذاہب سے سن کر پیدا ہوا ہو یا دیوتاؤں کے اشتراک عمل سے' مذہب سے وابستگی کا پیش خیمہ اور دین سے تعارف کا نقطہ آغاز ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کے ارشاد "دین کی ابتداء اس کی معرفت ہے" میں معرفت سے مراد یہی ابتدائی تصور ہے اور دین سے دین اسلام یا کوئی خاص دین مراد نہیں ہے بلکہ زندقہ و الحاد کے مقابلہ میں کسی آئین کی ذہنی پابندی مراد ہے جو اسی تصور کی پیداوار ہے۔ یہ درجہ معرفت ناقص اور تصور کی حد تک محدود ہے اور تصور کوئی بھی ہو وہ اپنے اندر قطعیت نہیں رکھتا۔ ممکن ہے کہ وہ صحیح ہو اور ممکن ہے کہ وہ صرف ذہنی پیداوار ہو اس وقت تک اسے صحت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا جب تک دلیل و برہان سے اس کی قطعیت کا ثبوت بہم نہ پہنچا لیا جائے اور ذہن کو شکوک و شبہات کے دغدغوں سے پاک و صاف نہ کر دیا جائے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس تصور پر قانع نہ رہے بلکہ فکر و نظر سے کام لے کر غیر یقینی صورت کو یقینی صورت میں بدلے اور ادراک و تصدیق کی منزل تک پہنچے۔ وہ افراد جو سہل انگاری سے کام لیتے ہوئے اس تصور ہی کو کافی سمجھ لیتے ہیں اور غور و فکر کی تکلیف گوارا نہیں کرتے وہ تصدیق سے محروم رہ جاتے ہیں حالانکہ اس تصور کے پیدا ہونے کے بعد ان پر یہ ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے کہ وہ فکر و نظر سے کام لیں اور آثار سے مؤثر کے وجود کا ثبوت بہم پہنچائیں۔ جبکہ اس کے وجود کی نشاندہی کرنے والے آثار ہر طرف نمایاں اور ہر سطح کے ذہن کے لئے علم و ایقان کا ذریعہ ہیں۔ چنانچہ ایک سطحی نظر رکھنے والا عام آدمی زمین اور اس میں سبزہ و گل کی روئیدگی' سربلند پہاڑ اور مچلتے ہوئے سمندر' گرتی ہوئی آبشاریں اور فضا میں اڑتے ہوئے ابر کے ٹکڑے' چاند' سورج کی چمک دمک اور ستاروں کی جگمگاہٹ' طلوع و غروب کے پر کیف مناظر اور شب و روز کے سفید و سیاہ ورق دیکھ کر خالق عالم کی ہستی کا یقین اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے اور ایک بلند نظر و باریک بین انسان کائنات کی رعنائی و پہنائی اور اس میں لاکھوں نوری سال کے فاصلوں پر واقع سحابیئے' فضا کی بلندیوں پر جگمگ کرتے سنہری جھمکے' محیط عالم پر چھائی ہوئی کہکشاں کی وسعتیں اور سیاروں کی محوری و دوری گردشیں دیکھ کر یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کس نے یہ بزم عالم آراستہ کی' کس نے چاند سورج کو ضیا بار بنایا اور کس نے قوت تجاذب و مدافعت پیدا کی۔ جس کے زیر اثر اجرام فلکی معینہ راہ پر گامزن اور لگے بندھے قانون پر راہ پیا ہیں۔ کیا یہ عظیم کائنات آپ ہی آپ پیدا ہو گئی اور خود بخود مقررہ راہوں پر رواں دواں ہے؟ مگر یہ کیسے جبکہ کوئی نقش بغیر نقاش کے اور کوئی اثر بغیر موثر کے وجود میں نہیں آتا تو یہ کائنات کسی خالق کی کارفرمائی کے بغیر کس طرح موجود ہو گئی یقیناً اس کے پیچھے ایک ایسی ہستی کا ہاتھ کارفرما ہے۔ جس سے کائنات کی

تخلیق اور عالم کا نظم و نسق وابستہ ہے۔ جب فکر و نظر کی رہنمائی سے اس نتیجہ پر پہنچتا ہے تو شک و تذبذب کے حدود سے نکل کر تصدیق کے درجہ تک رسائی حاصل کرلیتا ہے اور جوں جوں فکری عمل بڑھتا ہے ہستی باری کا عقیدہ پختہ ہوتا جاتا ہے۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ صانع عالم کو واحد و یگانہ مانا جائے۔ اگر اسے مان لینا ہی کافی ہوتا تو مشرکین قریش اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کوئی وجہ مخاصمت ہی باقی نہیں رہتی۔ اس لئے کہ وہ سب اسے مانتے تھے اور کوئی بھی اس کا انکار نہیں کرتا تھا۔ ان سے نزاع تھی تو اس بنا پر کہ وہ دوسروں کو بھی الوہیت یا الوہیت کے صفات میں شریک سمجھتے تھے چنانچہ مشرکین قریش خدا کو واحد و یکتا ماننا نہ چاہتے تھے بلکہ خدا کے ساتھ بتوں کو بھی شریک کرتے تھے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اسی لئے آمادہ پرخاش تھے کہ آپؐ نے ایک خدا کا تصور پیش کیا تھا اگر آپ بتوں کے عمل دخل کی نفی نہ کرتے تو ان کے جذبات برانگیختہ نہ ہوتے اس لئے کہ انہیں خدا سے نہیں بلکہ خدا کو ایک ماننے سے کدتھی اور اسی ایک کہنے سے وہ سیخ پا ہوتے تھے۔ قرآن مجید میں ہے۔

اذا دعی اللہ وحدہ کفر تم وان یشرک بہ تو ءمنوا

جب تنہا اللہ کو پکارا جاتا تھا تو تم انکار کرتے تھے اور اگر اس کے ساتھ اوروں کو شریک کیا جاتا تھا تو تم مان لیتے تھے۔

رہے دوسرے مذاہب تو اگرچہ وہ اپنا رابطہ الہامی کتابوں سے رکھنے کے دعویدار ہیں اور بنیادی طور پر خدا پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ مگر یہ عقیدہ توحید سے علیحدہ ہے کیونکہ وہ تصرف و تدبیر عالم میں دوسروں کو بھی شریک ٹھہراتے ہیں۔ چنانچہ یہود نے عزیر کو ابن اللہ قرار دے لیا۔ مسیحی ایک تین اور تین ایک کے چکر میں پڑ گئے اور باپ بیٹا اور روح القدس کے مجموعہ کو خدا ماننے لگے۔ ہندوؤں نے برہما کو پیدا کرنے والا وشنو کو زندہ رکھنے والا اور شیوا کو ہلاک کرنے والا فرض کرلیا اور پھر ان تینوں میں وحدت پیدا کرنے کے لئے ایک ہی مجسمہ میں ان تینوں کے سر الگ الگ دکھاتے ہیں جسے تریمورتی کہتی ہیں یہ بھی تثلیث ہی کی ایک صورت ہے۔ سناتن دھرمیوں نے خدا کے لاکھوں روپ بنا ڈالے جنہیں اوتار کہتے ہیں۔ آریہ توحید پرستی کا دعوی کرنے کے ساتھ روح اور مادہ کو بھی ایشور کی طرح قدیم اور ازلی سمجھتے ہیں۔ بعض نفس، مادہ اولی، دہر اور خلا کو قدیم مانتے ہیں۔ بعض اجرام فلک میں ارواح کے قائل ہیں جنہیں آتماؤں سے تعبیر کرتے ہیں اور انہیں اجرام فلکیہ کی طرح قدیم سمجھتے ہیں۔ بعض نے مختلف حوادث و وقائع کے مختلف خدا مان لئے جو ایک بڑے خدا کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ خدا نے کائنات کو خلق کرنے کے بعد اس کا نظم و انضباط دوسروں کے سپرد کر دیا ہے اور خود معطل و بے کار ہو کر رہ گیا ہے۔ سویہ دو خداؤں کے قائل ہیں ایک یزداں خالق خیر ہے اور ایک برہمن جو خالق شر ہے۔ خالق خیر کو نور سے اور خالق شر کو ظلمت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ بعض صوفیہ خدا، کائنات اور انسان کو ایک وحدت قرار دیتے ہیں۔ بعض فلاسفر اللہ کو صرف

عقل اول کا خالق مانتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ **الواحد لایصدر عنہ الا الواحد** (ایک سے ایک ہی چیز صادر ہوتی ہے) چنانچہ اللہ نے عقل اول کو پیدا کیا اور عقل اول نے عقل ثانی اور فلک اول کو اور اس طرح عقل عاشر نے جو کہ خدائے عالم طبیعت کے نام سے موسوم کی جاتی ہے اس جہان کو پیدا کیا۔

یہ مذاہب' خدا کو دو ماننے والے ہوں یا تین یا زیادہ' بہت سے خداؤں کے ضمن میں اللہ کی ہستی کا بھی اقرار کرتے ہیں۔ اس لئے انہیں منکرین خدا کی صف میں شمار نہیں کیا جا سکتا مگر درحقیقت یہ ماننا نہ ماننے کے برابر ہے اس لئے کہ جسے مانا ہے وہ چند خداؤں میں کاایک خدا ہے اور جسے ماننا چاہئے تھا وہ چند خداؤں میں کا ایک نہیں ہے بلکہ ایسا ایک ہے جس کا دوسرا نہیں ہے۔ اس ماننے کو ماننا اسی وقت کہا جائے گا جب اللہ کو ہر لحاظ سے واحد و یکتا مانا جائے' نہ اس کی قدرت و ازلیت میں کسی کو شریک ٹھہرایا جائے اور نہ اس کے افعال و اعمال میں کسی کو دخیل سمجھا جائے۔ لہٰذا وہ مذاہب و ادیان جو دوسروں کو کسی اعتبار سے بھی خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں وہ خدا شناسی کی منزل سے ناآشنا قرار پائیں گے۔

چوتھا درجہ یہ ہے کہ خدا کو ایک ماننے کے ساتھ اسے صفات ممکنات' جسم و جسمانیات' نقل و حرکت زمان و مکان وغیرہ سے منزہ و مبرا سمجھا جائے۔ جن لوگوں نے توحید کا عقیدہ رکھنے کے ساتھ یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ ہماری طرح شکل و صورت جسم اور اعضاء رکھتا ہے عرش پر متمکن اور مادی چیزوں کی طرح قابل رویت ہے' وہ خدا شناسی کی منزل سے بمراحل دور ہیں۔ اس لئے کہ اگر اسے زمان و مکان کا پابند' حرکت و انتقال کا حامل اور جسم و جسمانیات کی سطح پر قرار دے لیا تو اسے ان تمام نقائص سے متصف مانا جو ممکنات میں پائے جاتے ہیں اور جب وہ نقائص سے خالی نہ رہا تو واجب الوجود ہی کہاں رہا کیونکہ واجب الوجود وہی ہو سکتا ہے جو تمام نقائص سے بری اور ہر قسم کی احتیاج سے بلند تر ہو۔

پانچواں درجہ یہ ہے کہ اس کے صفات کو اس کی ذات سے الگ تصور نہ کیا جائے اس لئے کہ اگر ذات سے الگ صفات تجویز کئے گئے تو عقیدہ توحید ناقص و ناتمام رہے گا کیونکہ صفات کو زائد برذات ماننے سے دوئی لازم آئے گی' ایک ذات اور ایک صفت اور دوئی کا ادنیٰ شائبہ بھی اس کی عظمت توحید کے منافی ہے۔ جب اس کی ذات ہر اعتبار سے کامل اور احتیاج سے بری ہے تو اسے اظہار کلی کے لئے صفتوں کا سہارا لینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

معرفت خداوندی کے یہ پانچ مراتب ہیں جنہیں امیرالمومنین علیہ السلام نے چند مختصر الفاظ میں سمو کر پیش کیا ہے اور ہر درجہ کو درجہ ما قبل کے اعتبار سے کامل قرار دیا ہے۔ لہٰذا معرفت کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک ان پانچوں مراتب کو جزو عقیدہ نہ قرار دیا جائے اور اگر کسی درجہ پر بھی خط انکار کھینچا گیا تو نہ عقیدہ الوہیت بے داغ رہ سکتا ہے اور نہ عقیدہ توحید۔

اثبات وجود باری

امیرالمومنین علیہ السلام نے اللہ کے وجود پر مختلف دلائل قائم کئے ہیں جو عقل و فطرت کے معیار پر پورے اترتے اور ہر صاحب شعور کو اقرار پر مجبور کر دیتے ہیں۔ وجود باری کے سلسلہ میں حضرتؑ کے چند اقوال درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) و کلمتہ الاخلاص فانھا الفطرہ۔(نہج البلاغہ) اللہ کی ہستی و وحدت کا عقیدہ فطرت کی آواز ہے۔

خدا کی ہستی کا عقیدہ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے جو اسے ایک ان دیکھی اور غیر محسوس ذات کے اعتراف پر مجبور کرتی ہے۔ حضرتؑ نے اس فطری و جبلی شہادت کو اللہ کے وجود کے ثبوت میں پیش کیا ہے اگر چہ ہم اسے مختلف طریقوں سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے اور اس کے لئے دلیلیں ڈھونڈتے رہتے ہیں مگر ثابت کرنے کی یہ کوششیں اس لئے نہیں کرتے کہ اس کے وجود کا اثبات ہماری دلیلوں پر منحصر ہے بلکہ ہمارے شعور میں اس کا تصور اس طرح رچا بسا ہوا ہے کہ کوئی دلیل نہ ملنے پر بھی ہمارے ایقان میں کوئی کمی نہیں آسکتی۔ یہ جذب اور طبعی اعتقاد خود سب سے بڑی اور غیر متزلزل دلیل ہے اور اسے ذہنی شعور کی انکشافی کیفیت اور فطرت کی اندرونی شہادت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جو کسی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے عقلی دلائل کا سہارا لینے کی محتاج نہیں ہے۔ اگر آئینہ ضمیر و وجدان مادیت کے غبار سے دھندلا نہ گیا ہو اور ہوائے نفس کی پیروی نے توجہ فطری کو سلب نہ کیا ہو تو انسان فطرت کی روشنی میں یہ محسوس کرے گا کہ اس کائنات کی خلقت میں آفریدگار مطلق کا دست توانا کارفرما ہے جس نے ہر چیز میں نظم و ترتیب قائم کر کے اپنی حکمت بالغہ کا ثبوت دیا ہے۔

وجود باری کے فطری ہونے کے سلسلہ میں بعض اعلام نے فرمایا ہے کہ آیہ قرآنی **الست بربکم قالو ابلی** (کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں سب نے کہا کہ ہاں ایسا ہی ہے) میں خداوند عالم نے اپنے بندوں سے ربوبیت کا اقرار لیا ہے۔ اور اپنی ہستی کا اقرار نہیں لیا کیونکہ اس کی ہستی کا اعتراف فطری ہے اور ہر شخص فطرۃً اسے ماننے پر مجبور ہے۔

(۲) الحمد للہ الدال علی وجودہ بخلقہ و بمحدث خلقہ علی ازلیتہ۔(نہج البلاغہ) تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو خلق کائنات سے اپنے وجود کا اور پیدا شدہ مخلوقات سے اپنے قدیم و ازلی ہونے کا پتہ دینے والا ہے۔

انسان میں عقل کا جوہر ودیعت کیا گیا ہے تاکہ علت و معلول کے باہمی ربط میں ایک ابدی و ازلی وجود کا شعور

حاصل کرے۔ لہٰذا وجود باری کے سلسلہ میں عقل سے رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور عقل ہی سے صانع عالم کے وجود پر دلیل لائی جا سکتی اور اس کی ہستی کا اثبات کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ ان امور میں جو ماوراء الطبیعیات ہیں نہ ظاہری حواس کا گزر ہے اور نہ تجربات کا دخل ہے انہیں صرف عقل ہی سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اگر عقل سے رابطہ ختم کر کے اللہ کے کلام سے اس کے وجود پر استدلال کیا جائے تو جس کا وجود ہی ابھی زیر بحث ہے اس کے کلام سے استدلال کے کیا معنی۔ یہ تو دعویٰ کو دلیل کا درجہ دے دینا ہے اور پھر کسی چیز کو جو واقع میں سچ ہو سچا کہہ دینا کافی نہیں ہوتا، جب تک اس کی صداقت پر دلیل نہ قائم کی جائے۔ بیشک فطرت اللہ کے وجود پر ایک ناطق برہان ہے۔ مگر جن کی فطرت پر مادیت یا ماحول کے اثرات غالب آجاتے ہیں وہ فطرت کی رہنمائی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے صرف عقل ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے انہیں اللہ کا قائل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرتؑ نے وجود باری کے فطری و بدیہی ہونے کے باوجود عقل کو معیار قرار دیا ہے اور آثار قدرت و خلق کائنات سے اس کے وجود پر استدلال کیا ہے۔ اس استدلال کی بنیاد اس علم و یقین پر ہے جو زمین و آسمان اور کائنات کی وسعتوں میں غور و فکر سے انسان کے دل و دماغ میں پیدا ہوتا ہے اور ذہنوں کا رخ خالق و مدبر عالم کی طرف موڑ دیتا ہے۔ چنانچہ جو شخص ادنیٰ شعور رکھتا ہو اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ کوئی نشان قدم بغیر رہرو کے نہیں ابھرتا اور کوئی عمارت بغیر معمار کے کھڑی نہیں ہوتی اور ہر مصنوع صانع کا دست نگر اور ہر مخلوق خالق کی محتاج ہے۔ خواہ وہ ہماری نظروں کے سامنے ہو یا ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو۔ اسی بنا پر خداوند عالم نے کائنات میں غور و فکر کا حکم دیا ہے تاکہ اس کے نتیجہ میں اس کی ہستی کا اثبات کیا جا سکے۔ ارشاد باری ہے۔

قل انظر و اناذا فی السموات والارض۔ ان سے کہو کہ وہ زمین و آسمان کی چیزوں پر نظر ڈالیں۔

چنانچہ انسان جب اس کائنات کو دیکھے گا اور اس میں کارفرما حکمتوں پر نظر کرے گا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہ رہے گا کہ جب ہر مصنوع کے لئے صانع کا ہونا ضروری ہے تو اس کائنات کا بھی ایک خالق و صانع ہونا چاہئے جو بذات خود موجود ہو اور اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہ ہو۔

(۳) من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ (بحار الانوار) جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے پروردگار کو پہچان لیا۔

خداوند عالم کے آثار وجود النفس و آفاق میں پھیلے ہوئے ہیں اور چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز اس کی ہستی پر روشن و واضح برہان ہے ذرہ ہو یا آفتاب قطرہ ہو یا سمندر پتی ہو یا گلشن جرم صغیر ہو یا عالم کبیر یکساں اس کے وجود کی ایک علامت اور اس کی یکتائی کی طرف ایک اشارہ ہیں۔

ہر گیاہے کہ از زمین روید   وحدہ لا شریک لہ گوید

یہ کائنات میں بکھری ہوئی علامتیں انسانی پیکر میں سمو دی گئی ہیں۔ گویا کائنات ایک تفصیلی صحیفہ ہے اور انسان ایک اجمالی صفحہ ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

اتزعم انک جرم صغیر   وفیک انطوی العالم الاکبر

کیا تو یہ گمان کرتا ہے کہ تو ایک چھوٹا سا جسم ہے حالانکہ تیرے اندر عالم اکبر سمایا ہوا ہے۔

لہٰذا اشیاء کائنات پر نظر کرنے کے ساتھ اپنے نفسوں پر بھی نظر کرنے کی ضرورت ہے اگر انسان نفس کی کارفرمائی کو سمجھ لے گا تو کارفرمائے عالم کے عرفان کی راہ ہموار ہو جائے گی۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

سنریھم ایاتنا فی الافاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق۔

ہم انہیں اپنی نشانیاں اطراف عالم اور خود ان کے نفسوں میں دکھاتے ہیں تاکہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ یقیناً وہی برحق ہے۔

یہ انسان جو ایک چھوٹی سی کائنات ہے۔ جسم اور نفس پر مشتمل ہے۔ جسم میں گھٹاؤ بڑھاؤ ہوتا رہتا ہے چنانچہ جب تک قوت نمو باقی رہتی ہے ہڈیاں گوشت پوست اور اس کی ساتھ قدو قامت بڑھتا رہتا ہے اور جب زمانہ نمو ختم ہو جاتا ہے تو اعضاء تحلیل ہونا شروع ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ ہڈیوں پر سے گوشت تک اتر جاتا ہے ڈھانچہ بدل جاتا ہے اور صورت و ہیئت کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ مگر وہ خود بچپن ہو یا جوانی یا بڑھاپا ہر دور میں وہی رہا ہے جو بدو خلقت سے تھا۔ ایسا نہیں ہوتا کہ بچپن میں کوئی اور ہو جوانی میں کوئی اور اور بڑھاپے میں کوئی اور۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کا وجود و تشخص اس کے اعضاء سے نہیں بلکہ اس کے نفس سے وابستہ ہے جو شروع سے آخر تک ایک حالت پر باقی رہتا ہے اگرچہ یہ نفس نہ آنکھ سے دکھائی دیتا ہے نہ حاسوں کی گرفت میں آتا ہے نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کہاں پر ہے اور کس سمت میں ہے اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کہاں نہیں ہے مگر ہے اس لئے کہ اعضاء کی حرکت اور دوسرے آثار حیات اس کے وجود کی گواہی دیتے ہیں اور انہی آثار سے مردہ و زندہ میں تفریق کی جاتی ہے۔ اسی نفس کے زیر اثر اعضاء میں حس و حرکت ہوتی ہے اور عقل و فکر کی قوتیں کام کرتی ہیں اگر انسان اپنے جسم اور اس میں اپنے نفس کی کارفرمائی پر غور کرے تو اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جب اس چھوٹی سی کائنات کا نظام ایک متصرف و نگران کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا تو اس عظیم کائنات کا نظم و نسق جس کی وسعتیں انسانی حد تصور سے باہر ہیں کسی مدبر و حکیم اور خبیر و علیم ہستی کے بغیر کیونکر باقی رہ سکتا ہے۔

نفس شناسی و خدا شناسی میں چند وجوہ مماثلت یہ ہیں۔

(۱) جس طرح نفس محرک و مدبر بدن ہے اسی طرح اللہ محرک و مدبر عالم ہے۔

(۲) جس طرح نفس اپنے ارادہ و اختیار سے تدبیر بدن کرتا ہے اسی طرح اللہ اپنے ارادہ و اختیار سے تدبیر عالم کرتا ہے۔

(۳) جس طرح بدن میں نفس ایک ہوتا ہے اسی طرح اللہ واحد و یکتا ہے۔ اگر بدن میں دو نفس ہوتے تو ان میں باہمی ٹکراؤ ہوتا اور اس کے نتیجہ میں نظام بدن قائم نہ رہتا اسی طرح اگر ایک کے علاوہ کوئی اور بھی خدا ہوتا تو نظم عالم درہم و برہم ہو کر رہ جاتا اور تمام کائنات تباہ و برباد ہو جاتی جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے۔

لو کان فیھما الھتہ الا اللہ لفسدتا۔ اگر زمین و آسمان میں اللہ کے علاوہ اور بھی خدا ہوتے تو زمین و آسمان دونوں تباہ و برباد ہو جاتے۔

(۴) جس طرح نفس، تحریک و تدبیر بدن پر قدرت رکھتا ہے اسی طرح اللہ، نظم و نسق کائنات پر قادر ہے۔

(۵) جس طرح نفس، بدن کے ہر حصہ پر نظر رکھتا ہے اور جسم کی کوئی کیفیت اس سے مخفی نہیں ہے اسی طرح اللہ، کائنات کے ایک ایک ذرہ کا عالم و نگراں ہے اور کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔

(۶) جس طرح نفس تمام اعضاء بدن سے مساوی تعلق رکھتا ہے اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں حصہ جسم سے قریب اور فلاں حصہ جسم سے دور ہے اسی طرح اللہ تمام کائنات سے یکساں نسبت رکھتا ہے اور اس کا علم و قدرت سب پر یکساں محیط ہے۔

(۷) جس طرح نفس بدن سے پہلے موجود تھا اور بدن کے بعد موجود رہتا ہے اسی طرح اللہ ابدی و ازلی ہے اور ہر شے سے پہلے موجود اور ہر شے کے بعد موجود رہے گا۔

(۸) جس طرح نفس کی کیفیت کو جانا نہیں جا سکتا اسی طرح اللہ کی کنہ ذات کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔

(۹) جس طرح نفس کی جگہ متعین نہیں کی جا سکتی اسی طرح اللہ کے لئے محل و مقام تجویز نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۰) جس طرح نفس ہمارے لمس کی گرفت میں نہیں آتا اسی طرح اللہ کو چھوا نہیں جا سکتا۔

(۱۱) جس طرح نفس دیکھنے میں نہیں آتا لیکن اس کا وجود قابل رویت اشیاء سے بھی واضح تر ہے اسی طرح اللہ کا وجود غیر مرئی ہونے کے باوجود ہر چیز سے بدیہی و روشن تر ہے۔

(۱۲) جس طرح نفس متعدد صفات و ملکات کا حامل ہے اور پھر ایک ہے اسی طرح خدا تمام صفات کمالیہ کا مبداء و منشا ہونے کے باوجود یگانہ و بسیط ہے۔

(۱۳) جس طرح ہم اپنے نفس کا علم و ادراک رکھتے ہیں اور یہ علم و ادراک کسی دلیل پر مبنی نہیں ہے بلکہ وہ حضوری طور پر معلوم و منکشف ہے اسی طرح خالق کائنات کا وجود بدیہی اور دلیل کی احتیاج سے بالاتر

ہے۔

(۴) عرفت اللہ سبحانہ بفسخ العزائم و حل العقود و نقض الھمم۔ (نہج البلاغہ)

میں نے اللہ سبحانہ کو پہچانا ارادوں کے ٹوٹنے، نیتوں کے بدل جانے اور ہمتوں کے پست ہو جانے سے۔

مقصد یہ ہے کہ کوئی بھی انسان اپنے تمام ارادوں پر مستقل طور پر قائم نہیں رہ سکتا اور نہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوتا ہے حالانکہ اس کے ارادہ میں زور اور عزم میں قوت ہوتی ہے اور بظاہر اسباب و ذرائع بھی مہیا ہوتے ہیں اور کوئی مانع بھی نظر نہیں آتا مگر کوئی غیبی طاقت روکاوٹ بن کر کھڑی ہو جاتی ہے اور اس کے ارادہ و راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ اگر خود اسے یہ طاقت ہوتی تو اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے میں مانع ہی کیا تھا وہ اپنی ارادہ کی تکمیل کرتا اور اپنے مقصد سے ہمکنار ہوتا۔ مگر عزم و ارادہ کی مضبوطی کے باوجود اس کی ناکامی اس کا ثبوت ہے کہ اس کے ارادوں پر ایک ایسی طاقت حکمران ہے جو چاہے تو انہیں تکمیل تک پہنچنے دے اور چاہے تو انہیں ناکام کر دے۔ یہ عزم و ارادہ کی شکست اسی بالا دست ذات کی کارفرمائی کا کرشمہ ہے جس کے سامنے انسانی قوتیں سپر انداختہ ہو جاتی ہیں۔

(۵) ان اللہ تجلی لعبادہ من غیر ان راوہ وار یھم نفسہ من غیر ان یتجلی لھم۔ (علم الیقین محسن فیض)

اللہ اپنے بندوں کے لئے عیاں ہے بغیر اس کے کہ وہ اسے دیکھیں اور اس نے اپنے آپ کو دکھا دیا بغیر اس کے کہ وہ ان کے سامنے جلوہ گر ہو۔

دنیا میں ہر موجود اپنے آثار و عوارض سے اپنا وجود ثابت کرتا ہے مثلاً کسی انسان کی زندگی، زندگی مرتب ہونے والے اثرات سے جانی پہچانی جاتی ہے مگر خدا کا وجود اتنا واضح روشن اور منجلی ہے کہ کائنات کی ہر شے وہ محسوس ہو یا غیر محسوس مرئی ہو یا غیر مرئی اس کے وجود کی ایک مستقل دلیل ہے اور اتنا نمایاں وعیاں ہے کہ گویا مخلوق اور اس کے درمیان کوئی حجاب حائل نہیں ہے۔ حارث اعور بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ امیرالمومنین علیہ السلام بازار کی طرف سے گزرے تو ایک شخص کی زبان سے قسم کے یہ الفاظ سنے "**لا والذی احتجب بالسبع**" اس ذات کی قسم جو سات پردوں میں نہاں ہے" حضرتؑ نے اس کی پشت پر ہاتھ مارا اور پوچھا کہ وہ کون ہے جو سات پردوں میں پوشیدہ ہے کہا اللہ فرمایا۔

اخطات ثکلتک امک ان اللہ عزو جل لیس بینہ وبین خلقہ حجاب لانہ معھم اینما کانوا۔ (توحید صدوق)

تم نے غلط سمجھا ہے اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے وہ تو ہر مخلوق کے ساتھ ساتھ ہے جہاں بھی وہ ہو۔

اس نے کہا کہ یا امیرالمومنین پھر اس قسم کا کفارہ کیا ہے فرمایا کہ اس کا کفارہ یہ ہے کہ تم سمجھو کہ تم جہاں

بھی ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے۔ کہا کہ میں اس کا کفارہ مسکینوں کو کھانا کھلا کر ادا نہ کروں فرمایا کہ تم نے اپنے پروردگار کی قسم ہی کب کھائی ہے کہ تم پر کفارہ عائد ہو۔

مقصد یہ ہے کہ خداوند عالم ہمارے حاسوں اور ادراکی قوتوں سے بالاتر ہونے کے باوجود اپنے آثار قدرت کے اعتبار سے ظاہر و نمایاں ہے اور ناقابل رویت ہونے کے باوجود اس کا وجود اتنا ہی قطعی و یقینی ہے جتنا کسی شے کا رویت کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔

(۷) لیس باللہ من عرف بنفسہ ھو الدال باللہ لیل علیہ والمودی بالمعرفتہ الیہ (احتجاج طبرسی)

جس کی حقیقت نفس الامری پہچانی جا سکے وہ خدا نہیں ہے وہ خود اپنے وجود کی دلیل ہے اور اسی نے اپنی معرفت کے وسائل پیدا کئے ہیں۔

خداوند عالم اپنے وجود کے اثبات میں کسی غیر کے توسط کا محتاج نہیں ہے بلکہ وہ خود اپنے وجود کی مستقل دلیل ہے۔ یہ درست ہے کہ کائنات اوراس کے مظاہر اسکی ہستی کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں بلکہ ہر چیز جو انہی کے وجود کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اسی نے اس میں رہنمائی کا جوہر پیدا کیا ہے۔ چنانچہ ضمیر و وجدان کی شہادت سے اسے پہچانا تو ضمیر و وجدان کی دولت اسی کی دی ہوئی ہے اگر عقل کے ذریعہ اسے پہچانا تو یہ عقل اسی کا عطیہ ہے انبیاؑ و آئمہ کے ذریعہ پہچانا تو انبیاء و آئمہ اسی کے فرستادہ و مقرر کردہ ہیں۔ اگر کسی دلیل پر بنا کرتے ہوے اس کی معرفت حاصل کی تو دلیل کی طرف رہنمائی کرنے والا وہی ہے۔ اگر خداوند عالم نے انسان میں قوائے فکری و عقلی ودیعت نہ کئے ہوتے تو وہ علت و معلول کے ربط کو نہ سمجھ سکتا اور نتیجہ علتہ العلل یعنی خدا کے وجود پر دلیل قائم کرنے سے قاصر رہتا۔ چنانچہ حضرت ابراھیمؑ نے چاند سورج اور زہرہ کے طلوع و غروب سے جو اس کے وجود پر استدلال کیا اور اپنے کو مشرکین کی صف سے علیحدہ قرار دیا تو یہ اسی کی تعلیم و رہبری کا نتیجہ تھا چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

وتلک حجتنا آتیناھا ابراھیم علی قومہ۔

یہ ہماری سمجھائی بجھائی ہوئی دلیلیں ہیں جو ہم نے ابراھیم کو اپنی قوم پر حجت تمام کرنے کے لئے عطا کی ہیں۔

غرض جس چیز سے بھی اس کے وجود پر استدلال کیا جائے گا وہ اپنے وجود میں اس کی محتاج اور اس کی ذات پر منتہی ہو گی۔ جب خود اس کی ذات اپنی ذات کی طرف رہنمائی کرتی ہے تو اسے اپنے وجود کے ثبوت میں ذات سے خارج کسی چیز کی احتیاج نہ ہو گی چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

اولم یکف بربک انہ علی کل شئی شھید۔

کیا تمہارا پروردگار اس کے لئے کافی نہیں کہ وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔

اگرچہ اہل نظر کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مخلوقات سے خالق کے وجود پر دلیل قائم کرتے ہیں اور اس میں کوئی شبہہ بھی نہیں کہ ہر مصنوع صانع کے وجود پر ایک محکم برہان ہے مگر اہل عرفان کی بلند نگاہی اس پر اکتفا نہیں کرتی اور وہ مخلوقات سے خالق کے وجود پر استدلال کرنے کے بجائے خالق کے وجود کا آئینہ سمجھتے ہیں اور اسی سے اس کی ذات کا عرفان حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

اعرفوا اللہ باللہ (توحید صدوق)۔ اللہ کو اللہ کے ذریعہ پہچانو۔

حضرتؑ خود اس بلند مرتبہ معرفت پر فائز تھے چنانچہ ایک شخص نے آپؑ سے پوچھا کہ آپؑ نے کس چیز سے اللہ کو پہچانا فرمایا **بما عرفنی نفسہ**۔ اس چیز سے جس چیز سے خود اس نے اپنے کو پہچنوایا' پھر پوچھا کہ اس نے کیونکر پہچنوایا فرمایا

لا تشبھہ صورت ولا یحس بالحواس ولایقاس بالناس قریب فی بعدہ و بعید فی قربہ۔(توحید صدوق)

کوئی صورت اس کے مشابہ نہیں نہ حواس سے اسے معلوم کیا جاسکتا ہے اور نہ انسانوں پر اس کا قیاس ہو سکتا ہے وہ فہم و ادراک سے دور ہونے کے باوجود قریب ہے اور قریب ہونے کے باوجود دور ہے۔

ایک مرتبہ جاثلیق' مسیحیوں کے ایک گروہ کے ساتھ مدینہ آیا اور حضرتؑ سے پوچھا کہ آپؑ نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذریعہ اللہ کو پہچانا ہے یا اللہ کے ذریعہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پہچانا ہے فرمایا۔

ماعرفت اللہ بمحمد و لکن عرفت محمد باللہ عزو جل۔(توحید صدوق)

میں نے خدا کو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذریعہ نہیں پہچانا بلکہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خدائے بزرگ وبرتر کے ذریعہ پہچانا ہے۔

نظریہ مادیین اور اس کا رد

نظریہ مادیین کی رد میں امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لم یخلق الاشیاء من اصول از لیتہ ولا من اوائل کانت قبلہ ابدیتہ بل خلق ماخلق واتقن خلقہ و صور ماصور فاحسن صورتہ۔ (توحید صدوق)

خداوند عالم نے اشیاء کو بنیادی اجزاء اور مادی عناصر سے جو ازلی وابدی ہوں خلق نہیں کیا بلکہ جو چیز پیدا کی خود پیدا کی اور اس کی خلقت کو استحکام بخشا اور جس چیز کی صورت گری کی احسن طریقہ پر کی۔

اس جہان رنگ و بو میں جہاں خدا کے ماننے والے چلے آرہے ہیں وہاں منکرین خدا کا بھی ایک گروہ موجود رہا ہے یہ گروہ ماد ـیین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان ماد ـیین کے ایک گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ مادہ قدیم ہے اور اپنے وجود میں خالق سے بے نیاز ہے البتہ وہ ہستی جسے خدا کہا جاتا ہے اس نے مادہ میں حرکت و صورت ودیعت کی ہے اور مادہ خود ہی قانون علیت کے ماتحت خلق کا سلسلہ جاری کئے ہوئے ہے اور ایک گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ حرکت مادہ کا دائمی خاصہ ہے لہٰذا کسی ہستی کو جو محرک وصورت گر ہو ماننے کی ضرورت نہیں ہے پہلا گروہ اگرچہ خدا کو تحریک کی ضرورت کے پیش نظر مانتا ہے مگر اسے معطل و بے کار سمجھتا ہے جو نہ ماننے کے برابر ہے اور دوسرا گروہ سرے سے خدا کے وجود اور اس کی ضرورت کا قائل ہی نہیں ہے۔ قرآن مجید ان کے نظریہ کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے۔

قالو اماھی الاحیاتناالدنیا نموت و نحیی وما یھلکنا الاالدھر۔ وہ کہتے ہیں یہی دنیوی زندگی ہماری زندگی ہے یہیں مرتے اور یہیں جیتے ہیں اور زمانہ ہی ہمیں موت کے گھاٹ اتارتا ہے

ماد ـیین کے انکار کی بنیاد کسی دلیل و برہان پر نہیں ہے بلکہ انکار کے جواز میں یہ کہا جاتا ہے کہ خدا نہ مشاہدہ میں آیا ہے نہ تجربہ نے اسے ثابت کیا ہے اور نہ عقل ہی اس کے ماننے پر مجبور کرتی ہے۔ پھر ایک موہوم ہستی کو کیوں مانا جائے؟ ان کے نزدیک تمام موجودات کی تخلیق مادہ سے ہوئی ہے جو ازل سے چلا آرہا ہے۔ جس میں گھٹاؤ ہوتا ہے نہ بڑھاؤ۔ وہ خود سے ہے اور خود ہی اپنے سانچے بناتا اور ان میں ڈھلتا رہتا ہے۔ جیسے پانی کہ کبھی سیال ہے' کبھی منجمد اور کبھی گیس۔ چیز ایک ہی ہے صرف نام اور صورتیں بدلتی رہتی ہیں

نظریہ ماد ـیین کے ابطال سے پہلے مادہ پر ایک نظر کرنے کی ضرورت ہے کہ مادہ ہے کیا؟ یہ تو کسی نے نہیں بتایا اور نہ بتا سکتا ہے کہ مادہ کی اصل حقیقت کیا ہے جو کچھ بتایا گیا ہے وہ صرف مادہ کے خواص ہیں۔ چنانچہ جو چیز جگہ گھیرتی' وزن رکھتی اور حواس پنجگانہ میں سے کسی حاسہ سے محسوس ہوتی ہے اسے مادہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مادہ کے اجزائے ترکیبی کو عناصر اور ان کی چھوٹی سے چھوٹی اکائی کو جس میں مادہ کے تمام خواص موجود ہوتے ہیں سالمہ کہا جاتا ہے اور عنصر کا وہ آخری ذرہ جس کی مزید تقسیم کی جائے تو وہ اپنے خواص عنصری پر باقی نہ رہے جوہر کہلاتا ہے۔ چنانچہ پانی کی وہ اکائی جو مزید تقسیم کے بعد پانی ہی رہے پانی کا سالمہ ہو گی اور اس کے اجزائے ترکیبی آکسیجن اور ہائیڈروجن کا آخری ذرہ جو مزید تقسیم کے بعد آکسیجن یا ہائیڈروجن ہی رہے جوہر ہو گا ان سالموں کو جو پانی کے ایک قطرہ میں لاکھوں کی مقدار میں اور جوہروں کو جو ایک انچ کے ستر کروڑویں حصے سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں بڑی سے بڑی طاقتور خوردبین سے بھی دیکھا نہیں جا سکتا۔

ان غیر مرئی ذرات کا تصور سب سے پہلے ایک یونانی مفکر دیمقراطیس (۴۶۰ ـ ۳۷۰ ق م) نے پیش کیا اور

اسے ایٹم کا نام دیا جس کے معنی نا قابل تقسیم جزو کے ہیں دوسرے حکماء و فلاسفہ بھی اسے نا قابل تقسیم و تحلیل سمجھتے تھے۔ اس لئے اسے جزو لا یتجزی کہتے تھے لیکن اب جوہر کو نا قابل تقسیم نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے توڑا جا چکا ہے چنانچہ اس میں متعدد برقی ذرات دریافت ہو چکے ہیں جن میں مثبت برقیہ (پروٹون) منفی برقیہ (الیکٹرون) اور تعدیلی ذرہ (نیوٹرون) کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ پروٹون اور نیوٹرون مرکز میں ایک جگہ پر مرتکز ہوتے ہیں اور الیکٹرون پروٹون کے گرد برقی کشش سے اس طرح گردش کرتا ہے جس طرح سورج کے گرد سیارے۔ مادہ ان ذروں کے سوا کچھ نہیں ہے جو جوہری اجزاء میں شعاعی صورت میں پائے جاتے ہیں۔ یہ شعاعیں انرجی (توانائی) کہلاتی ہیں اور انہی کی کیمیائی ترکیب سے مادہ کی تشکیل ہوتی ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ مادہ اور توانائی ایک دوسرے کی مختلف شکلیں ہیں اگر یہ شعاعیں آزاد ہوں تو برق پارے ہیں اور تہ در تہ ہوں تو مادہ ہے۔

سائنس دانوں کا نظریہ ہے کہ ابتداء میں صرف انرجی (توانائی) تھی جو تہ بہ تہ ہو کر مادہ کی صورت میں تبدیل ہو گئی اور مادیین کے نزدیک انہی مادی ذرات کے میل جول اور تدریجی ارتقاء سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے چنانچہ ابتداء میں مادہ گیس کی صورت میں تھا اس گیس سے سحابیوں کی تشکیل ہوئی سحابیوں سے ستارے بنے اور ستاروں سے سیاروں نے جنم لیا اسی طرح دنیا کی دوسری چیزیں مادہ کے تحول و انقلاب سے بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ ان تمام چیزوں کا مادہ خلقت ایک ہے۔ ان میں رنگ، خاصیت، نرمی، سختی وغیرہ کے اعتبار سے جو تفاوت نظر آتا ہے وہ ان کے جوہروں کی کمی بیشی کی بنا پر ہوتا ہے۔

مادیین اور قائلین خدا دونوں مادی ذرات کو مادی اشیاء کی علت مادیہ سمجھتے ہیں۔ جس طرح زیور کے لئے سونا اور تخت کے لئے لکڑی۔ فرق یہ ہے کہ مادیین، علت مادیہ ہی کو علت فاعلیہ قرار دیتے ہیں۔ اس طرح کہ مادہ خود ہی مختلف شکلیں اختیار کرتا رہتا ہے اور قائلین خدا علت مادیہ کو علت فاعلیہ کا درجہ نہیں دیتے بلکہ ایک قادر مطلق ہستی کو مادہ و مادی اشیاء کا خالق و موجد سمجھتے ہیں۔

سائنس کے اس نظریہ سے بھی اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ ابتداء میں صرف برقی شعاعیں تھیں۔ جن کی ترکیب و ترتیب سے مادہ کی تشکیل ہوئی بلکہ اس کی تائید امیرالمومنین علیہ السلام کے بعض اقوال سے بھی ہوتی ہے چنانچہ آپؑ کا ارشاد ہے۔

اول ما خلق اللہ النور (بحار ج ۱۴ ص ۱۴۲) خدا نے سب سے پہلے نور کو پیدا کیا۔

اور یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ جوہر کو شکست و ریخت اور تحلیل و تجزیہ سے برقی شعاعوں کی طرف منتقل کیا جا سکتا ہے۔ حضرتؑ نے ان برقی شعاعوں کے انکشاف سے پہلے اپنے علم وہبی سے ان برقی شعاعوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

لوشئت لجعلت الماء نور۔ اگر میں چاہوں تو پانی کو نوری شعاعوں میں بدل دوں۔

اس مقام پر پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مادیین علم کو حواس کے دائرہ میں محدود سمجھتے ہیں اور صرف اسی چیز کا اعتراف کرتے ہیں جو محسوس و مرئی ہو تو انہیں مادہ کی ان برقی شعاعوں کا علم کیونکر ہوا جبکہ وہ غیر مرئی اور حواس کی گرفت سے بالاتر ہیں۔ اگر وہ یہ کہیں کہ ان کے خواص و آثار ان کے ماننے پر مجبور کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ آنکھ سے دیکھی اور حواس سے جانی نہیں جاسکتیں تو جب انہوں نے خواص و آثار سے غیر مرئی شعاعوں کے وجود کو تسلیم کیا ہے تو اس کائنات میں ہر سو بکھرے ہوئے آثار سے خالق کائنات کے وجود کا اعتراف کیوں نہیں کرتے۔ جبکہ یہ عقل کا قطعی فیصلہ ہے کہ کوئی چیز خود اپنے وجود کی خالق نہیں ہو سکتی بلکہ ہر معلول علت سے وابستہ اور ہر اثر مؤثر کی کار فرمائی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان برقی شعاعوں میں مثبت برق (پروٹون) پہلے وجود میں آئی یا منفی برق (الیکٹرون) اگر مثبت برق پہلے وجود میں آئی تو اسے منفی برق کی احتیاج کا احساس کیونکر ہوا کہ اس نے منفی برق کو ایجاد کیا اور اگر منفی برق پہلے وجود میں آئی تو اسے یہ احساس کیونکر ہوا کہ اسے اپنے نظام کو متوازن رکھنے کے لئے مثبت برق کی ضرورت ہے۔ جب کوئی چیز خود اپنے اجزاء کی خالق نہیں ہو سکتی تو مادہ اپنے اجزائے ترکیبی کا موجد کیونکر ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ ایک حکیم و برتر ذات ہے جس نے دو مختلف و متضاد چیزوں میں نظم و ترتیت اور توافق و ہم آہنگی پیدا کی ہے۔

مادیین کے نظریہ کی بنیاد مادہ کی قدامت اور اس کی حرکت پر ہے۔ مادہ کے قدیم وازلی ہونے کی ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی دلیل نہیں کہ مادہ ہمیشہ سے یونہی چلا آرہا ہے اور کسی نے اسے عدم سے وجود میں آتے نہیں دیکھا۔ لہٰذا جب تخریب و تعمیر کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری و ساری ہے اور مادہ خود ہی مختلف روپ دھارتا اور مختلف شکلیں بدلتا رہتا ہے نہ اس کا کوئی نقطہ آغاز تجویز کیا جاسکا ہے اور نہ اس کے پیچھے کسی کا ہاتھ کارفرما نظر آیا ہے تو اسے قدیم ہی مانا جائے گا۔ مادیین کی اس دلیل کا جواب تو اتنا ہی کافی ہے کہ اگر انہوں نے مادہ کو عدم سے وجود میں آتے نہیں دیکھا تو اس کی قدامت و ازلیت کا کب مشاہدہ کیا ہے۔ جب حدوث و قدم دونوں مشاہدہ کے حدود سے باہر ہیں تو انہیں ان میں کسی ایک کا قطعی فیصلہ کرنا چاہئے تھا جبکہ مادہ کی قدامت کا نظریہ کسی صورت میں عقل و منطق سے سازگار نہیں ہے کیونکہ مادہ کی حرکت جس کے زیر اثر مادی ذرات ایک صورت سے دوسری صورت میں منتقل ہوتے اور متفرق و مجتمع ہو کر مختلف شکلیں بدلتے ہیں اس کے حدوث کی واضح دلیل ہے۔ اس لئے کہ حرکت عرض حادث ہے اور اجتماع و افتراق کی صورتیں بھی حادث ہیں۔ جب حرکت اور اتصال وانفصال اور تغیر و تبدل کی سب صورتیں اعراض حادثہ ہیں تو جس پر یہ اعراض طاری ہوں گے وہ بھی حادث ہو گا۔ اس لئے کہ اعراض حادثہ اعیان

حادثہ ہی پر طاری ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا مادہ محل حوادث ہونے کی وجہ سے نہ قدیم ہو سکتا ہے اور نہ مبداء کائنات قرار پا سکتا ہے۔

مادیین کے نزدیک مادہ حیات و شعور سے خالی اور فکری و شعوری اعمال سے عاری ہے مگر موجودات عالم میں ذی حیات بھی ہیں اور غیر ذی حیات بھی' ذی شعور بھی ہیں اور غیر ذی شعور بھی۔ ایک ذی عقل انسان یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ حیات و شعور کا سرچشمہ کہاں سے پھوٹا؟ کس نے یہ زندگی دی اور کس نے یہ شعور بخشا؟ مادہ تو زندگی و شعور کا خالق ہو نہیں سکتا۔ اس لئے کہ جو خود حیات و شعور سے محروم ہو وہ دوسرے کو حیات و شعور کہاں سے دے گا اور کسی غیر ذی حیات کو ذی حیات کا اور کسی غیر ذی ادراک کو ذی ادراک کا خالق مانا نہیں جاسکتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ حیات و شعور مادی اجزاء کی ترتیت کا نتیجہ ہیں جس طرح آٹو میٹک گھڑی کے پرزوں کی ترتیب سے گھڑی میں حرکت پیدا ہوتی ہے اسی طرح مادی اجزاء کی مخصوص ترتیب سے حس و حرکت پیدا ہو جاتی ہے تو یہ بھی صحیح نہیں ہے اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ زندہ انسان اور مردہ انسان میں ترتیب مادی کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے مگر ایک میں حیات و شعور ہے اور دوسرے میں حیات و شعور نہیں ہے۔ اگر حیات و شعور مادی ترتیب ہی کا نتیجہ ہوتا تو دونوں میں یکساں زندگی بھی ہونا چاہئے تھی اور شعور بھی اور جب ایسا نہیں ہے تو ایک ایسا مبداء شعور و حیات ماننا ناگزیر ہو گا جو حیات و ادراک بھی رکھتا ہو اور قدیم و ازلی بھی ہو اور وہ ذات ذات خداوندی ہے جو حی و مدرک بھی ہے اور قدیم و ازلی بھی۔

کائنات کے اجزاء میں توافق و ہم آہنگی اور مقصد کی کارفرمائی بھی اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ یہ کائنات ایک علم و ادراک اور ارادہ و قدرت کی مالک ہستی کی تخلیق کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ اس کارگاہ عالم پر نظر کی جاتی ہے تو ہر شے دوسری شے سے اس طرح وابستہ نظر آتی ہے جس طرح زنجیر کی کڑیاں ایک دوسرے سے وابستہ و مرتبط ہوتی ہیں۔ جب سطح سمندر پر دھوپ پڑتی ہے تو بخارات وجود میں آتے ہیں اور بخارات کے ٹکڑے مل کر بادل کی شکل میں فضا پر چھا جاتے ہیں اور پھر موسلا دھار برسنے لگتے ہیں' جس سے زمین کی سیرابی اور دانہ کی روئیدگی کا ساماں ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ زمین کی زرخیزی' بیج کی استعداد' آفتاب کی حرارت' موسم کی اثر آفرینی اور ہوا کے جھونکے اپنے اپنے مقام پر ایک لگے بندھے قانون کے اندر شریک عمل ہوتے ہیں۔ اس نظم و ضبط کو دیکھ کر مادہ کے منتشر ذرات کے اتفاقی اجتماع کو کائنات کا خالق قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اتفاق کسی نظم و قانون کا پابند نہیں ہوتا اور نہ اس میں تسلسل و دوام پایا جاتا ہے۔ لہٰذا جو چیز ہمیشہ ایک نہج سے ظہور میں آئے اسے اتفاق پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ کیا یہ اتفاق کا کرشمہ ہے کہ ہمیشہ بہار کے موسم میں پتیاں پھوٹیں اور پھول کھلیں اور ہر پھول کی پتیاں طاق رہیں؟ موتی سیپیوں میں پیدا ہوں اور سیپیاں سمندر کی گہرائی میں پائی جائیں' مچھلیاں پانی میں زندہ رہیں اور پرندے فضاؤں میں اڑیں' سورج مشرق سے طلوع ہو اور مغرب کی سمت غروب ہو' چاند مقررہ تاریخوں میں گھٹے بڑھے' سورج اور چاند

گرہن معینہ دستور کے ماتحت لگے اور تمام کرے اور سیارے ہمیشہ اس رفتار سے اپنے مدار میں رواں دواں رہیں جو نظم کائنات اور نباتی و حیوانی زندگی کے لئے ضروری ہے؟ چنانچہ زمین چوبیس گھنٹوں میں ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اپنے گرد چکر کاٹتی ہے اگر یہ رفتار ہزار میل کے بجائے سو میل رہ جائے تو شب و روز کا طول دس گنا زائد ہو جائے یعنی ۱۲۰ گھنٹے کا دن اور ۱۲۰ گھنٹے کی رات۔ اس کے نتیجہ میں دن اتنے گرم ہو جائیں کہ تمام نباتات جل جائیں اور راتیں اتنی ٹھنڈی ہو جائیں کہ ہر چیز منجمد ہو کر رہ جائے۔ اتفاق بہرحال اتفاق ہوتا ہے۔ اس میں کسی نظم و ترتیب کی پابندی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اگر یہ سب کچھ اتفاق کی کرشمہ کاری ہے تو ہمیشہ ایک سا اتفاق کیوں ہوتا ہے اس چیز کو دیکھتے ہوئے کہ دنیا کی ہر چیز میں نظم و یک رنگی نئی پائی جاتی ہے اور موجودات وہ ارضی اجسام ہوں یا فلکی اجرام' سالمات ہوں یا جواہر' مثبت برقیے ہوں یا منفی' مقررہ حدود سے رائی برابر ادھر ادھر نہیں ہوتے۔ یہ اعتراف ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اس نظام کو چلانے والی کوئی برتر و حکیم ہستی موجود ہے۔ اسے بے شعور ذرہ کی غیر ارادی حرکت کا نتیجہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس نظم و ترتیب کے ساتھ جب اس چیز پر نظر کی جاتی ہے کہ ہر مخلوق میں وہی چیزیں ودیعت کی گئی ہیں جو اس کی نوع کے اعتبار سے ضروری' اس کی زندگی و بقا کے لئے لازمی ہیں تو یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کسی غیر شعوری حرکت کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مچھلی میں گلپھڑے پیدا کئے گئے تاکہ وہ پانی کے اندر سانس لے سکے۔ پرندوں کو پر دئے گئے تاکہ وہ پرواز کر سکیں۔ انسان کے جوڑوں میں لچک رکھی گئی تاکہ اسے اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں آسانی ہو۔ درختوں میں رگ و ریشہ کے جال بچھائے گئے تاکہ ہر حصہ میں غذا پہنچ سکے۔ کاروکسب اور آرام و راحت کے اوقات کا لحاظ کرتے ہوئے سورج کی روشنی تیز اور چاند کی روشنی دھیمی رکھی گئی۔ غرض دنیا کی ہر چیز میں کوئی نہ کوئی مصلحت اور کوئی نہ کوئی مقصد کارفرما نظر آتا ہے۔ اس سے ہر انسان یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ مادہ جو عدم شعور کی بنا پر مقصد کا پابند نہیں ہو سکتا' اس بامقصد تخلیق کا خالق نہیں ہے۔ بلکہ یہ مادہ کی بے معنی و بے مقصد کارفرمائی کے بجائے ایک علیم و حکیم ذات کی حکمت آفرینی کا کرشمہ ہے جس نے ہر چیز میں ترتیب' تناسب اور مقصد کو ملحوظ رکھا ہے۔

عقل و ادراک کی نارسائی

خدا کی کنہ حقیقت تک عقل کی نارسائی کے سلسلہ میں امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

الحمد لله الذی اعجزالا وهام ان تنال الاوجوده وحجب العقول عن ان تتخیل ذاته فی امتنا عها من الشبهته والشکل (توحید وصدوق)

تمام ستائش اس اللہ کے لئے ہے جس نے افکار و اوہام کو درماندہ کر دیا کہ وہ اس کے اصل وجود کے علاوہ اس کی حقیقت کو پا سکیں اور عقلوں کو اپنی ذات کے ادراک سے روک دیا ہے کیونکہ وہ شکل و شباہت سے بلند تر ہے۔

خالق کائنات کی کنہ حقیقت کا ادراک انسان کے دائرہ امکان سے باہر ہے' خواہ وہ بالغ نظر اور علم و حکمت کی بلندیوں پر فائز کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ انسان خود بھی محدود ہے اور اس کی فکری پرواز بھی محدود ہے اور خداوند عالم غیر محدود ہے۔ جس کی نہ ابتداء ہے اور نہ انتہا اور محدود کسی صورت سے غیر محدود کا احاطہ نہیں کر سکتا کہ اس کی کنہ ذات تک رسائی حاصل کر سکے اور غیب الغیوب کے پردوں کو اٹھا کر حقیقت واقعیہ کی نقاب کشائی کرے۔ جب ایک نقش اپنے نقاش کو نہیں سمجھ سکتا حالانکہ وہ دوسروں کی بنی ہوئی چیزوں' کاغذ' رنگ اور موباف کی مدد سے چند لکیروں کو ترتیب دے کر انہیں ایک مخصوص شکل دیتا ہے تو انسان اس صانع و صورت گر کی کنہ حقیقت کو کیونکر جان سکتا ہے۔ جس نے بغیر کسی نمونہ و مثال کے شکم مادر کی تاریکیوں میں اس کی نقش آرائی کی ہو۔ انسان تو خود اپنی ذات سے بھی تماما" و کمالا" آگاہ نہیں ہے۔ چنانچہ آج تک کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکا کہ وہ مادہ روح اور حیات کی حقیقت کو سمجھ چکا ہے تو مادہ کے موجد اور روح و حیات کے خالق کی کنہ حقیقت کو کیا سمجھ سکتا ہے جبکہ وہ نہ زمان و مکان کی حدوں میں سما سکتا ہے نہ حواس کی گرفت میں آسکتا ہے اور نہ اس کی کوئی مثل و شبیہہ ہے۔ عام انسانوں کا تو ذکر ہی کیا انبیاء و اوصیاء بھی کمال معرفت کے باوجود اس کی کنہ ذات کے ادراک سے عجز کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

یا من لا یعلم ماهوالاهو۔

اے وہ ذات جسے اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں جانتا۔

عقل انسانی کی پرواز یہیں تک ہے کہ وہ مصنوع سے صانع اور آثار سے خالق کائنات کی طرف رہنمائی کرے کیونکہ یہ آثار اس کے وجود اور اس کے صفات کمالیہ' علم و قدرت وغیرہ پر برہان ناطق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہی آثار و اعمال سے انبیاء و رسل اس کے وجود پر استدلال کرتے اور خدا پرستی کی دعوت دیتے تھے' چنانچہ جب

فرعون نے حضرت موسی علیہ السلام سے پوچھا کہ "**فمن ربکما یا موسی**" اے موسی علیہ السلام تم دونوں کا پروردگار کون ہے" تو حضرت موسی علیہ السلام نے کہا

ربناالذی اعطی کل شئی خلقہ ثم ھدی۔

ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر شے کی اس کے مناسب حال صورتگری کی۔ پھر زندگی بسر کرنے کے طریقوں کی طرف رہنمائی فرمائی۔

فرعون نے تو رب کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس کے آثار و افعال کے بارے میں دریافت نہیں کیا تھا مگر حضرت موسی علیہ السلام اس کی ذات کے متعلق کچھ نہیں کہتے بلکہ ہر مخلوق کی جسمانی و ذہنی ساخت اور فطری و وجدانی رہبری کو جو قدرت کا عطیہ ہے اس کے وجود پر بطور شاہد پیش کرتے ہیں اور یوں اسے ادھر متوجہ کرتے ہیں کہ اللہ کی ذات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جا سکتا اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو اس کے آثار و اعمال کے بارے میں اور یہی مظاہر و آثار اس کی ہستی کا ناقابل انکار ثبوت ہیں۔

خدا کے صفات عین ذات ہیں

ذات و صفات کی وحدت کے سلسلہ میں امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

وکمال الاخلاص لہ نفی الصفات عنہ لشھادتہ کل صفتہ انھا غیرالموصوف و شھادہ کل موصوف انہ غیر الصفت۔

کمال تزیہہ و اخلاص یہ ہے کہ اس سے صفتوں کی نفی کی جائے کیونکہ ہر صفت شاہد ہے کہ وہ اپنے موصوف کی غیر ہی اور ہر موصوف شاہد ہے کہ وہ صفت کے علاوہ کوئی چیز ہے۔

انسان کے صفات اس کی ذات سے جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اگر ایسا نہ ہو تو تمام انسان صفات کے اعتبار سے یکساں نظر آئیں حالانکہ ان مین عالم بھی ہوتے ہیں اور جاہل بھی، قادر و توانا بھی ہوتے ہیں اور عاجز و کمزور بھی۔ کیونکہ بعض میں علم و قدرت کی صفت پائی جاتی ہے اور بعض اس صفت سے عاری ہوتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ انسان کی ذات بحیثیت ذات علم و قدرت نہیں رکھتی بلکہ یہ صفتیں خارج سے اس میں آتی ہیں۔ اس کی ذات الگ ہے اور اس کے یہ صفات الگ ہیں۔ اگر خدا کو بھی ایسا ہی مان لیا جائے کہ وہ اپنے کمالات کے اظہار میں صفات کا محتاج ہے تو ذات بحیثیت ذات کمالات کی حامل نہ رہے گی بلکہ صفات کی دست نگر قرار پائے گی حالانکہ وہ ہر لحاظ سے بے نیاز اور احتیاج سے بری ہے اس کے علاوہ ذات کے ساتھ صفت تجویز کرنے سے دوئی کی جھلک پیدا ہو جائے گی کیونکہ مفہوم کے اعتبار سے صفت وموصوف میں مغائرت و بیگانگی ہوتی ہے۔ صفت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ

موصوف سے ایک الگ شے ہو اور موصوف ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ صفت سے جداگانہ چیز ہے۔ **لہٰذا** جب اسے صفت سے موصوف مانا جائے گا تو ذات کے ساتھ ایک اور چیز کو بھی ماننا ہو گا جو زائد بر ذات ہے اور جب اس کے ساتھ اور چیز کو بھی مانا تو وحدت حقیقیہ ختم ہو جائے گی اور جتنی صفتیں مانی جائیں گی اتنے زوائد اور ماننا ہوں گے۔ اگر یہ زوائد بھی ذات کی طرح قدیم ہوں گے تو جتنی صفتیں مانی جائیں گی اتنے قدیم اور ماننا پڑیں گے اور اگر یہ زوائد حادث ہیں تو ان کے وجود میں آنے سے پہلے وہ علم و قدرت سے عاری اور دوسرے صفات سے خالی قرار پائے گا اور یہ دونوں چیزیں بنیادی طور پر غلط ہیں۔ غرض اس کے صفات کمالیہ اس کی ذات سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہیں اور وہ اسی طرح عین ذات ہیں جس طرح انسان کے لئے انسانیت عین ذات ہے۔ بایں معنی کہ انسانیت ہی عین انسان ہے اسی طرح صفات باری عین ذات باری ہیں اور اس سے الگ کوئی شے نہیں ہیں۔

الفاظ صفات باری کی تعبیر سے قاصر ہیں

امیر المومنین کا ارشاد ہے۔ **لیس لصفتہ حد محدود ولانعت موجود۔** اس کے کمال ذات کی کوئی حد معین نہیں اور نہ اس کے لئے توصیفی الفاظ ہیں۔

خداوند عالم کے صفات الفاظ میں ڈھل نہیں سکتے اور نہ لفظوں کے ذریعہ ان کی حقیقت تک رسائی ممکن ہے اس لئے کہ الفاظ انسان کے وضع کردہ ہیں اور وہ انہی چیزوں کے لئے الفاظ بناتا اور وضع کرتا ہے جو اس کے علم و مشاہدہ میں آتی ہیں یا ان معانی و مفاہیم کے لئے جن کا شعور و ادراک اسے ہو سکتا ہے اور جو چیز انسانی فہم و ادراک سے بلند تر ہو اس کے لئے کوئی لفظ بھی وضع نہیں کی جا سکتی۔ آخر وہ کسی چیز کے مقابلہ میں لفظ وضع کرے گا جبکہ وہ چیز نہ اس کی نظر سے گزری ہے اور نہ تنگنائے ذہن میں سما سکتی ہے البتہ جب اس نے زمین و آسمان اور وسیع کائنات پر نظر کی اور اس سے خالق کے وجود کا پتا لگایا اور اس خلق کائنات سے یہ بھی جانا کہ خالق و وجود بخش عالم وہی ہو سکتا ہے جو بے خبر عاجز اور زندگی سے عاری نہ ہو تو ان منفی صفات کو علم قدرت اور حیات سے تعبیر کیا گیا۔ یہ الفاظ چونکہ توصیفی معنی کے لئے وضع کئے گئے ہیں اور صفت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے موصوف کے مغائر ہو تو جہاں ذات الگ اور صفت الگ ہو گی وہاں تو یہ الفاظ اپنے معانی پر منطبق ہوں گے اور جہاں ذات و صفت میں امتیاز و علیحدگی نہ ہو بلکہ جو ذات ہو وہی صفت ہو اور جو صفت ہو وہی ذات ہو وہاں یہ الفاظ واقعی مفہوم کے ادا کرنے سے قاصر رہیں گے اگرچہ اسے عالم، قادر اور حی کہا جاتا ہے۔ مگر صفت بحیثیت صفت اس میں نہیں ہو سکتی بلکہ علم، قدرت و حیات اور ارادہ کے آثار دیکھے گئے تو اسے عالم، قادر، حی اور مرید کے لفظوں سے یاد کیا اور انہی آثار کی بنا پر اسے صفات سے متصف مانا گیا۔ ان صفتوں کو صفات ثبوتیہ کا نام دیا گیا ہے۔ مگر در حقیقت ان صفات کے ذریعہ ان صفات کے اضداد کی نفی کرنا مقصود ہوتی ہے چنانچہ علم سے نفی جہل، قدرت سے نفی عجز، غنا و بے نیازی سے نفی

احتیاج، عدل سے نفی ظلم اور حیات سے نفی موت کی جاتی ہے۔ اسی طرح اسے موجود کہا جاتا ہے تو اس معنی سے کہ وہ معدوم نہیں ہے اور واجب الوجود کہا جاتا ہے تو اس معنی سے کہ وہ ممکن الوجود نہیں ہے۔ تاکہ سلب نقائص سے اس کے کمال ذات کی ایک حد تک نشاندہی کی جا سکے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام نے اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

ان قیل کان فعلی تاویل الا زلیتہ و ان قیل لم یزل فعلی تاویل نفی العلم۔ (توحید صدوق)

اگر یہ کہا جائے کہ وہ تھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عدم اس پر سابق نہیں ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ ہمیشہ سے رہا ہے تو اس کے معنی عدم و نیستی کی نفی کے ہیں۔

صفات ثبوتیہ و سلبیہ

خداوند عالم کی ذات تمام صفات جمال و کمال سے آراستہ اور تمام عیوب و نقائص سے بری ہے۔ ان صفات کی حد بندی نہیں ہو سکتی اس لئے کہ اللہ کی ذات غیر محدود ہے اور یہ صفات اس کی ذات سے جداگانہ وجود نہیں رکھتے بلکہ اس کی ذات ہی ان صفات کا مبداء و منشا ہے۔ لہٰذا ہر وہ صفت جو جمال و کمال کی آئینہ دار اور اس کے شایان شان ہو وہ اس کے لئے ثابت ہو گی اور ہر وہ صفت جو نقص و حدوث کی مظہر ہو اس کے ساحت قدس سے الگ قرار دی جائے گی۔ اصطلاح متکلمین میں پہلی قسم کو صفات ثبوتیہ اور دوسری قسم کو صفات سلبیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے ان صفات ثبوتیہ و سلبیہ میں سے چند نمایاں صفات ذکر کئے جاتے ہیں۔

علم باری تعالیٰ

امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لا یعزبہ عنہ عدد قطر الماء ولا نجوم السماء ولا سوافی الریح فی الھواء ولا دبیب لنمل علی الصفاء ولا مقیل النر فی اللیلتہ الظلماء یعلم ساقط الا وراق و خفی طرف الاحداق۔ نہج البلاغہ)

اس سے پانی کے قطروں اور آسمان کے ستاروں اور ہوا کے جھکڑوں کا شمار چکنے پتھر پر چیونٹی کے چلنے کی آواز اور اندھیری رات میں چھوٹی چیونٹیوں کے قیام کرنے کی جگہ، کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے وہ پتوں کے گرنے کی جگہوں اور آنکھ کے چوری چھپے اشاروں کو

جانتا ہے۔

خداوند عالم کا علم ماکان وما یکون پر محیط ہے اور چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی کوئی چیز اس کے دائرہ علم سے خارج نہیں ہے وہ ہونٹ کی جنبشوں چوری چھپے اشاروں اور دل میں گزرنے والے خیالات تک سے آگاہ ہے۔ جو شخص اللہ کو خالق عالم مانتا ہے وہ اسے عالم کائنات بھی تسلیم کرے گا۔ اس لئے کہ جو کسی شے کو جانتا ہی نہ ہو وہ اسے خلق نہیں کر سکتا۔ جب تمام عالم اس کا ایجاد کردہ ہے تو کون سی چیز اس کی نظروں سے اوجھل رہ سکتی ہے۔ وہ ازل سے ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ اس کا علم نہ معلومات کے تابع ہے اور نہ موجودات کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے کہ اشیاء موجود ہو لیں تو وہ جانے۔ بلکہ وہ ہر چیز کو اس کے موجود ہونے سے پہلے جانتا ہے اور اس پر طاری ہونے والے تصورات و کیفیات سے آگاہ ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے اس کے علم کی ہمہ گیری و وسعت پر روشنی ڈالنے کے لئے جزئیات کو بیان کیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ اس کا علم صرف کلیات میں منحصر نہیں ہے بلکہ تمام جزئیات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس سے ان فلاسفہ کی رد ہوتی ہے جن کا نظریہ یہ ہے کہ خدا کو جزئیات کے علم نہیں ہے اس لئے کہ جزئیات میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اور جزئیات کو تغیر سے وہ محل حوادث قرار پائے گا۔ یہ نظریہ فلاسفہ کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے اس لئے کہ جزئیات کے تغیر سے علم میں تغیر اس وقت لازم آتا ہے جب اسے ان تغیرات کا علم نہ ہو اور اگر تغیر و تبدل کی تمام صورتیں اس کے سامنے روشن ہوں تو یہ تغیر صرف معلومات میں ہو گا اور علم جو عین ذات ہے وہ اس سے متاثر نہیں ہو گا۔

علم الہیٰ کے سلسلہ میں مسئلہ بدا بھی آتا ہے جو شیعی معتقدات میں سے ہے۔ ایک گروہ نے فرقہ امامیہ کی طرف یہ نسبت دی ہے کہ یہ بدا کے پردہ میں اللہ کے لئے جہل تجویز کرتا ہے۔ یہ غلط فہمی اس بنا پر ہوئی ہے کہ بدا کے لغوی معنی کسی چیز کے مخفی ہونے کے بعد ظاہر ہونے کے ہیں اور اس سے یہ سمجھ لیا گیا کہ اللہ کو کسی امر میں غلطی کا احساس ہوتا ہے تو وہ اس میں تبدیلی کر دیتا ہے اور یہ غلطی جہل اور بے خبری ہی کی بنا پر ہو گی۔ فرقہ امامیہ کی طرف جہل باری کی نسبت سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ ان کے نزدیک نہ بدا کا یہ مفہوم ہے اور نہ اس معنی سے بدا کی نسبت اللہ کی طرف دی جا سکتی ہے بلکہ بدا کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز ہمارے لئے پردہ خفا میں تھی اس کا ظہور ہوا نہ یہ کہ اللہ پر کوئی چیز مخفی تھی اور وہ بعد میں اس پر ظاہر ہوئی۔ اگر ایسا ہو تو تمام اشیاء سے اس کی نسبت مساوی نہ رہے گی حالانکہ وہ اپنے عموم علم و قدرت کی بنا پر سب سے یکساں نسبت رکھتا ہے۔ البتہ احوال و ظروف کے بدلنے یا اجرائے احکام کی مصلحت کے ختم ہونے سے جس طرح احکام میں ترمیم کر دیتا ہے جسے نسخ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح مصالح و مقتضیات کے بدلنے سے حوادث و تکوینیات میں بھی ردوبدل کرتا رہتا ہے اور ایسا نہیں ہے جیسا کہ یہود کا عقیدہ ہے کہ اللہ کو جو کرنا تھا وہ کر چکا اب اس کے ہاتھ بندھ چکے ہیں بلکہ وہ محو و اثبات پر اختیار تام رکھتا ہے۔ چنانچہ جہاں محو کرنے میں مصلحت ہوتی ہے وہاں محو کر دیتا ہے اور جہاں ثبت کرنے میں مصلحت ہوتی ہے وہاں ثبت

کر دیتا ہے اور ردوبدل کی یہ تمام صورتیں اس کے سامنے روشن ہوتی ہیں۔ اسی محو و اثبات کا نام بدا ہے قرآن مجید میں ہے۔

یمحوالله مایشاء و یثبت و عنده ام الکتاب

وہ جس چیز کو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے ثبت کر دیتا ہے اور اس کے پاس ام الکتاب (لوح محفوظ) ہے۔

اگر نسخ احکام سے جہل لازم نہیں آتا تو بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر تکوینیات میں ردوبدل ہو تو اسے نتیجہ جہل قرار دے کر کسی کو مطعون کرنا تقاضائے دیانت و انصاف کے خلاف ہے۔

قدرت باری

حضرتؑ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا ہے۔

وماالذی نری من خلقک وتعجب له من قلو تک و نصفه من عظیم سلطانک وما تغیب عنا منه و قصرت ابصارنا عنه و انتهت عقولنا دونه وحالت سواترالغیوب بیننا و بینه اعظم۔(نہج البلاغہ)

یہ تیری مخلوق کیا ہے جو ہم دیکھتے ہیں اور اس میں تیری قدرت کی کارسازیوں پر تعجب کرتے ہیں اور تیری عظیم فرمانروائی کی کارفرمائیوں پر توصیف کرتے ہیں حالانکہ وہ مخلوقات جو ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے اور جس تک پہنچنے سے ہماری نظریں عاجز اور عقلیں درماندہ ہیں اور ہمارے اور جن کے درمیان غیب کے پردے حائل ہیں اس سے کہیں زیادہ با عظمت ہے۔

کائنات اور اس کی لا انتہاء وسعتیں اللہ کی قدرت بے پایاں کی شاہد ہیں اس لئے کہ یہ اسی کی تخلیق ہے اور خلق و ایجاد ارادہ و اختیار سے وابستہ ہے اور ارادہ و اختیار قدرت کا منہ بولتا ثبوت ہے لہٰذا جو صانع و خالق ہو گا وہ صاحب ارادہ و اختیار بھی ہو گا اور جو صاحب ارادہ و اختیار ہو گا وہ قادر و توانا بھی ہو گا۔ جب ایک مردہ انسان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ چلنے پھرنے لگے اور ایک نابینا سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ دیکھ سکے۔ تو ایک عاجز و درماندہ سے یہ امید کیونکر کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک ایسی کائنات ایجاد کر دے جس کی ایجاد پر وہ قدرت ہی نہ رکھتا ہو۔ لہٰذا جب وہ خالق و صانع عالم ہے تو وہ خلق کائنات پر قدرت بھی رکھتا ہو گا۔ اگر اس نے قدرت و اختیار کے بغیر ہی ایسا عالم پیدا کر دیا جس کا کوئی نمونہ اس کے سامنے نہ تھا تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ وہ پروں کے بغیر پرواز

کرتا، آنکھوں کے بغیر دیکھتا اور کانوں کے بغیر سنتا ہے۔ کوئی بھی ذی شعور اس کے دعویٰ کو تسلیم نہ کرے گا۔ اس لئے کہ اس میں اڑنے دیکھنے اور سننے کی طاقت ہی نہیں ہے۔ جب بصارت و سماعت کی قوت کے بغیر دیکھا' سنا نہیں جا سکتا تو قدرت و اختیار کے بغیر یہ عالم کیونکر خلق کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ خلق قدرت کی کارفرمائی ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ بہرحال جو اسے خالق و صانع مانتا ہے وہ اس کے قادر ہونے سے انکار نہیں کر سکتا اور انکار ہو بھی کیونکر سکتا ہے جبکہ اس کی قدرت کاملہ کے آثار ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں وہ اور جس میں دریا' پہاڑ' سمندر' ہرے بھرے درخت' قسم قسم کے حیوانات اور گوناگوں اقسام کے پرندے دکھائی دیتے ہیں اور فضا کی بلندیوں پر سورج چاند اور ستارے چمکتے نظر آتے ہیں اس کی قدرت کا روشن ثبوت ہیں اور پھر کائنات اسی کرہ خاکی اور نظر آنے والی اشیاء ہی کا نام نہیں ہے بلکہ ان دیکھی کائنات کے مقابلہ میں یہ دیکھی بھالی دنیا تو بس اتنی ہی ہے جتنی سمندر کے پھیلاؤ کے مقابلہ میں ایک معمولی لہر۔ جب اس دکھائی دی جانے والی کائنات میں قدرت کے آثار و مظاہر کا احاطہ نہیں ہو سکتا تو ان دیکھی کائنات میں قدرت کی کارفرمائیوں کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ انسان لاکھ چاہے قدرت کی بے پایاں وسعتیں اس کے فہم و ادراک کی رسائی سے بالاتر رہیں گی نہ اس کی قدرت کی حد بندی ہو سکتی ہے اور نہ گنی چنی چیزوں میں محدود کی جا سکتی ہے بلکہ وہ ہر چیز پر یکساں قدرت رکھتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ بعض چیزوں پر اسے قدرت حاصل ہو اور بعض چیزیں اس کے احاطہ قدرت سے باہر ہوں۔ اس لئے کہ تمام ممکنات سے اس کی نسبت یکساں ہے۔ لہذا تمام چیزوں پر قدرت بھی یکساں ہونا چاہئے ورنہ تخصیص بلا مخصص لازم آئے گی۔ البتہ قدرت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ فعل مقدور وقوع میں بھی آئے کیونکہ قدرت اور چیز ہے اور وقوع فعل اور ہے اور ان دونوں میں تلازم نہیں ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے امیرالمومنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ کیا اللہ اس پر قادر ہے کہ وہ اس زمین کو انڈے میں سمو دے اس طرح کہ نہ زمین کا حجم کم ہو اور نہ انڈا ٹوٹے حضرتؑ نے فرمایا۔

ویلک ان اللہ لا یوصف بعجز ومن اقدر ممن یلطف الارض ویعظم البیضہ (توحید صدوق)۔

خدا میں عجز و کمزوری نہیں ہو سکتی اس سے بڑھ کر کون قادر ہو گا جو چاہے تو زمین کو اتنا چھوٹا اور انڈے کو اتنا بڑا کر دے کہ زمین اس میں سما سکے۔

کلام باری

امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

انما کلامہ سبحانہ فعل منہ انشاء ومثلہ لم یکن من قبل ذلک کائنا ولو کان قدیما لکان بھاثانیا۔(نہج البلاغہ)

اللہ سبحانہ کا کلام بس اس کا ایجاد کردہ فعل ہے اور اس طرح کا کلام پہلے سے موجود نہیں ہو سکتا اور اگر وہ قدیم ہوتا تو وہ دوسرا خدا ہوتا۔

انسان جب کلام کرتا ہے تو حرف سے حرف جڑتے لفظ کی صورت میں ڈھلتے اور آواز کے اتار چڑھاو کے ساتھ لب و دہن سے نکلتے ہیں۔ یہ حرفوں کا جڑنا لفظوں میں ڈھلنا اور زبان کی حرکت سے یکے بعد دیگرے نکلنا یہ سب حدوث کی علامتیں ہیں اور کلام الٰہی حوادث حروف' الفاظ اور صوت کا مجموعہ ہے لہٰذا خدا وند عالم کو اس معنی سے تو متکلم نہیں کہا جاسکتا کیونکہ حادث ہی محل حادث ہو سکتا ہے اور خدانہ حادث ہے کہ مرکز حوادث ہو اور نہ جوہر ہے کہ محل اعراض ہو۔ بلکہ واجب الوجود اور قدیم و ازلی ہے۔ اس کے متکلم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ جس چیز میں چاہتا ہے کلام پیدا کر دیتا ہے اور اسے اپنی طرف نسبت دیتا ہے۔ چنانچہ اس نے درخت میں آواز پیدا کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا" **یا موسیٰ انی انا اللہ رب العالمین** " اے موسیٰ بیشک میں ہی اللہ ہوں جو سب جہانوں کا پروردگار ہے" جب کلام اللہ کا پیدا کردہ ہے تو اسے قدیم و غیر مخلوق نہیں کہا جاسکتا بلکہ وہ حادث و مخلوق ہی ہو گا۔ کیونکہ کلام لفظوں سے اور لفظ حرفوں سے مرکب ہوتا ہے اور جس میں اجزائے ترکیبی ہوں وہ حادث و مخلوق ہی قرار پائے گا۔ مگر ایک گروہ کلام الٰہی کو قدیم و غیر مخلوق مانتا ہے اور کلام کو دو قسموں پر تقسیم کر دیا ہے! ایک کلام نفسی اور ایک کلام ملفوظی اس کلام نفسی و ملفوظی کو یوں سمجھنا چاہئے کہ جب کوئی شخص کلام کرنا چاہتا ہے تو زبان پر الفاظ لانے سے پہلے دل میں الفاظ تجویز کرتا اور ذہن میں ان کی ترتیب قائم کرتا ہے۔ اس طرح کلام کا ایک ذہنی وجود قائم ہو جاتا ہے۔ یہ گویا کلام نفسی ہے اور جب ذہنی الفاظ زبان کی حرکت اور ہوا کے تموج سے کان کے پردوں سے ٹکراتے ہیں تو وہ کلام ملفوظی ہے۔ اس گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ کلام نفسی ازل سے مرتب صورت میں ذات الٰہی کے ساتھ قائم تھااور اسی کلام نفسی کے اعتبار سے جو اس کی صفت قدیم ہے وہ متکلم کہلاتا ہے۔

یہ کلام نفسی کی اصطلاح تیسری صدی ہجری میں وضع کی گئی تاکہ اس کے کلام کو قدیم ثابت کیا جاسکے۔ پہلے تو اس پر نظر کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا خدا کی صفتیں اس سے الگ تصور کی جا سکتی ہیں کہ کلام کو ایک جداگانہ حیثیت دے کر قدیم مانا جائے؟ اگر اس کی صفتیں اس کی ذات سے جدا مانی جائیں تو وہ قدیم ہوں گی یا حادث اگر حادث ہوں گی تو اللہ محل حوادث ٹھہرے گا اور قدیم ہوں گی تو قدیم ایک میں منحصر نہ رہے گا بلکہ جتنی صفتیں ہوں گی

اتنے قدیم ماننا پڑیں گے اور یہ دونوں صورتیں باطل ہیں۔ لہٰذا کلام کو ذات سے ایک قدیم صفت قرار دینا صحیح نہ ہو گا۔ اس موقع پر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ کلام نفسی اس کے علم کے علاوہ کوئی اور صفت ہے کہ اگر وہ کلام نفسی سے متصف نہ ہوتا تو حروف والفاظ سے بے خبر رہ جاتا؟ جب ایسا نہیں ہے بلکہ اس کا علم ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے تو علم سے الگ کلام نفسی کے ماننے کی ضرورت ہی کیا ہے اور پھر یہ کلام نفسی کلام نفسی کے حدود میں رہ کر کلام ہی نہیں ہے اور اللہ نے جسے وحی کی صورت میں اتارا اور انبیاء کے گوش زد کیا وہ یہی کلام ملفوظی ہی تو تھا جس کا وہ خالق و موجد ہے اور اسی خلق وایجاد کی بنا پر اسے متکلم کہا جاتا ہے اور جو چیز خلق ہو گی وہ لا محالہ حادث ہو گی۔ اگر کلام کو قدیم قرار دیا جائے گا تو ضروری ہے کہ وہ علت کا محتاج نہ ہو کیونکہ قدیم ایجاد و خلق سے بے نیاز ہوتا ہے نہ اس میں علت موجدہ کا عمل دخل ہوتا ہے جو اسے وجود میں لائے اور نہ علت مبقیہ کا جو اسے باقی و برقرار رکھے۔ اس لئے کہ علت موجدہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ معلول سے سابق ہو اور جس پر کوئی چیز سابق ہو گی وہ قدیم نہ ہو گا اور علت مبقیہ علت موجدہ ہی کے دوام استمرار کا نام ہے۔ جب علت موجدہ نہ ہو گی تو علت مبقیہ بھی نہ ہو گی۔ جب کلام اپنی قدامت کی بنا پر علت سے بے نیاز اور متکلم سے مستغنی ٹھہرا تو وہ اللہ کا فعل نہ رہا بلکہ دوسرا اللہ ہو گیا اور اگر اللہ کا فعل ہے تو وہ بہر صورت اللہ کا ایجاد کردہ ہو گا اور جس چیز سے ایجاد کا تعلق ہو گا وہ حادث قرار پائے گی۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

ما یاتیھم من ذکر من ربھم محدث

جب ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے ذکر میں سے کوئی چیز آئی ہے جو حادث ہے۔

نفی روایت

حضرتؑ نے خداوند عالم کے غیر مرئی ہونے کے بارے میں فرمایا ہے۔

لم ترینتہ العیک نظر و لم یدی ککی بصر ادرکت الابصار واحصیت الاعمار۔

نہ نظریں تیرے ساحت قدس تک پہنچ سکتی ہیں اور نہ نگاہیں تجھے دیکھ سکتی ہیں تو نے نظروں کو پا لیا ہے اور عمروں کا احاطہ کر لیا ہے۔

اللہ دنیا و آخرت میں نادیدنی اور نظر و بصر میں سمانے سے بلند تر ہے اسے نہ کسی نے دیکھا ہے اور نہ دیکھ سکے گا کیونکہ دیکھنے میں وہی چیز آتی ہے جو کسی سمت میں واقع ہو۔ رنگ، شکل اور جسم رکھتی ہو اور اللہ، مکان، سمت، اعضاء و جوارح اور تمام لوازم مادہ سے پاک وصاف ہے۔ ایک گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں نظر آئے یا نہ آئے آخرت میں بہرحال دکھائی دے گا اور دنیا والے اسے اسی طرح دیکھیں گے جس طرح فضا کی بلندیوں پر چاند دیکھتے ہیں۔

یہ نظریہ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ اللہ ذاتاً" ناقابل رویت ہے اور ناقابل رویت ذات نہ دنیا میں نظر آسکتی ہے اور نہ آخرت میں۔ چنانچہ قرآن مجید میں عمومیت کے ساتھ رویت کی نفی کی گئی ہے۔

لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھواللطیف الخبیر۔ آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھ رہا ہے اور وہ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز سے آگاہ اور باخبر ہے۔

اگر رویت کے معنی علم و یقین کے لئے جائیں تو بے شک اہل عرفان کا ضمیر و وجدان اسے دیکھتا ہے۔ بایں معنی کہ انہیں اس ان دیکھی ہستی کا اتنا ہی یقین ہوتا ہے جتنا کسی دیکھی بھالی ہوئی چیز کا ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے یقین کی تعبیر رویت سے کرتے ہیں۔ چنانچہ ذعلب یمنی نے امیرالمومنین علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا آپ نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے فرمایا **کیف اعبد ربا لم اره** میں اس رب کی کیونکر پرستش کر سکتا ہوں جسے دیکھا نہیں ہے اس نے دریافت کیا کہ آپ نے کیسے دیکھا ہے فرمایا۔

لم تره العیون بمشاھدہ الابصار ولکن راتہ القلوب بحقائق الایمان۔ (توحید صدوق) آنکھیں اسے آنکھوں کے مشاہدہ سے نہیں دیکھتیں بلکہ دل ایمانی حقیقتوں سے اسے دیکھتے ہیں۔

حضرتؑ کے اس ارشاد سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کے بارے میں جہاں جہاں نظر رویت اور لقاء کے الفاظ آئے ہیں وہاں رویت بصری مراد نہیں ہے بلکہ رویت قلبی مراد ہے جو علم و یقین کے معنی میں ہے۔

عدم مشابہت

حضرت کا ارشاد ہے۔

کذب العادلون بک اذ شبھوک باصنا مھم و نحلوک حلیتہ المخلوقین باوھامھم و جزاء وک تجزئہ المجسمات بخواطرھم۔ نہج البلاغہ) وہ لوگ جھوٹے ہیں جو تجھے دوسروں کے برابر سمجھ کر اپنے بتوں سے تشبیہ دیتے ہیں اور اپنے وہم میں تجھ پر مخلوقات کی صفتیں جڑ دیتے ہیں اور اپنے خیال میں اس طرح تیرے حصے بخرے کرتے ہیں جس طرح مجسم چیزوں کے جوڑ بند الگ الگ کئے جاتے ہیں۔

کوئی چیز اللہ کے مثل و مشابہ نہیں ہے نہ کسی چیز سے اس کی تمثیل دی جاسکتی ہے کہ جس طرح یہود غیرت مند شوہر سے اور عیسائی مہرباں باپ سے اس کی تمثیل دیتے ہیں اور نہ کسی چیز سے اس کی تشبیہ دی جاسکتی ہے کیونکہ

جس چیز سے بھی اس کی تشبیہ دی جائے گی وہ انسانی ذہن کی تخلیق ہو گی اور انسانی ذہن کی پرواز دیکھی بھالی چیزوں تک محدود ہے اور اللہ ہر اس چیز سے بلند تر ہے جو ذہن میں سمائے اور مشاہدہ میں آئے چنانچہ خلاق عالم کا ارشاد ہے۔

لیس کمثلہ شئی۔ اس کے مانند کوئی چیز نہیں ہے۔

پھر جس چیز کو اس کے مشابہ قرار دیا جائے گا وہ حادث ہونے کی بنا پر نقائص حدوث کی حامل اور مختلف کیفیات کا آماجگاہ ہو گی اور اللہ ہر نقص سے بری اور ہر عیب سے پاک ہے مگر کچھ ظواہر پرست افراد نے اسے مختلف کیفیتوں کا حامل قرار دے لیا ہے اور اس کے لئے ایسی چیزیں بھی تجویز کر دی ہیں جو اس کے ساحت قدس کے منافی ہیں چنانچہ حضرت عائشہؓ سے یہ روایت کی جاتی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے پوچھا کہ کیا اللہ ہنستا بھی ہے آپؐ نے فرمایا۔

والذی نفس محمد بیدہ انہ لیضحک۔ (تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۴) اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمد کی جان ہے وہ ہنستا ہے۔

اسی طرح ایک گروہ نے اسے انسانی شکل و صورت میں ڈھال لیا ہے اور انسانی اعضاء ایسے اعضاء اس کے لئے تجویز کر دیئے ہیں اور اس مقصد کے اثبات کے لئے یہ حدیث پیش کرتے ہیں۔

ان اللہ خلق آدمؑ علی صورتہ۔ اللہ نے آدمؑ کو اپنی شکل و صورت پر پیدا کیا۔

اس حدیث کا مطلب وہی لیا گیا ہے جو مذکورہ بالا ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے حالانکہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ تجسیم کے قائلین نے حدیث کا ابتدائی حصہ نظر انداز کر کے اس کا مفہوم ہی بدل ڈالا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام اس حدیث کے مورد و محل کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو آدمیوں کو جھگڑتے دیکھا اور ان میں سے ایک نے دوسرے کو کہا **قبح اللہ وجھک و وجہ من یشبھک**" تمہارے چہرے پر اللہ کی پھٹکار اور اس کے چہرے پر بھی جو تم سے مشابہ ہو" آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ الفاظ سنے تو فرمایا۔

لا تقل ھذا فان اللہ خلق آدم علی صورتہ۔ (توحید صدوق) ایسا مت کہو اللہ نے آدم کو بھی اسی کی صورت پر پیدا کیا تھا۔

اس مورد کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس چابکدستی سے مورد حدیث کو حذف کر کے ضمیر کا مرجع بدل دیا گیا ہے اور حدیث کو من مانے معنی پہنا دیئے گئے ہیں۔

خدا پابند مکان و زمان نہیں ہے

امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لم یسبقہ وقت ولم یتقدمہ زمان ولم یتعاورہ زیادہ ولا نقصان و لم یوصف باین ولا بمکان۔ (توحید صدوق)

وقت اس سے سابق نہیں ہے اور نہ زمانہ اس سے مقدم ہے۔ اس پر زیادتی و کمی وارد نہیں ہوتی۔ اس کے بارے میں نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور نہ یہ کہ وہ کس جگہ پر ہے۔

ہر مادی چیز دوسری مادی چیز سے نزدیک ہو گی یا دور' نیچے ہو گی یا اوپر' دائیں بائیں ہو گی یا آگے پیچھے' اسی طرح ایک چیز دوسری چیز سے پہلے وجود میں آئے گی یا بعد میں یا دونوں ایک ساتھ وجود میں آئیں گی۔ پہلی حد بندی مکان کے اعتبار سے ہے اور دوسری حد بندی زمان کے لحاظ سے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی چیز مادی ہو اور پھر مکان و زمان کے حدود سے باہر ہو۔ مکان و زمان کی احتیاج اسے ہوتی ہے جو جسم رکھتا ہو اور جو جسم و جسمانیات کے صفات سے بری ہو۔ جس میں نہ طول ہو نہ عرض اور نہ عمق۔ وہ مکان و زمان کی حدود میں کیونکر آسکتا ہے۔ اگر اللہ کے لئے مکان و زمان تجویز کیا جائے گا تو اس کی اولیت ختم ہو جائے گی۔ اس لئے کہ مکان و زمان کو اس سے پہلے ماننا ہو گا کیونکہ مکان ہوگا تو وہ ہو گا اور زمان ہو گا تو اس کا وجود ہو گا اور نتیجہ زمان و مکان کا پابند ہو کر ممکنات کی سطح پر آجائے گا نہ قدیم قرار پائے گا اور نہ واجب الوجود رہے گا۔

خدا مجموعہ اجزاء نہیں ہے

امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ولا یوصف بشئی من الاجزاء ولا بالجوارح والاعضاء۔(نہج البلاغہ)

اسے اجزاء اور اعضاء و جوارح میں سے کسی سے متصف نہیں کیا جاسکتا۔

خداوند عالم بسیط محض ہے اس کے لئے نہ اجزائے ذہنی تجویز کئے جاسکتے ہیں اور نہ اجزائے خارجی۔ اگر وہ اجزاء سے مرکب ہو گا تو وہ ان اجزاء کے ترکیب پانے سے جو اس سے پہلے موجود ہوں گے وجود میں آئے گا کیونکہ یہ مسلمہ امر ہے کہ جو چیز مرکب ہوتی ہے اس کے اجزاء پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ جب اس کے اجزاء اس پر مقدم ہوں گے تو وہ لامحالہ ان اجزاء کے بعد وجود پذیر ہو گا۔ اس صورت میں نہ اس کا مستقل وجود رہے گا اور نہ اجزاء کی

احتیاج سے بالاتر قرار پائے گا اور جو نہ اول و اقدم ہو اور نہ مستقلاً" وجود رکھتا ہو بلکہ اجزاء کا محتاج اور ان سے متاخر ہو وہ قدیم و واجب الوجود کیونکر ہو سکتا ہے؟

اللہ حرکت و سکون سے بری ہے

امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لایجری علیہ السکون والحرکۃ وکیف یجری ماھو اجراہ۔(نہج البلاغہ)

اس پر حرکت و سکون طاری نہیں ہو سکتا جو چیز اس نے مخلوقات پر طاری کی ہو وہ اس پر کیونکر طاری ہو سکتی ہے۔

اللہ حرکت و سکون سے بری ہے اس لئے کہ حرکت و سکون اسی چیز میں تجویز کیا جا سکتا ہے جس کے لئے محل و مقام اور نقل مکانی کا تصور کیا جا سکے۔ اس لئے کہ کسی چیز کو اس وقت تک ساکن نہیں کہا جا سکتا جب تک وہ کسی ایک جگہ کی پابند نہ ہو اور اللہ کے لئے جگہ تجویز کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسے محدود قرار دے لیا حالانکہ وہ غیر محدود اور مکان و زمان کے حدود سے بالاتر ہے اور متحرک اس وقت تک قرار نہیں دیا جا سکتا جب تک ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی عمل میں نہ آئے۔ اس منتقلی کے معنی یہ ہیں کہ ایک چیز ایک وقت میں ایک جگہ پر نہ تھی اور دوسرے وقت میں اس جگہ پر آگئی۔ پھر اس جگہ سے معدوم ہوئی اور دوسری جگہ پر موجود ہو گئی اور اسی نیست کے بعد ہست اور ہست کے بعد نیست کے سلسلہ پیہم کا نام حرکت ہے اور جو چیز نیستی سے ہستی میں اور ہستی سے نیستی میں آئے وہ لامحالہ حادث ہو گی۔ لہٰذا حرکت جو اس نیست و ہست کے مجموعہ کا نام ہے حادث ہو گی اور جس پر حرکت طاری ہو گی وہ بھی حادث ہو گا کیونکہ کسی چیز کے ساتھ اعراض کا پایا جانا اس کے حدوث کی دلیل ہے اور اللہ نہ حادث ہے اور نہ محل حوادث۔ اس لئے کہ حادث وہ ہے جو پردہ عدم سے وجود میں آئے اور خداوند عالم قدیم ہے جو مسبوق بالعدم نہیں ہو سکتا اور واجب الوجود ہے جس میں نیستی کا گزر ممکن نہیں ہے۔

ان صفات سلبیہ کے علاوہ بھی حضرتؑ کے کلام میں چند صفتوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن کی ذات خداوندی سے نفی ضروری ہے۔ جیسے اتحاد، حلول، احتیاج وغیرہ انہیں نظر انداز کیا جاتا ہے کیونکہ صفات سلبیہ کے ذیل میں جو مختصر دلائل ذکر کئے گئے ہیں انہی دلائل سے ان کی بھی نفی کی جا سکتی ہے۔

ہستی باری کا اقرار عمل کا مقتضی ہے

امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لا تجعلوا علمکم جھلا ویقینکم شکا اذا علمتم فاعملوا واذا تیقنتم فاقدموا۔

اپنے علم کو جہل نہ قرار دو اور یقین کو شک نہ بناو جب جان چکے تو عمل کرو اور یقین پیدا کر چکے تو آگے بڑھو۔

دنیا میں ہر چیز کے کچھ خواص ہوتے ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے مثلاً سنکھیا کی خاصیت سمیت ہے اور شراب کی خاصیت نشہ ہے خواہ سنکھیا کو سنکھیا سمجھ کر کھایا جائے یا نمک سمجھ کر یا شراب کو شراب سمجھ کر پیا جائے یا سرکہ سمجھ کر۔ سنکھیا اپنی خاصیت کے مطابق اثر کرے گا۔ اور شراب اپنی خاصیت کے مطابق اثر کرے گی اسی طرح علم و یقین کے بھی کچھ خواص ہوتے ہیں خواہ علم و یقین واقع کے مطابق ہو یا واقع کے مطابق نہ ہو۔ چنانچہ ایک شخص اندھیرے میں کوئی چیز دیکھتا ہے اور اسے رسی سمجھ کر بے جھجک گزر جاتا ہے مگر واقع میں وہ رسی نہ تھی بلکہ سانپ تھا یا اسے سانپ سمجھ لیتا ہے اور لرزتا کانپتا دوسری سمت ہو جاتا ہے مگر واقع میں وہ رسی تھی۔ پہلی صورت میں اسے کسی قسم کا خوف ڈر محسوس نہیں ہوا کہ بچ کر نکلنے کی کوشش کرتا اور دوسری صورت میں ڈرے بغیر نہیں رہا اور اسی ڈر کی بنا پر اس نے راستہ بدل دیا اور دوسری سمت چلا گیا۔ یہ خوف اور بے خوفی واقع کا اثر نہیں ہے اگر واقع اثر انداز ہوتا تو بے خوفی کی جگہ خوف اور خوف کی جگہ بے خوفی ہوتی بلکہ یہ بے خوفی اثر ہے اس کا کہ سانپ کو رسی سمجھ لیا گیا اور خوف اثر ہے اس کا کہ رسی کو سانپ قرار دے لیا گیا اگر کوئی یہ جانتے ہوئے کہ سامنے سانپ ہے نہ خوف کھاتا ہے اور نہ راستہ بدل کر چلتا ہے تو اس کا جاننا نہ جاننا اور علم جہل ہو گا اس لئے کہ اس نے تقاضائے علم کو نظرانداز کر دیا اور جس سے بچ کر نکلنے کی ضرورت تھی اس سے بچنے کی کوشش نہیں کی۔

ایمان کے معنی بھی علم و یقین کے ہیں اور اس کے تقاضے بھی وہی ہیں جو علم و یقین کے ہوتے ہیں۔ لہذا اللہ پر ایمان اور اس کی ہستی پر یقین محکم ہو گا تو انسان کی عملی زندگی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے گی اور اس یقین کے اثرات اس کے افعال و اعمال پر واضح طور پر مرتب ہوں گے۔ کیونکہ ایمان ایک باطنی محرک ہے جس کا اثر ظاہری اعمال پر پڑتا ہے اور انہی ظاہری اعمال سے ایمان کی کمزوری و پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگر ایمان پختہ و راسخ ہو گا تو عمل کی تحریک قوی ہو گی اور ایمان کمزور ہو گا تو عمل کی رفتار بھی سست ہوگی۔ یہ دونوں آپس میں اس طرح مرتبط ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ایمان کی حیثیت اساس و بنیاد کی ہے اگر عقیدہ و ایمان نہ ہو تو عمل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر عمل نہ ہو تو عقیدہ کی پختگی کا ثبوت بہم پہنچانا مشکل ہو گا۔ چنانچہ امیرالمومنین

علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

الایمان والعمل اخوان توأمان و رفیقان لا یفترقان لا یقبل اللہ احدھما الا بصاحبہ۔

ایمان اور عمل دو جڑواں بھائی ہیں اور ایسے دو ساتھی ہیں جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے اور اللہ ایک کو دوسرے کے بغیر قبول نہیں کرتا۔

اگر کوئی شخص صدق دل سے اللہ کی ہستی کا اقرار کرتا اور یہ یقین رکھتا ہے کہ ایک بالا دست ذات موجود ہے جس سے خلوت و جلوت کے اعمال پوشیدہ نہیں ہیں تو وہ نہ اس کے احکام کی بجا آوری میں کوتاہی کرے گا اور نہ اس کے اوامر کی خلاف ورزی میں جری و بیباک ہو گا اور اگر اس کی ہستی کے اعتراف کے ساتھ جذبہ عمل پیدا نہیں ہوتا تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ابھی عقیدہ ناپختہ اور اعتراف صرف رسمی ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کے ارشاد سے ظاہر ہے کہ وہ علم جو عمل سے عاری ہو وہ علم نہیں بلکہ جہل ہے اور وہ یقین جس پر یقین کے اثرات مرتب نہ ہوں وہ یقین نہیں بلکہ شک ہے۔

مسئلہ قضاء و قدر

مسئلہ قضاء و قدر ایک مشکل مسئلہ ہے اور بعض افراد کی ژولیدہ فکری و کج بیانی نے اسے اور مشکل بنا دیا ہے اور جوں جوں اسے حل کرنے اور اس کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے حیرت و سرگشتگی بڑھتی ہی رہی ہے اور کاروان فکر صحیح راہ کو کھو کر جبر و تفویض کی وادیوں میں بھٹکتے رہے ہیں۔ اسی لئے اس میں زیادہ غور و تعمق سے منع کیا گیا ہے تاکہ ذہن اس کی پیچیدگیوں میں الجھ کر غلط راہ کی طرف نہ مڑ جائیں۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے قضاو قدر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا۔

طریق مظلم فلا تسلکوہ وبحر عمیق فلا تلجوہ سر اللہ فلا تتکلفوہ۔

یہ ایک تاریک راستہ ہے اس میں قدم نہ اٹھاو ایک گہرا سمندر ہے اس میں نہ اترو اور اللہ کا ایک راز ہے اسے جاننے کی زحمت نہ اٹھاؤ۔

حضرتؑ نے عامتہ الناس کی ذہنی سطح کو دیکھتے ہوئے اس کی گہرائیوں میں جانے سے منع کیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ اگر کسی نے پوچھ لیا تو اس کی صحیح مفہوم کی طرف رہنمائی بھی فرمائی ہے اور مختلف عبارتوں اور اسلوبوں میں اس کے معنی کو اس طرح واضح کیا ہے کہ ارباب فکر و نظر نے یہ اعتراف کیا ہے کہ اس سے بلیغ تر اور حسین تر انداز بیان اور کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ چنانچہ حجاج ابن یوسف نے ابوالحسن بصری، عمرو ابن عبید، واصل ابن عطاء اور عامر شعبی کو تحریر کیا کہ وہ قضاء و قدر کے بارے میں جو رائے رکھتے ہوں یا جو آراء ان تک پہنچی ہوں انہیں

قلمبند کر کے مجھے بھجیں۔ ان سب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ قضاء و قدر کی تنگ و تار راہوں میں صرف امیرالمومنین علیہ السلام کے کلمات شمع راہ کا کام دیتے اور منزل کی صحیح نشاندہی کرتے ہیں۔ چنانچہ حسن بصری نے لکھا کہ میں نے قضاء و قدر کے بارے میں جتنے اقوال دیکھے اور سنے ان میں سب سے بہتر امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا یہ قول ہے۔

اتظن ان الذی نهاک دهاک انما دهاک اسفلک و اعلاک واللہ بری من ذالک۔

کیا تمہارا یہ گمان ہے کہ جس نے تمہیں گناہوں سے روکا ہے اس نے تمہیں گناہ پر مجبور کیا ہے۔ ہمیں جنسی قوتوں اور کام و دہن کی لذتوں نے مجبور کیا ہے اور خالق اس سے بری ہے کہ وہ ایسا کرے۔

عمرو ابن عبید نے تحریر کیا کہ میں نے قضاء و قدر کے بارے میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام علیہ السلام کے اس قول کو سب سے بہتر پایا ہے۔

لو کان الوزر فی الاجل محتوما لکان الموزور فی القصاص مظلوما۔

اگر گناہ قضائے حتمی کا نتیجہ ہو تو پھر مرتکب گناہ کو سزا دینا اس پر ظلم کرنا ہے۔

واصل ابن عطاء نے تحریر کیا کہ میرے نزدیک قضاء و قدر کے بارے میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا یہ ارشاد ہر اعتبار سے جامع ہے۔

ایدلک علی الطریق ویاخذ علیک المضیق۔

کیا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں راہ ہدایت دکھائے اور (نجات و سعادت کا) راستہ تمہارے لئے بند کر دے۔

عامر شعبی نے لکھا کہ قضاء و قدر کے بارے میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اس قول سے بہتر کوئی قول نہیں ہے۔

کلما استغفرت اللہ تعالی عنہ فهو منک و کلما حمدت اللہ تعالی علیہ فهو منہ۔

ہر وہ کام جس سے تم اللہ سے توبہ و استغفار کرو وہ تمہارا کیا دھرا ہے اور ہر وہ عمل جس پر تم اللہ کی حمد و ستائش کرو وہ اس کی توفیق کے شامل حال ہونے کا نتیجہ ہے۔

جب حجاج نے یہ کلمات پڑھے تو امیرالمومنین علیہ السلام سے دشمنی و عناد کے باوجود یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ

لقد اخذ و هامن عین صافیۃ۔(مصابیح الانوار ج ا ص ۱۴۵) ان لوگوں نے یہ مطالب سرچشمہ علم لدنی سے حاصل کئے ہیں۔

حضرتؑ کے ان ارشادات سے ظاہر ہے کہ انسان پر اللہ کی طرف سے کوئی جبر نہیں ہے بلکہ اس سے جو افعال صادر ہوتے ہیں وہ اس کے ارادہ و اختیار سے صادر ہوتے ہیں اس طرح کہ وہ چاہے تو کرے اور چاہے تو نہ کرے اور فعل و ترک کی یہ دونوں صورتیں اس کے ارادہ و اختیار کے تابع ہیں۔ لہٰذا اس کے افعال کی ذمہ داری اسی پر عائد ہو گی اگر یہ کہا جائے کہ اللہ نے انسان کو ایسا کیوں نہ بنایا کہ وہ برائی کرنے کے قابل ہی نہ ہوتا اور اس سے صرف نیکی ہی صادر ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا تو انسان نیکی و بدی کے امتیاز سے محروم رہتا اور انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانی سطح پر آجاتا کیونکہ انسان کا اصل کمال ہی یہی ہے کہ وہ نیکی و بدی کو پہچانے اور باختیار خود بدی سے منہ موڑ کر نیکی کی راہ اختیار کرے اور اچھے کاموں پر جزا کا اور برے کاموں پر سزا کا مستحق قرار پائے۔ اشاعرہ و جبریہ نے قضاء و قدر سے دھوکا کھایا اور یہ سمجھ لیا کہ انسان سے جو اچھے برے افعال سرزد ہوتے ہیں وہ ان کے بجالانے پر مجبور ہے کیونکہ قضاء و قدر نے اسے پابند بنا دیا ہے اور وہ ان خطوط سے سرمو ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتا جو اس کے لئے نوشتہ ازلی نے متعین کردئے ہیں۔ یہ عقیدہ سراسر غلط اور خلاف عقل و وجدان ہے اور دلائل قاطعہ اس کے بطلان پر شاہد ہیں۔

اولاً یہ کہ ہر ذی شعور انسان جانتا ہے کہ اس سے کچھ افعال باختیار صادر ہوتے ہیں جیسے چلنے پھرنے میں ہاتھ پیروں کی حرکت اور کچھ افعال بلا اختیار صادر ہوتے ہیں جیسے نبض کی جنبش اور دل کی دھڑکن وہ ان دونوں قسموں میں امتیاز کرتا اور یہ سمجھتا ہے کہ ہاتھ پیر کی حرکت اس کے اختیار و قدرت سے صادر ہوتی ہے اور نبض کی حرکت اور دل کی دھڑکن اس کے اختیار و قدرت سے باہر ہے بلکہ حیوان بھی یہ سمجھتا ہے کہ کون سا فعل اس کے مقدور میں ہے اور کون سا فعل اس کی قدرت سے باہر ہے چنانچہ اگر ایک تیز رو گھوڑے کے سامنے کوئی ندی یا چٹان آجائے تو وہ یہ سمجھ کر کہ اس ندی یا چٹان کو پھلانگنا اس کے بس میں نہیں ہے اپنے قدم روک لیتا ہے اور جب رکاوٹ برطرف ہو جاتی ہے اور راستہ ہموار دیکھتا ہے تو سمجھ جاتا ہے کہ دوڑ جاری رکھنا اس کے بس میں ہے اور وہ حسب معمول دوڑنے لگتا ہے جب ہم اپنے اختیاری اور غیر اختیاری افعال میں فرق کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اختیاری افعال پر قدرت رکھتے ہیں اور غیر اختیاری افعال ہمارے احاطہ قدرت سے باہر ہیں تو اگر اپنے اختیاری افعال کی نسبت اللہ کی طرف دیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہمارے اختیاری اور غیر اختیاری افعال میں کوئی فرق ہی نہیں ہے اور جنہیں ہم اختیاری کہتے ہیں ان کے بجالانے پر بھی اسی طرح مجبور ہیں جس طرح غیر اختیاری حرکات و افعال میں بے بس ہیں اور یہ امر بدیہیات کے خلاف ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر ہمارے افعال میں ہمارے اراداہ و اختیار کا کوئی دخل نہ ہوتا اور ہماری حیثیت اس اوزار

کے مانند ہوتی جو کسی صنعت کار کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ جس طرح وہ چاہتا ہے اسے حرکت دیتا ہے یا لوہے کے اس ٹکڑے کے مانند ہوتی جو مقناطیس کے اثر سے حرکت کرتا ہے تو پھر ہو سکتا تھا کہ ہم کسی فعل کو ناپسند کرتے اور اسے نہ کرنا چاہتے تو وہ ہم سے قہراً صادر ہوتا اور کسی کام کو پسند کرتے اور اسے نہ کرنا چاہتے تو وہ ہم سے صادر نہ ہوتا اس لئے کہ ان افعال کا فاعل تو اللہ ہے اور اس نے اپنے افعال کو ہمارے چاہنے اور نہ چاہنے کے تابع نہیں رکھا بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ ہم ایک کام کرنا چاہیں اور وہ نہ چاہے یا ہم ایک کام نہ کرنا چاہیں اور وہ کرنا چاہے مثلاً ہم مشرق کی طرف جانا چاہیں اور وہ یہ چاہے کہ ہم مغرب کی طرف بڑھیں تو قہراً ہمارے قدم مغرب کی طرف اٹھنا چاہئیں یا اس کے برعکس ہم مغرب کی سمت کا ارادہ کریں اور وہ یہ چاہے کہ ہم مشرق کی طرف جائیں تو قہراً ہمارا رخ مشرق کی سمت ہونا چاہئے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ جس سمت کا ہم قصد و ارادہ کرتے ہیں ہمارے قدم اسی سمت اٹھتے ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارے افعال ہمارے قصد و ارادہ کے تابع ہیں جب ہم چاہتے ہیں تو وہ افعال وجود میں آتے ہیں اور جب نہیں چاہتے تو وقوع میں نہیں آتے اور کوئی خارجی قوت ہمیں فعل یا ترک پر مجبور نہیں کرتی۔

تیسرے یہ کہ اگر انسانی افعال اللہ کے ارادہ سے وقوع میں آتے ہیں خواہ اس نے ان کے بجا لانے کا حکم دیا ہو یا ان سے منع کیا ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ دنیا میں کفر و شرک، قتل و ظلم اور دوسرے قبیح امور اسی کے ارادہ سے وجود میں آئے ہوں اور جن اعمال خیر کا وقوع نہیں ہوا وہ اس کی نظروں میں ناپسندیدہ ہوں کیونکہ جن اعمال کے وقوع کا اس نے ارادہ ہی نہیں کیا وہ لا محالہ اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہوں گے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے ان افعال کے بجا لانے کا حکم دیا جن کے وقوع کا اس نے ارادہ ہی نہیں کیا تھا اور ان کاموں سے منع کیا جن کو پسند کرتے ہوئے ایجاد کیا تھا۔ لہذا نافرمان کفر و عصیان کی بنا پر مطیع قرار پائیں گے کیونکہ انہوں نے وہی کام انجام دیئے جن کے وقوع کا اس نے ارادہ کیا تھا اور ان کاموں سے کنارہ کش رہے جن کے وقوع کا اس نے ارادہ نہیں کیا تھا اور اسے کوئی بھی ماننے کے لئے تیار نہ ہو گا کہ کفر و عصیان مراد الٰہی ہوں اور ایمان و اطاعت اور اعمال خیر ناپسندیدہ قرار پائیں۔ جبکہ اللہ کا ارادہ ایمان و اطاعت سے متعلق ہوتا ہے اور کفر و شرک اور معاصی کے وقوع کو ناپسند کرتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے

کل ذلک کان سیئہ عند ربک مکروھا

ان تمام باتوں میں جو بات بری ہے وہ تمہارے پروردگار کو ناپسند ہے

چوتھے یہ کہ تمام فرقہ اسلامیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ ہر مسلمان کو قضاؤ قدر الٰہی پر راضی رہنا چاہئے تو اگر تمام افعال اللہ کی طرف سے ہیں اور انسان مجبور محض ہے تو اگر وہ کفر اختیار کرتا ہے یا شرک کا مرتکب ہوتا ہے تو اسے بھی قضاؤ قدر کا فیصلہ سمجھ کر اس پر رضا مند رہنا چاہئے اور اس کے خلاف کچھ نہ کہنا چاہئے کیونکہ اس کے

خلاف لب کشائی اللہ کے فیصلہ قضاؤ قدر پر نکتہ چینی و حرف گری کے مترادف ہو گی حالانکہ کوئی بھی ذی عقل یہ نہیں کہہ سکتا کہ کفر و شرک پر راضی رہنا چاہئے اور اسے بلا چون و چرا قبول کر لینا چاہئے جبکہ اللہ بندوں کے لئے کفر کو پسند نہیں کرتا چنانچہ ارشاد الٰہی ہے

ولا یرضی لعبادہ الکفر　　　　اللہ اپنے بندوں کے لئے کفر پر راضی نہیں ہے۔

پانچویں یہ کہ اگر اچھے برے افعال اللہ ہی کے ارادہ سے صادر ہوتے ہیں اور انسان اس کے ارادہ کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہے اس طرح کہ جس چیز کو وہ چاہتا ہے بجبر کروا دیتا ہے اور جس چیز کو نہیں چاہتا اس سے بجبر روک دیتا ہے تو اس صورت میں اوامر و نواہی کے نفاذ کی ضرورت ہی کیا تھی جبکہ بندوں کو فعل و ترک کے سلسلے میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ لہٰذا نہ انبیاء کے بھیجنے کی ضرورت تھی نہ کتابوں کے نازل کرنے کی حاجت اور نہ اوامر و نواہی کے نفاذ کی احتیاج اور پھر احکام کی پابندی پر جزا اور خلاف ورزی پر سزا تجویز کرنے کا بھی کوئی جواز نہیں۔ کیونکہ جزا و سزا اختیاری افعال پر مرتب ہوتی ہے اور غیر اختیاری افعال پر جزا یا سزا تجویز کرنا سراسر غلط ہے۔ اس لئے کہ غیر اختیاری افعال کو نہ اچھا کہا جاسکتا ہے اور نہ برا۔ ان پر اچھائی یا برائی کا حکم اسی صورت میں لگایا جاسکتا ہے جب ان مین انسانی قدرت و اختیار کو دخل ہو۔ لہٰذا وہ عقیدہ جس کے نتیجہ میں بعثت انبیاء عبث' حشرو نشر بیکار' نفاذ' احکام باطل اور جزا و سزا غلط قرار پائے اسے کسی صورت میں اسلامی عقیدہ نہیں کہا جا سکتا۔ انہی غلط نتائج پر نظر کرتے ہوئے ابوالعلاء معری نے کہا ہے۔

زعم الجھول ومن یقول بقولہ　　　　ان المعاصی من قضاء الخالق

جاہل اور اس کے ہمنوا یہ گمان کرتے ہیں کہ گناہ خالق عالم کی قضاء و قدر کا نتیجہ ہیں۔

ان کان حقا مازعمت فلم قضی　　　　حدالزناء و قطع کف السارق

اگر تمہارا یہ گمان صحیح ہے تو اس نے زنا پر حد کی اور چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا کیوں تجویز کی۔

اس عقیدہ جبر کے بطلان کے بعد اس میں کوئی شک و شبہہ نہ ہونا چاہئے کہ انسان فاعل مختار ہے اور اس کے اچھے اور برے افعال اسی کے ارادہ و اختیار کے تابع ہیں۔ اللہ سبحانہ نے انہی اچھے اور برے افعال کو پہچنوانے کے لئے انبیاء و اوصیاء مامور فرمائے۔ جنھوں نے خیر و شر اور نیکی و بدی کی نشاندہی کی اور بدی سے بچ کر رہنے اور نیکی کی راہ پر چلنے کی تلقین فرمائی۔ اب ہم بدی کا راستہ اختیار کرتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ ہم نیکی کا راستہ جانتے نہیں بلکہ یہ ہمارے غلط انتخاب کا نتیجہ ہے اور نیکی کی راہ اختیار کرتے ہیں تو یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ نیکی ہے۔ شعور و وجدان اس کا شاہد ہے کہ جہاں تک بدی کو بدی اور نیکی کو نیکی سمجھ کر اختیار کرنے کا تعلق ہے وہ ہمارے ارادہ و اختیار ہی سے وابستہ ہے اور جس قوت سے ہم کوئی کام کر سکتے ہیں اسی قوت سے ہم اسے ترک بھی کر سکتے ہیں۔ اس

اعتبار سے ہم سے صادر ہونے والے افعال کا استناد ہماری طرف ہو گا اور اس اعتبار سے کہ قوت و اختیار کا جوہر اللہ کا عطا کردہ ہے ان افعال کا استناد اللہ کی طرف بھی صحیح ہے لیکن اس قوت اختیار کے دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس نے ہم سے اختیار چھین لیا ہے اور ہم مجبور کر دئے گئے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی بھوکے کو روٹی دیتا ہے اور وہ روٹی کھانے کے بجائے اسے پھینک دیتا ہے تو اس کی ذمہ داری روٹی دینے والے پر عائد نہ ہو گی بلکہ اس شخص کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا جس نے روٹی پھینکی ہے کیونکہ یہ فعل اسی کے ارادہ و اختیار سے صادر ہوا ہے۔

اس سے بھی انکار نہیں کیاجا سکتا کہ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے وہ قضاء و قدر سے باہر نہیں ہے مگر اس قضاء کا تعلق کبھی خلق و ایجاد سے ہوتا ہے اور کبھی افعال عباد سے۔ پہلی قسم قضائے تکوینی کہلاتی ہے اور دوسری قسم قضائے تشریعی قضائے تکوینی اپنے اندر لزوم رکھتی ہے کیونکہ کوئی طاقت اللہ کے ارادہ کے سامنے دیوار بن کر کھڑی نہیں ہو سکتی اور قضائے تشریعی۔ انسان کے ارادہ و اختیار سے وابستہ ہے۔ البتہ اللہ سبحانہ یہ جانتا ہے کہ انسان اپنے ارادہ و اختیار سے یہ اور یہ کرے گا اور چونکہ علم کسی فعل کے وقوع کا سبب نہیں ہوتا اس لئے اللہ کے علم سابق سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان اپنے افعال میں مجبور قرار پائے۔ چنانچہ ایک عراقی نے امیرالمومنین علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا شامیوں سے لڑنا اور صفین کی جانب ہمارا حرکت کرنا قضاء و قدر کا نتیجہ تھا فرمایا کہ ہاں اس ذات کی قسم جس نے دانہ کو شگافتہ اور ذی روح کو پیدا کیا ہم نے جہاں قدم رکھا جس نشیب میں اترے اور جس بلندی پر چڑھے وہ قضاء و قدر ہی کا فیصلہ تھا۔ کہا کہ پھر ہمیں تو کسی اجر کا استحقاق نہ ہونا چاہئے حضرتؑ نے فرمایا کہ تم نے اس قضا سے وہ قضاء سمجھ لی ہے جس کے خلاف ممکن نہیں ہوتا اگر ایسا ہو تو پھر ثواب و عقاب و حدو وعید اور امرونہی سب عبث قرار پائیں گے اور اس صورت میں انسان نیکی پر مدح کا اور برائی پر مذمت کا مستحق نہ رہے گا اور یہ مجوسیوں اور قدریوں کا نظریہ ہے۔

ان اللہ امر تخییر اونھی تحذیرا وکلف یسیر اولم یعص مغلوبا ولم یطع مکرھا ولم یرسل الرسل الی خلقہ عبثا۔ (مصابیح الانوار)

اللہ نے کرنے اور نہ کرنے کا اختیار دے کر احکام دئے ہیں اور (بری باتوں کے عواقب و نتائج سے) ڈراتے ہوئے منع کیا ہے۔ اس نے تکلیف شرعی میں آسانی رکھی ہے اور اس کی خلاف ورزی اس لئے نہیں کی جاتی کہ وہ مغلوب و عاجز ہے اور نہ بجبر اس کی اطاعت ہوتی ہے اور نہ اس نے مخلوق کی طرف رسولوں کو بیکار مبعوث کیا ہے۔

اس عراقی نے کہا کہ پھر وہ کون سی قضاء و قدر تھی جس کے زیر اثر ہم نکلے۔ فرمایا وہ اللہ کا حکم تھا۔ اور پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

وقضی ربک ان لا تعبدو الا ایاہ۔ تمہارے پروردگار نے تمہیں حکم دیا ہے کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو۔

مقصد یہ ہے کہ اس مقام پر قضاء کا تعلق افعال عباد سے ہے یعنی وہ اپنے بندوں کو مامور کرتا ہے کہ فلاں فلاں کام انجام دیں اور اس حکم کی تعبیر لفظ قضی سے کی ہے جیسا کہ آیت میں قضی کے معنی حکم دینے کے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس نے ہمیں بجبر اس فعل کی بجا آوری پر آمادہ کیا ہے بلکہ یہ ہمارے ارادہ و اختیار سے وقوع میں آیا ہے اور جب ہم نے اپنے ارادہ و اختیار سے اس کام کو انجام دیا ہے تو اس پر اجر و ثواب کے بھی مستحق ہوں گے۔

یہ واضح رہے کہ صرف ارادہ و اختیار ہی سے نیک اعمال وقوع میں نہیں آتے بلکہ اس کے ساتھ اسباب کا مہیا ہونا اور موانع کا برطرف ہونا بھی ضروری ہے اور جب تک اس کی تکمیل کے اسباب فراہم اور موانع برطرف نہ ہوں گے ارادہ عملی صورت اختیار نہ کر سکے گا۔ یہ اسباب کی فراہمی اور موانع کی برطرفی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اسی کا نام توفیق ہے۔ جس سے کسی صورت میں بے نیاز نہیں رہا جا سکتا۔ اسی توفیق کی دستگیری سے انسان اعمال خیر کو تکمیل تک پہنچاتا ہے اور جزا و ثواب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اس توفیق سے جبر کا توہم نہ ہونا چاہئے اس لئے کہ کسی کام کی انجام دہی کے اسباب مہیا کر دینا اور ہے اور اس کام پر مجبور کرنا اور ہے۔ بہرحال اس حد تک اللہ کے دخل کا اعتراف ضروری ہے کہ وہ موانع کو بر طرف کر کے اعمال خیر کی بجا آوری کے اسباب مہیا کرتا ہے۔ اس کے برعکس فرقہ معتزلہ کا نظریہ یہ ہے کہ بندوں کے افعال میں اللہ کا کسی اعتبار سے کوئی دخل نہیں ہے سوائے اس کے کہ اس نے بندوں کو قوت و طاقت دی ہے اور اعضاء و جوارح دئے ہیں جن سے وہ چلتا پھرتا دیکھتا سنتا اور دوسرے کام انجام دیتا ہے یہ عقیدہ جو تفویض کے نام سے موسوم ہے عقیدہ جبر کا ردعمل ہے جو جبر ہی کی طرح حقیقت و واقعیت سے دور ہے۔ اس لئے کہ اس سے انسان کا اللہ سے مستغنی و بے نیاز ہونا لازم آتا ہے۔ صحیح مسلک وہی ہے جو افراط و تفریط کی ان دونوں سمتوں کے درمیان ہے اور جسے احادیث میں امر بین امرین سے تعبیر کیا گیا ہے اور امیرالمومنین علیہ السلام کے ارشادات سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے چنانچہ حضرتؑ نے ایک شخص سے جو قضاء و قدر کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا فرمایا۔

ابا للہ تستطیع ام مع اللہ ام بدون اللہ۔ کیا تم اللہ کی مدد سے قدرت و استطاعت رکھتے ہو یا اللہ کے ساتھ شریک ہو کر یا اللہ کے بغیر۔

اسے کوئی جواب نہ سوجھا تو آپؑ نے فرمایا۔

انک ان زعمت انک مع اللہ تستطیع فقد زعمت انک شریک اللہ معہ فی ملکہ وان زعمت انک من دون اللہ تستطیع فقد ادعیت الربوبیتہ۔(توحید صدوق)

اگر تم یہ گمان کرو کہ تم اللہ کے ساتھ ہو کر استطاعت رکھتے ہو تو تم نے خدا کے ملک میں اس کا شریک ہونے کا گمان کیا اور اگر یہ کہو کہ تم اللہ کے بغیر خود مستقلاً" استطاعت رکھتے ہو تو تم نے ربوبیت کا دعویٰ کیا۔

اس شخص نے کہا لا بل باللہ استطیع "میں اللہ کی مدد و دستگیری سے استطاعت رکھتا ہوں" حضرتؑ نے فرمایا کہ اگر تم اس کے علاوہ کچھ اور کہتے تو گردن زدنی قرار پاتے۔

اصول خمسہ

دین اسلام کے اساسی عقائد کو اصول اور بنیادی اعمال کو فروع کہا جاتا ہے۔ یہ اصول پانچ ہیں! توحید' عدل'نبوت'امامت'اور معاد۔ ان میں سے توحید نبوت اور معاد کے اصول دین ہونے پر تمام فرق اسلامیہ کا اتفاق ہے اور عدل و امامت شیعہ عقائد میں شمار ہوتے ہیں۔ اصول اصل کی جمع ہے جس کے معنی جڑ کے ہیں اور فروع فرع کی جمع ہے اور اس کے معنی شاخ کے ہیں۔ عقائد کو اصول اور اعمال کو فروع اس لئے کہا جاتا ہے کہ جس طرح جڑ کے بغیر شاخیں پھلتی پھولتی نہیں اسی طرح اصول کو مانے بغیر فروع کے نشوو نما پانے اور برگ و بار لانے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ فروع ان شرعی احکام کا نام ہے جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغ سے ہم تک پہنچے۔ اگر کوئی اللہ کی ہستی اور اس کی وحدت و یکتائی کا قائل ہی نہیں ہے اور نہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کو تسلیم کرتا ہے تو وہ ان احکام کو احکام خداوندی ماننے اور ان پر عمل کرنے کے لئے آمادہ ہی کیونکر ہوگا اور اگر ان احکام کی بجا آوری و خلاف ورزی پر جزاء و سزا نہ ہو تو ان احکام کی پابندی کا ثمرہ و نتیجہ ہی کیا جبکہ انجام کار مطیع و نافرمان دونوں برابر ہو جاتے ہیں اور اگر حشرو نشر کے ساتھ عدل کا عقیدہ نہ ہو تو اللہ کے لئے کون سا امر مانع ہے کہ وہ نیک و فرمانبردار بندے کو جہنم میں جھونک دے اور سرکش و نافرمان کو جنت میں جگہ دے دے۔ عادل نہ تسلیم کیا جائے تو جزاء و سزا کا نظریہ ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر احکام میں تحریف و تبدل سے تحفظ کا سرو سامان نہ ہو تو احکام اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں رہ سکتے بلکہ اغراض فاسدہ کا نشانہ بن کر اپنی ہیئت و صورت کھو بیٹھیں گے اور ابلاغ و اعلام کے باوجود حجت ناتمام رہے گی اور اتمام حجت کے بغیر ثواب و عقاب کا استحقاق ختم ہو جاتا ہے۔ اسی تحفظ و نگہداشت کی ذمہ داری کا ام امامت ہے۔ یہ اصول تمام تر عقل پر مبنی

ہیں اور عقل ہی وہ معیار ہے جس پر صحیح و غلط کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں بار بار فکر و تدبر کی دعوت دی گئی ہے تاکہ عقل و بصیرت کی روشنی میں عقائد کو پرکھا جائے اور جانچ پرکھ کر دل و دماغ میں جگہ دی جائے۔ ذیل میں اصول خمسہ کے بارے میں امیرالمومنین علیہ السلام کے چند ارشادات درج کئے جاتے ہیں جو حقائق دینیہ و معارف الہیہ کا سرچشمہ ہیں۔

توحید

توحید کا مطلب یہ ہے کہ خالق کائنات ایک ہے اور ہر اعتبار سے واحد و یکتا ہے نہ اس کی ذات میں کوئی شریک ہے نہ صفات میں اور نہ افعال میں۔ خلق و رزق، موت و حیات اور نظم عالم میں اسی کا عمل دخل ہے اور نہ اس کے علاوہ کوئی معبود اور عبادت کا سزاوار ہے۔ اس لحاظ سے توحید کے چار اقسام ہوں گے! توحید فی الذات توحید فی الصفات، توحید فی الافعال اور توحید فی العبادات۔

توحید فی الذات کے بارے میں حضرت کا ارشاد ہے۔

واعلم یا بنیّ انہ لو کان لربک شریک لاتتک رسلہ ولرائیت آثار ملکہ و سلطانہ و لعرفت افعالہ وصفاتہ ولکنہ الہ واحد کما وصف نفسہ لایضادہ فی ملکہ احد ولا یزول ابدا۔(نہج البلاغہ)

اے فرزند! یقین کرو کہ اگر تمہارے پروردگار کا کوئی شریک ہوتا تو اس کے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تے اور اس کی سلطنت و فرمانروائی کے بھی آثار دکھائی دیتے اور اس کے افعال و صفات بھی کچھ معلوم ہوتے مگر وہ ایک اکیلا خدا ہے جیسا کہ اس نے خود بیان کیا ہے اس کے ملک میں کوئی اس سے ٹکر نہیں لے سکتا وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

خداوند عالم کی وحدت و یکتائی پر یہ ایک کھلی ہوئی اور روشن دلیل ہے جس میں نہ اصطلاحی الفاظ صرف ہوئے ہیں اور نہ ترتیب مقدمات سے اخذ نتائج پر مبنی ہے بلکہ اتنی سادہ اور واضح ہے کہ ہر سطح کا ذہن اسے سمجھتا اور قبول کرتا ہے۔ اس سے کسی فرد کو خواہ وہ کسی گروہ سے تعلق رکھتا ہو انکار نہیں ہو سکتا کہ ابتدائے آفرینش سے پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک جتنے بھی انبیاء و رسل آئے سبھوں نے ایک ہی خدا کی نشاندہی کی اور ایک ہی خدا کا پیغام پہنچایا اگر اس ذات احد کے علاوہ کوئی اور بھی خدا ہوتا تو اس کے واجب الوجود ہونے کا تقاضا یہ تھا کہ وہ علم و قدرت اور دوسرے صفات کمالیہ رکھتا اور ان صفات کمالیہ کا ظہور ہوتا۔ اس کی قدرت کے آثار اور علم و حکمت کے مظاہر دیکھنے میں آتے اور انبیاء رسل کے ذریعہ اس کے احکام ہم تک پہنچتے۔ ان میں سے کچھ ایک خدا کی

طرف سے آتے کچھ دوسرے خدا کی طرف سے مبعوث ہوتے اور اپنے اپنے خدا کی نمائندگی کرتے مگر اول سے آخر تک ہر نبی کی زبان سے بغیر کسی اختلاف کے ایک ہی آواز بلند ہوتی ہے کہ وہ واحد و یکتا ہے اور ہم سب اسی ایک خدا کے فرستادہ ہیں جس کا کوئی شریک و مثیل نہیں ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

وما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الہ الا انا فاعبدون۔

ہم نے تم سے پہلے جو بھی رسول بھیجا اسے وحی کے ذریعہ یہی تعلیم دیتے رہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے لہٰذا میری عبادت کرو۔

دنیا میں اور چیزوں کو بھی ایک کہا جاتا ہے مگر اللہ کی وحدت ان ایک کہی جانے والی چیزوں سے جداگانہ نوعیت رکھتی ہے۔ وہ نہ گنتی میں سماتا ہے اور نہ شمار میں آتا ہے چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

واحد لابعدد۔ (نہج البلاغہ)

وہ ایک ہے مگر نہ گنتی کے اعتبار سے۔

فن حساب میں عدد اسے کہا جاتا ہے جو اپنے ما قبل اور مابعد عدد کے مجموعہ کا نصف ہو چنانچہ دو کے پہلے ایک کا عدد ہے اور اس کے بعد تین کا عدد ہے اور ایک اور تین کا مجموعہ چار ہوتا ہے اور دو کا عدد چار کا نصف ہے اسی طرح تین کے پہلے دو کا عدد ہے اور اس کے بعد چار کا عدد ہے اور دو اور چار کا مجموعہ چھ ہوتا ہے اور تین چھ کا نصف ہے یونہی چار کے پہلے تین کا عدد ہے اور اس کے بعد پانچ کا عدد ہے اور تین اور پانچ کا مجموعہ آٹھ ہوتا ہے اور چار آٹھ کا نصف ہے یونہی آخر عدد تک دیکھتے جایئے تو ہر عدد اپنے ماقبل اور مابعد کے مجموعہ کا نصف ہو گا جب عدد کی یہ تعریف ٹھہری کہ وہ اپنی دونوں سمتوں میں واقع ہونے والے اعداد کے مجموعہ کا نصف ہو تو ایک پر عدد صادق نہ آئے گا اس لئے کہ اس کی ایک سمت پر تو عدد ہے اور دوسری سمت عدد سے خالی ہے لہٰذا اللہ کو عدد کے اعتبار سے ایک نہیں کہا جائے گا اس لئے کہ ایک عدد ہی نہیں ہے۔

اس کے علاوہ جہاں گنتی میں آنے والے ایک کا تصور ہو گا وہاں دو کا بھی تصور ہو گا اور خداوند عالم ہر اعتبار سے واحد و یگانہ ہے۔ جس میں دوئی کے تصور کی بھی گنجائش نہیں ہے اس لئے کہ تعدد کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ایک مابہ الاشتراک ہو اور ایک مابہ الامتیاز اسی مابہ الاشتراک و مابہ الامتیاز کو جنس و فعل سے تعبیر کیا جاتا ہے مثلاً انسان اور اونٹ دو الگ الگ چیزیں ہیں ان دونوں میں ایک مابہ الاشتراک ہے اور وہ جنبہ حیوانیت ہے اور ایک مابہ الامتیاز ہے جو انسان کو اونٹ سے اور اونٹ کو انسان سے الگ کرتا ہے۔ چنانچہ انسان کا مابہ الامتیاز نطق یعنی تعقل و ادراک کی قوت ہے جو اسے اونٹ سے علیحدہ کرتی اور اس کی نوع کو اونٹ کی نوع سے الگ قرار دیتی ہے۔ اسی طرح دو انسان انسانیت میں اشتراک کے باوجود اس لئے دو ہیں کہ دونوں کے مشخصات و عوارض وجودی مختلف ہیں مثلاً دونوں کے رنگ نسل زبان خدوخال قدوقامت عمر اور طینت میں اختلاف ہے ماں باپ جدا اور خاندان الگ ہے۔

لہٰذا ایسا موجود جو حدود و قیود سے بری ہو نہ اس کی جنس ہو اور نہ فصل تو اس کے لئے دوسرا تجویز کرنا سراسر خلاف عقل ہو گا۔ اس لئے کہ تعدد کے لئے مابہ الاشتراک ومابہ الامتیاز کا ہونا ضروری ہے اور باری تعالیٰ اجزائے ذہنی و خارجی کی ترکیب اور حدود و قیود سے بالاتر ہے اگر اس کے لئے حدوقید تجویز کی جائے تو حدوقید کے منتفی ہونے سے اس کی بھی نفی لازم آئے گی حالانکہ وہ واجب الوجود ہے جو کسی صورت میں نیستی سے دوچار نہیں ہو سکتا جب اس کے لئے حدود و قیود نہیں ہیں تو اس کے ساتھ کوئی اور تجویز نہیں کیا جا سکتا وہ ایک اور صرف ایک ہے اور یہ وحدت و یکتائی وحدت عددی سے جدا ہے۔ اس لئے کہ وحدت عددیہ میں دوسرا تجویز کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ خارج میں دوسرا نہ پایا جاتا ہو مگر اللہ کے لئے نہ خارج میں، نہ ذہن میں اور نہ وہم میں دوسرا تجویز ہی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ جنگ جمل میں ایک اعرابی امیرالمومنین علیہ السلام کے سامنے آیا اور کہا کہ آپؑ یہ کہتے ہیں کہ اللہ ایک ہے اور ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ کچھ لوگ اس کی طرف لپکے اور کہا کہ تم دیکھتے نہیں ہو کہ حضرتؑ کس عالم میں ہیں ہر طرف جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور تم نے یہ مسئلہ چھیڑ دیا ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ اسے پوچھنے دو ہم بھی تو نظریہ وحدت کی بقاء کے لئے جنگ کر رہے ہیں۔ یہ تو وہی چاہتا ہے جو ہم ان لوگوں سے چاہتے ہیں۔ اس کے بعد اعرابی سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے شخص یہ جملہ کہ "خدا ایک ہے" چار معنی رکھتا ہے! دو معنی اللہ کے بارے میں غلط ہیں اور دو معنی صحیح ہیں۔ جو دو معنی غلط ہیں ان میں سے ایک معنی یہ ہے کہ وہ گنتی کے اعتبار سے ایک ہے تو جس کا کوئی دوسرا نہ ہو اسے گنتی کے لحاظ سے ایک نہیں کہا جا سکتا۔ اسی لئے جنہوں نے اسے تین میں کا ایک مانا وہ کافر ہوئے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اسے ایک اس طرح کہا جائے جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں (ہندی عراقی یا حجازی) انسانوں میں سے ایک ہے تو یہ اسے دوسروں کے مانند ٹھہرانا ہے۔ اور جن دو معنوں کے اعتبار سے اسے ایک کہنا صحیح ہے ان میں سے ایک معنی یہ ہیں کہ وہ ایک ہے یعنی تمام موجودات میں کوئی شے اس کے مشابہ نہیں ہے تو بیشک وہ ایسا ہی ہے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک ہے یعنی ہر اعتبار سے ناقابل تقسیم ہے نہ خارج میں اس کی تقسیم ہو سکتی ہے اور نہ عقل و وہم میں تو بیشک ہمارا پروردگار ایسا ہی ہے ان دونوں معنوں کا حاصل یہ ہے کہ نہ اس کا کوئی شریک ہے اور نہ اجزاء سے اس کی ترکیب ہوئی ہے۔

توحید فی الصفات کے بارے میں حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فمن وصف اللہ سبحانہ فقد قرنہ ومن قرنہ فقد ثناہ ومن ثناہ فقد جزاہ و من جزاہ فقد جھلہ۔ (نہج البلاغہ)

جس نے ذات الٰہی کے علاوہ صفات مانے اس نے ذات کا ایک دوسرا ساتھی مان لیا اور جس نے اس کی ذات کا کوئی اور ساتھی مانا اس نے دوئی پیدا کی جس نے دوئی پیدا کی۔ اس نے اس کے لئے جز بنا ڈالا اور جو اس کے لئے اجزا کا قائل ہوا وہ اس سے بے خبر رہا۔

اللہ کے صفات اس کی ذات سے الگ نہیں ہیں بلکہ عین ذات ہیں بایں معنی کہ یہ صفتیں خارج سے اس پر طاری نہیں ہوئیں بلکہ خود اس کی ذات ہی ان صفات کمالیہ کا مبداء ومنشا ہے۔ اگر اس کے صفات زائد بر ذات قرار دیئے جائیں گے تو چونکہ اس کی ہر صفت قدیم ہے اس لئے جتنی صفتیں ہوں گی اتنے خدا اور ماننا ہوں گے اور اگر ذات وصفات کے مجموعہ کو وجوب و قدامت سے متصف مانا جائے توذات خداوندی میں ترکیب لازم آئے گی اور یہ دونوں چیزیں توحید کے منافی ہیں لہذا ان صفات کو عین ذات ماننا ہی تقاضائے توحید ہے۔ اس کی مزید توضیح علم الہیات کے باب میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

توحید فی الافعال کے بارے میں حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ذلک مبتدع الخلق و وارثہ والہ الخلق و رازقہ والشمس والقمر دائبان فی مرضاتہ۔ (نہج البلاغہ)

وہی مخلوقات کا پیدا کرنے والا اور اس کا وارث و مالک ہے اور کائنات کا معبود اور ان کا رازق ہے۔ سورج اور چاند اسی کی منشا کے مطابق ایک ڈھرے پر بڑھے جانے کی سرتوڑ کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔

اللہ اپنے علم و قدرت سے ہر چیز پر علمی و عملی احاطہ کئے ہوئے ہے اور کوئی چیز اس کے دائرہ علم و احاطہ اختیار سے باہر نہیں ہے۔ وہ ہر چیز کو جانتا اور ہر شے پر اقتدار تام رکھتا ہے۔ اسے نہ کسی معاون کی ضرورت اور نہ کسی شریک کار کی حاجت ہے۔ وہی خالق و رازق' محیی و ممیت اور مدبر و کارساز عالم ہے' اس نے خلق و رزق' احیاء و اماتت اور تدبیر عالم میں نہ کسی کو اپنا شریک ٹھہرایا ہے اور نہ یہ امور کسی کے سپرد کئے ہیں۔ وہ جس طرح اپنی ذات میں کوئی شریک نہیں رکھتا اسی طرح اپنے افعال میں بھی دوسروں کی شرکت سے بے نیاز ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

اللہ الذی خلقکم ثم رزقکم ثم یمیتکم ثم یحییکم هل من شرکاء کم من یفعل من ذلکم من شئی سبحانہ و تعالی عمایشرکون۔

خدا وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہیں رزق دیا پھر وہی تمہیں مارے گا پھر وہی تمہیں جلائے گا۔ کیا تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا ہے جو ان کاموں میں سے کوئی کام کر سکے۔ یہ لوگ جسے اس کا شریک بناتے ہیں وہ اس سے پاک و منزہ ہے۔

توحید فی العبادات کے بارے میں حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

الذی لاتحق العبادۃ لغیرہ الاللہ۔ (تفسیر البرہان)

عبادت کا استحقاق اللہ کے علاوہ اور کسی کو نہیں ہے۔

اللہ معبود حقیقی ہے اور اس کے علاوہ سب اس کے بندے ہیں۔ اس عبودیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اسی کی

عبادت کریں اور اسی کے آگے سجدہ ریز ہوں۔ ہر نبی اور ہر رسول نے اپنی امت کو خدائے واحد کی پرستش کی تعلیم دی اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بھی عبادت کو مقصد حیات انسانی قرار دیتے ہوئے اسی کو عبادت کا سزا وار ٹھہرایا اور خود ساختہ بتوں کی پرستش سے بشدت منع کیا۔ توحید کا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ اللہ کو ایک مان لیا جائے بلکہ ایک ماننے کے ساتھ ہر بندگی اور ہر پرستش کو بھی اس کے لئے مخصوص کرنا ضروری و لازمی ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ کو ایک مانتا ہے مگر شعوری یا لاشعوری طور پر غیر اللہ کو بھی عبادت میں شریک کرتا ہے تو وہ آخرت کی کامیابی و کامرانی سے محروم رہتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

من کان یرجو لقاء ربہ فلیعمل عملا صالحا و لایشرک بعبادۃ ربہ احدا۔

جو شخص اپنے پروردگار کی لقاء کا امیدوار ہے اسے چاہئے کہ نیک عمل کرے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

عدل

امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

ارتفع عن ظلم عبادہ و قام بالقسط فی خلقہ و عدل علیھم فی حکمہ۔ (نہج البلاغہ)

وہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے سے بالاتر ہے۔ وہ مخلوق کے بارے میں عدل سے چلتا ہے اور اپنے حکم میں انصاف برتتا ہے۔

خداوند عالم کے صفات میں عدل ایک بنیادی صفت ہے عدل کے معنی یہ ہیں کہ ہر شے کو اس کے مناسب حال، محل و مقام پر رکھا جائے۔ یہ صفت اللہ کے تمام افعال و اوامر میں کارفرما ہے۔ وہ نہ ظلم کا مرتکب ہوتا ہے نہ شر کا اور نہ اس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوتا ہے جو قبیح اور عبث ہو بلکہ اس کا ہر قدم حکمت و مصلحت سے وابستہ اور ہر حکم مقصد کا حامل ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہ نے قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں اپنی اس صفت کا ذکر کیا ہے کبھی مثبت الفاظ میں جیسے۔

و تمت کلمتہ ربک صدقا وعدلا۔

تمہارے پروردگار کی بات سچائی اور عدل پر تمام ہوتی ہے۔

اور کبھی منفی انداز میں جیسے۔

ان اللہ لیس بظلام للعبید۔ اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

ان واضح نصوص کے بعد کوئی ایسا رخ اختیار نہ کرنا چاہئے تھا جس سے عدل کی نفی ہوتی ہو مگر اشاعرہ نے حسن و قبح عقلی کا انکار کر کے عدل کا بھی ایک طرح سے انکار کر دیا ہے حسن و قبح عقلی کا مطلب یہ ہے کہ اچھے اور برے افعال کے پرکھنے کا معیار عقل ہے چنانچہ انسان سے جو افعال صادر ہوتے ہیں ان میں کچھ اچھے ہوتے ہیں جیسے صدق، مروت، دیانت، حفظ، عہد وغیرہ اور کچھ برے ہوتے ہیں جیسے کذب، فریب، غصب، ظلم وغیرہ ان افعال کی اچھائی اور برائی کا فیصلہ عقل ہی نے کیا ہے اور وہی اچھے افعال کو اچھا اور برے افعال کو برا سمجھتی ہے اور جن افعال کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ نہیں کر پاتی ایسا نہیں ہے کہ ان میں اچھائی یا برائی نہ ہو بلکہ واقع میں ان میں اچھائی ہوتی ہے یا برائی اور شارع نے تشریع احکام میں اسی حسن و قبح کا لحاظ رکھا ہے۔ اس طرح کہ جن چیزوں میں اچھائی ہوتی ہے انہیں واجب یا مستحب کا درجہ دے دیا جاتا ہے اور جن چیزوں میں برائی ہوتی ہے انہیں حرام یا مکروہ قرار دے دیا جاتا ہے چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

انہ لم یامرک الابحسن و لم ینھک الاعن قبیح۔ (نہج البلاغہ) اللہ نے تمہیں انہی چیزوں کا حکم دیا ہے جو اچھی ہیں اور انہی چیزوں سے منع کیا ہے جو بری ہیں۔

اشاعرہ کا نظریہ یہ ہے کہ افعال کی اچھائی اور برائی کا معیار عقل نہیں ہے کیونکہ افعال ذاتا" نہ اچھے ہوتے ہیں اور نہ برے بلکہ شرع جس فعل کے بجا لانے کا حکم دے وہ اچھا ہے اور جس سے منع کرے وہ برا ہے اور عقل یہ تجویز کرنے سے قاصر ہے کہ کون سا فعل اچھا ہے اور کون سا فعل برا ہے کیونکہ حسن و قبح صرف حکم شریعت کے تابع ہے اور حکم شریعت سے قطع نظر کسی شے میں نہ اچھائی ہے نہ برائی۔ اس نظریہ کی رو سے اگر اللہ کسی بری بات کا حکم دے تو وہ اچھی ہو جائے گی اور کسی اچھی بات سے منع کر دے تو وہ بری ہو جائے گی۔ اس کے اوامر و نواہی میں واقعی اچھائی، برائی اور مصلحت کا کارفرما ہونا ضروری نہیں ہے لہٰذا وہ نیکوکار بندوں کو جہنم میں ڈال دے اور بدکاروں کو جنت میں جگہ دے دے یا بندوں پر ایسے احکام عائد کرے جو بشری طاقت سے باہر ہوں تو اس سے نہ اس کے عدل پر حرف آئے گا اور نہ اس کا انصاف مجروح ہو گا اس لئے کہ وہ جو کرے وہ اچھا اور مطابق عدل ہے اور جو نہ کرے وہ برا ہے۔ اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ نفی عدل ہے کیونکہ اس طرح اس کے اوامر و نواہی میں نہ مصلحت کا دخل ہو گا اور نہ عدل کے تقاضوں کا۔ اس کے برعکس حسن و قبح عقل کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ انہی چیزوں کا حکم دیتا ہے جن میں کوئی خوبی پائی جاتی ہے اور انہی چیزوں سے روکتا ہے جن میں برائی مضمر ہوتی ہے۔ لہٰذا نیکوکار کو جہنم میں ڈالنا صریحا" ظلم ہو گا اور ظلم قبیح ہے اور بندوں کو ایسے افعال کا پابند کرنا جو ان کی طاقت سے باہر ہوں تقاضائے حکمت

کے منافی ہو گا اور جو فعل قبیح یا منافی حکمت ہو وہ اس سے سرزد نہیں ہوتا۔

اشاعرہ اپنے نظریہ کی یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ جب اللہ ہر چیز پر حق تصرف رکھتا ہے تو اس کے بعض تصرفات پر پابندی عائد کرنا اس کے دائرہ اختیارات کو محدود کر دینا ہے اور یہ اس کی شان الوہیت کے منافی ہے اشاعرہ کا یہ ایراد اس صورت میں وارد ہو سکتا تھا جب یہ کہا جاتا کہ وہ فعل قبیح یا عبث پر قادر ہی نہیں ہے اور جب کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے ظلم اور دوسرے افعال قبیحہ کا مرتکب نہیں ہوتا کیونکہ یہ چیزیں اس کی شان قدوسیت کے خلاف ہیں تو اس سے نہ اس کی قوت و قدرت محدود ہوتی ہے اور نہ اس کے تصرفات پر پابندی عائد ہونے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

نبوت

حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لم یخل سبحانہ خلقہ من نبی مرسل او کتاب منزل او حجتہ لازمتہ او محجتہ قائمتہ رسل لا تقصر بھم قلتہ عدد ھم ولا کثرہ المکذبین لھم من سابق سمی لہ من بعدہ اوغابر عرفہ من قبلہ۔ (نہج البلاغہ)

اللہ سبحانہ نے اپنی مخلوق کو بغیر کسی فرستادہ پیغبر، آسمانی کتاب یا دلیل قطعی یا طریق روشن کے کبھی یونہی نہیں چھوڑا۔ ایسے رسول جنہیں تعداد کی کمی اور جھٹلانے والوں کی کثرت عاجز و درماندہ نہیں کرتی تھی۔ ان میں کوئی سابق تھا جس نے بعد میں آنے والے کا نام و نشان بتایا کوئی بعد میں آیا جسے پہلا پہچنوا چکا تھا۔

انسان کی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک حیوانی اور دوسرا عقلی۔ اگر انسان اپنی زندگی کا مقصد دنیوی عیش و تنعم ہی کو قرار دے لے تو اسے اختیار ہے کہ جس طرح چاہے زندگی بسر کرے۔ نہ اس کی نفسانی خواہشوں پر گرفت ہو گی اور نہ اس پر کوئی اخلاقی واجتماعی پابندی عائد ہو گی۔ یہ حیوانی زندگی ہے جسے انسانی و عقلی زندگی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان اپنے کو ہمہ جہتی آزاد تصور نہ کرے کہ ہر قید و بند کو توڑ کر جو چاہے کرے۔ یہ مادہ سے ماوراء عقلی و روحانی زندگی ہے جو چند حدود و قیود کی پابند ہے یہ حدود و قیود حکومتوں کے وضع کردہ بھی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ہر حکومت ایسے قوانین نافذ کرتی رہتی ہے جو اخلاقی قدروں کے حامل تصور کئے جاتے ہیں۔ مگر یہ قانون اور ضابطے آئے دن بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ آج اچھائی کی کچھ قدریں ہیں اور کل ان کی جگہ دوسری قدریں لے لیتی ہیں آج اچھائی اور برائی کا معیار اور ہے اور کل اور ہو گا بلکہ ایک ہی وقت میں ایک معاشرہ میں ایک چیز اچھی سمجھی

جاتی ہے اور دوسرے معاشرہ میں بری اور ایسا متحدہ لائحہ عمل جس پر تمام عقلاء روزگار متفق ہوں نہ ترتیب دیا گیا ہے اور نہ اختلاف طبائع کو دیکھتے ہوئے ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی مخصوص طبقہ کو وضع قوانین کا اختیار دے دیا جائے تو وہ ایسے ہی قوانین وضع کرے گا جو اسی طبقہ کے مفاد میں ہوں گے اور اگر ہر شخص کو اس کی عقل و رائے پر آزاد چھوڑ دیا جائے کہ اس کے لئے وہی اچھائی ہے جسے وہ اچھا سمجھے اور وہی برائی ہے جسے وہ برا سمجھے تو پھر نہ نیکی کا کوئی معیار ہو گا اور نہ بدی کا کوئی پیمانہ۔ بلکہ ہر شخص کی اپنی اپنی رائے ہو گی اور اپنا اپنا نظریہ۔ اس کے نتیجہ میں نہ کوئی نصب العین طے پائے گا اور نہ انسانی معاشرہ میں وحدت و اجتماعیت پیدا ہو سکے گی۔ لہٰذا وحدت و اجتماعیت کے لئے ایک ایسا ضابطہ و قانون ناگزیر ہے جو آفاقی و ہمہ گیر مفاد عمومی کا حامل اور حقوق عامہ کے تحفظ کا ضامن ہو ایسا قانون اسی کی طرف سے ہو سکتا ہے جو نوع بشر کے تمام افراد کے مصالح و حکم کا احاطہ کئے ہو اور ان کے سود و زیاں کا علم رکھتا ہو اور وہ صرف خداوند عالم ہے۔ مگر وہ نہ دیکھا جا سکتا ہے نہ اس سے ہم کلام ہوا جا سکتا ہے اور نہ اس سے براہ راست احکام لئے جاسکتے ہیں جیسا کہ خود اس کا ارشاد ہے۔

وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الاو حیا او من وراء حجاب او یرسل رسلا۔
کسی آدمی کے لئے یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ اس سے ہم کلام ہو مگر وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کے پیچھے سے یا فرشتے بھیج کر۔

لہٰذا خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ایسے قابل اعتماد وسائط کی ضرورت ہے جو اس سے بذریعہ وحی احکام لیں اور انہیں جوں کا توں اس کے بندوں تک پہنچائیں۔ اس اخذ و ابلاغ کا نام نبوت و رسالت ہے اور ان وسائط کو نبی یا رسول کہا جاتا ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کے ارشاد سے ظاہر ہے کہ خلاق عالم نے ہر عہد میں ابلاغ احکام و اتمام حجت کے لئے انبیاء بھیجے اور زمین کا کوئی خطہ اور بنی نوع انسان کا کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جس میں کوئی نہ کوئی نبی ہدایت خلق کے لئے نہ آیا ہو چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

ولقد بعثنا فی کل امت رسولا۔
ہم نے ہر قوم میں ایک نہ ایک رسول بھیجا۔

قول مشہور کی بنا پر ان انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ جن میں سے حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیغمبران اولوالعزم تھے۔ پہلے چاروں نبیوں کی شریعتیں ختم ہو چکی ہیں اور خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت ہمیشہ باقی و برقرار رہنے والی ہے۔ ان تمام انبیاء پر خواہ ان کا ذکر قرآن میں آیا ہو یا نہ آیا ہو ایمان لانا اور انہیں ہر چھوٹے بڑے گناہ سے معصوم سمجھنا ضروری ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے اثبات کے لئے قرآن مجید اور آپؐ کی سیرت طیبہ کافی و وافی

ہیں۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے جس کی بے مثل فصاحت و بلاغت نے عرب کے فصحاء وادباء کی زبانوں کو گنگ کر دیا۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جب اسے خالق کے کلام کی حیثیت سے پیش کیا اس دعوی کے ساتھ کہ اس کی مثل و نظیر لاؤ تو زبان دانوں کی اجتماعی طاقتیں جواب دے گئیں اور زبان آوری کا جوہر دم توڑتا نظر آنے لگا۔ یہ عجز و درماندگی اس کا ثبوت ہے کہ یہ کلام بشری طاقت سے باہر اور آپؐ کی نبوت کا زندہ و پائندہ معجزہ ہے اسی طرح آپؐ کی سیرت آپ کی صداقت کی واضح دلیل ہے۔ چنانچہ یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ آپؐ کی زندگی شروع سے آخر تک صداقت و حق پسندی اور دیانت و راستبازی کا مکمل نمونہ تھی۔ یہاں تک کہ کفار و مشرکین دشمنی و عناد کے مظاہرں کے باوجود آپؐ کی راستگوئی و امانت داری پر حرف رکھنے کی جرات نہ کر سکے۔ جب آپؐ کی صدق بیانی مسلم اور ہر شک و شبہہ سے بلند تر ہے تو جس نے زندگی کے کسی دور میں کوئی جھوٹی بات نہ کہی ہو اور نہ کوئی غلط کلمہ اس کی زبان سے نکلا ہو تو اس سے یہ توقع نہیں جا سکتی کہ وہ غلط بیانی سے کام لے گا یا کوئی جھوٹا دعویٰ کرے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا جوہر صرف صداقت و دیانت ہی نہ تھا بلکہ آپؐ کی سیرت کے جس پہلو پر نظر کی جائے وہ اتنا جذاب اور پر کشش ہے کہ ایک دنیا کی نظروں کو اپنی طرف کھینچ لینے کی طاقت رکھتا ہے۔ آپؐ کی عظمت و رفعت، شرف و فضیلت اور کمال نبوت کے سلسلہ میں امیرالمومنین علیہ السلام کے خطبات میں سے چند کلمے بطور مشتے از خروارے درج کئے جاتے ہیں جو ماخذ و حرف آخر کا درجہ رکھتے ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حلیۂ مبارک کے بارے میں فرمایا ہے۔

کان حبیبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ مملت الجبین مقرون الحاجبین ادعج الوینین سھل الخلین اقنی الانف دقیق المسربہ کث اللحیتہ براق الثنایا کان عنقہ ابریق فضتہ کان لہ شعیرات من لبتہ الی رتہ سلفوفہ کانھا ضیب کافوی لم یکن فی بلنہ شعیرات خیرھالم یکن بالطویل الناھب ولا بالقصیر النزیہ کان اذا مشی مع الناس عمر ھم نورہ و کان اذا مشی کان ینقلع من صخرا و یخلر مت صبب کان بلور الکعبین لطیف القلمین دقیق الخصر۔ (بحار الانوار ج ۱۰ ص ۵ طبع جدید)

میرے حبیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پیشانی کشادہ، ابرو پیوستہ، آنکھیں سرنگیں، رخسار نرم و ہموار، ناک ستواں، سینہ پر رؤوں کی دھاری، ریش مبارک گھنی، دانت چمکیلے، گردن لانبی جیسے چاندی کی صراحی، سینہ سے ناف تک کافور کی ڈلیوں کی طرح کے بال، اس کے علاوہ جسم مبارک پر بال نہ تھے نہ زیادہ طویل القامت تھے اور نہ زیادہ پست قد جب لوگوں کے ہجوم میں نکلتے تو آپ کا نور سب پر چھا جاتا تھا۔ چلتے تھے تو پیروں کو اوپر اٹھا کر گویا بلندی سے نیچے اتر رہے ہوں یا پانی کے بہاؤ میں بہ رہے ہوں۔ پیروں کے دونوں ٹخنے گول پیر نازک اور کمر پتلی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسلی و خاندانی رفعت و سربلندی کے بارے میں فرماتے ہیں۔

حتی افضت کرات اللہ سبحانہ الی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ فاخرجہ من افضل المعاون منبتا واعزالا رومات مغرسا من الشجرہ التی صدع منها انبیائہ وانتخب منها امناء ۔ عترتہ خیر العتر و اسرتہ خیر الاسر و شجرتہ خیر الشجر۔ (نہج البلاغہ)

یہاں تک کہ یہ شرف الہٰی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ تک پہنچا جنہیں ایسے معدنوں سے کہ جو پھلنے پھولنے کے اعتبار سے بہترین اور ایسی اصلوں سے کہ جو نشو ونما کے لحاظ سے بہت باوقار تھیں پیدا کیا۔ اسی شجرہ سے کہ جس سے انبیاء پیدا کئے اور جس میں سے امین منتخب فرمائے۔ ان کی عترت بہترین عترت اور قبیلہ بہترین قبیلہ اور شجرہ بہترین شجرہ ہے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی افضلیت و برتری کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

ما براء اللہ نسمت خیرا من محمد صلی اللہ علیہ وآلہ۔ (فصول)

خداوند عالم نے کسی ذی روح کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ سے بہتر خلق نہیں کیا۔

آپؐ کی سادہ زندگی اور سادہ معاشرت کے بارے میں فرماتے ہیں۔

لقد کان ضل اللہ علیہ وآلہ یا کل علی الارض و یجلس جلستہ العبد و یخصف بیدہ نعلہ و یرقع بیدہ ثوبہ و یرکب الحمارالعاری و یردف خلفہ۔ (نہج البلاغہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زمین پر بیٹھ کر کھانا کھاتے اور غلاموں کی طرح بیٹھتے تھے۔اپنے ہاتھ سے جوتی ٹانکتے تھے اور اپنے ہاتھوں سے کپڑوں میں پیوند لگاتے تھے اور بے پالان کے گدھے پر سوار ہوتے تھے اور اپنے پیچھے کسی کو بٹھا بھی لیتے تھے۔

آپؐ کے اخلاق و اطوار کی شائستگی اور عادات و فضائل کی پاکیزگی کے سلسلے میں فرماتے ہیں۔

ماصافح رسول اللہ صلی اللہ علیہ ولہ احد اقط فنزع یدہ من ید حتی یکون ھوالذی ینزع یدہ وما فاوضہ احد قط فی حاجتہ او حدیث فانصرف حتی یکون الرجل ینصرف ومانا زعہ الحدیث حتی یکون ھوالذی یسکت وما رای مقد ما رجلہ بین یدی جلیس لہ قط۔(مستدرک الوسائل)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی سے مصافحہ کرتے تو اس وقت تک اپنا ہاتھ الگ نہ کرتے جب تک وہ اپنا ہاتھ نہ کھینچتا اور جب کوئی آپ سے کسی حاجت کے متعلق کچھ کہتا یا گفتگو کرتا تو جب تک وہ نہ پلٹتا آپ نہ پلٹتے اور جب تک وہ خاموش نہ ہوتا آپ کلام نہ کرتے اور مجلس میں اپنے کسی ساتھی کے سامنے اپنے پاؤں پھیلانا پسند نہ فرماتے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محاصر و محاسن کا شمار ہو سکتا ہے اور نہ آپؐ کی اخلاقی عظمتوں کا احاطہ کیا جا سکتا ہے چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے ایک یہودی عالم نے کہا کہ آپ اپنے ابن عم (پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خصائل و اوصاف گنوائیں حضرت نے فرمایا کہ پہلے تم دنیا کی چیزوں کی گنتی بتاو کہا کہ دنیا کی چیزوں کا شمار ہماری قوت و طاقت سے باہر ہے فرمایا دنیا کی چیزوں کے بارے میں قدرت کا ارشاد ہے **قل متاع الدنیا قلیل** "کہو کہ دنیا کا سازو سامان تھوڑا ہے" اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف و محاسن کے بارے میں فرمایا ہے **انک لعلی خلق عظیم** "تم خلق عظیم پر فائز ہو" جب قلیل کا احاطہ نہیں ہو سکتا تو عظیم کا شمار کیونکر ہو سکتا ہے۔

آپؐ پر نبوت کے اختتام پذیر ہونے کے بارے میں فرمایا۔

فقفی بہ الرسل و ختم بہ الوحی۔

آپ کو سب رسولوں کے آخر میں بھیجا اور آپ کے ذریعہ وحی کا سلسلہ ختم کیا۔

امامت

امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

اللھم لاتخلی من حجج فی ارضک حجتہ بعد حجتہ یھدونھم الی دینک ویعلمونھم علمک۔ (وسائل الشیعہ ج ۳ ص ۳۷۹)

بار الہا زمین میں تیرے مقرر کردہ حج میں سے ایک حجت کے بعد دوسری حجت کا ہونا ضروری ہے جو تیرے دین کی طرف لوگوں کی رہنمائی کریں اور تیرے تعلیمات سے انہیں آگاہ کریں۔

امامت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت میں دینی و دنیوی سربراہی کا نام ہے اور اس منصب پر فائز ہونے والا امام کہلاتا ہے۔ جس کی اطاعت و پیروی افراد امت پر واجب ہے۔ امام کے فرائض میں اسلامی مفاد کے تحفظ' شرعی احکام کے نفاذ اور اجرائے حدود کے ساتھ مسلمانوں کی عملی تربیت اور حقداروں کی حق رسی بھی داخل ہے۔ ان فرائض کے سلسلہ میں امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

انہ لیس علی الامام الا ماحمل من امرہ الابلاغ فی الموعظتہ والا جتہاد فی النصیحتہ والاحیاء للسنتہ و اقامتہ الحدود علی مستحقیہا واصدار السہمان علی اہلہا(نہج البلاغہ)

امام کا فرض تو بس یہ ہے کہ جو کام اسے اپنے پروردگار کی طرف سے سپرد ہوا ہے اسے انجام دے اور وہ یہ ہے کہ پندو نصیحت کی باتیں لوگوں تک پہنچائے، سمجھانے بجھانے میں پوری پوری کوشش کرے۔ سنت کو زندہ رکھے اور جو حد کے سزا وار ہیں ان پر حد جاری کرے اور غصب کئے ہوئے حصوں کو ان کے اصلی وارثوں تک پہنچائے۔

نصب امام کے وجوب میں خوارج کے علاوہ اسلامی مکاتب فکر میں سے کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ البتہ طریق نصب میں نظریات مختلف ہیں۔ اہلسنت کا نظریہ یہ ہے کہ امت پر نصب امام دلیل سمعی کی رو سے واجب ہے۔ معتزلہ اور زیدیہ کہتے ہیں کہ امت پر نصب امام دلیل عقلی کی بنا پر واجب ہے اور امامیہ کا مسلک یہ ہے کہ امام کا تقرر منجانب اللہ ہوتا ہے اور اس میں جمہورامت کی رائے کا دخل نہیں ہے۔ امام کے منجانب اللہ تقرر پر عقل و نقل دونوں متفق ہیں۔ چنانچہ عقل قطعی طور پر بتلاتی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد شریعت کے تحفظ کے لئے کسی ایسے فرد کا تقرر ضروری ہے جو احکام دین کو تبدل و تحریف اور شیرازہ اسلام کو انتشار و پراگندگی سے محفوظ رکھ سکے اور انسانی طبائع کے اختلاف اور آراء کے تباین کو دیکھتے ہوئے اسے عوام کی صوابدید پر چھوڑ دینا عمداً" افتراق و انتشار اور باہمی تصادم کو دعوت دینا ہے اس لئے کہ عوام انتخابی الجھیڑوں بکھیروں میں باہمی ٹکراؤ سے بچ کر نہیں رہ سکتے اور جبکہ پہلا چناؤ جو سقیفہ بنی ساعدہ کی چار دیواری میں ہوا وہ دھینگا مشتی سے خالی نہ رہ سکا تو اور انتخابات معرکہ آرائی سے کیا خالی رہیں گے۔ پھر اکثر افراد اپنی رائے کا اظہار اسی کے حق میں کریں گے۔ جس سے ان کا مفاد وابستہ ہو گا یا کوئی خاص لگاؤ ہو گا۔ یہ نہیں دیکھیں گے کہ اس میں اہلیت و صلاحیت بھی پائی جاتی ہے یا نہیں۔ لہٰذا ایسی اکثریت کا فیصلہ جو ذاتی اغراض کی سطح سے بلند نہ ہو عقل سلیم کے نزدیک قابل پذیرائی نہیں ہو سکتا پھر اکثریت کے منتخب کردہ رہنما کی رہنمائی پر اعتماد بھی تو نہیں کیا جاسکتا کیونکہ جسے منتخب کیا ہے اس سے رہنمائی میں یقیناً غلطیاں ہو سکتی ہیں اور ان غلطیوں سے ہدایت کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ لہٰذا خدا کے مقرر کردہ ہی سے صحیح رہنمائی کی توقع کی جا سکتی ہے کیونکہ اس کا ہر قول و عمل منشائے الٰہی کا ترجمان ہوتا ہے جس میں غلطی کا امکان ہی نہیں ہوتا اور قرآن مجید بھی اس امر کا شاہد ہے کہ نصب امام اللہ سے متعلق ہے چنانچہ ارشاد باری ہے۔

ان علینا للھدی

ہدایت کے ہم ذمہ دار ہیں۔

جب ہدایت اللہ کے ذمہ ہے تو جن افراد کے ذمہ ہدایت کا نشرو ابلاغ ہو گا ان کا تقرر بھی اللہ کی طرف سے ہونا چاہئے ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہدایت اللہ کی طرف سے ہو اور ہادی کا تقرر ہمارے چناؤ پر منحصر ہو اگر ہم راہ ہدایت

کا از خود تعین نہیں کر سکتے تو ہادی و رہنما کا تقرر بھی ہمارے دائرہ اختیار سے باہر ہو گا چنانچہ خداوند عالم نے بندوں کے حق انتخاب کی نفی کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

وربک یخلق مایشاء ویختار ما کان لھم الخیرہ۔ تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے منتخب کرتا ہے ان لوگوں کو چناؤ کا کوئی حق نہیں ہے۔

جب عقل اور قرآن کی رو سے نصب امام ضروری قرار پایا تو لا محالہ اس کی معرفت اور اتباع بھی واجب ہو گا۔ اس لئے کہ اگر اس کا قول و عمل واجب الاتباع نہیں ہو گا تو اس کے نصب کرنے کا فائدہ و نتیجہ ہی کیا اور اتباع اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس کی معرفت نہ ہو۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام معرفت امام کے وجوب و لزوم کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

انما الائمتہ قوام اللہ علی خلقہ و عرفاء ہ علی عبادہ لا یدخل الجنتہ الامن عرفھم ولا یدخل النار الامن انکرھم وانکروہ۔ بلاشبہ آئمہ اللہ کے ٹھہرائے ہوئے نمائندے ہیں اور اس کو بندوں سے پہچنوانے والے ہیں۔جنت میں وہی لوگ جائیں گے جنہیں ان کی معرفت ہو اور وہ بھی انہیں پہچانیں اور دوزخ میں وہی ڈالے جائیں گے جو نہ انہیں پہچانیں اور نہ وہ ان کو پہچانیں۔

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں وارد ہوا ہے کہ۔

من مات ولم یعرف امام زمانہ فقد مات میتہ جاھلیتہ۔ (شرح عقائد نسفی ص۱۱۰) جو شخص اپنے زمانہ کے امام کو پہچانے بغیر مرجائے وہ جاہلیت کی موت مرا۔

یہ ارشاد پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ ہر زمانہ اور ہر دور میں وجود امام ضروری ہے اور اس کی معرفت جاہلیت کی موت سے سپر کا کام دینے والی ہے۔ بعض افراد نے اس مقام پر امام سے قرآن مجید مراد لے کر ضرورت امام اور اس کی معرفت کی اہمیت کو کم کرنا چاہا ہے۔ حالانکہ لفظ امام سے قرآن کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ جس طرح لفظ قرآن سے امام کی طرف ذہنی تبادر نہیں ہوتا۔ اگر اس سے قرآن مجید مراد ہوتا تو اس معنی کی تعیین کے لئے قرینہ نصب کرنے کی ضرورت تھی اور جبکہ کوئی قرینہ نہیں ہے تو مفہوم وضعی سے عدول کرنا اور امام سے قرآن مجید مراد لینا صریحا" دھاندلی ہے۔ جس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید مراد لینے کی صورت میں ہر زمانہ کے لئے الگ الگ قرآن ماننا ہوں گے ورنہ زمانہ کی تقیید لغو اور بے معنی قرار پائے گی۔ حالانکہ قرآن ہر دور میں ایک رہا ہے اور ایک رہے گا اور زمانہ کے ساتھ اس میں تبدیلی نہیں آتی کہ یہ کہا جائے کہ فلاں

زمانہ میں فلاں قرآن اور فلاں دور میں فلاں قرآن۔ یہ زمانہ کی قید ظاہر کرتی ہے کہ امام سے مراد وہ ہادی و رہنما ہیں جو یکے بعد دیگرے آئیں گے اور ایک حجت کے بعد دوسری حجت کا ظہور ہوتا رہے گا۔ اس سلسلہ آئمہ کے کسی نہ کسی فرد کا ہر دور میں موجود ہونا ضروری ہے تاکہ حفاظت شریعت اور امت کی رہنمائی کا کام جاری رہے۔ چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد گیارہ اماموں تک یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا اور جب پیش آنے والے حوادث و واقعات کے لئے قولی و عملی نمونے پیش کر دئے گئے تو حکمت الہیہ کے اقتضا نے آخری فرد کے ظہور کو آخری دور پر اٹھا رکھا۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام نے ان آئمہ کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

ان لیلتہ القدر فی کل سنتہ وانہ ینزل فی تلک اللیلتہ امر السنتہ و ان لذلک الامر ولاہ بعدرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ قال من ھم فقال انا واحد عشر من صلبی آئمتہ محدثون (فصول ص ۴۸)

ہر سال میں ایک لیلتہ القدر ہوتی ہے اور اس شب میں سال بھر میں رونما ہونے والے امور نازل ہوتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ کے بعد چند ولی امور ہوں گے (ابن عباس نے) عرض کیا کہ وہ کون ہیں فرمایا میں اور میری نسل سے گیارہ افراد جو امام و محدث ہیں۔

کتب اہلسنّت میں بھی متعدد احادیث ایسی تحریر ہیں جن میں آئمہ و خلفاء کی تعداد بارہ بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں

لا یزال الدین قائما حتی تقوم الساعتہ ویکون علیھم اثنا عشر خلیفہ کلھم من قریش (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۱۹)

دین ہمیشہ باقی و برقرار رہے گا یہاں تک کہ قیامت آئے اور لوگوں میں بارہ خلفاء گزریں گے جو سب کے سب قریش میں سے ہوں گے۔

جابر ابن سمرہ کہتے ہیں۔

سمعت رسول اللہ قال یکون بعدی اثنا عشر خلیفہ کلھم من قریش (مسند احمد ج ا ص ۹۲)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ میرے بعد بارہ خلفاء ہوں گے اور وہ سب کے سب قریش میں سے ہوں گے۔

یہ اور اس قبیل کی دوسری حدیثیں آئمہ اہلبیت کے سوا اور کسی پر منطبق نہیں ہوتیں اس لئے کہ اگر ان خلفاء سے خلفاء راشدین مراد لئے جائیں تو ان کی تعداد چار سے آگے نہیں بڑھتی اور اگر ان خلفاء کے ساتھ اموی خلفاء کو شامل کیا جائے تو ان کے آخری خلیفہ مروان ابن محمد پر خلفاء کی تعداد سترہ ہوتی ہے اور صرف اموی خلفاء مراد لئے جائیں تو ان کی تعداد تیرہ ہے اور اگر ان سے خلفاء بنی عباس مراد لئے جائیں تو خلفاء راشدین کو ان کے ساتھ

منسلک کرنے کی صورت میں بھی اور الگ شمار کرنے کی صورت میں بھی ان کی تعداد بارہ سے دگنی تگنی ہو جاتی ہے اور اگر ان میں سے نیک و صالح افراد کا انتخاب کر کے بارہ کی گنتی پوری کی جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان غیر صالح خلفاء کے دور کے مسلمان انہی غیر صالح اور فساق و فجار خلفاء کی معرفت اور اتباع پر مامور تھے یا یہ کہ وہ معرفت کی تکلیف سے مستثنیٰ تھے۔ پہلی صورت میں فساق و غیر صالح افراد قابل اتباع ٹھہریں گے اور یہ عقلاً و شرعاً قبیح اور ناقابل قبول ہے اور دوسری صورت میں عموم معرفت کا حکم اپنے عموم پر باقی نہ رہے گا۔

علمائے اہلسنّت نے خلفاء کی تعداد پوری کرنے کی راہ ڈھونڈ نکالی اور بارہ خلیفوں کی ایک فہرست ترتیب دے کر انہیں ان احادیث کا مصداق قرار دے لیا۔ چنانچہ ملا علی قاری نے خلفاء اثنا عشر کی جو فہرست پیش کی ہے وہ یہ ہے۔

الخلفاء الراشدون الاربعة و معاویة و ابنہ یزید و عبدالملک ابن مروان و اولادہ الاربعة و بینھم عمر ابن عبدالعزیز (شرح فقہ اکبر ص ۸۴)

چاروں خلفاء راشدین (ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، اور علیؑ) معاویہ اور اس کا بیٹا یزید، عبدالملک ابن مروان اور اس کے چاروں بیٹے (ولید، سلیمان، یزید اور ہشام) اور عمر ابن عبدالعزیز۔

اس فہرست پر نظر کرنے سے بآسانی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ صرف حکومت و اقتدار کا نام خلافت رکھ دیا گیا ہے اور جو بھی برسر اقتدار آجائے وہ خلیفہ و دینی رہنما قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے لئے نہ علم کی ضرورت ہے اور نہ حسن عمل کی۔ بلکہ ہر فاسق و فاجر دینی قیادت کے فرائض سرانجام دے سکتا اور مسند رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا وارث و جانشین قرار پا سکتا ہے اور علانیہ فسق و فجور کے ارتکاب سے بھی اس کی برطرفی کا جواز پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ شارح عقائد نسفی تحریر کرتے ہیں۔

لا ینعزل الامام بالفسق والجور لانہ قد ظھر الفسق وانتشر الجور من الائمة والامراء بعد الخلفاء الراشدین والسلف کانوا ینقادون لھم ویقیمون الجمع والاعیاد باذنھم (شرح در عقائد نسفی ص ۱۱۰)

امام کو اس کے فسق و ظلم کی وجہ سے معزول نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ خلفاء راشدین کے بعد آئمہ و امراء علانیہ فسق وجور کے مرتکب ہوتے رہے ہیں اور پہلے لوگ برابر ان کی اطاعت کرتے اور جمعہ و عید کی نمازوں میں ان کے ساتھ شامل ہوتے رہے ہیں۔

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ ظالم و فاسق حکمرانوں کو معزول کرنے کی طاقت کے فقدان یا مصلحت و مفاد کی خاطر عوام کی خاموشی کو ایسے حکمرانوں کی امامت کے جواز کی دلیل قرار دے لیا گیا ہے اور معاویہ یزید اور ولید ایسے افراد کو

آئمہ کی صف میں شمار کیا جاتا ہے جن کے "کارہائے نمایاں" اہل نظر سے مخفی نہیں ہیں۔

یہ حکمران صرف دنیوی فرمانرواؤں کی حیثیت سے مسند حکومت پر متمکن نہ تھے بلکہ خلافت کے نام سے دینی اقتدار بھی اپنے لئے مخصوص کر چکے تھے۔ جو نسل در نسل ان کے خاندان میں محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ حالانکہ نسلی و خاندانی حکومت اور شہنشاہی و ملوکیت اسلامی نظریہ حکومت کے قطا" خلاف ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام نے اس انتخاب کے خلاف پر زور احتجاج کیا جو جمہوریت کے نام سے عمل میں آیا تھا۔ کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ یہ جمہوریت استبداد و ملوکیت کا پیش خیمہ ہے اور جب احتجاج نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا تو خاموشی کو ناگزیر سمجھ کر سکوت اختیار کر لیا اور دینی مصالح کے پیش نظر تصادم و باہم آویزی کی صورت پیدا نہ ہونے دی۔ اسی طرح دوسرے آئمہ اہلبیت کا طرز عمل بھی یہی رہا۔ انہوں نے نہ کسی سیاسی تحریک میں حصہ لیا اور نہ سیاست وقت کا ساتھ دیا' نہ کسی حکومت سے تعاون کیا اور نہ کسی حکومت کے خلاف محاذ قائم کیا اور نہ اپنے خاندان کے ان افراد کی قولا" و عملاً" ہمت افزائی کی جو حکومت وقت کے خلاف میدان میں اتر آئے تھے۔ بلکہ ایک غیر سیاسی فضا میں وہ فرائض جو بحیثیت امام ان پر عائد ہوتے تھے انجام دیتے رہے اور اپنی زندگیاں اسلامی اصولوں کے نشر اور دینی قدروں کے تحفظ کے لئے وقف کر دیں۔ وہ نہ ذاتی اقتدار کے خواہاں تھے اور نہ خاندانی حکومت کے۔ چنانچہ جب ابو مسلم خراسانی نے اموی حکومت کا تختہ الٹ کر امام جعفر صادق علیہ السلام کو حکومت کی پیشکش کی تو آپ نے اسے رد کرتے ہوئے فرمایا۔

ما انت من رجالی ولا الزمان زمانی۔ (کتاب الملل و النحل ص ۱۵۴)

تم نہ میرے آدمی ہو اور نہ زمانہ کے حالات میرے سازگار ہیں۔

اگر امام علیہ السلام کے پیش نظر شخصی یا خاندانی حکومت کا قیام ہوتا تو حکومت قبول کر لیتے یا علویین کی تائید کر کے خاندانی حکومت کی داغ بیل ڈال دیتے۔ مگر پہلی صورت میں حکومت کی پیشکش کرنے والے دنیوی طرز پر تشکیل حکومت کے خواہاں تھے تاکہ ذاتی مفادات حاصل کر سکیں اور یہ ذاتی مفادات اور غلط مقاصد حکومت الٰہیہ کے قیام میں مانع ہوتے اور دوسری صورت میں اولاد علی علیہ السلام کی حکومت تو قائم ہو جاتی مگر حکومت الٰہیہ جس کے آئمہ اہلبیت داعی تھے قائم نہ ہوتی اور آئمہ اہل بیت کا مقصد الٰہی حکومت کو بروئے کار لانا تھا نہ انسانی حکومت کو اور الٰہی حکومت الٰہی نمائندوں ہی کے ذریعہ قائم ہو سکتی ہے۔ اس لئے جہاں دینی قیادت امام سے متعلق ہے وہاں دنیوی امارت بھی امام کا حق ہے تاکہ دین و سیاست کی راہیں الگ الگ نہ ہونے پائیں۔ چنانچہ جب امیرالمومنین علیہ السلام کو امارت کے ساتھ ظاہری اقتدار بھی حاصل ہوا تو آپؑ نے فرمایا۔

الان انرجع الحق الی اهله و نقل الی منتقله۔ (نہج البلاغہ)

اب وہ وقت آیا ہے کہ حق اپنے اہل کی طرف پلٹا ہے اور اپنی صحیح جگہ پر منتقل ہوا ہے

لیکن یہ تسلط و اقتدار امامت کے لئے شرط نہیں ہے اور نہ عدم اقتدار سے منصب امامت متاثر ہوتا ہے اگر

اقتدار ہی دلیل امامت ہے تو پھر خلافت و امامت کو تیس سال کی مدت میں محدود کیوں سمجھ لیا گیا جب کہ اس کے بعد بھی اموی و عباسی فرمانروا برسر اقتدار آتے رہے اور ان کے اقتدار کو دلیل خلافت قرار دینے کے بجائے ملک عضوض کہا جاتا ہے اور ان کی حیثیت دنیوی فرمانرواؤں سے زیادہ تسلیم نہیں کی جاتی۔ امیرالمومنین علیہ السلام کی امامت و خلافت نصوص قطعیہ سے ثابت ہے اور ان نصوص کو نظرانداز کر کے اقتدار کو دلیل امامت قرار دے لینا صحیح فکر کا نتیجہ نہیں ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کی خلافت و امامت کے سلسلہ میں چند دلائل جو نصوص کا درجہ رکھتے ہیں تحریر کئے جاتے ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے دعوت عشیرہ کے موقع پر فرمایا۔

ان ھذا اخی ووصیی و خلیفتی فیکم فاسمعواله واطیعوا (تاریخ طبری ج ۲ ص ۶۳)

یہ میرا بھائی میرا وصی اور میرا جانشین ہے اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔

یہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم امیرالمومنین علیہ السلام کی وصایت و خلافت اور ان کے مفترض الطاعت ہونے کی واضح دلیل ہے۔

غزوہ تبوک کی طرف جاتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔

اما ترضی ان تکون منی بمنزلہ ھار ون من موسی الاانه لانبی بعدی (صحیح بخاری ج ۳ ص ۵۴)

(اے علی) کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰ سے تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ آپ نبوت کے علاوہ ان تمام مدارج و مراتب پر فائز تھے جو حضرت ہارون علیہ السلام کو حاصل تھے ان مراتب میں نمایاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وزارت و جانشینی کا مرتبہ ہے

چنانچہ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی ارشاد ہے۔

واجعل لی و زیرا من اھلی ھارون اخی اشدد به ازری و اشرکه فی امری کی نسبحک کثیرا و نذکرک کثیرا انک کنت بنا بصیرا

میرے گھر والوں میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر قرار دے اس کے ذریعہ میری پشت قوی کر اور میرے کام میں اسے میرا شریک بنا تا کہ ہم زیادہ سے زیادہ تیری تسبیح کریں اور کثرت سے تجھے یاد کریں اور تو ہماری حالت کا نگراں ہے۔

خداوند عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کو شرف قبولیت عطا کرتے رہے فرمایا۔

قداوتیت سؤلک یا موسی اے موسیٰ تمہارا سوال پورا کر دیا گیا

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں دعا فرمائی۔ چنانچہ اسماء بنت عمیس کہتی ہیں۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یقول اللھم انی اقول کما قال اخی موسی اللھم اجعل لی وزیرا من اھلی اخی علیا اشدد بہ ازری واشرکہ فی امری کے نسبحک کثیرا و نذکرک کثیرا انک کنت بنا بصیرا (مرقاہ شرح مشکواہ ج ۱۱ ص ۳۳۷)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا کہ اے اللہ میں بھی وہی درخواست کرتا ہوں جو میرے بھائی موسٰی نے کی تھی اسے اللہ میرے اہل میں سے میرے بھائی علی کو میرا وزیر بنا اس کے ذریعہ میری پشت مضبوط کر اور میرے کاموں میں اسے میرا شریک ٹھہرا تاکہ ہم دونوں کثرت سے تیری تسبیح کریں اور کثرت سے تجھے یاد کریں اور تو ہماری حالت دیکھ ہی رہا ہے۔

لہٰذا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت و وزارت آپ ہی کے پائے نام ہونا چاہئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجتہ الوداع سے پلٹتے ہوئے ایک اجتماع کثیر میں منبر پر بلند ہو کر فرمایا۔

ایھالناس انی تارک فیکم امرین لن تضلوا ان اتبعتمو ھما و ھما کتاب اللہ واھل بیتی عترتی (ثم قال) اتعلمون انی اولی بالمومنین من انفسھم (ثلث مرات) قالو انعم فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من کنت مولاہ۔ فعلی مولاہ (متدرک حاکم ج ۳ ص ۱۱۰)

اے لوگو میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں اگر تم ان کی پیروی کرو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے اور وہ اللہ کی کتاب اور میرے اہلبیت ہیں جو میری عترت ہے (پھر فرمایا) کیا تم جانتے ہو کہ میں مومنین کے نفسوں پر ان سے زیادہ حق تصرف رکھتا ہوں (یہ جملہ تین مرتبہ فرمایا) سب نے کہا کہ ہاں اس اقرار کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس کا میں مولا و آقا ہوں اس کے علی بھی مولا و آقا ہیں ۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام کے مولا ہونے کے اعلان سے پہلے اپنے اولی بالتصرف ہونے کا اقرار لیا تاکہ ذہنوں میں یہ الجھاؤ پیدا نہ ہونے پائے کہ یہاں مولا کے معنی اولی بالتصرف کے علاوہ بھی کچھ ہو سکتے ہیں۔ اگر یہاں دوست مددگار وغیرہ معنی مراد ہوتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس اعلان سے قبل اپنی

اولویت کا اقرار لینے کی ضرورت ہی کیا تھی اور دوسرے عدم ضلالت کو اہل بیت کے اتباع سے وابستہ کرنے کے بھی یہی معنی ہیں۔ اس لئے کہ جو واجب الاتباع ہو گا وہ اولی بالتصرف حاکم اور امام بھی ہو گا صرف لفظیں الگ الگ ہیں مفہوم دونوں کا ایک ہے۔

ان نصوص کے علاوہ وہ تمام اوصاف بھی بدرجہ اتم آپؑ میں موجود تھے جو امامؑ کے لئے ضروری اور اس کے شایان شان ہیں۔ چنانچہ ان اوصاف میں سے ایک صفت عصمت ہے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ امام قوانین الٰیہ کا نگراں اور احکام شرعیہ کا پاسبان ہوتا ہے اور اس فریضہ سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتا ہے جب وہ معصوم ہو۔ اگر خطاکار وغیر معصوم ہو گا تو اس کا غلط طرز عمل احکام شریعت پر اثر انداز ہو کر مفاد امامت کو مجروح کر دے گا اور احکام تغیرو تبدل سے محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ اگر ابلاغ شریعت کے پیش نظر نبی کے لئے عصمت ضروری ہے تو تحفظ شریعت کے پیش نظر امام کے لئے بھی عصمت لازمی ہو گی۔ ان دلائل سے قطع نظر کرتے ہوئے جو حضرتؑ کی عصمت پر شاہد ناطق کی حیثیت رکھتے ہیں صرف آپؑ کی زندگی پر نظر کر لینا ہی آپؑ کی عصمت کے اثبات کے لئے کافی ہے۔ چنانچہ زندگی کے ابتدائی لمحوں سے لے کر عمر کی آخری ساعتوں تک آپؑ کا کوئی قول و فعل ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا جو منافی عصمت ہو بلکہ دشمن و معاند سیاسی اختلاف کے باوجود آپؑ کی پاکدامانی اور بے داغ کردار کا اعتراف کرتے رہے ہیں امیرالمومنین علیہ السلام خود بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی عصمت کا شاہد قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ماوجد لی کذبتہ فی قول ولا خطلتہ فی عمل (نہج البلاغہ)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ تو میری کسی بات میں جھوٹ کا شائبہ پایا اور نہ میرے کسی کام میں لغزش و کمزوری دیکھی۔

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپؑ کے کسی قول یا فعل کو غلط سمجھا ہوتا تو منصب نبوت اور تربیت کی ذمہ داری کا تقاضا یہ تھا کہ آپؑ کو غلط روش پر متنبہ کرتے اور قول و عمل کی اصلاح فرماتے۔ مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی کہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منشا کے خلاف کوئی بات آپؑ کی زبان سے نکلی ہو یا کوئی ایسا فعل سرزد ہوا ہو جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تنبیہہ کی ضرورت محسوس کی ہو۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپؑ کے ہر قول و عمل کو بنظر استحسان دیکھا اور اس پر تحسین و آفرین کی۔

دوسری صفت علم ہے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ امام کے فرائض میں شرعی احکام کا بیان، مشکل مسائل کا حل، قضایا کا تصفیہ اور مذاہب باطلہ کی رد بھی داخل ہے اور اس کے لئے مختلف علوم پر احاطہ ضروری ہے اور فصل قضایا میں تو ہر قسم کے علم کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ اگر امام علم سے عاری اور مسائل ضروریہ سے بھی ناواقف ہو تو وہ دوسروں کی علمی و دینی رہنمائی سے قاصر رہے گا اور اگر افراد امت میں کوئی اس سے زیادہ علم رکھتا ہو گا تو پھر

اسے استحقاق امامت ہونا چاہئے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کے بارے میں لکھا جا چکا ہے کہ صحابہؓ میں کوئی بھی آپ کے علمی پایہ تک نہ پہنچ سکا۔ لہٰذا جو اعلم ہو گا وہی امامت اور امت کی قیادت کا اہل ہو گا۔

تیسری صفت ہر جہتی فضیلت ہے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ اگر کسی صفت میں بھی کوئی اس سے بڑھ کر ہو گا تو اس صفت سے متعلقہ امور کی انجام دہی میں اس کی صوابدید کا پابند ہو گا اور اس صورت میں متبوع ہونے کی بجائے تابع قرار پائے گا اور فاضل کو نظرانداز کرنے سے ترجیح مفضول لازم آئے گی جو عقلاً" قبیح ہے اور ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ انتخاب سے جوہر فضیلت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ جاہل منتخب ہو گا تو وہ جاہل ہی رہے گا اور ظالم منتخب ہو گا تو اس کی طبیعت کا تقاضا بدل نہ جائے گا اور فاسق منتخب ہو گا تو انتخاب اس کے اندر صفت عدالت پیدا نہیں کرے گا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اقتدار کی طاقت اسے اور خود سر و مطلق العنان بنا دے۔

امیرالمومنین علیہ السلام کی افضلیت اتنی واضح و آشکارا ہے کہ اس سے وہی انکار کر سکتا ہے جو جوہرپاروں اور سنگریزوں میں امتیاز کرنے سے قاصر ہو۔ چنانچہ تاریخ و حدیث کے صفحات آپ کے فضائل سے چھلک رہے ہیں ابن عبدالبر تحریر کرتے ہیں۔

قال احمد ابن حنبل و اسمعیل ابن اسحق القاضی لم یرو فی فضائل احد من الصحابہ تالا ساںند الحسان ماروی فی فضائل علی ابن ابی طالب(استیعاب ج ۲ ص۴۶۶)

احمد ابن حنبل اور اسمٰعیل ابن اسحاق قاضی کہتے ہیں کہ صحابہ میں سے کسی ایک کے بارے میں اتنے فضائل وارد نہیں ہوئے جتنے صحیح السند علی ابن ابی طالب کے بارے میں وارد ہوئے ہیں۔

غرض امیرالمومنین علیہ السلام اور آئمہ اطہار علیہ السلام جو ہر دور میں اپنے علم و عمل اور فضل و کمال میں منفرد حیثیت کے مالک تھے مقاصد دینیہ کی تکمیل کا فریضہ ادا کرتے رہے اور یہی ان کے منصب امامت کا تقاضا تھا۔ انہوں نے مصیبتوں پر مصیبتیں اٹھائیں' قید و بند کی سختیاں جھیلیں مگر اسلام کے قیام و بقا اور دینی اقدار کے تحفظ میں اپنی کوششوں کو جاری رکھا اور اپنے قول و عمل سے رہنمائی فرماتے رہے۔ یہ انہی کی فرض شناسی کا نتیجہ ہے کہ عصبیت و عناد کا غبار اسلام کے صحیح نقوش کو چھپا نہ سکا اور مخالف کی تند و تیز آندھیاں شمع ہدایت کو بجھا نہ سکیں۔

؎ وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے۔

معاد

امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

اذا رجفت الراجفتہ و حقت بجلا ھا القیامتہ لحق بکل منسک اھلہ و بکل معبود عبدتہ وبکل مطاع اھل طاعتہ فلم یحز فی عدلہ و قسطہ یومئذ خرق بصر فی الھواء ولا ھمس قدم فی الارض الابحقہ۔
(نہج البلاغہ)

جب زمین زلزلہ میں اور قیامت اپنی ہولناکیوں کے ساتھ آجائے گی اور ہر عبادتگاہ سے اس کے پجاری، ہر معبود سے اس کے پرستار اور ہر پیشوا سے اس کے مقتدی ملحق ہو جائیں تو اس وقت فضامیں شگاف کرنے والی نظر اور زمین میں قدموں کی ہلکی چاپ کا بدلہ بھی اس کی عدالت گستری و انصاف پروری کے پیش نظر حق و انصاف سے پورا پورا دیا جائے گا۔

دنیا میں کوئی چیز اتنی یقینی نہیں ہے جتنی یقینی و حتمی چیز موت ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اسے لفظ یقین سے تعبیر کیا گیا ہے۔

واعبد ربک حتی یا تیک الیقین۔

اپنے پروردگار کی عبادت میں لگے رہو یہاں تک کہ تمہارے پاس یقین (موت) آئے

یہ زندگی جو نفس کی آمد و شد پر قائم ہے چراغ سر راہ ہے جسے موت کا جھونکا ایک نہ ایک دن بجھا دے گا۔ جو آئے وہ گزر گئے اور جو ہیں وہ گزر جائیں گے۔ گویا آنا جانے کی تمہید اور پیدا ہونا مرنے کا پیش خیمہ ہے۔ خالق موت و حیات کے سوا سب کو مرنا اور فنا سے ہمکنار ہونا ہے۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے۔

کل شئی ھالک الاوجہہ

ذات الٰہی کے علاوہ ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔

یہ زندگی دم توڑ کر ہمیشہ کے لئے ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ اس زندگی کے بعد بھی ایک زندگی ہے۔ یہ زندگی عمل کی زندگی ہے اور وہ زندگی جزا و مکافات کی زندگی ہے اور اس کا بگڑنا سنورنا یہاں کے اعمال پر منحصر ہے۔ چنانچہ خلاق عالم ایک دن سب اگلے پچھلے مرنے والوں کو زندہ کرے گا اور حساب و کتاب کے بعد نیک اعمال کی جزا اور برے اعمال کی سزا دے گا۔ چنانچہ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے۔

ومن یعمل مثقال ذرہ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرہ شرا یرہ

جس نے ذرہ برابر نیکی کی وہ نیکی دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی وہ بدی دیکھے گا۔

اس حشر و نشر اور زندگی کی بعد موت کا نام معاد ہے۔ یہ عقیدہ اسلام کے تمام مکاتب فکر کا متفقہ عقیدہ ہے

بلکہ دوسرے مذاہب بھی کسی نہ کسی اعتبار سے قانون مکافات اور نتائج اعمال کے قائل ہیں۔ اگر اختلاف ہے تو صرف طریق کار میں۔ چنانچہ ہنود اور بدھسٹ اواگون کے قائل ہیں اواگون کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے اعمال کے نتیجہ میں مختلف جونیں بدلتا ہے۔ اگر اس کے اعمال اچھے ہوتے ہیں تو دوبارہ پیدا ہو کر خوشحال و فارغ البالی کی زندگی بسر کرتا ہے اور برے اعمال ہوتے ہیں تو فقر و افلاس اور دریوزہ گری کی زندگی گزارتا ہے یا کسی حیوان کی جون میں جنم لے کر اپنے کئے کی سزا بھگتتا ہے۔ بدھسٹوں کے ہاں یہ سلسلہ نروان (مبداء اول سے اتصال) تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور ہنود کے ہاں یہ سلسلہ کہیں بھی ختم ہونے میں نہیں آتا ہے۔ یہ عقیدہ جیسا کچھ بھی ہے ظاہر ہے تاہم جزاو سزا کا تصور موجود ہے۔ عیسائیوں کے ہاں بھی بنیادی طور پر حشر و نشر کا عقیدہ موجود ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ نظریہ بھی قائم کر لیا ہے کہ حضرت مسیح صلیب پر چڑھ کر ان کے اگلے پچھلے گناہوں کا کفارہ ہو چکے ہیں جس کے بعد ان سے اعمال کی باز پرس ہو گی اور نہ پاداش گناہ کی سزا۔ صرف اعتراف گناہ نجات کے لئے کافی ہے۔ یہاں بھی عقیدہ معاد کی جھلک نظر آتی ہے۔ اگرچہ اس کا مقصد فوت ہو گیا ہے۔ قدیم فلاسفہ میں بھی ایسے افراد گزرے ہیں جنہوں نے اس عالم کے ماوراء دوسرے عالم کی نشان دہی کی ہے۔

البتہ فلاسفہ کے ایک گروہ نے حیات بعدالموت کو عقلی اعتبار سے ناممکن بتایا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جب انسان مرجاتا ہے تو وہ معدوم ہو جاتا ہے اور اعادہ معدوم محال ہے یہ نظریہ ان کے واہمہ کی پیداوار ہے اور حشر و نشر کو اعادہ معدوم سے تعبیر کرنا غلط ہے۔ اس لئے کہ موت عدم کا نام نہیں ہے بلکہ صرف روح و بدن کی علیحدگی اور اجزاء کی پراگندگی کا نام ہے اور حشر و نشر کے موقع پر انہی پراگندہ اجزاء کو یکجا کر دیا جائے گا اور اللہ کی قدرت کاملہ کو دیکھتے ہوئے اس میں کوئی استبعاد نہیں ہے کہ وہ متفرق اجزاء کو جمع کر کے ان میں ازسر نو زندگی دوڑا دے اور قدرت نے اس کی ایک جھلک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اعجاز نمائی کے سلسلہ میں دکھا بھی دی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔

واذ قال ابراہیم رب ارنی کیف تحیی الموتی قال اولم تومن قال بلی ولکن لیطمئن قلبی قال فخذ اربعتہ من الطیر فصر ھن الیک ثم اجعل علی کل جبل منھن جزوا ثم ادعھن یاتینک سعیا۔

اس واقعہ کو یاد کرو جب ابراہیم نے کہا کہ اے میرے پروردگار تو مجھے دکھا دے کہ تو کیونکر مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ اللہ نے فرمایا کیا تمہیں اس کا یقین نہیں۔ کہا یقین تو ہے لیکن اطمینان قلب چاہتا ہوں۔ فرمایا چار پرندے لو اور انہیں ذبح کرو پھر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہر پہاڑ پر ایک ایک ٹکڑا ڈال دو اس کے بعد انہیں آواز دو وہ سب کے سب دوڑتے ہوئے تمہارے پاس آئیں گے۔

اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چار مختلف قسم کے پرندے لئے انہیں ذبح کرنے کے بعد ان کے ٹکڑے کئے اور ان ٹکڑوں کو آس پاس کی چوٹیوں پر ڈال دیا اور اس کے بعد انہیں پکارا تو منتشر و پراگندہ اجزاء میں قوت پرواز پیدا ہوئی اور ایک جزو دوسرے جزو سے اس طرح پیوست ہوا کہ ہر پرندہ اپنی پہلی شکل و صورت پر آگیا۔ جس طرح ان بے روح پرندوں کے اجزاء معدوم نہیں ہوئے اسی طرح انسان مرنے کے بعد اگرچہ حیات سے محروم ہو جاتا ہے مگر اس کے اجزاء کسی نہ کسی صورت میں موجود رہتے ہیں خداوند عالم انہی متفرق و پراگندہ اجزاء کو جمع کرے گا اور جس طرح پہلے ان میں روح دوڑا کر اانہیں زندگی دی تھی اسی طرح دوبارہ انہیں زندہ کرے گا۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

قال من یحیی العظام وھی رمیم قل یحییھا الذی انشاھا اول مرہ۔

وہ کہنے لگا کہ ان ہڈیوں کو جو گل سڑ گئی ہیں کون زندہ کر سکتا ہے۔ اس سے کہہ دو کہ ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی مرتبہ زندگی بخشی تھی۔

جو شخص توحید و رسالت کا عقیدہ رکھتا ہے اس کے لئے معاد کا عقیدہ رکھنا بھی ناگزیر ہے۔ اس لئے کہ دنیا میں جتنے انبیاء آئے انہوں نے اللہ کی طرف سے اچھے کاموں کے بجا لانے کا حکم دیا اور برے کاموں سے منع کیا۔ لہٰذا جنہوں نے اس کے احکام کی پیروی کرتے ہوئے اچھے کام کئے ان کو جزا ملنا چاہئے اور جنہوں نے اس کے حکم سے سرتابی کرتے ہوئے برے کام کئے ان کی کوئی سزا ہونا چاہئے اور اگر جزا و سزا نہ ہو تو اس کی ضرورت ہی کیا تھی کہ انبیاء و مرسلین بھیجے جائیں اور اگر بھیجے ہی گئے تو اس کا ہماری عملی زندگی پر کیا اثر۔ جبکہ ان کی بات ماننا اور نہ ماننا دونوں برابر ہیں اور پھر اللہ کو مانا جائے تو کیوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا جائے تو کس لئے جب کہ ہمارے افعال و اعمال کا نہ محاسبہ ہونا ہے نہ اچھائیوں کا کوئی انعام ہے اور نہ برائیوں پر سزا و عقوبت ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ دنیا ہی میں انسان کو اس کے اچھے اور برے کاموں کا بدلہ مل جاتا ہے تو بیشک بعض مجرموں کو اپنے کئے کی سزا دنیا میں مل جاتی ہے مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے بے گناہ شخص کو قتل کر دیتا ہے اور اس خون ناحق کے باوجود قانون کی گرفت سے بچا رہتا ہے۔ ایک شخص دوسرے کے خرمن میں آگ لگا دیتا ہے اور اس کا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔ ایک ایمانداری کو اپنا شعار بناتا ہے اور فقر و افلاس اور بدحالی میں مبتلا رہتا ہے اور دوسرا غصب و خیانت کا مرتکب ہوتا ہے اور بڑے ٹھاٹ سے زندگی گزارتا ہے۔ اسی طرح دوسرے مجرموں کو ان کے جرائم اور جرائم پر مرتب ہونے والے اثرات کی سزا دنیا میں نہیں ملتی۔ لہٰذا عقل کا فیصلہ یہ ہے کہ ایک رب عالم ہونا چاہئے جہاں انسان کو بدی کی قرار واقعی سزا اور نیکی کا پورا پورا صلہ مل سکے۔

بعض لوگوں کی یہ بھی ذہنی اپج ہے کہ انسانی ضمیر کی تحسین و سرزنش ہی انسان کے افعال کی جزا و سزا ہے۔ چنانچہ جب انسان کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اس کا ضمیر اس کی تحسین کرتا ہے اور کوئی برا کام اس سے سرزد ہوتا ہے تو

اس پر ملامت کرتا ہے اور یہ تحسین نیکی کا اجر اور یہ سرزنش برائی کا بدلہ ہے جو اسی دنیا میں اسے مل جاتا ہے۔ للذا جزا و سزا کو آخرت پر اٹھا رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ خیال سراسر فاسد ہے اس لئے کہ ایک شخص کا ضمیر جس فعل پر اس کی ملامت کرتا ہے اسی فعل پر دوسرے کی تحسین کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ایک چیز قابل تحسین بھی ہے اور لائق سرزنش بھی۔ دوسرے یہ کہ جب انسان پہلی دفعہ کسی جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کا ضمیر ملامت کرتا ہے اور جب دوبارہ اس کا مرتکب ہوتا ہے تو ملامت میں اتنا زور نہیں رہتا جتنا پہلی دفعہ تھا اور جوں جوں اس جرم کو دہرایا جاتا ہے ملامت کم ہوتی جاتی ہے۔ اگر اس ضمیر کی ملامت کو سزا سمجھ لیا جائے تو چاہئے یہ تھا کہ جوں جوں جرم میں اضافہ ہوتا سزا بھی بڑھتی جاتی مگر یہاں اس کے برعکس جرم بڑھتا جاتا ہے اور سزا گھٹتی جاتی ہے یہاں تک کہ جب جرم کی عادت مستحکم ہو جاتی ہے تو سزا ختم ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ ضمیر کی تحسین و سرزنش جزا و سزا نہیں ہے بلکہ تحسین نیکیوں کی محرک اور سرزنش برائیوں پر ایک تنبیہہ ہے۔

عقیدہ معاد صرف نظریاتی عقیدہ نہیں ہے بلکہ ہماری دنیوی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ چنانچہ انسان اگر یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اس زندگی کے بعد بھی ایک زندگی ہے جس میں اچھے اور برے کاموں کا محاسبہ ہوگا تو وہ عواقب و نتائج کو نظر انداز کر کے اپنے اعمال کا رخ متعین نہیں کرتا بلکہ جہاں دنیا کے سود و زیاں پر نظر رکھتا ہے وہاں دائمی نفع و نقصان پر بھی نظر رکھے گا اور اگر یہ نظریہ قائم کرلے کہ بس یہی زندگی ہے اور اس کے بعد کچھ نہیں ہے نہ حساب و کتاب ہے نہ زندگی کا احتساب نہ اطاعت کی جزا ہے اور نہ معصیت کی سزا تو اس کا طرز عمل ہر قید و بند سے آزاد ہوگا نہ اس کے لئے کوئی نیکی کا محرک رہے گا اور نہ بدی سے کوئی مانع۔ اگرچہ معاشرہ کا خوف اور قانون کا ڈر ایک حد تک نیکیوں کا محرک اور برائیوں سے سد راہ ہوتا ہے مگر جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو اور نہ قانون ہی اپنی گرفت میں لے سکتا ہو وہاں اخروی باز پرس کا ڈر ہی برائیوں سے مانع ہو سکتا ہے۔ اگر سزا کا خوف انسان کے ذہن پر محیط نہ ہو تو وہ برائیوں سے بچنے کی کوشش نہیں کرے گا اور جزا کی توقع نہ ہو تو نیکیوں میں کوئی کشش باقی نہ رہے گی کہ گناہ کی وقتی لذتوں سے منہ موڑ کر ان نیکیوں کو اختیار کرے جن پر کوئی نتیجہ و اثر مرتب ہونے والا نہیں ہے۔

علی علیہ السلام اور قرآن

امیرالمومنین علیہ السلام ترجمان قرآن اور پاسبان حریم کتاب اللہ تھے دونوں ایک منزل کے راہ سپار اور ایک مقصد کے علمبردار تھے اور اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ رہے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی ان میں جدائی تجویز نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

علی مع القران والقران مع علی لن یفترقا حتی یردا علی الحوض (مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۲۴)

علی علیہ السلام قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علی علیہ السلام کے ساتھ ہے یہ دونوں جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر وارد ہوں۔

اس ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چند نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

(ا) علی علیہ السلام اور قرآن ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ ایک کو دوسرے سے بے نیاز تصور نہیں کیا جا سکتا۔ علی علیہ السلام قرآن کے تعلیمات و معارف سے مستغنی نہیں ہو سکتے اور قرآن اپنے مجملات و متشابہات میں علی علیہ السلام کی ترجمانی سے بے نیاز نہیں رہ سکتا کیونکہ قرآن کا ہر اجمال تفصیل کا اور ہر ابہام تشریح کا محتاج ہے اور عام انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ متشابہات کے مخفی گوشوں کو بے نقاب کر کے قرآن کی صحیح مراد تک پہنچ سکیں بلکہ ان کے معنی و مطلب کو وہی بیان کر سکتا ہے جسے علم میں رسوخ و پختگی حاصل ہو۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے۔

ھوالذی انزل علیک الکتاب منہ ایات محکمات ھن ام الکتاب و اخر متشابھات فاماالذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ماتشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ وما یعلم تاویلہ الااللہ والراسخون فی العلم۔

وہی وہ خدا ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی اس میں کچھ آیتیں محکم ہیں جو کتاب کی بنیاد ہیں اور کچھ متشابہ ہیں۔ جن لوگوں کے دلوں میں کھوٹ ہے وہ انہی متشابہ آیتوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں تاکہ فتنہ و انتشار پھیلائیں اور انہیں اپنے من مانے معنی پہنائیں حالانکہ اللہ اور ان لوگوں کے علاوہ جنہیں علم میں پختگی حاصل ہے ان کے اصلی معنی و مطلب کو کوئی نہیں جانتا۔

قراء میں کا ایک گروہ آیہ **وما یعلم تاویلہ الااللہ** میں اللہ پر وقف کرتا ہے اور **والراسخون فی العلم** کا تعلق آیہ **مابعد یقولون امنابہ** سے مانتا ہے۔ اس صورت میں علم تاویل اللہ سے مختص قرار پائے گا جس پر اس نے کسی کو مطلع نہیں کیا مگر اس صورت میں ان آیات کی افادیت ختم ہو جائے گی اور ان کے نازل کرنے کا کوئی مقصد و مفاد نہ رہے گا۔ جب ان کا معنی و مفہوم سمجھا ہی نہیں جا سکتا تو انہیں نازل کرنا ایک فعل عبث ہو گا اور چونکہ اللہ سے فعل عبث صادر نہیں ہوتا لہٰذا ان میں کوئی مقصد بھی کارفرما ہو گا اور اس مقصد تک رسائی کے لئے ان آیات کے معانی و مطالب کے جاننے والوں کی ضرورت ہے اور وہ وہی لوگ ہیں جنہیں آیت میں راسخون فی العلم کہا گیا ہے اور وہی قرآن کے حقائق کے اور اس کی تاویل کے جاننے والے ہیں۔ اس آیت کی روشنی میں عقل بھی یہی فیصلہ کرتی ہے کہ

ایسے افراد کا وجود ناگزیر ہے جو تاویل کا صحیح علم رکھتے ہوں۔ اس لئے کہ یہ آیت صریحاً" بتلاتی ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی رائے سے آیتوں کا مفہوم متعین کرتے اور ان کی غلط سلط تاویل کر کے لوگوں کو بہکاتے اور فتنہ و انتشار پھیلاتے ہیں اگر ان کج ذہن لوگوں کے مقابلہ میں ایسے افراد موجود نہ ہوں جو صحیح تاویل کی طرف رہنمائی کرنے والے ہوں تو پھر ان غلط کار اور گمراہ لوگوں کے علاوہ کون رہ جاتا ہے کیا اس سے اللہ کی حجت ناتمام نہ رہے گی کہ خود ساختہ تاویلوں کا سہارا لے کر ضلالت و گمراہی پھیلانے والے تو ہوں اور اس ضلالت و فتنہ انگیزی کا سد باب کرنے والا کوئی نہ ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہر عربی دان راسخ فی العلم ہے اور ان آیتوں کے صحیح معنی و مفہوم کو سمجھ سکتا ہے تو پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ تاویل کے سلسلہ میں اختلاف ہوتا اور مختلف و متضاد اقوال جمع ہو جاتے۔ یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ سب متضاد اقوال صحیح و درست ہیں اور جو بھی اپنے دل سے کوئی تاویل گھڑ لے اور آیتوں کے معنی اپنے مطلب پر ڈھال لے وہ صحیح ہی ہوں گے اگر ایسا ہو تو صحیح و غلط کا امتیاز ختم ہو جائے گا اور تمام فرق باطلہ کو حق پر ماننا ہو گا اس لئے کہ وہ اپنے نظریات کی بنیاد تاویل ہی پر رکھتے ہیں۔ چنانچہ مشبہ اور مجسمہ **الرحمن علی العرش استوی، واضع الفلک باعیننا، یداللہ فوق ایدیھم** وغیرہ آیات سے اپنے عقائد پر دلیل لاتے ہیں اور جبریہ اپنے نظریہ جبر پر آیتہ **خالق کل شئی** سے استدلال کرتے ہیں۔ لہٰذا ہر تاویل صحیح اور قابل تسلیم نہیں ہو سکتی ان حالات میں ایسی ہستیوں کا وجود ضروری ہے جنہیں قرآن کا ہر جہتی علم ہو اور اس کی صحیح تاویل سے آگاہ ہوں۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے فرض منصبی کے پیش نظر ان ہستیوں کی نشان دہی فرمائی اور انہیں قرآن کا قرین و عدیل اور اس کے اسرار و رموز کا خزینہ دار قرار دیا تاکہ غلط اور صحیح تاویل کے سلسلہ میں ان کی طرف رجوع کیا جا سکے ارشاد نبوی ہے۔

انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ واھل بیتی و انھما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض (مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۴۸)

میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میرے اہل بیت یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر وارد ہوں

اور امیرالمومنین علیہ السلام کے بارے میں صراحتہ" فرمایا۔

یاعلی انا صاحب التنزیل و انت صاحب التاویل
(فصول عالمی ص۸۸)

اے علی علیہ السلام میں صاحب تنزیل ہوں اور تم صاحب تاویل ہو۔

امیرالمومنین علیہ السلام خود ہی فرمایا کرتے تھے۔

هذا کتاب الله الصامت وانا کتاب الله الناطق (فصول ص ۷۷) وہ خاموش کتاب ہے اور میں بولتا ہوا قرآن ہوں۔

چنانچہ آپؑ کا ہر قول قرآن کا ترجمان اور ہر عمل قرآن کی عملی تفسیر تھا اور انہی قرآنی تعلیمات کے نشرو فروغ کے لئے آپؑ کی زندگی کے لمحات وقف تھے انہوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ حیات میں منکرین تنزیل سے پیہم جہاد کئے جو قرآن کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکا خود ساختہ کلام سحرو جادو کا کرشمہ اور اساطیر الاولین کہتے تھے اور اپنے زمانہ خلافت میں منکرین تاویل مارقین قاسطین اور ناکثین سے مسلسل جنگیں لڑیں جنہوں نے قرآن کے صحیح تعلیمات کو نظرانداز کرکے اسے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ان منکم من یقاتل علی تاویل القران کما قاتلت علی تنزیلہ (مسند احمد ابن حنبل ج ۳ ص ۸۲) تم میں وہ بھی ہے جو تاویل قرآن پر جنگ کرے گا جس طرح میں نے تنزیل پر جنگ کی ہے۔

اس پر حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ نے کہا کہ کیا وہ ہم ہیں فرمایا نہیں بلکہ وہ ہے جو جوتیاں گانٹھ رہا ہے اور اس وقت حضرت علی علیہ السلام پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جوتے گانٹھ رہے تھے۔

(۲) تاویل کے لئے تنزیل سے آگاہی ضروری ہے کیونکہ علم تنزیل کے بغیر نہ ناسخ و منسوخ کا پتا چل سکتا ہے اور نہ مجمل و مبین کا' نہ عام و خاص کا علم ہو سکتا ہے اور نہ مطلق و مقید کا' اگر علم تنزیل کے بغیر تاویل کی جائے گی تو تنزیل میں تحریف و تبدل اور تاویل میں غلطی کا امکان رہے گا۔ لہٰذا جو تاویل سے تماما" و کمالا" آگاہ ہو گا وہ تنزیل سے بھی پوری طرح باخبر ہو گا۔ حضرت علی علیہ السلام جو حسب ارشاد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمتاویل کے عالم تھے وہ تنزیل سے بھی پوری طرح آگاہ ہوں گے۔ اگر ایک آیت ایک لفظ اور ایک حرف سے بھی بے خبر فرض کئے جائیں تو نہ ان کی تاویل قابل اعتماد قرار پائے گی اور نہ مکمل قرآن کا ساتھ باقی رہے گا۔ حضرت علی علیہ السلام تنزیل کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

سلونی عن کتاب الله فوالله مامن ایته الاوانااعلم آبلیل نزلت ام بنهار ام فی سهل ام فی جبل (اتقان ج ۲ ص ۳۱۹) کتاب اللہ کے متعلق مجھ سے پوچھو خدا کی قسم میں قرآن کی ہر آیت کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہ رات کو نازل ہوئی یا دن کو' ہموار زمین پر نازل ہوئی یا پہاڑ پر۔

(۳) قرآن مجید تمام علوم پر حاوی ہے خواہ شریعت سے متعلق ہوں یا معیشت سے اخلاق سے متعلق ہوں یا

سیاست سے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے۔

ونزلنا علیک الکتاب تبیانا لکل شئی۔

ہم نے تم پر کتاب نازل کی جس میں ہر چیز کا واضح بیان ہے۔

لہٰذا امیرالمومنین جو عدیل قرآن ہیں ان کا دائرہ علم بھی قرآن کے دائرہ علم کی وسعتوں تک پھیلا ہوا ہو گا۔ اگر کسی علم کی حضرتؑ سے نفی کی جائے تو قرآن کو بھی اس علم سے خالی ماننا پڑے گا۔ حالانکہ قرآن تمام علوم کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوے ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

مامن شئی تطلبونہ الا وھو فی القران فمن اراد ذلک فیسئلنی عنہ (وسائل)

کوئی چیز ایسی نہیں جس کی تمہیں تلاش ہو اور وہ قرآن میں نہ ہو لہٰذا جو اس کے بارے میں پوچھنا چاہے وہ مجھ سے پوچھ لے۔

(۴) قرآن اللہ کا کلام اور رشد و ہدایت کا پیغام ہے۔ اس میں نہ ضلالت کا شائبہ ہو سکتا ہے نہ خطا و لغزش کا گزر اور نہ غلطی کا امکان اور جو ہمہ وقت قرآن کے ساتھ ہو گا وہ بھی خطاو لغزش سے بری اور گناہ سے پاک ہو گا۔ اگر اس کے لئے خطا و بے راہروی تجویز کی جائے گی تو اسے قرآن سے جدا ماننا پڑے گا۔ لہٰذا جس طرح قرآن محفوظ عن الخطا ہے اسی طرح علی علیہ السلام بھی معصوم عن الخطا ہوں گے اور دونوں طہارت و پاکیزگی اور عظمت و رفعت میں مساوی قرار پائیں گے۔

(۵) قرآن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کی دلیل اور ان کی نبوت کا زندہ جاوید معجزہ ہے۔ اسی طرح علی علیہ السلام برہان نبوت اور معجزہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ نہ قرآن کی کوئی مثال ہو سکتی ہے اور نہ علی علیہ السلام کی کوئی نظیر۔ دونوں اعجازی لحاظ سے بے مثل و بے نظیر ہیں۔ شیخ شہاب الدین تحریر کرتے ہیں۔

امیرالمومنین علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ وکرم اللہ وجہہ ایتہ من ایات اللہ و معجزہ من معجزات رسول اللہ (مستطرف ج ۱ ص ۱۲۱)

امیرالمومنین علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ و کرم اللہ وجہہ' اللہ کی آیتوں میں سے ایک آیت اور رسول اللہ کے معجزوں میں سے ایک معجزہ تھے۔

(۶) قرآن مجید سراپا حق اور حق و باطل میں تمیز کرنے والا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے۔

وانزل التوراۃ والانجیل من قبل ھدی للناس و انزل الفرقان۔

اس نے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے توریت و انجیل نازل کی اور حق و باطل میں تمیز دینے والی کتاب اتاری۔

اسی طرح حضرت علی علیہ السلام کی ذات ایمان و نفاق میں تمیز کرنے والی ہے۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

لا یحبک الا مومن ولا یبغضک الا منافق (مسند احمد ج ۱ ص ۹۵)

اے علی علیہ السلام تمہیں دوست نہیں رکھے گا مگر مومن اور تمہیں دشمن نہیں رکھے گا مگر منافق۔

جابر ابن عبداللہ انصاری کہتے ہیں ۔

ماکنا نعرف المنافقین الا ببغض علی ابن ابی طالب (استیعاب ج ۳ ص ۴۷)

ہم علی ابن ابی طالب سے بغض و عناد کی وجہ سے منافقوں کو پہچان لیا کرتے تھے۔

(۷) قرآن مجید انہی الفاظ و کلمات کا مجموعہ ہے جن سے عربوں کی زبان آشنا اور ان کے روز مرہ میں مستعمل تھے مگر اس کے اسلوب و انداز بیان میں جو بلاغت اور باطن میں جو حقائق و معارف مضمر ہیں ان کی گہرائیوں تک نہ پہنچا جا سکتا ہے اور نہ ان کی بے پایاں وسعتوں کو ناپا جا سکتا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ان القران ظاهره انیق و باطنه عمیق لاتفنی عجائبه ولا تنقضی غرائبه۔

قرآن کا ظاہر خوشنما اور باطن گہرا ہے نہ اس کے عجائبات مٹنے والے ہیں اور نہ اس کے لطائف ختم ہونے والے ہیں۔

اسی طرح حضرت علی علیہ السلام کے ظاہر اوصاف کے لحاظ سے انہیں شجاع، سخی، زاہد، عالم وغیرہ کہا جاتا ہے مگر ان اوصاف کی واقعی بلندی کا صحیح اندازہ وہی کر سکتا ہے جو ان صفات میں ان کا ہم پایہ ہو یا ان سے بالاتر ہو اور جو ان کی سطح سے بمراحل پست تر ہو وہ ان اوصاف کی گیرائی و گہرائی کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

یا علی ما عرف اللہ الا انا وانت وما عرفنی الااللہ وانت وما عرفک الا اللہ وانا

اے علی علیہ السلام اللہ کو نہیں پہچانا مگر میں نے اور تم نے اور مجھے نہیں پہچانا مگر اللہ نے اور تم نے اور تمہیں نہیں پہچانا مگر اللہ نے اور میں نے۔

(۸) علی علیہ السلام اور قرآن کے باہمی تلازم کا تقاضا یہ ہے کہ وجوب اتباع اور مقام تمسک میں اہمیت کے اعتبار سے دونوں کو ایک سطح پر سمجھا جائے اور ایک کو کافی سمجھ کر دوسرے کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد علی علیہ السلام کو کافی سمجھ کر قرآن کو چھوڑ دیا جائے یا قرآن کو کافی سمجھ کر علی علیہ السلام سے روگردانی اختیار کر لی جائے تو ایک سے دستبرداری دوسرے سے دستبرداری کو مستلزم ہو گی اور نتیجۃً نہ

علی علیہ السلام سے تمسک رہے گا اور نہ قرآن سے۔ جب اس تلازم کے نتیجہ میں دونوں سے تمسک ضروری ہے تو جس معنی سے قرآن کے ساتھ تمسک لازم ہو گا اسی معنی سے عدیل قرآن علی علیہ السلام سے بھی تمسک واجب ہو گا۔ تمسک بالقرآن کے معنی یہ نہیں ہیں کہ صرف قرات و تجوید کی پابندی کے ساتھ اس کی تلاوت کر لی جائے یا اسے حفظ کر لیا جائے یا گلے میں حمائل کی صورت میں لٹکا لیا جائے بلکہ تمسک و وابستگی کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اوامر و نواہی احکام و ہدایات اور نصائح و مواعظ کے مطابق زندگی کا لائحہ عمل ترتیب دیا جائے اسی طرح علی علیہ السلام سے وابستگی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ صرف ان کا نام ورد زباں رہے اور ان کے تعلیمات سے کوئی واسطہ نہ رکھا جائے بلکہ وابستگی کے معنی یہ ہیں کہ ان کے احکام کی پابندی کی جائے اور ان کے نقش قدم کو دلیل راہ بنایا جائے۔ اگر زبان سے وابستگی کا اظہار کیا جائے مگر طور طریقہ وہ اختیار کیا جائے جو ان کے قول و عمل کے خلاف ہو تو یہ تمسک و وابستگی نہیں ہے بلکہ سراسر انحراف و برگشتگی ہے۔

جمع قرآن

امیرالمومنین علیہ السلام کا پہلا علمی و دینی کارنامہ جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد ظہور میں آیا وہ قرآن کی ترتیب و جمع آوری ہے۔ اگرچہ جو آیت نازل ہوتی تھی بعض صحابہ اسے ضبط تحریر میں لے آتے تھے مگر یہ آیتیں درخت خرما کی چھال، لکڑی اور چمڑے کے ٹکڑوں پر لکھی جاتی تھیں۔ جن میں نظم و ترتیب کا لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ ضرورت تھی کہ ان متفرق اجزاء کو ترتیب نزول کے مطابق یکجا کر دیا جائے۔ چنانچہ حضرتؑ نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور تمام مشاغل سے دستبردار ہو کر ہمہ تن قرآن کی ترتیب و تدوین کی طرف متوجہ ہو گئے اور اسے ترتیب نزول کے مطابق جمع کر کے اسلام کی بنیادی ضرورت کی تکمیل کی۔ محمد ابن سیرین کہتے ہیں کہ حضرتؑ نے فرمایا۔

آلیت ان لا ارتدی بردائی الا الی الصلواۃ حتی اجمع القرآن۔ (تاریخ الخلفاء ص ۱۳۰)	میں نے قسم کے ذریعہ اپنے اوپر یہ پابندی عائد کر لی ہے کہ نماز کے علاوہ عبا نہ اوڑھوں گا جب تک قرآن جمع نہ کر لوں۔

صحابہ کے پاس قرآن کے جو اجزاء غیر مرتب صورت میں تھے انہیں ترتیب نزولی کے مطابق مرتب کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی چنانچہ سورہ فاتحہ کے بعد چار طویل سورتیں مدنی ہیں اور اس کے بعد بعض مدنی سورتوں میں مکی آیتیں اور مکی سورتوں میں مدنی آیتیں ملی جلی ہوئی ہیں۔ بعض مدنی آیتیں مکی آیتوں سے پہلے اور بعض منسوخ آیتیں ناسخ آیتوں کے بعد درج ہیں چنانچہ بیوہ ہونے والی عورتوں کے بارے میں پہلے یہ آیت نازل ہوئی۔

والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا وصیتہ لازواجھم متاعا الی الحول غیر اخراج

وہ لوگ جو بیویاں چھوڑ کر دنیا سے جا رہے ہوں انہیں اپنی بیویوں کے بارے میں وصیت کرنا چاہئے کہ انہیں گھر سے نکالے بغیر ایک سال تک نان و نفقہ دیا جائے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ ابتدا میں بیوہ ہونے والی عورتوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ اپنے متوفی شوہروں کے گھروں میں ایک سال تک رہیں۔ اس کے بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا اور یہ ناسخ آیت نازل ہوئی۔

والذین یتوفون منکم و یذرون ازواجا یتربصن بانفسھن اربعتہ اشھر و عشرا۔

جو لوگ تم میں سے بیویاں چھوڑ کر مرجائیں تو بیویاں چار مہینے دس دن تک اپنے کو روکیں۔

یہ دونوں آیتیں سورہ بقرہ کی ہیں مگر ناسخ آیت پہلے ہے اور منسوخ آیت بعد میں حالانکہ تنزیل کے اعتبار سے اس کے برعکس ہونا چاہئے تھا۔

قرآن مجید کی جمع آوری ترتیب نزولی کے مطابق وہی کر سکتا تھا جو ترتیب آیات سے کما حقہ واقف ہوتا اور امیرالمومنین علیہ السلام کے علاوہ ایک فرد بھی ایسا نظر نہیں آتا جو ہر ہر آیت کے بارے میں تفصیلی علم رکھتا ہو۔ آپ ہر آیت کے شان نزول، محل نزول اور وقت نزول سے آگاہ تھے اور جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی تھی اسے قلمبند کر لیتے تھے چنانچہ آپؑ خود فرماتے ہیں۔

ان کل آیتہ انزلھا اللہ علی نبیہ عندی باطلاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وخط یدی۔ (فصول حر عاملی ص ۶۵)

خداوند عالم نے ہر وہ آیت جو اپنے نبی پر نازل کی وہ میرے پاس ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے لکھوایا اور میں نے اپنے ہاتھ سے قلمبند کیا۔

آپؑ پیغمبر اکرم کی زندگی میں قرآن مجید حفظ بھی کر چکے تھے اور وہ حفظ اسی ترتیب کے مطابق ہو گا جس ترتیب سے قرآن نازل ہوا تھا لہذا طبعاً" تدوین قرآن میں ترتیب نزول کو ملحوظ رکھا ہو گا کیونکہ سور و آیات کی ترتیب کے بدلنے کا کوئی داعی نہ تھا۔ علامہ سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

قدورد عن علی انہ جمع القرآن علی ترتیب النزول عقب موت النبی۔ (اتقان ج ۱ ص ۷۴)

حضرت علی علیہ السلام سے وارد ہوا ہے کہ آپ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد ترتیب نزول کے مطابق قرآن مجید جمع کیا۔

حضرتؑ کا جمع کردہ قرآن یقیناً" ان تمام فوائد کا حامل ہو گا جو کسی کتاب کی ترتیب کے برقرار رہنے پر مرتب

ہوسکتے ہیں۔ بہتر تو یہی تھا کہ اسی ترتیب کو قائم رکھا جاتا مگر اس کی ترویج خلاف مصلحت سمجھی گئی اور از سر نو اس کی ترتیب ضروری قرار دے لی گئی۔ حضرتؑ نے اپنے جمع کردہ قرآن پر اصرار مناسب نہ سمجھا اور اس خیال سے کہ وحدت اسلامی کو دھچکا نہ لگے اسی کو واجب العمل قرار دیا۔ چنانچہ اس قرآن کے بارے میں فرمایا۔

اعلموا ان ھذا القرآن ھوالناصح الذی لا یغش والھادی الذی لایضل والمحدث الذی لا یکذب۔ (نہج البلاغہ)

یاد رکھو کہ یہ قرآن ایسا نصیحت کرنے والا ہے جو فریب نہیں دیتا اور ایسا ہدایت کرنے والا ہے جو گمراہ نہیں کرتا اور ایسا بیان کرنے والا ہے جو جھوٹ نہیں بولتا۔

یہ اور اس قبیل کے دوسرے توثیقات کے بعد موجودہ قرآن ہمارے لئے حجت و سند ہے خواہ اس کی ترتیب کچھ ہو کیونکہ ترتیب کے بدل جانے سے اعتبار و استناد پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ معانی و مطالب میں چنداں فرق آتا ہے جب کہ وہ کمی و زیادتی سے پاک اور تحریف و تبدل سے محفوظ ہے اور یہی علماء شیعہ کا مسلک رہا ہے چنانچہ شیخ صدوق رحمتہ اللہ تحریر کرتے ہیں۔

اعتقادنا ان القرآن الذی انزل اللہ تعالی علی نبیہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ ھو مابین الدفتین وھو مافی ایدی الناس لیس باکثر من ذلک۔ (اعتقادیہ ص ۱۵۰)

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وہ قرآن جو اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ پر نازل فرمایا وہ وہی ہے جو دو دفتیوں کے درمیاں ہے اور عام لوگوں کے ہاتھوں میں ہے اس سے زائد نہیں ہے۔

اسی طرح شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی نے التبیان فی علوم القرآن میں، سید مرتضیٰ علم الہدیٰ نے مسائل طرابلسیات، میں علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں، سید محسن بغدادی نے شرح وافیہ میں، شیخ جواد بلاغی نے آلاء الرحمٰن میں اور دیگر اکابر محققین نے اپنے مصنفات میں عدم تحریف قرآن کی صراحت کی ہے۔

قرأت قرآن

قرآن مجید کی ایک ایک لفظ وحی منزل ہے جس کے حروف و الفاظ میں رد و بدل کا اختیار نہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ہے اور نہ کسی اور کو۔ چنانچہ ارشاد الہی ہے۔

قل مایکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی ان اتبع الاما یوحی الی۔

اے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کہہ دو کہ مجھے یہ اختیار نہیں ہے کہ میں اپنی طرف سے قرآن کو بدل ڈالوں میں تو اسی کا تابع ہوں جو مجھ پر وحی ہوتی ہے۔

مگر قرآن مجید میں مختلف قرأتوں کے جواز سے رد و بدل کی گنجائش پیدا کر دی گئی۔ یوں تو یہ قرأتیں متعدد ہیں مگر تیسری صدی ہجری میں ان قرأتوں کو سات میں محدود کر لیا گیا جو قراء سبعہ کی طرف منسوب ہیں۔ اس کے جواز میں یہ حدیث نبوی پیش کی جاتی ہے کہ **انزل القرن علی علیہ السلام سبعتہ احرف** قرآن مجید سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔ ان سات حرفوں سے سات قرأتیں مراد لی جاتی ہیں اور ان ساتوں قرأتوں کو متواتر مانا جاتا ہے جو اللہ نے نازل فرمائیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زبان پر جاری ہوئیں۔ حالانکہ سات حرفوں سے سات قرأتیں مراد لینے کی کوئی سند نہیں ہے اور نہ ان کے تواتر پر کوئی دلیل قائم ہے۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو جب حضرت عثمانؓ نے تمام مسلمانوں کو ایک قرات پر جمع کر کے بقیہ قرآنوں کو جلا دیا تو اس پر صحابہ احتجاج کرتے اور ایک قرأت کی پابندی کے خلاف آواز اٹھاتے مگر کسی طرف سے اس کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں ہوتی۔ البتہ ان کے قرآن جلانے پر مسلمانوں کی ایک جماعت ضرور معترض ہوئی۔ بہرحال یہ اختلاف تنزیلی نہیں ہے بلکہ یہ اختلاف اس لئے رونما ہوا کہ ان قاریوں کا طریقہ تلفظ مختلف تھا۔ جس سے ایک حرف دوسرے قریب المخرج حرف سے بدل جاتا تھا جیسے صراط اور سراط یا آواز کو ذرا کھینچنے سے ایک حرف کی کمی بیشی ہو جاتی تھی جیسے مالک یوم الدین اور ملک یوم الدین یا اس وجہ سے کہ اس دور میں قرآن کی کتابت نقطوں اور اعرابی حرکتوں سے معرا ہوتی تھی، جس سے لفظ کی ہیئت میں فرق آجاتا تھا جیسے **یطھرن** اور **یطھرن** یا ان نسخوں میں کتابت کے اعتبار سے اختلاف ہو گا جو حضرت عثمانؓ نے لکھوا کر مکہ، مدینہ، شام، بصرہ، کوفہ، یمن اور بحرین بھجوائے تھے ان شہروں کے باشندے اپنے ہاں کے قاریوں کی قراءت پر اعتماد کرتے تھے اور انہی کی قرات کے مطابق پڑھتے تھے چنانچہ اہل مکہ ابن کثیر کی قرأت کے، اہل مدینہ نافع کی قرأت کے، اہل شام ابن عامر کی قرأت، اہل کوفہ حمزہ و عاصم کی قرأت کے اور اہل بصرہ ابو عمرو اور یعقوب کی قرأت کے پابند تھے البتہ تیسری صدی کے آغاز میں ابن مجاہد نے یعقوب کے بجائے کسائی کی قراءت کو ترجیح دی۔

ان قراء میں سے اکثر کا سلسلہ تلمذ امیرالمومنین علیہ السلام تک منتہی ہوتا ہے۔ چنانچہ ان میں سے ابو عمرو

اور عاصم نے ابو عبدالرحمٰن سے قراءت حاصل کی اور ابو عبدالرحمٰن کہتے ہیں **قرات القران کله ...... علی ابن ابی طالب** "میں نے پورا قرآن علی ابن ابی طالبؑ سے پڑھا" حمزہ اور کسائی ابن مسعود کی قراءت پر اعتماد کرتے تھے اور ابن مسعود کا قول ہے کہ **مارائت اقراء من علی ابن ابی طالب** "میں نے علی ابن ابی طالبؑ سے بڑے کوئی قاریٔ قرآن نہیں دیکھا" ابن کثیر نافع اور ابو عمرو کی اکثر قرأتیں ابن عباس تک منتہی ہوتی ہیں اور ابن عباس نے ابی ابن کعب اور علی ابن ابی طالب سے قرآن پڑھا تھا۔ غرض ان قراء میں سے اکثر کی بازگشت حضرتؑ کی طرف ہے چنانچہ ابن ابی الحدید معتزلی نے تحریر کیا ہے۔

اذا رجعت الی کتب القرآن وجدت آئمته القراء کلهم یرجعون الیه کابی عمرو ابن العلا و عاصم ابن النجود وغیر هما لانهم یرجعون الی ابی عبدالرحمن ابن السلمی القاری و ابوعبدالرحمن کان تلمیذ وعنه اخذ القرآن فقد صار هذا الفن من الفنون التی ینتهی الیه۔ (مقدمہ شرح ص ۷)

اگر ان کتابوں پر نظر کرو جو قرآن مجید کے سلسلہ میں لکھی گئی ہیں تو تم دیکھو گے کہ تمام آئمہ قراءت حضرت علی علیہ السلام کی طرف رجوع کرتے ہیں جیسے ابو عمرو ابن العلاء اور عاصم وغیرہ اس طرح کہ یہ قراء ابو عبدالرحمن کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ابو عبدالرحمن حضرت کے شاگرد تھے اور انہی سے درس قرآن لیا تھا لہٰذا یہ فن بھی انہی فنون میں شمار ہو گا جو حضرت تک منتہی ہوتے ہیں۔

اگرچہ ان قراء میں اکثر کا سلسلہ قراءت حضرتؑ تک منتہی ہوتا ہے مگر ان کی قرأتوں کے اختلاف کو دیکھ کر یہ کہنا پڑے گا کہ انہوں نے وہی قراءتیں حضرتؑ سے لی ہوں گی جن پر وہ متفق تھے اور کچھ قرأتوں کے سلسلہ میں دوسروں سے استفادہ کیا ہو گا یا اپنے اجتہاد و رائے سے کوئی قرأت مقرر کر لی ہو گی ایسا نہیں ہے کہ ان کی ہر قرأت حضرتؑ سے نسبت رکھتی ہو اور ان سے سیکھی گئی ہو۔ اس لئے کہ قرآن کی تنزیلی قرأت ایک ہی ہے جس میں متعدد قرأتوں کی صحت کی گنجائش نہیں ہے اور نہ متداول اول قرأت کے علاوہ دوسرے قراء کی قرأتوں پر اعتماد و وثوق صحیح ہے۔ البتہ اگر آئمہ معصومین علیہ السلام میں سے کسی نے کسی قرأت کی توثیق کر دی ہو تو وہ صحیح قرار دی جائے گی۔

نقاط و اعراب قرآن

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں حروف منقوطہ پر نقطے دینے اور اعراب لگانے کا طریقہ مرسوم نہ تھا اور اس دور کی تمام تحریریں نقطوں سے عاری اور اعراب سے خالی ہوتی تھیں چنانچہ قرآن مجید کے حروف بھی نقطوں اور اعرابی علامتوں کے بغیر لکھے جاتے تھے۔ وہ لوگ جو کتابت قرآن پر مامور ہوتے تھے وہ نقطوں سے آگاہ ہی نہ

تھے کہ ایک شکل و صورت والے حرفوں پر امتیاز کے لئے نقطے لگاتے اور نہ عربوں کو اس کی چنداں احتیاج تھی وہ نقطوں کی ضرورت محسوس کئے بغیر پڑھ لیتے تھے اور موقع و محل سے سمجھ لیتے تھے کہ اس مقام پر کون سا حرف ہو گا اور اس کی اعرابی حرکت کیا ہونا چاہئے مگر غیر عربوں کے لئے نقطوں کے بغیر قرآن مجید کی تلاوت انتہائی دشوار تھی کیونکہ منفرد شکل و صورت رکھنے والے حرفوں کے علاوہ متحد الاشکال حروف میں ان کے لئے اشتباہ کا ہونا ضروری تھا۔ جیسے ت اور ث، س اور ش، ص اور ض، ع اور غ وغیرہ۔ ابوالاسود دئلی نے اس طرف توجہ کی اور قرآن مجید کے حروف پر نقطے لگائے۔ جلال الدین سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

ابوالاسود اول من نقطہ المصحف۔ (المزہر ج ۲ ص ۳۹۸)

ابوالاسود نے سب سے پہلے قرآن مجید پر نقطے لگائے۔

یہ نقطے متحد الاشکال حروف کے باہمی امتیاز کے لئے بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ وہ حروف جو ایک مخصوص اور انفرادی شکل رکھتے ہیں جیسے ا ک ل م و ہ ان پر نقطوں کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی اور وہ حروف جو ایک ہی شکل و صورت رکھتے ہیں جیسے ب ت ث یا مرکب ہونے کی صورت میں ہم شکل ہو جاتے ہیں جیسے ف ق ان میں نقطوں کے ذریعہ امتیاز پیدا کیا گیا اور ی چونکہ غیر مخلوط ہونے کی صورت میں منفرد شکل رکھتی ہے اس لئے اس پر نقطے نہیں دئے جاتے اور مرکب ہونے کی صورت میں چونکہ اس کی شکل منفرد نہیں رہتی اس لئے نقطے لکھے جاتے ہیں۔ ب اور ی دو حروف ایسے ہیں جن کے نیچے نقطے دئے جاتے ہیں کیونکہ اوپر نقطے لکھنے کی صورت میں ب اور ن میں فرق نہ رہتا اور ی اور ت میں امتیاز ختم ہو جاتا۔ اسی طرح زیر زبر اور پیش تینوں حرکتوں کو ظاہر کرنے کے لئے بھی انہوں نے اعرابی نقطوں کی تشکیل کی اس طرح کہ جب انہوں نے دیکھا کہ ہر حرکت کے ادا کرتے وقت منہ کی ایک خاص شکل بن جاتی ہے تو اپنے کاتب سے کہا کہ تم میرے انداز تلفظ کو دیکھو اگر کسی حرف کے تلفظ میں میرا منہ کھل جائے تو تم اس حرف کے اوپر ایک نقطہ ڈال دینا اور جس حرف کے ادا کرنے میں میرے دونوں لب مل جائیں تو اس کے آگے ایک نقطہ لگا دینا اور اگر آواز کا رخ نیچے کی طرف ہو تو تم اس حرف کے نیچے نقطہ لکھ دینا اس طرح بالترتیب زبر پیش اور زیر کی حرکتوں کو ان نقطوں سے واضح کیا اور بعد میں نقطوں کے بجائے اعرابی حرکات ◌َ ◌ُ ◌ِ کی صورت میں یہ تینوں حرکتیں ظاہر کی گئیں۔ ان اعرابی اشکال کے موجد خلیل ابن احمد فرہیدی متوفی ۱۷۰ھ تھے۔ ابوالاسود کا یہ کارنامہ بھی امیرالمومنین علیہ السلام کا کارنامہ ہے کیونکہ ابوالاسود نے یہ طریق کار حضرت ہی سے سیکھا تھا۔ چنانچہ ابن حجر عسقلانی تحریر کرتے ہیں۔

اول من وضع العربیتہ و نقط المصاحف ابوالاسود و قدسئل عمن نہج لہ الطریق فقال تلقیتہ عن علی ابن ابی طالب۔ (اصابہ ج ۲ ص ۲۳۳)

جس نے سب سے پہلے علوم عربیہ وضع کئے اور قرآن میں نقطے لگائے وہ ابوالاسود تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ تم نے یہ طریقہ کس سے سیکھا ہے تو انہوں نے کہا کہ میں نے اسے علی ابن ابی طالب سے

حاصل کیا ہے۔

قرآن مجید کی زریں خدمات کے سلسلہ میں حضرتؓ کی یہ خدمت بھی ایک بلند درجہ رکھتی ہے۔ آپؓ نے قراءت قرآن کی دشواریوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنے شاگرد ابوالاسود کو نقاط کی تعلیم دی۔ جس کی وجہ سے نہ صرف غیر عربوں کے لئے تلاوت قرآن کی راہیں کھلیں بلکہ خود عربوں کے لئے بھی آسانی و سہولت پیدا ہو گئی۔

کتابت و املاء قرآن

تحریر و املاء کا بنیادی ضابطہ یہ ہے کہ الفاظ کو اسی طرح ضبط تحریر میں لایا جائے جس طرح ان کا تلفظ کیا جاتا ہے۔ مگر عربی زبان میں بعض الفاظ کے رسم الخط میں ایک آدھ حرف زیادہ کر دیا جاتا ہے جو تلفظ میں نہیں آتا جیسے عمرو میں واؤ تاکہ لفظ عمر اور عمر میں فرق ہو سکے اسی طرح واو جمع کے بعد الف لکھ دیا جاتا ہے تاکہ واو جمع اور واو غیر جمع میں امتیاز کیا جا سکے مگر قرآن مجید کے رسم الخط میں اس عام قاعدہ کی پابندی کہیں کہیں نہیں ہے چنانچہ بعض مقامات پر ایسی واو کے بعد بھی الف لکھ دیا گیا ہے جو واو جمع نہیں ہے جیسے **یذعوا** اور کہیں واو جمع کے بعد الف نہیں لکھا گیا جیسے **وباء وبغضب من الله** یونہی **لا او ضعوا** اور **لاذبحت** میں لا کے بعد الف زائد ہے اس لئے کہ یہ لائے نافیہ نہیں ہے بلکہ لام تاکید ہے جس کے فعل متصل سے یہ الف بھی پڑھنے میں نہیں آتا یونہی بعض جگہوں پر وہ تا جو حالت وقف میں ہا ہو جاتی ہے لمبی تا کی صورت میں لکھی ہوتی ہے جیسے نعمت رحمت کلمت حالانکہ وہ ہا کی صورت میں لکھی جاتی ہے۔

اس رسم الخط کا آغاز چونکہ قرن اول میں ہو چکا تھا اس لئے اس رسم الخط کی پابندی ضروری قرار دے لی گئی تاکہ قرآن مجید کے نسخوں میں خط و املاء کے اعتبار سے اختلاف نہ ہونے پائے۔ ابن خلدون تحریر کرتے ہیں۔

رسمه الصحابه بخطوسهم و کانت غیر مستحکم فی الاجاده فخالف الکثیر من رسومهم ما اقتفیته رسوم ضاعته الخط عند اهلها ثم اقتفی التابعون من السلف رسمهم فیها تبر کا بمارسمه اصحابه رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ (مقدمہ ص ۲۹۴)

صحابہ نے اپنے ہاتھ سے قرآن مجید کے نسخے قلمبند کئے لیکن ان کا خط فنی اعتبار سے ناقص و کمزور تھا چنانچہ بہت سی جگہوں پر ان کا رسم الخط اہل فن کے رسم الخط کے خلاف ہے پھر بعد کے آنے والوں نے تبرکاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب ہی کے رسم الخط کو اختیار کیا۔

قرآن مجید کو تحریری شکل میں لانے کا اہتمام و انصرام خود پیغمبر اکرم نے کیا تھا اور اسے لوگوں کی قوت حافظہ پر چھوڑ دینے کے بجائے احاطہ تحریر میں لا کر ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دینا ضروری سمجھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ

و آلہ وسلم نے چند پڑھے لکھے لوگوں کو کتابت وحی پر مامور فرمایا اور جو آیت نازل ہوتی اسے فورا لکھوا دیتے۔ صدر اول میں چونکہ نوشت و خواند پر قدرت رکھنے والے چند ہی افراد تھے اس لئے کچھ لوگوں سے کتابت وحی اور تحریر مراسلات دونوں کام لئے جاتے اور کچھ لوگوں سے صرف خطوط و رسائل لکھوائے جاتے۔ بعض مؤلفین نے کاتبان وحی اور کاتبان رسائل و خطوط کو ایک ہی عنوان کے تحت درج کر دیا ہے جس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ ان میں کاتب وحی کون تھا اور کاتب خطوط و رسائل کون۔ اسی سے کچھ لوگوں کو اشتباہ ہو گیا اور انہوں نے معاویہ ابن ابی سفیان کو جو خطوط و رسائل لکھتا تھا اور وہ بھی گاہے گاہے' کاتب وحی قرار دے لیا حالانکہ اس کا کاتب وحی ہونا واقعات کی روشنی میں بعید معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لایا اور اسلام لانے کے بعد مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کے بجائے مکہ ہی میں رہا اور نزول قرآن کا آغاز ابتدائے بعثت سے ہو چکا تھا البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی کبھار مدینہ آتا ہو اور اس سے خطوط و رسائل کے سلسلہ میں تحریری کام بھی لے لیا جاتا ہو۔چنانچہ مورخین نے اسے صرف کاتب رسائل وخطوط بھی لکھا ہے۔ علامہ سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

و کان احدالکتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (تاریخ الخلفاء ص ۱۳۶)

معاویہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبوں میں سے ایک کاتب تھے۔

ابن حجر عسقلانی نے تحریر کیا ہے۔

قال المدائنی کان زید ابن ثابت یکتب الوحی و کان معاویہ یکتب للنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فیما بینہ و بین العرب۔ (اصابہ ج ۳ ص ۴۱۳)

مدائنی کہتے ہیں کہ زید ابن ثابت کتابت وحی کرتے تھے اور معاویہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عربوں کے درمیان مراسلات کے سلسلہ میں تحریری کام کرتے تھے۔

محمد ابن عبدوس جہشیاری نے تحریر کیا ہے۔

و کان خالد ابن سعید ابن العاص و معاویہ ابن ابوسفیان یکتبان بین یدیہ فی حوائجہ۔ (کتاب الوزراء و الکتاب ص ۱۲)

خالد ابن سعید ابن عاص اور معاویہ ابن ابی سفیان آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوائج و ضروریات کے سلسلہ میں تحریری خدمت بجا لاتے تھے۔

علامہ عقاد تحریر کرتے ہیں۔

تتفق الاخبار علی کتابتہ للنبی ولا تتفق علی کتابتہ للوحی۔ (معاویہ ابن ابی سفیان فی المیزان ص ۱۶۴)

اس پر روایات کا اتفاق ہے کہ معاویہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تحریری کام کرتے تھے مگر ان کے کاتب وحی ہونے پر روایات متفق نہیں ہیں۔

مسعودی تحریر کرتے ہیں۔

کتب لہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبل وفاتہ بشھور فاشادو اسن ذکرہ و رفعوا سن منزلتہ بان جعلوہ کاتبا للوحی۔ (مروج الذہب ج ۲ ص ۴۷)

معاویہ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے چند ماہ قبل آپؐ کا کچھ تحریری کام کیا مگر عوام نے ان کا ذکر اتنا اچھالا اور ان کا درجہ اتنا بلند کر دیا کہ انہیں کاتب وحی قرار دے لیا۔

ابن عبد ربہ الاندلسی نے عقد الفرید میں حضرت عثمانؓ کو بھی کاتب وحی لکھ دیا ہے مگر دوسرے ماخذ طبری' اصابہ' استیعاب' سیرہ حلبیہ وغیرہ میں اس کا تذکرہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی اسی طرح کی خود ساختہ بات ہے جس طرح معاویہ کا کاتب وحی ہونا بے اساس ہے۔ تاہم جنہوں نے کتابت وحی کے سلسلہ میں کام کیا ان کے نام کتب تاریخ میں درج ہیں مگر ان میں کوئی فرد ایسا نہیں ہے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے سن کر کاملا" و کمالا" قرآن تحریر کیا ہو بلکہ سبھی متفرق آیتوں کے کاتب تھے۔ البتہ امیرالمومنین علیہ السلام جو اکثر اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں موجود رہتے تھے اور جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں لکھوا دیتے تھے اور اگر نزول وحی کے موقع پر موجود نہ ہوتے تو دوسرے موقع پر انہیں لکھوا دیا کرتے تھے۔ ابن شہر آشوب تحریر کرتے ہیں۔

کان النبی اذا نزل علیہ الوحی لیلالم یصبح حتی یخبربہ علیا و اذا نزل علیہ نھارا لم یمس حتی یخبربہ علیا۔ (مناقب)

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر رات کو وحی نازل ہوتی تو صبح ہونے سے پہلے علی علیہ السلام کو بتا دیتے اور جب دن کو وحی نازل ہوتی تو شام سے پہلے علی علیہ السلام کو آگاہ کر دیتے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں کتابت وحی کا فریضہ انجام دیا اور آپؐ کی رحلت کے بعد قرآن کی نزولی ترتیب قائم کی اور صحت کتابت کی طرف خصوصی توجہ دی۔ چنانچہ کاتبان قرآن کو متنبہ کرتے رہتے کہ تحریر واضح اور اصول کتابت کے مطابق ہو تا کہ پڑھنے میں آسانی رہے اور الفاظ میں اشتباہ نہ ہونے پائے۔ ابو حکیمہ بیان کرتے ہیں کہ

كنت اكتب المصاحف فمربى على ابن ابى طالب كرم الله وجهه فقال اجلل قلمك فقصمت من قلمى قصمته فقال هكذانوره كما نوره الله (عقد الفريد ج ۳ ص ۲۷)

میں قرآن مجید تحریر کیا کرتا تھا ایک مرتبہ علی ابن ابی طالب کا میری طرف سے گزر ہوا آپ نے فرمایا قلم کو جلی رکھو میں نے قلم کی نوک کاٹ ڈالی فرمایا کہ جس طرح اللہ نے اسے روشن کیا ہے اسی طرح تم بھی اسے روشن و نمایاں کرو۔

انصار لفظ تابوت کی آخری تا کو ھا اور قریش تا پڑھتے تھے۔ علامہ سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

قال القاسم ابن معين لم تختلف نعته قريش والانصار فى شئى من القران الا فى التابوت غلفته قريش بالتاء ولغته الانصار بالهاء (المزہرج ۲ ص ۷۳)

قاسم ابن معین کہتے ہیں کہ لغت قرآن کے سلسلہ میں قریش اور انصار میں کوئی اختلاف نہ تھا سوائے لفظ تابوت کے قریش اسے تا کے ساتھ پڑھتے تھے اور انصار ھا کے ساتھ۔

ایک مرتبہ زید کاتب نے حضرت کے سامنے لفظ تابوت کو ہا کے ساتھ پڑھا تو آپ نے فرمایا کہ اسے لانبی تا کے ساتھ التابوت لکھو تاکہ اسے ہا نہ پڑھا جائے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے قرآن مجید کے متعدد نسخے اپنے ہاتھ سے قلمبند کئے اور بعض اجزاء دستبرد زمانہ سے اب تک محفوظ چلے آرہے ہیں۔ چنانچہ مکتبہ رضویہ مشہد میں چند سورتوں پر مشتمل ایک مجموعہ ہے جس کے ۹۲ اوراق ہیں اور ایک مجموعہ سورہ ھود سے سورہ کھف تک ہے جس کے ۶۸ اوراق ہیں اور اس کے نیچے کتبہ علی ابن ابی طالب تحریر ہے اسی طرح مکتبہ نجف میں ایک قرآن مجید موجود ہے جس کے آخر میں تحریر ہے۔

كتبه على ابن ابى طالب فى سنته اربعين من الهجره (اعیان الشیعہ ج ۱ ص ۲۷۶)

علی ابن ابی طالب نے ۴۰ ھ میں تحریر کیا۔

علامہ رافعی نے لکھا ہے۔

فى فهرست لابن النديم انه راى عند ابى يعلى حمزه الحسنى مصحفا بخط على يتوراثه بنو حسن۔ (اعجاز القرآن ص ۳۲)

ابن ندیم نے فہرست میں لکھا ہے کہ انہوں نے ابو یعلی حمزہ حسنی کے پاس قرآن مجید کا ایک نسخہ دیکھا جو حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اور وہ اولاد حسن میں وراثۃ" منتقل ہوتا رہتا ہے۔

تفسیر قرآن

قرآن مجید انہی الفاظ و کلمات پر مشتمل ہے جو عرب میں رائج اور زبانوں پر جاری و ساری تھے۔ مگر لفظوں کی ترتیب و ترکیب اور بیان کے طرز واسلوب میں وہ حسن کارفرما ہے جس نے اسے اعجازی حیثیت دے دی اور عرب کے سخن طراز و سحربیان اس کی قوت اعجاز سے انکار نہ کرسکے۔ قرآن مجید صرف لفظوں کی ترتیب و تنظیم اور بلاغت کے اعتبار ہی سے معجزہ نہیں ہے بلکہ جس پہلو سے دیکھا جائے معجزہ اور انسانی قدرت سے بالاتر ہے۔ فصحاو بلغاء کے لئے بلاغت کے اعتبار سے معجزہ ہے حکماء کے لئے حکمت اور طریق و استدلال کے لحاظ سے معجزہ ہے' قانون دانوں کے لئے قوانین کی آفاقیت و ہمہ گیری کے اعتبار سے معجزہ ہے' سیاست دانوں کے لئے سیاسی اصولوں کی نوعیت کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ اسی طرح اخلاقی تعلیمات' تشریعی نظریات اور علمی اکتشافات کے لحاظ سے معجزہ خالدہ ہے۔

قرآن مجید کے انہی مطالب و مضامین کی توضیح اور اس کی لفظی و معنوی تشریح کا نام تفسیر ہے۔ ایک عربی دان الفاظ قرآن کے معانی تو سمجھ سکتا ہے مگر اس کے مجملات اور دقائق و نکات کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ احادیث پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمسے روشنی حاصل کی جائے یا ان ہستیوں کے آثار سے استفادہ کیا جائے جو اس سرچشمہ نبوت علیہ السلام سے براہ راست سیراب ہوئے اور حاملان علم کتاب قرار پائے اگر ان سے بے نیاز رہ کر تفسیر کی جائے گی تو وہ ذاتی آراء کا مجموعہ ہو گی تفسیر نہ ہو گی اس لئے کہ تفسیر نام ہے مراد الہی کی توضیح کا اور ظن و رائے سے مراد الہی تک پہنچا نہیں جا سکتا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں اگرچہ چند صحابہ قرآنی مطالب پر نظر رکھتے تھے مگر حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں اتفاق رائے ہے کہ وہ تفسیر میں یکتا اور قرآن فہمی میں یگانہ روزگار تھے اور صحابہ میں کوئی بھی ان کا ہم پایہ و ہمسر نہ تھا۔ کیونکہ فہم قرآن کے صحیح ذوق کے ساتھ درسگاہ نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تعلیم و تربیت پانے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکے فیوض سے مستفید ہونے کا جتنا موقع انہیں ملا وہ کسی اور کو نہ مل سکا۔ آپؑ قرآن کے محل نزول، تاریخ نزول، عام و خاص، مطلق و مقید، مجمل و مبین، ناسخ و منسوخ اور محکم و متشابہ سے پوری طرح آگاہ اور اس کے اسرار و غوامض اور دقائق و معارف پر کماحقہ حاوی تھے۔ آپؑ اپنے خطبات میں بھی ان مطالب پر روشنی ڈالتے اور انہیں تحریر میں بھی لائے چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد جو قرآن مرتب کیا وہ ایک تفسیری حیثیت رکھتا تھا اور تنزیلی و تاویلی تشریحات پر مشتمل تھا۔ محمد ابن سیرین کہتے ہیں۔

لو اصبت ذلک الکتاب کان فیہ العلم۔ (تاریخ الاسلام ذہبی ج ۲ ص ۱۹۹)

اگر وہ کتاب مجھے مل جاتی تو اس سے علم کا ایک ذخیرہ دستیاب ہوتا۔

اس تفسیر کے دسترس سے باہر ہونے کے باوجود کتب تفاسیر میں آپ کے تفسیری کلمات اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ اس دور کے مسلمانوں میں سے کسی ایک سے بھی اتنے اقوال مروی نہیں ہیں۔ علامہ سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

ولا احفظ عن ابی بکر رضی اللہ عنہ الا آثار واقلیلتہ جدالا تکاد تجاوز العشرہ واما علی فروی عنہ الکثیر۔ (اتقان ج ۲ ص ۳۲۸)

میں تفسیر کے سلسلہ میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کے آثار بہت ہی کم پاتا ہوں اور جو ہیں وہ کسی صورت میں دس سے زیادہ نہیں البتہ حضرت علی علیہ السلام سے بہت زیادہ تفسیری اقوال مروی ہیں۔

دوسرے خلفاء کے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔

والروایہ عن الثلثہ نزرہ جدا۔ (اتقان ج ۲ ص ۳۲۸)

خلفاء ثلثہ سے تفسیر کی روایات بہت کم ہیں۔

بہرحال امیرالمومنین علیہ السلام کو جہاں تفسیر میں نمایاں امتیاز حاصل ہے وہاں اس کی تدوین میں بھی تقدم حاصل ہے اور وہ افراد جنہوں نے تفسیر کی تدوین کی یا تفسیر میں شہرت پائی ان کا سلسلہ تلمذ بھی آپ تک منتہی ہوتا ہے چنانچہ ان میں سے ایک مشہور مفسر ابن عباس ہیں جنہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دعا دی تھی کہ۔

علمہ الحکمت و تاویل الکتاب۔ (طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۳۶۵)

خدایا اسے حکمت اور کتاب کی تاویل کا علم عطا کر۔

ابن عباس کی طرف منسوب ایک تفسیر تنویر المقباس مطبوعہ صورت میں موجود ہے مگر یہ خود ان کی مدون کردہ نہیں ہے بلکہ جو تفسیری روایات ان کی طرف منسوب ہیں انہیں ابو طاہر محمد ابن یعقوب فیروز آبادی متوفی ۸۱۷ھ نے جمع کر دیا ہے۔ ابن عباس کا قول ہے۔

کلما لکلمت بہ فی التفسیر فانما اخذتہ عن علی کرم اللہ وجہہ۔ (سیرت حلبیہ ج ۲ ص ۴)

میں نے تفسیر کے سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ میں نے حضرت علی علیہ السلام سے اخذ کیا ہے۔

دوسرے میثم ابن یحیٰ تمار ہیں جنہوں نے امیرالمومنین علیہ السلام سے قرآن پڑھا اور علم تاویل سیکھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک موقع پر ابن عباس سے کہا۔

یا ابن عباس سلفی ماشئت من تفسیر القرآن فانی قرأت تنزیلہ علی امیرالمومنین فعلمنی تاویلہ۔
(بحارالانوار ج ۹ ص ۶۳۰)

اے ابن عباس تفسیر قرآن کے بارے میں جو پوچھنا چاہو مجھ سے پوچھو میں نے امیرالمومنین علیہ السلام سے قرآن پڑھا ہے اور انہوں نے مجھے تاویل قرآن کی تعلیم دی ہے۔

ابن عباس نے قلم دوات طلب کر کے ان کے افادات کو قلمبند کر لیا۔

جابر ابن عبداللہ انصاری اور ابی ابن کعب نے بھی حضرتؑ سے استفادہ کیا اور طبقہ اولیٰ کے مفسرین میں سے سعید ابن جبیر' ابو صالح بصری اور طاوس ابن کیسان یمانی ابن عباس کے واسط سے حضرتؑ کے فیوض علمیہ سے مستفید ہو کر علم تفسیر میں نامور ہوئے۔

ذیل میں حضرتؑ کے کلمات کی روشنی میں سورہ فاتحہ کا ایک تفسیری خاکہ درج کیا جاتا ہے۔

تفسیر سورہ فاتحہ

سورہ فاتحہ قرآن مجید کا پہلا سورہ ہے جو فاتحہ الکتاب' ام القرآن اور سبع مثانی کے نام سے موسوم ہے۔ اسے فاتحہ الکتاب قرآن مجید کا افتتاحیہ ہونے کی بنا پر کہا گیا ہے اور ام القرآن اس لئے کہ یہ سورہ تمام مطالب قرآنی کا خلاصہ اپنے اندر رکھتا ہے اور سبع مثانی (سات دہرائی جانے والی آیتیں) اس وجہ سے کہ ہر نماز کی پہلی اور دوسری رکعت میں اس کا دہرانا واجب ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

ولقد اتیناک سبعا من المثانی۔ ہم نے تمہیں سات دہرائی جانے والی آیتیں دی ہیں۔

امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ۔

السبع المثانی فاتحہ الکتاب۔ سبع مثانی سے مراد سورہ فاتحہ ہے۔

بعض مفسرین نے اس سورہ کو مدنی لکھا ہے اور بعض کا قول یہ ہے کہ یہ سورہ ایک دفعہ مکہ میں نازل ہوا اور ایک دفعہ مدینہ میں اور اسی تکرار نزول کی وجہ سے اسے سبع مثانی کہا گیا ہے۔ لیکن اکثر کے نزدیک یہ سورہ مکی ہے اور یہی امیرالمومنین علیہ السلام سے مروی ہے چنانچہ ابن جوزی نے تحریر کیا ہے۔

انها مکیہ و هومروی عن علی ابن ابی طالب۔ (زادالمسیر ج ا ص ۱۰)

سورہ فاتحہ مکی ہے اور یہ قول علی ابن ابی طالب سے مروی ہے۔

حضرتؑ کا یہ قول ہی مشہور و معتبر ہے اور اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ سبعا من المثانی جس سے مراد سورہ فاتحہ ہے سورہ حجر کی آیت ہے اور سورہ حجر بالاتفاق مکی ہے لہٰذا سورہ فاتحہ کو بھی مکی ہونا چاہئے اور اس لئے بھی کہ سورہ فاتحہ نماز کا لازمی جزو ہے اور نماز مکہ ہی میں شروع ہو چکی تھی۔

یہ سورہ سات آیتوں پر مشتمل ہے اور پہلی آیت بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے۔ علامہ سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

انہ سئل عن السبع المثانی فقال الحمد لله رب العالمین فقیل لہ انما هی ست یات فقال بسم الله الرحمن الرحیم ایتہ۔ (اتقان ج ا ص ۷۹)

حضرت علی علیہ السلام سے سبع مثانی کے بارے میں پوچھا گیا آپ نے فرمایا کہ اس سے مراد سورہ الحمد ہے کہا گیا کہ اس کی چھ آیتیں ہیں فرمایا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی تو ایک آیت ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی بسم اللہ کو سورہ فاتحہ کا جزو قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

فاتحہ الکتاب سبع آیات ولهن بسم الله الرحمن الرحیم۔ (تفسیر بیضاوی ص ۳)

سورہ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں اور ان میں کی پہلی آیت بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے۔

جو لوگ بسم اللہ کو سورہ فاتحہ کا جزو نہیں سمجھتے وہ سات آیتوں کی گنتی اس طرح پوری کرتے ہیں کہ صراط الذین انعمت علیهم کو چھٹی آیت اور غیر المغضوب علیهم ولا الضالین کو ساتویں آیت قرار دیتے ہیں اور جو اسے جزو سورہ سمجھتے ہیں ان کے نزدیک یہ ایک ہی آیت ہے اور یہی صحیح ہے جیسا کہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ظاہر ہے کہ بسم اللہ سورہ فاتحہ کی پہلی آیت اور اس کا جزو ہے بلکہ دوسرے سوروں میں بھی اس کی حیثیت جزو سورہ اور مستقل آیت کی ہے چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

والتسمیہ فی اول کل سورہ ایہ منها و انما کان یعرف انقضاء السورہ بنزولها۔ (صافی)

ہر سورہ میں بسم اللہ اس سورہ کی ایک آیت ہے اور اس کے نازل ہونے ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ پہلا سورہ ختم ہو گیا ہے۔

البتہ سورۂ برائت کے شروع میں بسم اللہ نہیں ہے چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لم ینزل بسم اللہ الرحمن الرحیم علی راس سورہ برائتہ لاف بسم اللہ الامان والرحمتہ ونزلت برائتہ لرفع الامان و للسیف۔ (جوامع الجامع طبرسی)

سورہ برائت کے شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں ہے اس لئے کہ بسم اللہ امان و رحمت کے لئے ہے اور سورہ برائت امان کی برطرفی اور تلوار کے لئے نازل ہوا ہے۔

بہرحال بسم اللہ سورہ فاتحہ کا ایک جزو ہے جسے نماز میں سورہ فاتحہ کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے کیونکہ سورہ فاتحہ نماز کا لازمی جز ہے جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ **لاصلواہ الابفاتحہ الکتاب** (سورہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی) اور بسم اللہ سورہ فاتحہ کی ایک آیت ہے جس کے بغیر سورت کی تکمیل نہیں ہوتی۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے کچھ لوگوں کے بارے میں سنا کہ وہ سورہ فاتحہ کے ساتھ بسم اللہ نہیں پڑھتے آپ نے اس پر بگڑ کر فرمایا۔

ھی ایتہ من کتاب اللہ انساھم ایاھا الشیطان۔ (تفسیر برہان)

بسم اللہ قرآن کی آیت ہے اور شیطان نے یہ آیت انہیں بھلا دی ہے۔

صحابہ بسم اللہ کو نہ صرف سورہ فاتحہ کا بلکہ سورہ برائت کے علاوہ ہر سورت کا جزو سمجھتے تھے اور فرادی و باجماعت نمازوں میں برابر پڑھتے اور سنتے آئے تھے۔ اسی لئے جب معاویہ نے مدینہ میں نماز بالجہر پڑھائی اور سورہ فاتحہ کے بعد دوسرا سورہ بغیر بسم اللہ کے پڑھ دیا تو ہر طرف سے انصار و مہاجرین کی آوازیں آئیں کہ۔

یا معاویہ اسرقت الصلواہ ام نسیت۔ (مستدرک حاکم ج ۱ ص ۲۳۳)

اے معاویہ تم نے نماز میں چوری کی ہے یا بھول کر ایسا کیا ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام تمام نمازوں میں وہ جہری ہوں یا اخفاتی بسم اللہ بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ فخرالدین رازی تحریر کرتے ہیں۔

ان علیا کان مذھبہ الجھر ببسم اللہ فی جمیع الصلوات۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۵۹)

حضرت علی علیہ السلام کا مسلک جہر تھا اور وہ تمام نمازوں میں بسم اللہ بلند آواز سے پڑھتے تھے۔

یہی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مسلک اور ان کا طرز عمل تھا۔ چنانچہ ابو ہریرہ دوسی کہتے ہیں۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم یجھر ببسم اللہ الرحمن الرحیم۔ (مستدرک حاکم ج ۱ ص ۲۳۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بسم اللہ الرحمن الرحیم اونچی آواز سے پڑھتے تھے۔

ابن عباس کہتے ہیں۔

كان رسول الله علیہ والہ وسلم یجھر ببسم الله الرحمن الرحیم۔ (مستدرک حاکم ج ۱ ص ۲۰۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بسم اللہ الرحمن الرحیم اونچی آواز سے پڑھتے تھے۔

انس ابن مالک کہتے ہیں کہ۔

صلیت خلف النبی صلی الله علیہ والہ وسلم و خلفہ ابی بکر و خلفہ عمروخلف عثمان و خلف علی فکلھم کانوا یجھرون بقراۃ بسم الله الرحمن الرحیم۔ (مستدرک حاکم ج ۱ ص ۲۳۴)

میں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں اور ابوبکرؓ عمرؓ عثمانؓ اور حضرت علی علیہ السلام کی بھی اقتداء کی ہے اور سب کے سب بسم اللہ الرحمن الرحیم بلند آواز سے پڑھتے تھے۔

سورہ فاتحہ اگرچہ سات آیتوں کا مختصر سا سورہ ہے مگر ان تمام تعلیمات پر حاوی ہے جو قرآن مجید میں بہ تفصیل بیان ہوئے ہیں قرآن مجید کی تعلیمات کا بنیادی نقطہ اعتقاد اور عمل ہے۔ اعتقاد کا تعلق مبداء و معاد سے ہے اور عمل کا تعلق عبادت و استداد سے۔ چنانچہ **الحمد للہ** میں مبداء کائنات کا ذکر ہے جو اپنے صفات کمالیہ کی بنا پر ہر ستائش کا سزاوار ہے اور **رب العالمین** میں اس کی صفت ربوبیت کا اور **الرحمن الرحیم** میں اس کی صفت رحمت کا اور **مالک یوم الدین** میں اس کی صفت عدالت اور جزا و مکافات کے قانون کا تذکرہ ہے اور **اياک نعبدلو اياک نستعین** میں اس کی عبادت و پرستش اور اس سے استعانت کا اعتراف ہے اور **اھدنا الصرا ط المستقیم** میں اس سے ہدایت و استقامت کی طلب و خواہش ہے کیونکہ وہی ہدایت کی توفیق دیتا اور رہنمائی کا سروسامان کرتا ہے۔ پھر اطاعت و عصیان کے اعتبار سے انسانوں کے تین گروہوں کا ذکر کیا ہے پہلا گروہ وہ جو راہ راست پر ثابت قدم ہے یہ انعام یافتہ گروہ ہے کیونکہ ہدایت اور ہدایت پر ثبات سب سے بڑا انعام ہے اور دوسرا گروہ وہ جو ہوائے نفس کے زیر اثر عمداً حق سے روگرداں ہے یہ گروہ وہ ہے جو اپنی کجروی و کج ذہنی کے نتیجہ میں غضب الٰہی کا مستحق ہے اور تیسرہ گروہ وہ جو اپنی کوتاہی کی بنا پر گمراہی میں پڑا ہوا ہے پہلے گروہ کی طرف **صراط الذین انعمت علیھم** سے اور دوسرے گروہ کی طرف **غیر المغضوب علیھم** سے اور تیسرے گروہ کی طرف **ولاالضالین** سے اشارہ کیا ہے اس طرح اعتقاد و عمل اور ان پر مرتب ہونے والے نتائج و اثرات کا اس میں ذکر آگیا ہے اور یہی اعتقاد کی پختگی اور عمل کی درستی' قرآن کا بنیادی مقصد ہے جو اس سورہ میں اجمالاً" بیان کر دیا گیا ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے اس سورہ کی جامعیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

علم القران کلہ فی سورہ الفاتحہ۔ (بحارالانوار)

قرآن کا پورا علم سورہ فاتحہ میں سمو دیا گیا ہے

سورہ فاتحہ میں قرآنی معارف راز سربستہ کی صورت میں موجود ہیں مگر عام اہل علم ظواہر الفاظ کی حد تک معانی کی نقاب کشائی کر سکتے ہیں اور اس کے بواطن کی عمیق گہرائیوں تک پہنچ کر اس کے حکم و اسرار کا استخراج ان

کے بس کی بات نہیں ہے یہ راسخون فی العلم اور وارثان علم نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام ہے کہ وہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف سے علوم و معارف کے دفتر ترتیب دیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ابن عباس رات کے وقت امیرالمومنین علیہ السلام کے ہاں آئے اور تفسیر قرآن کے متعلق کچھ سمجھنا چاہا۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ قرآن کا پہلا سورہ کون سا ہے کہا سورہ فاتحہ فرمایا سورہ فاتحہ کی ابتداء کیا ہے کہا بسم اللہ فرمایا بسم اللہ کی ابتداء کیا ہے کہا بسم فرمایا بسم کی ابتداء کیا ہے کہا با اس کے بعد حضرتؑ نے با کی تفسیر کرنا شروع کی یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور یہ کہہ کر سلسلہ بیان ختم کیا کہ

لوزادنا اللیل لزدنا۔ (تفسیر برہان) — اگر رات میں اور گنجائش ہوتی تو ہم اور بیان کرتے۔

حضرتؑ کا مشہور قول ہے کہ۔

لوشئت لاوقرت سبعین بعیرامن تفسیر فاتحہ الکتاب۔ (احیاء العلوم ج ۱ ص ۲۶۰) — اگر میں سورہ فاتحہ کی تفسیر بیان کروں تو ستر اونٹوں کے بار کے برابر ہو جائے۔

اب اس سورہ کی ہر آیت کے ذیل میں حضرتؑ کا ایک ایک تفسیری قول درج کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم "خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں جو رحمن و رحیم ہے" آیت کے شروع میں با حرف جار اور اسم مجرور ہے۔ کلام عرب میں جار و مجرور کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہوتا ہے یہاں لفظ ابتداء قرار دیا گیا ہے اسی تعلق کی بنا پر بسم اللہ کا ترجمہ "اللہ کے نام پر شروع کرتا ہوں" کیا جاتا ہے۔ حضرت نے اس کی تفسیر کے سلسلہ میں فرمایا۔

استعین علی اموری کلھا باللہ الذی لاتحق العبادہ الالہ المغیث اذا استغیث و المجیب اذا دعی۔ (صافی) — میں ہر کام میں اس اللہ سے مانگتا ہوں جس کے علاوہ کوئی عبادت کا سزاوار نہیں مدد ہے جب اس سے فریاد کی جاتی ہے تو فریاد کو پہنچتا ہے اور جب اسے پکارا جاتا ہے تو سنتا ہے۔

الحمدللہ "تمام تعریف اللہ کے لئے ہے" حمد کے معنی توصیف و ثناء کے ہیں اور اللہ کی ان گنت نعمتوں اور بے پایاں احسانوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی تحمید و ستائش کی جائے اور یہ حمد و ستائش ایک طرح سے اعتراف ہے اس کے انعامات و احسانات کا چنانچہ ایک شخص نے حضرتؑ سے الحمد للہ کے بارے میں دریافت کیا تو آپؑ نے فرمایا۔

ان اللہ عرف عبادہ بعض نعمہ علیھم جملا اذ لا یقدرون علی معرفتہ جمیعھا بالتفصیل لانھا اکثر من ان تحصی اوتعرف فقال قولوا الحمد للہ علی ماانعم بہ علینا۔ (صافی)

اللہ نے اپنے بندوں کو اپنی نعمتیں اجمالی طور پر پہچنوائی ہیں اور یہ بات ان کے بس میں نہیں ہے کہ اس کی تمام نعمتوں کو بالتفصیل پہچان سکیں اس لئے کہ نہ ان کا شمار ہو سکتا ہے اور نہ انہیں جانا جا سکتا ہے لہٰذا اس نے فرمایا کہ تم یہ کہو کہ تمام حمد اللہ کے لئے ہے ان انعامات کے مقابلہ میں جو اس نے ہمیں دئے ہیں۔

اللہ اس ان دیکھی اور غیر محسوس ہستی کا اسم ذات ہے جس کے ادراک سے بشری عقول عاجز اور انسانی حواس درماندہ ہیں، وہ ہمارے ادراک سے بالاتر ہے اور جوں جوں اس ذات مجرد کے بارے میں غور و خوض کیا جاتا ہے حیرت و سرگشتگی بڑھتی ہی جاتی ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

اللہ معناہ المعبود الذی یالہ فیہ الخلق۔ (توحید صدوق)

اللہ سے مراد وہ معبود ہے جس کے بارے میں کائنات حیران و سرگرداں ہے۔

اگرچہ وہ عقل و ادراک کے حدود سے باہر ہے مگر انسان کائنات کو دیکھ کر خالق کائنات کا شعوری احساس رکھتا ہے اور اسے آخری امید گاہ سمجھ کر اپنی حاجتیں اس سے وابستہ کرتا ہے حضرتؑ فرماتے ہیں۔

ھوالذی یتالہ الیہ کل مخلوق عندالحوائج ولشدائد اذا انقطع المرجاء من کل من دونہ وتقطع الاسباب من جمیع من سواہ۔ (صافی)

جب سب سے امیدیں منقطع ہو جاتی ہیں اور کوئی وسیلہ و ذریعہ باقی نہیں رہتا تو اللہ وہ ہے جس کی طرف ہر مخلوق حاجت روائی و مشکل کشائی میں رجوع کرتی ہے۔

رب العالمین "وہ تمام جہانوں کا پالنے والا ہے" رب صفت مشبہ بمعنی اسم فاعل ہے جس کے معنی پرورش کرنے والے کے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ وہی تمام خلق کائنات کا پالنے والا اور ہر ایک کے حسب حال و حسب ضرورت زندگی و بقا کا سامان مہیا کرنے والا ہے۔ حضرتؑ نے لفظ رب کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

مالکھم وخالقھم وسائق ارزاقھم الیھم من حیث یعلمون ولا یعلمون۔ (برہان)

وہ تمام خلائق کا مالک خالق اور جانی اور انجانی جگہوں سے رزق پہنچانے والا ہے۔

عربی زبان میں مالک کے لئے رب کی لفظ عام طور پر استعمال ہوتی ہے اللہ کے لئے اس کا استعمال اضافت کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور بغیر اضافت کے بھی اور اللہ کے علاوہ دوسروں کے لئے اس کا استعمال اضافت کے ساتھ ہو

گا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

قال ارجع الی ربک۔ (یوسف نے) کہا اپنے مالک کے پاس پلٹ جاو۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک شخص سے کہا۔

ارب غنم انت ام رب ابل۔ کیا تم بکریوں کے مالک ہو یا اونٹوں کے۔

ایک عرب شاعر نے کہا ہے۔

فاذا انتشیت فاننی ‍ ‍ ‍ رب الخور نق والسدیر

جب میں نشہ کی حالت میں ہوتا ہوں تو میں اپنے کوشاہان حیرہ کے خورنق و سدیر کا مالک سمجھتا ہوں۔

واذا صحوت فاننی ‍ ‍ ‍ رب الشو یھتہ والبعیر۔

اور جب ہوش میں آتا ہوں تو بکریوں اور اونٹوں کا مالک رہ جاتا ہوں۔

مالک کو رب اس لئے کہا جاتا ہے کہ مالک ہی اپنی زیر ملکیت اشیاء کی دیکھ بھال کرتا اور ان کی زندگی و بقا کا نگراں ہوتا ہے دوسری لفظ خالق ہے۔ بظاہر خلق اور ربوبیت دو الگ الگ صفتیں ہیں اور خلق سے ربوبیت کا مفہوم نہیں نکلتا مگر حقیقت یہ ہے کہ جہاں تخلیق کسی مقصد کے پیش نظر ہو گی وہاں ربوبیت کی کارفرمائی بھی لازما" ہو گی۔ چنانچہ یہ صفت ربوبیت ہی کا تقاضا تھا کہ اس نے کائنات کو پیدا کیا تاکہ اس کی ربوبیت کا فیضان جاری و ساری ہو اور ہر اعلیٰ و ادنیٰ اس سے بہرہ یاب ہو۔ لہٰذا اللہ کی صفت تخلیق سے ربوبیت کو اور ربوبیت سے تخلیق کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ تیسری لفظ رازق ہے۔ رزق سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے زندگی و وجود کی بقا اور نشو و نما کی تکمیل وابستہ ہے۔ ان چیزوں کے مہیا کرنے کا نام رازقیت ہے اور ان اشیاء کے تسلسل کا نام ربوبیت ہے لہٰذا جو رزق رسانی سے تربیت و پرورش کا سلسلہ جاری کئے ہوئے ہے وہ رازق بھی ہو گا۔

الرحمن الرحیم "جو رحمٰن اور رحیم ہے" رحمن اور رحیم دونوں کا ماٴخذ رحم ہے جو اللہ کی صفت رحمت کا پتا دیتے ہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ رحمٰن اس رحمت کو بتاتا ہے جو عام اور سب کو شامل ہے اور رحیم اس رحمت کی خبر دیتا ہے جو مومنین سے مخصوص ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

الرحمن الذی یرحم ببسط الرزق علینا لا جمیع بنافی دینا و دنیانا و اخرتنا۔ (توحید صدوق)

رزق کے پھیلاؤ کی بنا پر وہ رحمٰن ہے اور دین و دنیا میں توفیق دینا اور آخرت کی کامیابی عطا کرنے کی بنا پر وہ رحیم ہے۔

خداوند عالم کی وہ رحمت جو دنیا میں جاری و ساری ہے عمومیت کی حامل ہے۔ چنانچہ اس نے دنیوی سامان معیشت کو طبیعی قوانین کے تابع رکھا ہے اور ان قوانین کے نتائج سب کے لئے یکساں قرار دیئے ہیں خواہ کوئی کافر ہو یا مسلمان، مطیع ہو یا نا فرمان۔ دنیوی نعمتوں سے استفادہ کا موقع جس طرح ایک مومن و مسلم کو حاصل ہے اسی طرح ایک کافر کو بھی میسر ہے۔ دونوں کے لئے سرو سامان زندگی موجود اور رزق و روزی کے اسباب فراہم ہیں اور اس کی عمومی رحمت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ بلا امتیاز کفرو اسلام سب کی پرورش کا سرو سامان کرے اور اس کی خصوصی رحمت مومنین تک محدود ہے کہ دنیا میں انہیں ایمان و عمل صالح کی توفیق بخشی اور آخرت میں فوز و کامرانی ان کے پائے نام کی۔ اگرچہ دنیا میں انہیں تکالیف و شدائد کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے مگر یہ رنج و زحمت اور دنیوی خوشی ہی سے محرومی اللہ کی غضبناکی کا نتیجہ نہیں ہے کہ انہیں اخروی رحمت سے محروم قرار دے لیا جائے اور کفار پر دنیوی نعمتوں کی فراوانی ان سے خوشنودی کا اظہار نہیں ہے کہ آخرت میں اس کے غضب سے بچ جائیں۔ خدا وند عالم کی ذات غضب و رحمت دونوں کی مظہر ہے اسے ایک جگہ رحمت کے تقاضوں کو بروئے کار لانا دوسری جگہ غضب کے اظہار سے مانع نہیں ہوتا اور ایک جگہ کی نمود دوسری جگہ رحمت کی کارفرمائی سے عناں گیر نہیں ہوتی۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

لایشغلہ غضب عن رحمتہ ولا تلھیہ رحمتہ من عتابہ۔(نہج البلاغہ)

غضب کے شرارے اسے رحمت کے فیضان سے روکتے نہیں ہیں اور نہ رحمت کی فراوانی اسے سزا و عقاب سے غافل کرتی ہے۔

مالک یوم الدین "وہ روز جزا کا مالک ہے" دین کے معنی جزاو مکافات کے ہیں اور یوم الدین سے مراد یوم حشر ہے۔ جس میں اچھے کاموں کی جزا اور برے کاموں کی سزا دی جائے گی۔ اس دن تمام اختیارات اللہ کو ہوں گے اور ہر چیز اسی کے قبضہ قدرت میں ہو گی۔ یوں تو دنیا و آخرت میں اللہ ہی مالک و مختار ہے مگر آیت میں یوم آخرت کی تخصیص اس بنا پر ہے کہ دنیا میں اللہ کے علاوہ انسان بھی مالک کہلاتے اور سمجھے جاتے ہیں اگرچہ ان کی ملکیت چند روزہ اور عارضی ہوتی ہے اور آخرت میں تو صرف اللہ ہی ہر لحاظ سے مالک ہو گا اور اس کے علاوہ نہ کوئی مالک ہو گا اور نہ کوئی صاحب اختیار و قدرت۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

انہ یملک نواصی الخلق یوم القیامتہ۔(بحار)

قیامت کے دن تمام مخلوقات اسی کے قبضہ قدرت میں جکڑی بندھی ہو گی۔

ایاک نعبد و ایاک نستعین "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں" اس آیت میں عبادت و استعانت دونوں کا حصر اللہ کی ذات میں کیا گیا ہے یعنی صرف وہی عبادت کا سزاوار ہے اور بس اسی سے مدد مانگی جا

سکتی ہے۔ اگر اس کی مدد کا سلسلہ منقطع ہو جائے تو نہ عبادت ہو سکتی ہے اور نہ کوئی نیک کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ انسان اپنے ارادہ و اختیار سے عبادت کرتا ہے مگر اعضاء و جوارح اور قوت و طاقت اسی کی دی ہوئی ہے اور عمل خیر کی توفیق بھی اسی کی طرف سے ہوتی ہے۔ لہذا عبادت کے ساتھ استعانت کے پیوند کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں اور اس عبادت کے بجا لانے کی توفیق اور قوت و طاقت کی بحالی بھی اسی سے طلب کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کی توفیق و اعانت نہ ہو تو نہ شیطان کے وسوسوں اور نفس کی چیرہ دستیوں سے بچا جا سکتا ہے اور نہ عبادت و اعمال خیر کو اتمام تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ وہ مستقلاً" اعمال و عبادات بجا لاتا ہے اور اس میں اللہ کی مدد و توفیق کا کوئی عمل دخل نہیں ہے وہ مفوضہ کے طریق کار کا پیرو ہو گا اور جو معبود حقیقی کی پرستش میں دوسروں کو بھی شریک کرے وہ شرک کا مرتکب قرار پائے گا۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

انا نعبد اللہ ولا نشرک بہ شیاء و انا نستعین باللہ عزو جل علی الشیطان الرجیم۔

ہم اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور کسی چیز کو اس کا شریک نہیں ٹھہراتے اور شیطان مردود کے خلاف اس سے مدد چاہتے ہیں۔

اھدنا الصراط المستقیم "ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت فرما" ہدایت کے معنی رہبری و رہنمائی کے ہیں اور صراط مستقیم سے مراد دین اسلام ہے جو ٹیڑھی میڑھی راہوں میں سیدھی راہ ہے اور اسی راہ کی طرف ہدایت و رہنمائی کی برکات میں دعا مانگی جاتی ہے۔ اس ہدایت طلبی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دعا مانگنے والا صراط مستقیم پر نہیں ہے یا اسے صراط مستقیم پر ہونے میں شبہ ہے بلکہ یہاں ہدایت کے معنی ثبات و استقامت کے ہیں اگر ایک شخص دوسرے آدمی سے جو بیٹھا ہوا ہو یہ کہے کہ میرے واپس آنے تک بیٹھے رہو تو اس کے یہ معنی نہیں لئے جائیں گے کہ وہ بیٹھا ہوا نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہو گا کہ جس طرح بیٹھا ہے اسی طرح بیٹھا رہے اسی طرح اللہ سے طلب ہدایت کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح تو نے پہلے ہماری رہنمائی کی ہے اسی طرح ہر لحہ و ہر آن ہماری ہدایت کا سلسلہ جاری رکھ اور ہمیں راہ حق پر ثبات کی توفیق دے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام نے اس آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے۔

اوجعلنا توفیقک الذی اطعناک بہ فی ماضی ایامنا حتی نطیعک فی مستقبل اعمارنا۔ (صافی)

اپنی اس توفیق کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھ جس کے ذریعہ ہم نے اپنے گزشتہ دنوں میں تیری اطاعت کی یہاں تک کہ ہم اپنی زندگی کے آنے والے دنوں میں تیری اطاعت کرتے رہیں۔

اس معنی کی شاہد یہ آیت قرآنی ہے۔

وان هذا صراطی مستقیما فاتبعوه ولا تتبعو السبل فتفرق بكم عن سبیلہ۔

اور یہی میرا سیدھا راستہ ہے تم اسی پر چلتے رہو اور دوسری راہوں پر نہ چلنے لگو کہ وہ تمہیں خدا کی راہ سے ہٹا کر پراگندہ و منتشر کردیں۔

اللہ نے پہلے صراط مستقیم کے متعلق یہ بتایا کہ وہ سیدھا راستہ ہے جس میں کوئی کجی' الجھاؤ اور پیچیدگی نہیں ہے اور پھر اس کی پیروی کا حکم دیا اور پیروی کے معنی یہی ہیں کہ اس پر ثبات قدم کے ساتھ جما جائے تاکہ ٹیڑھی ترچھی راہوں میں بھٹکنے سے محفوظ رہیں۔

صراط الذین انعمت علیهم "ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا ہے" آیت کے اس جزو میں صراط مستقیم کی نشاندہی کی گئی ہے کہ وہ ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر اللہ کے انعامات ہوئے۔ یہ انعامات مال و زر' جاہ و حشم اور شاہی و فرمانروائی کی صورت میں نہ تھے کہ دولتمندوں اور شہنشاہوں کے طریق کار کی روشنی میں صراط مستقیم کا سراغ لگایا جائے بلکہ یہ نبیوں' راستبازوں' شہیدوں اور نیک بندوں کی شاہراہ ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

هم الذین قال الله تعالی من یطع الله والرسول فاولئک مع الذین انعم الله علیهم من النبین والصدیقین والشهداء والصالحین و حسن اولئک رفیقا۔

وہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ جنہوں نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا ہے یہ انعام یافتہ گروہ نبیوں صدیقوں شہیدوں اور نیکو کار بندوں کا ہے اور یہ لوگ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں۔

غیر المغضوب علیهم ولاالضالین "نہ ان کا راستہ جن پر غضب ہوا اور نہ ان کا جو گمراہ ہوئے" یہ صراط مستقیم کی دوسری پہچان ہے یعنی سیدھی راہ وہ ہو گی جو مورد غضب قرار پانے والوں اور گمراہ ہونے والوں کی راہ نہ ہو۔ مغضوبین سے مراد وہ گروہ ہے جو حق کو جاننے پہچاننے کے باجود حق کو ماننے سے انکار کرے اور ضالین کا گروہ وہ ہے جو حق کو پہچاننے کی کوشش ہی نہ کرے اور تحقیق حق کے بجائے جس عقیدہ پر ہے اسی عقیدہ پر جما رہے۔ پہلا گروہ یہود کا ہے جن کا رویہ اسلام کے خلاف ہمیشہ معاندانہ رہا اور حق کو سمجھنے کے باوجود عمداً" حق سے انحراف کرتے رہے اور اسی انکار و عناد کے نتیجہ میں غضب الہی کے مستحق قرار پائے اور دوسرا گروہ نصاریٰ کا ہے جن کا طرز عمل اگرچہ معاندانہ نہ تھا مگر وہ عصبیت کا شکار ہو گئے اور راہ حق سے بھٹک کر گمراہی میں پڑے رہے۔ یہ دونوں گروہ

مغضوبین و ضالین کا واضح مصداق ہیں۔ چنانچہ قیصر روم نے امیرالمومنین علیہ السلام سے دریافت کیا کہ سورہ فاتحہ میں جنہیں مغضوبین اور ضالین کہا گیا ہے وہ کون لوگ ہیں حضرتؑ نے جواب میں فرمایا کہ مغضوبین سے مراد یہود ہیں جیسا کہ اللہ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے۔

وباء و بغضب من اللہ۔ اور وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گئے۔

اور ضالین سے مراد نصاری ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

وضلوا عن سواء السبیل۔ وہ سیدھی راہ سے بھٹک گئے۔

حضرتؑ نے مغضوبین و ضالین کے تحت یہود و نصاری کا ذکر ان کے مغضوبیت و گمراہی میں نمایاں ہونے کی وجہ سے کیا ہے۔ یہ مقصد نہیں ہے کہ مغضوبین سے مراد صرف یہود اور ضالین سے مراد صرف نصاریٰ ہیں بلکہ جو بھی حق کو سمجھنے کے باوجود حق سے منہ موڑے وہ مغضوب ہو گا اور جو بھی حق کو تلاش کرنے کے بجائے باطل عقیدہ پر جما رہے وہ گمراہ ہو گا۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

کل من کفر باللہ فھو مغضوب علیھم و ضال عن سبیل اللہ۔ (صافی) جو بھی اللہ کے ساتھ کفر اختیار کرے وہ غضب ہی کا مستحق اور اللہ کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے۔

اس سورہ کے معانی جو حضرتؑ کے ارشادات کی روشنی میں درج کئے گئے ہیں وہ سرچشمہ و ماخذ ہیں ان تمام بنیادی مطالب اور تفصیلات کا جو کتب تفاسیر میں تحریر ہیں۔

تنویع قرآن

امیرالمومنین علیہ السلام جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد قرآن مجید کے علوم و معارف اور آیات کے معانی و مطالب پر سب سے زیادہ گہری نظر رکھتے تھے انہوں نے جہاں ترتیب نزول کے مطابق قرآن کی جمع آوری فرمائی وہاں معانی و مطالب کے لحاظ سے آیات کی ترتیب و تدوین بھی فرمائی اور ناسخ و منسوخ، عام و خاص، مطلق و مقید، رخص و عزائم، محکم و متشابہ، عبر و امثال، مجمل و مبین وغیرہ کے تحت مندرجات قرآن کے الگ ابواب ترتیب دیئے اور قرآنی علوم، شرح و بسط سے بیان کئے۔ چنانچہ قرآن مجید کے بنیادی اقسام کے سلسلہ میں فرمایا۔

ان اللہ تبارک و تعالی انزل القرآن علی سبعتہ اقسام کل قسم منھا کاف شاف وھی امرونھی و ترغیب و ترھیب و جدل و مثل وقصص۔(صافی)

خداوند تبارک تعالی نے قرآن مجید کو سات قسموں پر نازل کیا ہے اور ہر قسم اپنی مقام پر کافی و شافی ہے اور وہ سات قسمیں یہ ہیں امر' نہی' ترغیب' تخویف' مجادلہ' امثال اور قصص۔

اس اجمالی تقسیم کے بعد آیات کی ساٹھ قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ چنانچہ محمد ابن ابراہیم ابن جعفر کی تفسیر جو حضرتؑ کے ارشادات پر مشتمل ہے اور بحار الانوار کی انیسویں جلد میں چھبیس صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے ان ساٹھ اقسام کا تفصیلی بیان موجود ہے مثلاً" قرآنی آیات میں کہاں لفظ عام اور معنی خاص ہیں اور کہاں لفظ خاص اور معنی عام ہیں کہاں پر لفظ واحد اور معنی جمع کے ہیں اور کہاں پر لفظ جمع ہے اور معنی واحد کے ہیں' کہاں پر لفظ ماضی ہے اور معنی مستقبل کے ہیں' کہاں پر الفاظ مختلف اور معانی متفق ہیں اور کہاں پر الفاظ متفق اور معانی مختلف ہیں' اس طرح کہ ایک آیت میں ایک لفظ کے معنی کچھ اور ہیں اور دوسری آیت میں کچھ اور مثلاً" لفظ خلق مختلف جگہوں پر چار معنوں میں' لفظ فتنہ پانچ معنوں میں' لفظ نور چھ معنوں میں' لفظ وحی سات معنوں میں اور لفظ قضا دس معنوں میں وارد ہوا ہے۔ یونہی لفظ امت ضلال' ظلم' شرک وغیرہ کے مختلف معانی ان کے مواقع استعمال کے لحاظ سے بیان فرمائے ہیں اور ہر معنی کے سلسلہ میں ایک یا چند آیتیں بطور استشہاد پیش کی ہیں۔ اسی طرح مختلف فرقوں' بت پرست' مجوس' نصاری'' یہود' ملاحدہ' جبریہ' دہریہ وغیرہ کے عقائد باطلہ کی رد میں جو آیتیں وارد ہوئی ہیں انہیں الگ الگ عنوان کے تحت بیان کیا ہے۔ بلا شبہ قرآنی آیات کی تنویع اور معانی و مطالب کے اعتبار سے ان کی تقسیم کی بنیاد آپؑ کے ہاتھوں پڑی اور جن لوگوں نے معانی قرآن' علوم قرآن اور احکام قرآن کے سلسلہ میں کام کیا ہے ان سب پر آپؑ کو تقدم حاصل ہے۔

علم التجوید

اصطلاح قراء میں تجوید کے معنی یہ ہیں کہ الفاظ قرآن کو اس طرح پڑھا جائے کہ حروف اپنی صوتی کیفیت کے ساتھ اپنے مخارج سے ادا ہوں اور جس مقام پر وقف ہونا چاہئے وہاں وقف کیا جائے اور جہاں وقف نہ ہونا چاہئے وہاں وقف نہ کیا جائے۔ یہ علم اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ دنیا کے ہر انسان کے لئے وہ عرب کا باشندہ ہو یا عجم کا نماز میں قرآن کی تلاوت صحیح تلفظ کے ساتھ ضروری ہے۔ اگر ادائے حروف میں صوتی کیفیت اور مخارج کا لحاظ نہ کیا جائے تو بعض حروف دوسرے حروف سے مشتبہ ہو جائیں گے جیسے ط اور ت' ہ اور ح' ض اور ذ' وغیرہ۔ جس کے یا تو معنی میں تغیر پیدا ہو جائے گا یا لفظ ہی بے معنی ہو جائے گا۔ اس لئے نماز کی صحت اور قرآن کے

لفظی و معنوی تحفظ کے لئے حروف کی صحیح ادائیگی اور وقف شناسی ضروری ہے۔

وقف یہ ہے کہ کسی کلمہ کے آخری حرف پر سانس روک کر ٹھہرایا جائے یا متحرک کو ساکن کر دیا جائے یا گول ت کو ہ سے یا تنوین مفتوح کو الف سے بدل دیا جائے۔ ایسے کلمہ پر وقف کرنا جسے اپنے مابعد سے نہ لفظی تعلق ہو اور نہ معنوی وقف تام کہلاتا ہے جیسے **اولئک هم المفلحون** اگر مابعد سے معنوی تعلق ہو اور لفظی تعلق نہ ہو تو یہ وقف کافی ہے جیسے **لا ریب فیه** اگر مابعد سے صرف لفظی تعلق ہو تو وقف حسن ہے جیسے الحمد للہ اور اگر مابعد سے لفظی و معنوی دونوں طرح کا تعلق ہو تو یہ وقف قبیح ہے جیسے الحمد پر وقف کیا جائے۔ تلاوت میں یہ امر ملحوظ ہونا چاہئے کہ کہاں پر وقف لازم ہے، کہاں پر اولیٰ کہاں پر جائز اور کہاں پر قبیح۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہاں پر آیت تمام ہے یا ناتمام ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام حفظ قرآن کے ساتھ ادائے حروف و صحت تلفظ پر پورا اقتدار رکھتے اور اوقاف کی پابندی کرتے تھے اور ترتیل قرآن کے معنی بھی یہی ہیں کہ تلاوت میں ان امور کا لحاظ رکھا جائے۔ چنانچہ آپ سے **ورتل القرن ترتیلا** (قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھو) کے معنی دریافت کئے گئے تو آپؑ نے نہ فرمایا۔

هو حفظ الوقوف وبیان الحروف (صافی) ترتیل کے معنی اوقاف کی پابندی اور حروف کی صحیح ادائیگی کے ہیں۔

حفظ وقوف سے مراد وقف تام و وقف حسن کی پابندی ہے اور بیان حروف سے مراد یہ ہے کہ جن حروف کے تلفظ میں بھرپور آواز کے نکالنے کی ضرورت ہے انہیں بھرپور آواز سے پڑھا جائے اور جن میں ہلکی اور باریک آواز کے نکالنے کی ضرورت ہے ان میں باریک آواز نکالی جائے اور جہاں زبان کو اوپر اٹھانے کی ضرورت ہے وہاں اوپر اٹھائی جائے اور جہاں نیچے لانے کی ضرورت ہے وہاں نیچے لایا جائے اور تمام حروف کو ان کے مخارج سے اس طرح ادا کیا جائے کہ ان متعلقہ کیفیات پورے طور پر نمایاں ہو جائیں اور ایک حرف سے دوسرے حرف مشتبہ نہ ہونے پائے۔

آداب تلاوت

قرآن مجید، حکم و معارف اور عبرو مواعظ کا معدن اور اخلاق و آداب اور شرعی احکام کا ماخذ ہے۔ اس لئے اس کے تعلیمات کو تازہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تلاوت و تکرار کا سلسلہ جاری رہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔

فاقرو اما تیسر من القرآن۔ جتنا قرآن باسانی پڑھ سکو پڑھ لیا کرو۔

قرآن مجید کی تلاوت عبادات میں شامل ہے اور دوسری عبادات کی طرح اس کی تلاوت کے بھی کچھ آداب ہیں جنہیں ملحوظ رکھنا ضروری ہے تاکہ قرآن کی تلاوت اور دوسری کتابوں کے پڑھنے میں فرق وامتیاز رہے۔ یہ آداب کچھ قاری قرآن سے متعلق ہیں کچھ عمومی تلاوت سے، کچھ مخصوص سورتوں اور آیتوں کی تلاوت سے اور کچھ ختم قرآن سے۔ ذیل میں حضرتؑ کے چند ارشادات آداب تلاوت کے سلسلہ میں درج کئے جاتے ہیں۔

قاری قرآن کو چاہئے کہ وہ وضو و طہارت کے ساتھ تلاوت کرے کیونکہ قرآن مجید کے حروف کو بغیر وضو کے چھونا جائز نہیں ہے اور اس کی حرمت و تقدیس کا تقاضا بھی یہی ہے۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لایقرء العاقل القرآن اذا کان علی غیر طهر حتی یتطهر لہ (تحف العقول) جب تک کوئی عاقل و ذی شعور طہارت و پاکیزگی کی حالت میں نہ ہو قرآن کی تلاوت نہ کرے۔

حروف و الفاظ قرآن صاف ادا کرے۔ اس طرح کہ مد، قصر، غنہ وغیرہ نمایاں ہوں اور اتنا تیز نہ پڑھے کہ الفاظ خلط ملط ہو جائیں اور نہ اتنا رک رک کر کہ مرتبط الفاظ کی کڑیاں الگ ہو جائیں۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

بینہ تبیینا ولا تهذہ هذ الشعرولا تنشرہ نثرہ الرمل ولکن فزعو اقلو بکم القاسیتہ ولا یکن هم بختتم اخر السورہ۔ (مقدمہ صافی) قرآن کے الفاظ کو واضح طور پر ظاہر کرو اور شعروں کی طرح جلد جلد نہ پڑھو اور نہ اس کے الفاظ کو ریت کے ذروں کی طرح بکھیرو بلکہ اپنے سخت دلوں میں خوف کا جذبہ پیدا کرو اور یہ طے نہ کرلو کہ بہرحال سورہ کو ختم کرنا ہے۔

قرآن کی تلاوت کے ساتھ اس کے معانی پر نظر رکھے اور اس کے مطالب و مقاصد میں غور و خوض کرے چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا۔ کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہیں۔

جب مسبحات اخیرہ، سورہ حدید، حشر، صف، جمعہ، تغابن اور اعلی پڑھے تو **سبحان اللہ الاعلی** کہے اور جب سورہ التین پڑھے تو آخر میں **و نحن علی ذلک من الشاھدین** کہے اور جب **قولوا امنا باللہ** پڑھے تو **امنا باللہ** کہے اور جب آیہ **ان اللہ و ملئکتہ یصلون علی النبی** پڑھے تو جس حالت میں ہو درود پڑھے اور جب قرآن ختم کرے تو دعائے ختم قرآن پڑھے۔ امیرالمومنین علیہ السلام ختم قرآن کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے۔

اللھم اشرح بالقرآن صدری واستعمل بالقرآن بدنی و نور بالقرآن بصری و اطلق بالقرآن لسانی و اعنی علیہ ماابقیتنی فانہ لاحول ولا قوہ الابک۔ (بحارالانوار)

بارالہا قرآن کے ذریعہ میرا سینہ کشادہ کر قرآن کے ذریعہ میرے بدن کو مصروف عمل رکھ قرآن کے ذریعہ میری آنکھوں کو روشن کر اور قرآن کو میرا ورد زباں قرار دے اور جب تک تو مجھے زندہ رکھے اس سلسلہ میں میری مدد فرما کیونکہ قوت و توانائی کا سہارا ہے تو تو ہے۔

قرآنی استخراج واستنباط

امیرالمومنین علیہ السلام قرآن مجید سے اخذ و استنباط احکام میں حیرت انگیز دستگاہ رکھتے تھے اور جب کسی پیچیدہ مسئلہ میں ذہنی قوتیں سپر انداختہ اور فہم و فراست کی طاقتیں مضحل ہو جاتی تھیں تو آپ کا ذہن فوراً" قرآن کی طرف پلٹتا اور مشکل سے مشکل مسئلہ کو قرآن کی روشنی میں حل کردیتے اس طرح کہ نہ کسی کو لب کشائی کی جرأت ہوتی اور نہ قوت استدلال کے سامنے سوال و جواب کی نوبت آتی۔ گویا قرآن مجید کا ایک ایک مخفی گوشہ اپنے تمام حقائق و معارف کے ساتھ آپؑ کی نظروں کے سامنے اس طرح روشن تھا جس طرح چشم بینا کے سامنے آفتاب کا طلوع اور سپیدہ سحر کی نمود۔ اس سلسلہ کے چند واقعات درج کئے جاتے ہیں جن سے آپؑ کے ذہنی استحضاء اور قرآن پر ہمہ جہتی عبور کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ایک شخص نے آپ سے کہا کہ یاامیرالمومنین جن لوگوں سے ہم برسرپیکار ہیں انہیں کس نام سے یاد کریں جبکہ ہم اور وہ ایک ہی نبی کی امت ہیں ہمارا ان کا روزہ و نماز ایک اور حج ایک ہے۔ فرمایا اسی نام سے یاد کرو جس نام سے اللہ نے انہیں اپنی کتاب میں یاد کیا ہے۔ کہا کہ مجھے تو کتاب اللہ کی ہربات کا علم نہیں ہے۔ فرمایا کیا تم نے یہ ارشاد خداوندی نہیں سنا؟

ولو شاء اللہ ما اقتتل الذین من بعد ماجائتھم البینات ولکن اختلفوا فمنھم من امن ومنھم من کفر۔

اگر خدا چاہتا تو وہ لوگ آپس میں نہ لڑتے بعد اس کے کہ ان کے پاس روشن معجزے آچکے تھے مگر انہوں نے آپس میں اختلاف کیا ان میں سے بعض ایمان لائے اور بعض کافر ہوئے۔

ابن کواء نے حضرتؑ سے پوچھا کہ کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے بھی اللہ کسی سے ہم کلام ہوا ہے؟ فرمایا کہ ہاں اللہ نے ہر نیک و بد سے کلام کیا ہے اور سب نے جواب بھی دیا ہے۔ کہا کہ وہ کیسے؟ فرمایا کیا تم نے قرآن مجید میں یہ آیت نہیں پڑھی؟

واذ اخذ ربک من بنی آد م من ظھورھم ذریتھم والشھدھم علی انفسھم الست بربکم قالوا بلی شھدنا۔

اے رسول لوگوں کو وہ وقت یاد دلاؤ جب تمہارے پروردگار نے بنی آدم سے یعنی ان کی پشتوں سے پیدا ہونے والی نسلوں سے عہد لیا اور انہیں خود ان کے نفسوں پر گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں سب نے کہا ہاں ہم اس کے گواہ ہیں۔

حضرتؑ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ نماز سے فارغ ہو کر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا مانگو۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ کیا اللہ ہر جگہ موجود نہیں ہے؟ فرمایا ہاں وہ ہر جگہ ہے۔ کہا پھر کیا ضرورت ہے کہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی جائے؟ فرمایا کیا تم نے اس آیت کی تلاوت نہیں کی؟

وفی السماء رزقکم وما توعدون۔

آسمان میں تمہارا رزق ہے اور وہ چیزیں جن کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

جب رزق اوران چیزوں کا جن کا اللہ نے وعدہ کیا ہے محل آسمان ہے تو رزق اور وعدہ کی ہوئی چیزیں بھی وہیں سے طلب کی جائیں گی۔ قیصر روم نے معاویہ سے دریافت کیا کہ لاشئے کیا ہے؟ اسے کوئی جواب نہ سوجھا تو عمرو ابن عاص نے کہا کہ یہ علی علیہ السلام ہی بتا سکیں گے۔ تم کسی شخص کو ایک گھوڑا دے کر ان کے پاس بھیجو اور وہ ان سے یہ کہے کہ یہ گھوڑا فروخت کے لئے ہے اور جب وہ قیمت دریافت کریں تو وہ لاشئے بتائے اور وہ جو جواب دیں گے اس سے مسئلہ حل ہو جائے گا۔ چنانچہ ان کا ایک آدمی گھوڑا لے کر حضرتؑ کے پاس آیا اور بیچنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ آپؑ نے قیمت پوچھی تو اس نے کہا لاشے۔ حضرتؑ نے قنبر سے کہا کہ گھوڑا لے لو اور اسے صحرا میں لے جا کر سراب (وہ چمکتی ہوئی ریت جس پر پانی کا دھوکا ہوتا ہے) دکھاؤ کہ وہ لاشے ہے اور یہ آیت پڑھی۔

يحسبه الظمان ماء حتى اذا جاءه لم يجده شيئا۔ پیاسا اسے پانی خیال کرتا ہے یہاں تک کہ جب اس کے پاس آیا تو اسے کچھ بھی نہ پایا۔

حضرتؑ سے ایک شخص نے درد شکم کی۔ شکایت کی فرمایا کہ تم اپنی بیوی سے کچھ رقم لو اور اس سے شہد خریدو اور اس میں بارش کا پانی ملا کر پیو۔ پھر فرمایا کہ قرآن مجید میں بارش کے پانی کے بارے میں ارشاد ہے۔

وانزلنا من السماء ماء مبارکا۔ ہم نے آسمان سے بابرکت پانی اتارا ہے۔

اور شہد کے بارے میں ارشاد ہے۔

یخرج من بطونها شراب مختلف الوانه فیه شفاء للناس۔ مکھیوں کے پیٹ سے پینے کی چیز نکلتی ہے جو مختلف رنگوں کی ہوتی ہے اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔

اور بیوی کے مہر سے اس کی رضامندی سے لی ہوئی رقم کے بارے میں ارشاد ہے۔

فان طبن لکم عن شئی منه نفسا فکلوا هنیأ مریٔا۔ اگر تمہاری عورتیں دلی رضامندی سے تمہیں اپنے مال میں سے کچھ دیں تو اسے پاکیزہ و گوارا سمجھ کر کھاؤ برتو

لہٰذا جب کسی گوارا چیز کے ساتھ برکت اور شفا شریک ہو گی تو تم انشاء اللہ شفایاب ہو جاؤ گے۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ عذاب خدا سے دو چیزیں باعث امان تھیں! ایک ان میں سے اٹھ گئی مگر دوسری تمہارے پاس موجود ہے لہٰذا اسے مضبوطی سے تھامے رہو۔ وہ امان جو اٹھالی گئی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تھے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

وما کان اللہ لیعذبهم و انت فیهم۔ اللہ ان لوگوں پر عذاب نہیں کرے گا جب تک تم ان میں موجود ہو۔

اور وہ امان جو باقی ہے وہ توبہ و استغفار ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے۔

وما کان اللہ معذبهم وهم یستغفرون۔ اللہ ان لوگوں پر عذاب نہیں کرے گا جبکہ یہ لوگ توبہ و استغفار کر رہے ہوں گے

علامہ سید رضی نے کہا ہے کہ یہ بہترین استخراج ہے۔

راس الجالوت نے حضرتؑ سے دریافت کیا کہ تمام اشیاء کی اصل کیا ہے۔ فرمایا پانی اور اس آیت کی تلاوت

کی۔

وجعلنا من الماء کل شئی حی۔ ہم نے ہر ذی حیات کو پانی سے پیدا کیا ہے۔

خواص سور و آیات

قرآن مجید اپنے اسلوب بیان اور حقائق آفرین مطالب کے اعتبار ہی سے معجزہ نہیں ہے بلکہ اپنے گونا گوں خواص و اثرات کے لحاظ سے بھی اعجازی شان کا حامل ہے اور موثر حقیقی نے جس طرح ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خاصہ قرار دیا ہے اسی طرح قرآن کے الفاظ و حروف میں خواص واثرات ودیعت کئے ہیں۔ چنانچہ اس کے سور و آیات ہر مصیبت کی سپر' ہر دکھ کا مداوا اور ہر درد کی دوا ہیں۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

خیرالداوء القرآن ۔(اتقان ص ۵۱۸) بہترین دوا قرآن ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے جہاں قرآن کے معانی و مطالب اور تفسیری نکات پر روشنی ڈالی ہے وہاں سورو آیات کے خواص و اثرات بھی بیان فرمائے ہیں۔ ان میں سے چند خواص تحریر کئے جاتے ہیں۔

اگر کوئی شخص رات کو سوتے وقت سورہ اخلاص پڑھے تو اللہ اپنے فرشتوں کے ذریعہ اس کی حفاظت و نگہداشت کرے گا۔ اگر کوئی فقیر و نادار ہو تو جب اپنے گھر میں قدم رکھے تو گھر والوں پر سلام کرے اور اگر گھر میں کوئی نہ ہو تو **السلام علینا من ربنا** کہے اور سورہ **قل ھواللہ احد** کی تلاوت کرے انشاء اللہ فقر و تنگدستی سے نجات پائے گا۔

اگر کوئی شخص ہر جمعہ کو سورہ نساء کی تلاوت کرے تو فشار قبر سے محفوظ رہے گا۔
اگر کوئی سفر پر جائے تو سوار ہوتے وقت سورہ زخرف کی یہ آیت پڑھے انشاء اللہ سفر پر امن رہے گا۔

سبحان الذی سخرلنا ھذا وما کنا لہ مقرنین وانا الی ربنا لمنقلبون۔ پاک ہے وہ خدا جس نے اسے ہمارے تابع فرمان کیا حالانکہ ہم ایسے نہ تھے کہ اس پر قابو پاتے اور ہمیں یقیناً اپنے پروردگار کی طرف پلٹنا ہے۔

اگر کسی شخص کو کوئی حاجت درپیش ہو تو وہ پنجشبہ کے دن صبح کے وقت گھر سے نکلے اور سورہ آل عمران کے آخری رکوع کی اس آیت **ان فی خلق السموات والارض واختلاف اللیل والنھار** کی تلاوت **انک لا تخلف المیاد** تک کرے اور اس کے بعد آیتہ الکرسی' سورہ قدر اور سورہ فاتحہ پڑھے انشاء اللہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گا۔
اگر کسی کی آنکھ دکھنے میں آئے تو آیتہ الکرسی کی تلاوت کرے۔

اگر کوئی شخص سورہ اعراف کی آیت **ان ولی اللہ الذی نزل الکتاب وھو یتولی الصالحین** کی تلاوت کرے تو وہ ڈوبنے اور جلنے سے محفوظ رہے گا۔

اگر کوئی شخص سورہ ہود کی یہ آیت پڑھے تو ڈوبنے سے محفوظ رہے گا۔

بسم اللہ مجرھا و مرسھا ان ربی لغفور رحیم

اللہ ہی کے نام سے اس کا بہنا اور ٹھہرنا ہے بیشک میرا پروردگار غفور و رحیم ہے

اگر کوئی شخص سورہ والصفت کی یہ آیت پڑھے تو بچھو وغیرہ کے ڈسنے سے محفوظ رہے گا۔

سلام علی نوح فی العالمین کذلک نجزی المحسنین انہ من عباء نا المومنین۔

تمام جہانوں میں نوح پر سلام ہے ہم نیکی کرنے والوں کو جزائے خیر دیتے ہیں بیشک نوح ایماندار بندوں میں سے تھے۔

اگر کوئی شخص سوتے وقت سورہ بنی اسرائیل کی آیت **قل ادعو اللہ او ادعوا الرحمن ایا ما تدعوا فلہ الاسماء الحسنی** کی تلاوت **کبرہ تکبیرا** تک کرے تو چوری سے محفوظ رہے گا۔

جو شخص طلوع آفتاب سے پہلے گیارہ مرتبہ سورہ اخلاص اور گیارہ مرتبہ سورہ قدر پڑھے وہ اس دن گناہوں سے بچ کر رہے گا۔

اگر کوئی شخص سورہ توبہ کی یہ آیت پڑھے تو درندوں کے حملہ سے محفوظ رہے گا۔

لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیہ ماعنتم حریص علیکم بالمومنین روف رحیم فان تولو افقل حسبی اللہ لاالہ الا ھو علیہ توکلت و ھو رب العرش العظیم۔

تم میں سے ایک رسول تمہارے پاس آیا جسے تمہارا تکلیف اٹھانا شاق گزرتا ہے وہ تمہاری بھلائی کا انتہائی خواہشمند اور ایمانداروں پر بہت شفیق و مہرباں ہے اگر یہ لوگ تم سے منہ پھیرلیں تو ان سے کہہ دو کہ میرے لئے اللہ کافی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں میں نے اسی پر بھروسا کیا ہے اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔

اگر کوئی شخص سورہ یونس کی آیت **ان ربکم اللہ الذی خلق السموات والارض** کی تلاوت **تبارک اللہ رب العالمین** تک کرے تو وہ پرخطر صحراؤں میں آفات سے محفوظ رہے گا۔

اگر کوئی جانور منہ زوری دکھائے تو اس کے دائیں کان میں سورہ آل عمران کی یہ آیت پڑھی جائے۔

وله اسلم من فی السموات والارض طوعا و کرھا والیہ یرجعون۔

جو مخلوق آسمان میں ہے اور جو لوگ زمین میں ہیں خوشی سے ہو یا ناخوشی سے سب اس کے آگے سرنگوں ہیں اور آخر سب اسی کی طرف پلٹیں گے۔

تدوین حدیث

قرآن مجید کی طرح احادیث بھی شرعی اوامر و نواہی کا سرچشمہ اور دینی احکام کا اہم ماخذ ہیں۔ اگر حدیث کو قابل عمل اور درخور اعتناء نہ سمجھا جائے تو قرآن کی افادیت بھی مضمحل ہو جائے گی اس لئے کہ قرآن کے اکثر احکام مجمل اور شرح طلب ہیں جنہیں احادیث ہی کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر احادیث کو نظر انداز کر کے قرآن کے مفہوم کو اپنی رائے سے متعین کرنے کی اجازت ہوتی تو نماز' روزہ' حج وغیرہ احکام کی کوئی واضح صورت ہی باقی نہ رہتی اور نہ اسلامی اصطلاحات کا کوئی خاص مفہوم متعین ہوتا۔ بلکہ ہر شخص ان اصطلاحات کی من مانی تشریح کر کے یہ سمجھ لیتا کہ وہ قرآن کے اوامر پر عمل پیرا ہے اور اس کے احکام سے عہدہ برآ ہو چکا ہے۔ بیشک قرآن ایک جامع دستاویز ہے مگر اس میں اکثر احکام اجمالا" بیان ہوئے ہیں اور ان کی تشریح و تفصیل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس مانزل الیھم۔

ہم نے تم پر قرآن اتارا تاکہ جو احکام لوگوں کے لئے نازل کئے گئے ہیں تم انہیں واضح طور سے بیان کرو۔

قرآن کے اسی اجمال و ابہام کی بنا پر جب امیرالمومنین علیہ السلام نے ابن عباس کو خوارج سے گفتگو کے لئے بھیجا تو ان سے فرمایا۔

لاتخاصمھم بالقرآن فان القرآن حمال ذو وجوہ تقول ویقولون ولکن ماججھم بالسنتہ فانھم لن یجدوا عنھا محیصا۔ (نہج البلاغہ)

تم ان سے قرآن کی رو سے بحث نہ کرنا کیونکہ قرآن بہت سے معانی کا حامل ہوتا ہے اور بہت سی وجہیں رکھتا ہے تم اپنی کہتے رہو گے اور وہ اپنی کہتے رہیں گے بلکہ تم حدیث سے ان کے سامنے استدلال کرنا وہ اس کے بعد گریز کی کوئی راہ نہ پا سکیں گے۔

بہرحال احادیث کی اہمیت وافادیت ناقابل انکار ہے اور اس اہمیت کا تقاضا یہ تھا کہ قرآن کی ترتیب و تدوین کے ساتھ احادیث کی بھی جمع آوری کی جاتی اور یہ دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مسلمانوں ہی کا فریضہ تھا کہ وہ

احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حفظ کا سرو ساماں کرتے اور انہیں ضبط تحریر میں لا کر ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیتے۔ مگر ادھر متوجہ ہونے کے بجائے ان کی توجہ ملکی فتوحات پر مرکوز ہو گئی اور کچھ لوگوں نے انفرادی طور پر احادیث کو قلمبند کیا ہو تو کیا ہو مگر اجتماعی طور پر کوئی کام نہ ہو سکا۔ بلکہ یہ اختلاف اٹھ کھڑا ہوا کہ آیا احادیث کو تحریری شکل میں لانا چاہئے یا نہیں۔ یہ اختلاف صحابہ میں بھی تھا اور تابعین میں بھی۔ آخر تابعین کے آخری دور میں یہ اختلاف برطرف ہوا اور اس پر اتفاق رائے ہوا کہ احادیث کو عوام کے حافظہ پر چھوڑنے کے بجائے تحریر میں لانا مستحسن عمل ہے۔ ان لوگوں میں جو تحریر حدیث کی مخالفت میں پیش پیش تھے ایک حضرت عمرؓ بھی تھے چنانچہ جب صحابہ نے انہیں احکام و سنن نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تدوین کا مشورہ دیا تو انہوں نے کہا۔

انی اردت ان اکتب السنن وانی ذکرت قوما کانوا قبلکم کتبوا کتبا فاکبوا علیها و تر کوا کتاب الله وانی والله لا البس کتاب الله بشئی ابدا۔(تدریب الداوی ج ۲ ص ۶۷)

میرا ارادہ تھا کہ میں سنن نبویہ کو تحریر میں لاؤں مگر مجھے پہلے لوگ یاد آگئے جنہوں نے کتابیں لکھیں اور ہمہ تن انہی کتابوں کے ہو کر رہ گئے اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا خدا کی قسم میں کوئی چیز تحریر میں لا کر کتاب اللہ کو مشتبہ نہیں ہونے دوں گا۔

بلکہ انہوں نے روایت حدیث پر بھی بڑی حد تک پابندی عائد کر دی تھی اور ابن مسعود، ابوالدرداء اور ابو ذر غفاریؓ کو اس جرم میں کہ وہ احادیث پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بیان کرتے ہیں قید کر دیا تھا اور ابو ہریرہ کو روایت حدیث پر شہربدر کر دینے کی دھمکی دی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کچھ حدیثیں جمع کی تھیں مگر انہیں ضائع کر دیا۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میرے والد نے پانچ سو حدیثیں قلمبند کی تھیں۔ ایک رات میں نے دیکھا کہ وہ بڑے بے چین ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو کوئی تکلیف ہے یا کوئی پریشان کن خبر سنی ہے۔ انہوں نے اس وقت تو کچھ نہ کہا جب صبح ہوئی تو مجھے بلا کر کہا۔

ای بنیته هلمی الاحادیث التی عندک فجئته بها وزعا بنار فحر قها فقلت لا احرقتها قال خشمت ان اموت وهی عندی فیکون فیها احادیث من رجل قد استمنته ووثقت ولم یکن کما حدثنی۔ (تذکرہ الحفاظ ذہبی ج ۱ ص ۵)

اے بیٹی وہ حدیثیں لاؤ جو تمہارے پاس ہیں میں وہ حدیثیں لے کر آئی تو انہوں نے آگ منگوائی اور انہیں جلا دیا میں نے کہا کہ آپ نے انہیں کیوں جلایا ہے کہا کہ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ میں مرجاؤں اور یہ حدیثیں میرے پاس رہیں اوران میں ایسی حدیثیں بھی ہوں جو مجھ سے قابل اعتماد لوگوں نے بیان کی ہوں مگر وہ ویسی نہ ہوں جیسے انہوں نے روایت کی ہوں۔

حضرت ابو بکرؓ نے اس مجموعہ میں وہی احادیث درج کی ہوں گی جنہیں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے

بالمشافہ سنا ہو گا یا ان لوگوں سے سماعت کی ہو گی جنہوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سنا ہو گا اور وہ سب صحابہ ہی تھے جن کی عدالت و راستگوئی پر حرف رکھنا مسلک جمہور کے خلاف ہے پھر خدا جانے انہوں نے کیوں ان کی روایت کردہ احادیث کو قابل وثوق و اعتماد نہ سمجھا اور انہیں جلا کر ناپید کر دینا ضروری خیال کیا۔

حضرت ابوبکرؓ کے نواسے عروہ ابن زبیر نے بھی حدیثوں کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا مگر اسے بے ضرورت سمجھ کر جلا دیا۔ چنانچہ ابن حجر عسقلانی تحریر کرتے ہیں۔

قال معمر عن هشام ان اباه حرق كتبا فيها فقه۔
(تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۱۸۳)

معمر کہتے ہیں کہ مجھ سے ہشام نے بیان کیا کہ ان کے باپ عروہ نے دینی علوم کی تمام کتابیں جلا دیں۔

عروہ خود کہتے ہیں۔

كنا نقول لانتخذ كتابا مع كتاب الله فمحوت كتبي
(تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۱۸۳)

ہم یہ کہا کرتے تھے کہ ہمیں کتاب اللہ کے ساتھ کوئی اور کتاب نہ رکھنا چاہئے چنانچہ میں نے تمام نوشتوں کو مٹا دیا۔

جب روایت حدیث کی اجازت ہی نہ تھی اور جو چند ایک مجموعے تھے وہ بھی ضائع کئے جا رہے تھے تو پھر تدوین حدیث کی مزید گنجائش کیسے نکل سکتی تھی۔

امیرالمومنین علیہ السلام جہاں تنزیل و تاویل قرآن پر عبور تام رکھتے تھے وہاں احادیث سے بھی پوری طرح باخبر تھے کیونکہ اقوال و ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے براہ راست سننے اور ان سے مستفید ہونے کے جتنے مواقع انہیں ملے وہ کسی اور کو میسر نہیں ہوئے۔ چنانچہ آپ سے پوچھا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ سب سے زیادہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بیان کرتے ہیں فرمایا۔

انی كنت اذا سئلته انبانی و اذا سكت ابتداء نی۔
(طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۳۳۸)

میں آنحضرت سے کوئی چیز دریافت کرتا تو وہ مجھے بتاتے اور خاموش رہتا تو وہ خود مجھ سے بیان کرتے۔

حضرتؑ اس خیال سے کہ احادیث و آثار نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مٹنے نہ پائیں اور یہ علم و ہدایت کا سرمایہ زندہ و پائندہ رہے لوگوں کو یہ تاکید کرتے تھے کہ۔

تذاكروالحديث فانكم الاتفعلوا (مستدرک حاکم ج ۱ ص ۹۵)

ایک دوسرے سے احادیث بیان کرتے رہو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو حدیث کے آثار مٹ جائیں گے۔

اس کے علاوہ انہیں ضبط تحریر میں لانا بھی ضروری سمجھتے تھے تاکہ ان کے حفظ وبقا کا ساماں ہو سکے۔ چنانچہ

قرآن مجید کی جمع آوری کے ساتھ حدیث کی ترتیب و تدوین کا بھی اہتمام کیا اگرچہ ابورافع' ابوذرغفاری' سلمان فارسی رضی اللہ عنھم اور چند دوسرے افراد نے کچھ حدیثیں قلمبند کیں مگر اس میں سبقت و تقدم کا شرف آپؑ ہی کو حاصل ہے۔ آپؑ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ہی میں حدیث کی تدوین شروع کر دی تھی اور احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مشتمل ایک صحیفہ قلمبند کیا تھا۔ اس صحیفہ کا تذکرہ صحیح بخاری و مسلم میں بھی ہے۔ چنانچہ محمد ابن اسمٰعیل بخاری نے تحریر کیا ہے۔

عن ابی جحیفتہ قال قلت لعلی هل عند کم کتاب قال لاالاکتاب الله اوفهم اعطیہ رجل مسلم او مافی هذہ الصحیفتہ۔ (صحیح بخاری ا ص ٦٩)

ابو جحیفہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی علیہ السلام سے کہا کہ کیا آپ لوگوں کے پاس کوئی کتاب ہے فرمایا اللہ کی کتاب ہے یا وہ قوت فہم ہے جو ایک مرد مسلمان کو عطا کی گئی ہے یا وہ جو اس صحیفہ میں تحریر ہے۔

یہ حدیثیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لکھواتے تھے اور آپؑ قلمبند کرتے تھے۔ چنانچہ شیخ صدوق نے تحریر کیا ہے کہ محمد ابن ذکریا غلابی نے ایک طویل حدیث کے بارے میں شعیب ابن واقد مزنی سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد فرمایا تھا کہ۔

انہ جمع هذا الحدیث من الکتاب الذی هو املاء رسول الله وخط علی ابن ابی طالب۔ (امالی صدوق ص ٢٦)

انہوں نے یہ حدیث اس کتاب سے لی ہے جو رسول اللہ نے لکھوائی اور علی ابن ابی طالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

حضرتؑ کا یہ تحریر کردہ صحیفہ دنیائے اسلام کا پہلا مجموعہ حدیث ہے۔ چنانچہ آقائے بزرگ محسن طہرانی رحمتہ اللہ نے تحریر کیا ہے۔

هذا اول کتاب کتب فی الاسلام من کلام البشر واملاء النبی و خط الوصی۔ (الذریعہ ج ٢ ص ٣٠٩)

یہ دنیائے اسلام میں کلام بشر کی پہلی کتاب ہے جسے نبی اکرم نے لکھوایا اور آپ کے وصی علی ابن ابی طالب نے قلمبند کیا۔

امیرالمومنین علیہ السلام کی یہ کتاب آئمہ اہلبیت کے پاس موجود رہی ہے اور امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادق علیہما السلام نے مختلف مواقع پر مسائل شرعیہ کے سلسلہ میں اس کا حوالہ دیا ہے اور اسے کتاب علی صحیفہ الفرائض اور جامعہ کے نام سے یاد کیا ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

ان عندنا لصحيفة يقال لها الجامعة ما من حلال او حرام الا وهو فيها۔(فصول ص ۶۳)

ہمارے پاس ایک صحیفہ ہے جسے جامعہ کہا جاتا ہے اور اس میں ہر حلال اور ہر حرام کا ذکر ہے۔

تنویع حدیث

حدیث کا نشر و شیوع رواہ حدیث کے واسطہ سے ہوا۔ اس طرح کہ فلاں نے فلاں سے سنا اور فلاں نے فلاں سے بیان کیا۔ اس نام بنام سلسلہ رواہ کو سند کہا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ سند ہی وہ معیار ہے جس پر حدیث کو پرکھا اور صحیح و سقیم کو جانچا جا سکتا ہے۔ اگر حدیث کے رواہ ثقہ و راستگو ہوں گے تو حدیث بھی قابل وثوق و اعتماد قرار پائے گی اور اگر ان کی عدالت مشتبہ اور صدق بیانی مشکوک ہو گی تو حدیث بھی اعتماد و وثوق کے پایہ سے گر جائے گی۔ اس لئے ہر حدیث کو ایک سطح پر سمجھا نہیں جا سکتا بلکہ کچھ قابل اعتماد و وثوق ہوں گی اور کچھ متروک و ساقط الاعتبار۔ اس کی صحت یا عدم صحت پر اس وقت تک حکم نہیں لگایا جا سکتا جب تک سلسلہ سند کے رواہ کو پرکھ نہ لیا جائے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام لوگوں کو یہ ہدایت کرتے تھے کہ وہ متن حدیث کے ساتھ راوی یا رواہ کا بھی ذکر کریں تاکہ حدیث کی صحت کو پرکھا جا سکے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اذا حد ثتم بحديث فاسند وه الى الذى حد ثكم فان كان حقا فلكم وان كان كذبا فعليه۔ (وسائل الشيعہ ج ۳ ص ۳۷۷)

جب حدیث بیان کرو تو جس نے تم سے وہ حدیث بیان کی ہے اس کی سند کا بھی ذکر کرو اگر وہ صحیح ہو گی تو تمہیں فائدہ پہنچے گا اور جھوٹ ہو گی تو اس کا مظلمہ بیان کرنے والے پر ہو گا۔

حدیث کو بیان کرتے وقت یہ اطمینان ہونا چاہئے کہ راوی دروغ گو اور غلط کار تو نہیں ہے تاکہ صحیح و غلط میں تفریق اور موضوع احادیث کے نشر کا سدباب ہو سکے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کسی حدیث کو اس کے راوی کی صدق بیانی پر اطمینان کئے بغیر قبول نہ کرتے تھے۔ امام ذہبی تحریر کرتے ہیں۔

كان على كرم الله وجهه اماما متحريا فى الاخذ بحيث انه يستحلف من يحدثه الحديث۔ (تذکرہ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۰)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ پورا اطمینان کرنے کے بعد حدیث کو قبول کرتے تھے اس طرح کہ وہ حدیث بیان کرنے والے سے قسم لے لیتے تھے۔

علماء متقدمین کے نزدیک صحت و سقم کے لحاظ سے حدیث کے مراتب میں تفریق مسلم تھی مگر انہوں نے اقسام حدیث کے لئے کوئی خاص اصطلاحی نام وضع نہیں کئے۔ علماء متاخرین میں سب سے پہلے السید جمال الدین الحسنی

متوفی ۶۷۳ھ نے احادیث کو راوی کے ایمان عدالت اور قوت حفظ و ضبط کے اعتبار سے چار بنیادی قسموں پر تقسیم کیا اور انہیں صحیح، حسن، موثق اور ضعیف کے نام سے موسوم کیا۔

صحیح وہ ہے جس کے سلسلہ سند میں تمام رواہ ثقہ و معتمد امامی المذہب ہوں۔

حسن وہ ہے جس کے سلسلہ سند میں تمام رواہ امامی المسلک اور ممدوح ہوں مگر ان کی عدالت حد وثوق تک نہ پہنچی ہو۔

موثق وہ ہے جس کے سلسلہ سند میں تمام یا بعض عقیدۃ" امامی نہ ہوں مگر ان کی صدق بیانی پر اعتماد ہو۔

ضعیف وہ ہی جس کے رواہ میں مذکور بالا تینوں قسموں کے شرائط نہ پائے جاتے ہوں۔

اس تنویع حدیث کی بنیاد بھی امیرالمومنین علیہ السلام کے ہاتھوں قائم ہوئی اور آپ نے رواہ حدیث کے حالات و اوصاف پر ایک جامع تبصرہ فرماتے ہوئے انہیں چار قسموں پر تقسیم کیا ہے۔ یہ تبصرہ سلیم ابن قیس ہلالی کی روایت سے نہج البلاغہ اور کافی باب اختلاف الحدیث میں درج ہے۔ اس تبصرہ کے چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔

رجل منافق مظهر للايمان متصنع بالاسلام لايتاثم ولا يتحرج يكذب على رسول الله صلى عليه وله متعمدا۔

ایک تو وہ جس کا ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ وہ ایمان کی نمائش کرتا ہے اور مسلمانوں کی سی وضع قطع بنا لیتا ہے نہ گناہ کرنے سے گھبراتا ہے اور نہ کسی افتاد میں پڑنے سے جھجکتا ہے وہ جان بوجھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ پر جھوٹ باندھتا ہے۔

ورجل سمع من رسول الله شيئالم يحفظه على وجهه فوهم فيه ولم يتعمد كذبا فهو فى يديه ويرويه ويعمل به ويقول انا سمعته من رسول الله عليه وآله

دوسرا شخص وہ ہے جس نے تھوڑا بہت رسول اللہ سے سنا لیکن جوں کا توں اسے یاد نہ رکھ سکا اور اس میں اسے سہو ہو گیا یہ جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولتا یہی کچھ اس کے دسترس میں ہے اسے ہی دوسروں سے بیان کرتا ہے اور اسی پر خود بھی عمل پیرا ہے اور کہتا بھی یہی ہے کہ میں نے رسول اللہ سے سنا ہے

ورجل ثالث سمع من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ شیئا یا مربہ ثم نہی عنہ وھو لایعلم اوسمعہ ینہی عن شئی ثم امر بہ و ھولا یعلم۔

تیسرا شخص وہ ہے کہ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کی زبان سے سنا کہ آپ نے ایک چیز کے بجا لانے کا حکم دیا ہے پھر پیغمبر نے تو اس سے روک دیا لیکن یہ اسے معلوم نہ ہو سکا یا یوں کہ اس نے پیغمبر کو ایک چیز سے منع کرتے ہوئے سنا پھر آپ نے تو اس کی اجازت دے دی لیکن اس کے علم میں یہ چیز نہ آسکی۔

واخر رابع لم یکذب علی اللہ ولا علی رسولہ مبغض للکذب خوفا من اللہ و تعظیما لرسول اللہ صلی اللہ علیہ و الہ ولم یھم بل حفظ ما سمع علی وجھہ فجاء بہ علی ما سمعہ لم یزد فیہ ولم ینقص منہ۔

چوتھا شخص وہ ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول پر جھوٹ نہیں باندھتا وہ خوف خدا اور عظمت رسول کے پیش نظر کذب سے نفرت کرتا ہے اس کی یادداشت میں غلطی واقع نہیں ہوئی بلکہ جس طرح سنا اسی طرح اسے یاد رکھا اور اسی طرح اسے بیان کیا نہ اس میں کچھ بڑھایا اور نہ اس میں سے کچھ گھٹایا۔

حدیث کے سلسلہ سند کو دیکھنے کے ساتھ یہ بھی دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ حدیث قرآن کے کسی حکم کے منافی تو نہیں ہے یا کسی مشہور و معتبر حدیث سے متعارض تو نہیں ہے یا شریعت کے کسی مسلمہ اصول کے خلاف تو نہیں ہے یا عقل کے قطعی فیصلہ کی مخالف تو نہیں ہے یا اس سے انبیاء و آئمہ کی عظمت و تقدیس پر حرف تو نہیں آتا۔ یہ وجوہ بھی صحیح و سقیم میں امتیاز کا ایک ذریعہ ہیں لہذا حدیث کو روایتہ" پرکھنے کے ساتھ درایتہ" بھی اس پر نظر کرنے کی ضرورت ہے تاکہ صحیح و غلط میں تفریق کی جا سکے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

اعقلو الخبر اذا سمعتوہ عقل رعایتہ لا عقل روایتہ فان رواہ العلم کثیر و رعاتہ قلیل۔(نہج البلاغہ)

جب کوئی حدیث سنو تو اسے عقل کے معیار پر پرکھ لو صرف نقل الفاظ پر بس نہ کرو کیونکہ علم کے نقل کرنے والے تو بہت ہیں اور اس میں غور و فکر کرنے والے کم ہیں۔

کلیات فقہیہ

اسلام ایک مکمل اور دائمی شریعت ہے جس کے احکام و قوانین ہر دور کے عصری تقاضوں پر پورے اترنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور جس طرح آج سے چودہ سو برس پہلے قابل عمل و نفاذ تھے اسی طرح آج بھی ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے کیونکہ یہ آخری شریعت ہے جس کی تکمیل آخری نبی کے ذریعہ ہوئی اب نہ کوئی نئی شریعت آئے گی اور نہ کوئی نبی اور رسول مبعوث ہو گا جو شریعت کو تبدیل کر کے نئے احکام کا اجراء کرے۔ اگرچہ زمانہ تشریع کے بعد کثرت سے جدید مسائل پیدا ہوئے اور امتداد زمانہ کے ساتھ پیدا ہوتے رہیں گے۔ یہ تو ممکن نہ تھا کہ ہر جزئی مسئلہ کا تفصیلی حکم بیان کیا جاتا مگر شریعت اسلام نے ایسے قواعد و کلیات بیان کر دیئے ہیں جن سے ان جزئیات اور پیش آمدہ مسائل میں عملی رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے اور موقع و محل کے اعتبار سے احکام اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ اس اخذ و استنباط کا تعلق علم فقہ سے ہے۔ فقہ کے لغوی معنی فہم و دانش کے ہیں اور قرآن مجید میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے چنانچہ ارشاد باری ہے۔

فما لھو لاء القوم لا یفقھون حدیثا۔

ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ کوئی بات سمجھتے ہی نہیں ہیں۔

اور اصطلاح شرع میں شرعی مدارک و ماخذ سے فروعی احکام کے استخراج کا نام ہے۔ یہ اخذ و استنباط کی قوت چند افراد تک محدود اور اس کی ضرورت کسی خاص دور سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر زمانہ میں اس کی احتیاج رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی تاکہ زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات اور روز افزوں ضروریات کا حل اسلام کی روشنی میں تلاش کیا جا سکے اور فکری تعطل اور فقہی جمود پیدا نہ ہونے پائے۔ ان فقہی احکام کے مآخذ چار ہیں۔ قرآن، حدیث، عقل اور اجماع

قرآن مجید ان فقہی و اسلامی احکام کا سب سے اہم مآخذ ہے۔ اس میں عبادات و معاملات، حدود و تعزیرات، حقوق اللہ و حقوق العباد، اوامر و نواہی اور انسانی زندگی کی رہنمائی کے تمام اصول و ضوابط درج ہیں جو ناقابل ترمیم ہر مسلمان کے لئے واجب العمل ہیں۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں

علیک بقرائہ القرآن والعمل بما فیہ ولزوم فرائضہ و شرائعہ و حلالہ و حرامہ وامرہ ونہیہ۔ (الفقیہ)

تمہارے لئے ضروری ہے کہ قرآن پڑھو اس کے تعلیمات پر عمل کرو اور اس کے فرائض و احکام حلال و حرام اور امر و نہی کے پابند رہو۔

قرآن مجید کی کچھ آیتیں مجمل و مبہم ہیں اور کچھ آیتوں کے معنی واضح اور متعین ہیں وہ آیتیں جن کے معنی

مجمل اور محتاج تشریح ہیں ان کی تفسیر و تاویل احادیث و اقوال معصومین علیہ السلام کی روشنی میں کی جائے گی۔ اپنی رائے سے معنی کا تعین کرنا درست نہیں ہے اور وہ آیتیں جن کے معنی متعین ہیں ان کے ظاہر مفہوم پر عمل کیا جائے گا۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

کل ایتہ محکمتہ نزلت فی تحریم شئی من الامور المتعارفتہ التی کانت فی ایام العرب تاویلھا فی تنزیلھا فلیس یحتاج فیھا الی تفسیر اکثر من تاویلھا۔ (فصول حر عاملی ص ۸۴)

ہر وہ محکم آیت جو عرب میں متعارف اور جانی پہچانی ہوئی چیزوں میں سے کسی چیز کو حرام قرار دینے کے لئے نازل ہوئی ہو اس کا مفہوم قرآنی الفاظ میں موجود ہے لہٰذا اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے اس کے معنی کا جاننا کافی ہے کسی تفسیر کی احتیاج نہیں ہے۔

حدیث اس قول یا فعل یا کسی فعل پر رضا مندانہ سکوت کا نام ہے جو رسول خدایا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم آئمہ اہل بیت علیہ السلام میں سے کسی امام سے منقول ہو۔ ہر وہ حدیث جو باعتبار سند متواتر ہو یا اس کے رواہ ثقہ و راسخو ہوں یا اس کی صحت کے قرائن موجود ہوں وہ حجت و سند ہے۔ لیکن وہ حدیث جو قول مشہور کے خلاف یا علماء نے اس سے اعراض کیا ہو یا اس کے رواہ پایہ اعتبار سے ساقط ہوں اسے دلیل کا درجہ نہیں دیا جائے گا۔

امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول فالرد الی اللہ الاخذ بمحکمہ کتابہ والرد الی الرسول الاخذ بسنتہ الجامعہ غیر المتفرقہ۔ (وافی)

اگر تم کسی بات میں جھگڑا کرو تو اس میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو اللہ کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی محکم آیتوں پر عمل کیا جائے اور رسول کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے ان متفق علیہ ارشادات پر عمل کیا جائے جن میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

عقل اس قوت کا نام ہے جو دیکھی بھالی چیزوں سے ان دیکھی چیزوں پر حکم لگاتی اوراچھی اور بری باتوں میں امتیاز کرتی ہے۔ اگرچہ شرع کا کوئی حکم خلاف عقل نہیں ہوتا مگر یہ ضروری نہیں کہ عقل ہر حکم شرعی کی حکمت و مصلحت کا احاطہ کر سکے بلکہ اکثر احکام، عقل کی دسترس سے باہر ہیں اور عقل ان پر حکم لگانے سے قاصر ہے۔ اس طرح کے احکام، احکام تعبدی کہلاتے ہیں جو شارع کے ذریعہ معلوم کئے جاتے ہیں جیسے نماز کی مخصوص ہیئت، رکعتوں کی تعداد اور قیام و قعود اور رکوع و سجود کی کیفیت۔ البتہ جن چیزوں کی اچھائی یا برائی پر عقل حکم لگاتی ہے ان کے بارے میں عقل کا فیصلہ قطعی سمجھا جائے گا جیسے صدق بیانی، ایفائے عہد اور امانت داری کا اچھا اور قابل

تعریف ہونا اور خیانت، غصب اور دروغ گوئی کا برا اور لائق نفرین ہونا۔

اجماع یہ ہے کہ کسی حکم شرعی پر فقہاء امت کا اتفاق رائے ہو اگر کسی مسئلہ پر ان کا اتفاق ہو گا تو اس اتفاق کو سند سمجھا جائے گا اگرچہ کتاب و سنت سے اس کا مآخذ معلوم نہ ہو سکے کیونکہ یہ اتفاق فقہاء اس امر سے کاشف ہے کہ امام بھی اس رائے سے متفق ہیں۔ چنانچہ اگر ایک ہی استاد کے شاگرد کسی امر پر متفق ہوں اور یہ بھی علم ہو کہ وہ استاد کی رائے کے خلاف نہیں جاتے تو ان سب کا یک رائے ہونا اس امر کا ثبوت ہو گا کہ ان کے استاد کا مسلک بھی یہی رہا ہو گا اور اجماع کے استناد کا اصل محور یہی کشف و یقین ہے۔ گویا اجماع خود دلیل نہیں ہے بلکہ کشف رائے معصوم علیہ السلام کا ایک ذریعہ اور دلیل کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے۔

اگر ان مآخذ میں سے کسی شے کا حکم معلوم نہ ہو سکے اور ترک و عمل میں تردد ہو تو اس صورت میں اصول علمیہ و استصحاب، احتیاط براءت اور تخییر میں سے کسی ایک ضابطہ سے رہنمائی حاصل کی جائے گی یہ قواعد و ضوابط اگرچہ قطعی و یقینی نہیں ہیں مگر ان کے اعتبار و استناد پر ادلہ قطعیہ قائم ہیں۔

استصحاب یہ ہے کہ کسی شے کو اس کے سابقہ حکم پر جبکہ اس کے خلاف کا علم نہ ہو باقی و برقرار رکھا جائے مثلاً" کسی شے کی طہارت کا یقین ہو اور پھر طہارت میں شک پیدا ہو تو اس شک کی طرف التفات نہ کیا جائے اور اسے سابقہ حکم طہارت پر علی حالہ باقی سمجھا جائے۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے اس اصل و ضابطہ کے بارے میں فرمایا ہے۔

من کان علی یقین فشک فلیمض علی یقینہ فان الشک لاینقض الیقین۔ (فصول حر عاملی)

جس شخص کو کسی بات کا یقین ہو اور پھر شک سے دو چار ہو تو اسے اپنے علم و یقین پر باقی رہنا چاہئے اس لئے کہ شک یقین کو زائل نہیں کر سکتا۔

احتیاط یہ ہے کہ ایسا طرز عمل اختیار کیا جائے جس سے تکلیف شرعی سے عہدہ برآ ہونے کا یقین ہو جائے مثلاً" کسی امر میں شک ہو کہ وہ واجب ہے یا مستحب تو اسے بجا لایا جائے یا کسی امر میں شک ہو کہ وہ حرام ہے یا مباح تو اسے ترک کیا جائے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

اخوک دینک فاحتط لدینک بما شئت۔ (امالی مفید)

تمہارا دین تمہارے لئے بمنزلہ بھائی کے ہے لہٰذا جس طرح ہو دین میں احتیاط سے کام لو۔

برأت یہ ہے کہ کسی شے کے بارے میں یہ علم نہ ہو کہ اس پر عمل کرنا چاہئے یا اسے ترک کرنا چاہئے تو اس صورت میں عدم دلیل کو دلیل نفی قرار دے کر اسے مورد تکلیف نہ قرار دیا جائے اور اسے جائز و مباح سمجھا جائے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

سکت لجم عن اشیاء ولم یدعھا نسیانا فلاتتکلفو ھا۔(نہج البلاغہ) اللہ نے جن چند چیزوں کا حکم بیان نہیں کیا انہیں بھولے سے نہیں چھوڑا لہٰذا ان کا بار اٹھانے کی کوشش نہ کرو۔

تخییر یہ ہے کہ شارع کی طرف سے فعل یا ترک کی پابندی کا یقین ہو مگر یہ علم نہ ہو کہ یہ پابندی فعل کی صورت میں ہے یا ترک کی صورت میں اور احتیاط کی بھی کوئی صورت نہ ہو تو پھر اختیار ہے کہ ان دونوں صورتوں میں سے جس صورت پر چاہے عمل کرے۔

ایک گروہ نے قیاس و رائے اور استحسان و استصلاح ایسے خود ساختہ اصول کو بھی ماخذ کا درجہ دے دیا ہے ان میں قیاس سر فہرست ہے اور اکثر پیش آئندہ مسائل کا مآخذ اسے قرار دے لیا گیا ہے۔ قیاس کو منطقی اصطلاح میں تمثیل کہا جاتا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک شے کا حکم دوسری شے پر جاری کر دیا جائے اس بنا پر کہ ان دونوں میں ایک مشترک وصف پایا جاتا ہے جو بظاہر علت حکم ہے۔

اس قیاس کے اعتبار و استناد پر کوئی دلیل شرعی نہیں ہے اور نہ امر مشترک کو علت حکم قرار دینے کا کوئی جواز ہے کیونکہ شرع اسلام میں دو متماثل چیزوں کے احکام جدا جدا بھی ہوتے ہیں جیسے چوری اور غصب دونوں غیر کا مال ہتھیا لینے میں متماثل ہیں مگر چوری میں ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے اور غصب میں یہ حکم نہیں ہے اور دو مختلف چیزوں کا حکم ایک بھی ہوتا ہے جیسے زناء محصنہ اور ارتداد دو الگ چیزیں ہیں مگر ان دونوں کا حکم ایک ہے اور وہ سزائے موت ہے لہٰذا وصف میں اشتراک، حکم میں اشتراک کو اور حکم میں اشتراک، وصف میں اشتراک کو مستلزم نہ ہو گا لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ امر مشترک کو علت حکم ٹھہرا کر قیاس ایسی غیر یقینی چیز کو شرعی حکم کا مدرک قرار دے لیا جائے جب کہ کسی حکم کو اس وقت تک حکم شرعی تسلیم نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ خود قطعی نہ ہو یا اس کے اعتبار و اسناد پر دلیل قطعی قائم نہ ہو۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

لاتقف مالیس لک بہ علم۔ جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو اس پر عمل کی بنیاد نہ رکھو۔

آئمہ اہل بیت علیہ السلام نے دین میں قیاس آرائی و رائے زنی سے بشدت منع کیا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لا تقيسوا الدين فان من الدين مالا يقاس و سياتی اقوام يقيسون فهم اعداء الدين واول من قايس ابليس۔(وسائل الشیعہ)

دین میں قیاس نہ کرو اس لئے کہ دین میں قیاس کا دخل نہیں ہے البتہ ایک گروہ ایسا آئے گا جو قیاس سے کام لے گا وہ دین کا دشمن ہے جس نے سب سے پہلے قیاس کیا وہ ابلیس تھا۔

فقہ اسلامی میں عبادات، عقود، ایقاعات اور احکام سے بحث کی جاتی ہے۔ عبادت کے معنی بندگی و پرستش کے ہیں جیسے نماز روزہ وغیرہ عقود وہ ہیں جن میں دو طرف سے مخصوص الفاظ کی ضرورت پیش آتی ہے جیسے نکاح اور بیع و شراء وغیرہ۔ ایقاعات وہ ہیں جن میں ایک ہی طرف سے مخصوص الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے جیسے طلاق اور احکام وہ ہیں جن میں الفاظ کی احتیاج نہیں ہوتی جیسے میراث، دیت وغیرہ۔

ذیل میں فقہی عناوین کے تحت امیرالمومنین علیہ السلام کے جستہ جستہ اقوال اور مختلف قضایا درج کئے جاتے ہیں یہ اقوال ماخذ کا اور قضایا نظائر اور رہنما اصول کا درجہ رکھتے ہیں۔

باب الطہارت

یوں تو ہر مذہب اور ہر معاشرہ میں صفائی و پاکیزگی کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر اسلام نے طہارت و پاکیزگی کو نہ صرف معاشرتی اعتبار سے اہمیت دی ہے بلکہ اسے عبادات کا جزو قرار دیا ہے۔ چنانچہ اکثر عبادات و اعمال کی صحت کے لئے طہارت شرط اور ان کی بجا آوری کے لئے لباس، جسم اور جگہ کی پاکیزگی لازمی ہے۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے۔

ان اللہ یحب التوابین و یحب متطھرین۔ خدا توبہ کرنے والوں اور پاک و پاکیزہ رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام طہارت کو اسلام کا شعار اور ایمان کا جزو سمجھتے تھے۔ چنانچہ حجر[1] ابن عدی کا ایک غلام بیان کرتا ہے کہ میں نے حجر سے کہا کہ میں نے آپ کے بیٹے کو دیکھا کہ وہ بیت الخلاء میں داخل ہوا اور طہارت کے بغیر باہر نکل آیا۔ حجر نے کہا کہ تم طاقچہ پر سے فلاں صحیفہ اٹھا لاؤ میں نے وہ صحیفہ پیش کیا تو انہوں نے اس صحیفہ میں سے پڑھا۔

ھذا ما سمعت علی ابن ابی طالب یذکر الطھور نصف الایمان۔ (طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۲۲۰) میں نے علی ابن ابی طالب کو فرماتے سنا کہ طہارت نصف ایمان ہے۔

پانی نجاست کو دور کرنے کا ذریعہ ہے اور قابل تطہیر اشیاء کو پاک کرتا ہے۔ اگر وہ کم از کم اتنی جگہ گھیرے جس کا طول، عرض اور گہراؤ ہر ایک ساڑھے تین بالشت ہو تو وہ نجس شے کے ملنے سے نجس نہیں ہو گا اور اگر اس کا

---

[1] حجر نام اور ابو عبدالرحمن کنیت تھی۔ پیغمبر اکرم کے صحابی اور ان کے تربیت یافتہ تھے۔ ابن عبدالبر نے تحریر کیا ہے

کان حجر من فضلاء الصحابہ (استیعاب) جو پیغمبر کے فاضل صحابہ میں سے تھے۔

کوفہ کے رہنے والے اور امیرالمومنین کے ثقہ اصحاب اور رواۃ حدیث میں سے تھے۔ ابن سعد نے تحریر کیا ہے۔

وکان ثقتہ معروفا لم یرو عن غیر علی شیا (طبقات ج ۶ ص ۲۲) حجر معتمد علیہ اور جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ انہوں نے حضرت علی کے علاوہ کسی اور سے نقل روایت نہیں کی۔

۵۱ھ میں معاویہ نے حضرت علیؑ سے وابستگی کے جرم میں انہیں قتل کروا دیا اور دمشق سے چھ میل کے فاصلہ پر مقام مرج عذراء میں دفن ہوئے۔

رنگ یا بو یا ذائقہ متاثر ہو جائے تو وہ نجس قرار پائے گا۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام نے ایسے پانی کے بارے میں فرمایا۔

یتوضاء منہ ویشرب منہ مالم یتغیر اوصافہ طعمہ ولونہ وریحہ۔ (مستدرک الوسائل)

جب تک اس کا ذائقہ رنگ اور بو متغیر نہ ہو اس سے وضو بھی کیا جا سکتا ہے اور پیا بھی جاسکتا ہے۔

وہ پانی جو زمین سے ابلتا رہتا ہے جیسے کنواں، چشمہ، دریا وغیرہ اگر نجس شے کے ملنے سے اس میں تغیر پیدا نہ ہو تو وہ نجس، نجس ہو گا خواہ مذکورہ بالا مقدار سے کم ہو۔ حضرتؑ کا قول ہے۔

الماء الجاری لا ینجسہ شئی۔ (مستدرک الوسائل)

آب جاری کو کوئی چیز نجس نہیں کرتی

کسی چیز کو اس وقت تک نجس نہیں قرار دیا جائے گا جب تک اس کے نجس ہونے کا علم نہ ہو جائے۔ اگر طہارت کا ادنی احتمال بھی ہو تو اس کی سابقہ حالت پر نظر کرتے ہوئے اسے پاک سمجھا جائے۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ماابالی اصابنی بول ام ماء اذا لم اعلم ۔(فصول حرعاملی)

میں اس کی پروا نہیں کرتا کہ مجھ پر پانی کے چھینٹے پڑے ہیں یا پیشاب کے جب تک مجھے اس کا علم نہ ہو جائے۔

اس ظاہری نجاست کے علاوہ جس کا ازالہ پانی اور دوسرے مطہرات سے ہو سکتا ہے ایک باطنی نجاست بھی ہے جسے حدث سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے ازالہ کے لئے وضو یا غسل کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے لئے وضو کی ضرورت ہو اسے حدث اصغر کہا جاتا ہے اور جس کے لئے غسل کی احتیاج ہو اسے حدث اکبر کہتے ہیں اور در صورتیکہ وضو یا غسل ممکن نہ ہو تو پھر وضو یا غسل کے عوض تیمم کیا جائے گا۔

وضو چہرے اور ہاتھوں کو کہنیوں سے لے کر انگلیوں کے کناروں تک دھونے اور سر کے اگلے حصہ اور دونوں پیروں پر مسح کرنے کا نام ہے۔ وافی و وسائل میں ہے کہ امیرالمومنین علیہ السلام نے محمد ابن حنیفہ سے وضو کے لئے پانی طلب کیا جب وہ پانی لائے تو آپ نے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالا اور دونوں ہاتھوں کو دھویا اور دھوتے وقت یہ دعا پڑھی۔

بسم اللہ والحمد للہ الذی جعل الماء طھورا ولم یجعلہ نجسا۔

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں اور تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جس نے پانی کو نہایت پاک بنایا اور نجس نہیں قرار دیا۔

پھر کلی کی اور کلی کرتے وقت یہ دعا پڑھی۔

اللھم انطق لسانی بذکرک واجعلنی ممن ترضی عنہ۔

بارالہا میری زبان کو اپنے ذکر کے ساتھ گویا رکھ اور مجھے ان لوگوں میں سے قرار دے جن سے تو راضی و خوشنود ہے۔

پھر ناک میں پانی ڈالا اور یہ دعا پڑھی۔

اللھم لاتحرم علی ریح الجنت واجعلنی ممن یشم ریحھا وطیبھا وریحانھا۔

خدایا مجھے جنت کی خوشبو سے محروم نہ کرنا اور ان لوگوں میں سے قرار دینا جن کے مشام میں جنت کے پھولوں کی خوشبو اور مہک پہنچے گی۔

پھر چہرے کو دھویا اور یہ دعا پڑھی۔

اللھم بیض وجھی یوم تسو دفیہ الوجوہ ولا تسود وجھی یوم تبیض فیہ الوجوہ۔

اے خدا میرے چہرے کو روشن کرنا اس دن جب چہرے سیاہ فام ہوں گے اور میرے چہرے کو سیاہ فام نہ کرنا اس دن جب چہرے روشن ہوں گے۔

پھر دائیں ہاتھ کو کہنیوں سمیت دھویا اور یہ دعا پڑھی۔

اللھم اعطنی کتابی بیمینی والخلد بیساری۔

اے خدا میرا نامہ اعمال میرے دائیں ہاتھ میں دینا اور جنت بائیں ہاتھ میں۔

پھر بائیں ہاتھ کو اسی طرح دھویا اور یہ دعا پڑھی۔

اللھم لا تعطنی کتابی بشمالی ولا تجعلھا مغلولہ الی عنقی و اعوذبک من مقطعات النیزان۔

اے خدا میرا نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں نہ دینا اور میرے ہاتھوں کو گردن سے بندھا ہوا قرار نہ دینا اور میں آگ کے کپڑوں سے پناہ مانگتا ہوں۔

پھر سر کے اگلے حصہ پر مسح کیا اور یہ دعا پڑھی۔

اللھم غشنی برحمتک وبرکاتک وعفوک۔

اے خدا مجھے اپنی رحمت برکت اور عفو میں ڈھانپ لے۔

پھر دونوں پیروں پر مسح کیا اور مسح کرتے وقت یہ دعا پڑھی۔

اللھم ثبت قلمی علی الصراط یوم تزل فیہ الاقدام واجعل سعی فیما یرضیک عنی۔

بار الہا صراط پر میرے قدموں کو ثبات بخشنا اس دن کہ جب قدم اس پر سے پھسلیں گے اور میری کوشش کو انہی کاموں کے لئے وقف کر دے جو تجھے راضی کریں۔

قرآن مجید میں وضو کی یہی ترتیب بیان ہوئی ہے اور مسح سر کے ساتھ پیروں کے مسح کا صریحاً" حکم ہے مگر ایک گروہ مسح کی بجائے پیروں کے دھونے کو جزو وضو قرار دیتا ہے اور پیروں میں موزے ہوں تو ان پر مسح کے جواز کا قائل ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام موزوں پر مسح کو غلط سمجھتے تھے چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔

ولئن امسح علی ظھر حمار احب الی ان امسح علی الخفین۔(متدرک الوسائل)

میں موزوں پر مسح کرنے سے یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ گدھے کی پیٹھ پر مسح کروں۔

ایک دوسری روایت میں یہ فرمایا کہ۔

لا نمسح علی الخفین ومن کان من شیعتنا فلیقتد بنا ولیستنن بستنا۔ (وانی)

ہم موزوں پر مسح نہیں کرتے اور جو شخص ہمارے شیعوں میں سے ہو اسے ہماری پیروی کرنا چاہئے اور ہمارے طریقہ پر چلنا چاہئے۔

اگر اعضاء وضو میں سے کسی عضو پر زخم کی وجہ سے دوا لگی ہو یا پٹی بندھی ہو اور اسے کھولنا اور اس پر پانی ڈالنا باعث ضرر ہو تو اس عضو کے کھلے حصہ کو دھونے کے بعد اس زخم یا پٹی پر گیلے ہاتھوں سے مسح کرے۔ اگر زخم کی جگہ نجس ہو اور اسے پاک نہ کیا جا سکتا ہو تو اس پر پاک کپڑا رکھے اور اس پر ہاتھ پھیرلے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من کان بہ جرح و علیہ عصایب فانہ یجزی عنہ اذا توضا ان یمسح علی العصایب۔ (متدرک الوسائل)

جس شخص کے زخم ہو اور اس زخم پر پٹی بندھی ہو تو اس کے لئے وضو میں پٹی پر مسح کرلینا کافی ہے۔

غسل کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے سر و گردن کو دھویا جائے پھر جسم کا دایاں حصہ اور پھر بایاں حصہ یا حوض وغیرہ میں ایک دم غوطہ لگایا جائے۔ غسل کی دو قسمیں ہیں غسل واجب اور غسل مسنون۔ اغسال واجبہ میں سے ایک غسل جنابت ہے جو مادہ منویہ کے نکلنے سے واجب ہوتا ہے خواہ مباشرت سے نکلے یا احتلام کے ذریعہ سوتے میں نکلے یا جاگتے میں، قصداً" نکلے یا بغیر قصد و ارادہ کے بلکہ زن و مرد کے اعضاء اگر اس طرح ملیں کہ سر حشفہ تک دخول ہو جائے جب بھی غسل واجب ہو گا خواہ مادہ منویہ کا اخراج نہ ہو۔ چنانچہ ایک مرتبہ عمر ابن خطابؓ نے یہ مسئلہ صحابہ کے سامنے پیش کیا اور پوچھا کہ اگر کوئی شخص مباشرت کرے اور مادہ منویہ خارج نہ ہو تو کیا اس پر غسل واجب ہو گا۔

کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ آخر میں امیرالمومنین علیہ السلام سے دریافت کیا گیا آپؑ نے فرمایا۔

اتو جبون علیہ الجلد والرجم ولا توجبون علیہ صاع من ماء فقد وجب علیہ الغسل۔ (وافی)

تم ایسے شخص کے لئے دروں اور سنگساری کی سزا تو تجویز کرتے ہو اور غسل کے لئے ایک صاع پانی ضروری نہیں سمجھتے اس پر غسل واجب ہے۔

اگر کوئی شخص خواب میں یہ دیکھے کہ وہ محتلم ہوا ہے اور بیدار ہونے پر جسم یا لباس میں تری نہ پائے تو اس پر غسل واجب نہیں ہو گا۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

انما الغسل من الماء الاکبر فاذ ارأی فی منامہ ولم یرالما ولاکبر فلیس علیہ غسل۔ (وافی)

غسل مادہ منویہ کے خارج ہونے سے عائد ہوتا ہے اگر کوئی شخص خواب میں یہ دیکھے کہ وہ محتلم ہوا ہے اور بیدار ہونے پر کچھ نہ دیکھے تو اس پر غسل واجب نہیں ہے۔

دوسرا غسل مس میت ہے جو میت کو غسل سے قبل اور سرد ہونے کے بعد چھونے سے واجب ہوتا ہے اہلسنّت کے نزدیک غسل مس میت واجب نہیں ہے مگر فرقہ امامیہ کے نزدیک واجب ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ جب امیرالمومنین علیہ السلام نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غسل دیا تو کیا خود بھی غسل کیا؟ آپؑ نے فرمایا۔

النبی طاہر مطہر ولکن امیرالمومنین فعلہ و جرت بہ السنتہ۔ (وافی)

پیغمبر اکرم پاک و پاکیزہ تھے اس کے باوجود امیرالمومنین علیہ السلام نے غسل کیا اور (ان کے اوصیاء کے بارے میں بھی) یہی سنت جاری و ساری ہے۔

اغسال مسنونہ متعدد ہیں ان میں سے غسل جمعہ کے بارے میں بڑی تاکید وارد ہوئی ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کسی کو اس کی سستی و سہل انگاری پر تنبیہہ کرتے تو فرماتے۔

واللہ لانت اعجز من تارک الغسل یوم الجمعہ۔ (وافی)

خدا کی قسم تم تو اس شخص سے بھی گئے گزرے ہو جو جمعہ کے دن بھی غسل نہیں کرتا۔

تیمم یہ ہے کہ اگر وضو یا غسل کے لئے پانی نہ ہو یا پانی ہو اور وضو یا غسل کے لئے کافی نہ ہو یا کوئی امر استعمال سے مانع ہو تو دونوں ہاتھ مٹی وغیرہ پر مار کر پیشانی اور دونوں ہاتھوں پر مسح کرے۔ اگر اثنائے سفر میں وضو یا غسل کے لئے پانی نہ ہو تو پانی کی جستجو کرے۔ اس طرح کہ اگر زمین پتھریلی اور ناہموار ہو تو چاروں سمتوں میں اتنی دور

تک جائے جتنی دور کمان سے رہا کیا ہوا تیر جاتا ہے اور اگر زمین ہموار ہو تو اس سے دوگنی مسافت تک جائے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

یطلب اماء فی السفر ان کان الحزونتہ فغلوہ و ان کانت سھولہ فغلو تین۔(الوسائل الشیعہ)

سفر میں پانی کی تلاش کی جائے اگر زمین سنگلاخ و ناہموار ہو تو ایک تیر کے فاصلہ تک اور نرم و ہموار ہو تو دو تیروں کے فاصلہ تک۔

تیمم اجزائے زمین، مٹی، پتھر، ریت اور گچ پر کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ کیا گچ اور چونے پر تیمم کیا جا سکتا ہے؟ فرمایا ہاں۔ پھر پوچھا کہ کیا راکھ پر بھی تیمم ہو سکتا ہے؟ فرمایا۔

لالانہ لایخرج من الارض انما یخرج من الشجر۔ (وسائل الشیعہ)

نہیں اس لئے کہ وہ زمین سے نہیں نکلتی بلکہ درخت (کی لکڑی کے جلنے) سے بنتی ہے۔

اگر ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ ہو اور ان چیزوں میں سے کوئی چیز دستیاب نہ ہو سکے تو پھر کپڑوں اور دوسری چیزوں کو جھاڑ کر غبار جمع کرے اور اس پر تیمم کرے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من اخذتہ السما و شدید ہ والارض مبتلہ واراداں یتیمم فلینفض سرجد اوا کافہ فیتیمم بغبارہ۔ (متدرک الوسائل)

اگر شدید بارش کی وجہ سے زمین تر بتر ہو جائے اور تیمم کا ارادہ ہو تو زین جھول کو جھاڑ کر غبار اکٹھا کرے اور اس پر تیمم کرے۔

اگر کسی عذر کی بنا پر یا پانی کے نہ ملنے کی وجہ سے تیمم کرے تو جب عذر برطرف ہو جائے یا پانی مل جائے تو تیمم باطل ہو جائے گا۔ حضرتؑ کا قول ہے۔

اذامر بالماء او وجدہ انتقض تیممہ۔ (متدرک الوسائل)

جب پانی کے قریب سے گزرے یا پانی پالے تو تیمم ٹوٹ جائے گا۔

اگر تیمم سے نماز شروع کر دے اور پہلی رکعت میں رکوع سے پہلے پانی نظر آجائے تو نماز کو قطع کر دے اور وضو کر کے از سر نو نماز پڑھے اور اگر رکوع میں پہنچ گیا ہو تو نماز کو اختتام تک پہنچائے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ان دخل فی الصلوٰۃ ثم وجد الماء فینصرف فتوضاء ویصلی ان لم یکن رکع فان رکع مضی فی صلواتہ۔ (متدرک الوسائل)

اگر نماز شروع کر دے اور پھر پانی پالے تو اگر اس نے رکوع نہیں کیا تو وضو کرے اور نماز پڑھے اور اگر رکوع کر لیا ہے تو نماز کو جاری رکھے۔

اگر پانی کے مل جانے کی توقع ہو تو نماز کو آخر وقت کے لئے اٹھا رکھے۔ اگر پانی مل جائے تو بہتر ورنہ تیمم

سے نماز ادا کرے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لاینبغی ان تیمم من لم یجد الماء الا فی خرالوقت۔
(مستدرک الوسائل)

جسے پانی نہ ملے اسے چاہئے کہ نماز کے آخر وقت تیمم کرے۔

باب الصلوٰة

صلوٰۃ اس عبادت کو کہتے ہیں جو قیام و قعود، رکوع و سجود اور قراءت سورو اذکار سے صورت پذیر ہوتی ہے اور نماز کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ نماز تمام عبادات میں سب سے اہم عبادت اور اعمال میں سب سے بہتر عمل ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

اوصیکم بالصلواہ وحفظها فانها خیرالعمل وهی عمود دینکم۔ (مستدرک الوسائل)

میں تمہیں نماز اور اس کی پابندی کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ یہ بہترین عمل اور تمہارے دین کا ستون ہے۔

نماز کے لئے ضروری ہے کہ لباس اور جگہ غصبی نہ ہو۔ اگر یہ چیزیں شرعی جواز کے بغیر حاصل کی گئی ہوں گی تو ان میں نماز صحیح نہ ہو گی۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

انظر فیما تصلی وعلی ماتصلی ان لم یکن من حله ووجهه فلا قبول۔ (فصول حرعاملی)

یہ دیکھو کہ تم کس چیز میں اور کس چیز پر نماز پڑھ رہے ہو اگر یہ چیزیں حلال اور صحیح طریق سے حاصل نہ کی گئی ہوں گی تو نماز قابل قبول نہ ہو گی۔

نماز سے پہلے اذان و اقامت کہنا مستحب ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من صلی باذان و اقامته صلی خلفه صفان من الملئکته ومن صلی باقامته صلی خلفه صف۔ (فصول حرعاملی)

جو شخص اذان و اقامت کے ساتھ نماز پڑھے اس کے پیچھے فرشتوں کی دو صفیں نماز ادا کرتی ہیں اور جو شخص صرف اقامت کے ساتھ نماز پڑھے اس کے پیچھے فرشتوں کی ایک صف نماز پڑھتی ہے۔

جب موذن اذان دے رہا ہو تو اس کے ساتھ ساتھ کلمات اذان کو دہرانا چاہئے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ اس سے رزق میں وسعت آتی ہے اور تنگدستی دور ہو جاتی ہے۔

اگر کوئی شخص مسجد میں اس وقت آئے جب نماز جماعت ختم ہو چکی ہو اور ابھی صفیں منتشر نہ ہوئی ہوں تو اس صورت میں اذان و اقامت ساقط ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

اذا دخل رجل المسجد وقد علی اهله فلا یوذنن ولایقیمن۔ (وسائل الشیعہ)

جب کوئی شخص مسجد میں آئے اور نمازی نماز پڑھ چکے ہوں تو وہ اذان واقامت نہ کہے۔

نمازوں کو ان کے مقررہ و اوقات میں ادا کرنا چاہئے اس طرح کہ نہ وقت سے پہلے پڑھے اور نہ وقت گزار

دے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

صل الصلواہ لو قتھا الموقت لھا ولاتعجل وقتھا لفراغ ولاتوخرھاعن وقتھا لاشتغال۔ (نہج البلاغہ)

نماز کو اس کے مقررہ وقت پر ادا کرو اور فراغت حاصل کرنے لئے قبل از وقت نہ پڑھو اور نہ مشغولیت کی وجہ سے اس میں تاخیر کرو۔

اگر کسی وجہ سے نماز میں تاخیر ہو جائے اور صرف ایک رکعت کے ادا کرنے کا وقت رہ جائے تو ادا کی نیت سے نماز پڑھے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من ادرک من الصلواہ رکعتہ قبل طلوع الشمس فقد ادرک الصلواہ قامتہ۔ (فصول)

جس نے سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ایک رکعت پڑھ لی اس کی نماز پوری ہو گئی۔

ہر مسلمان پر شب و روز میں ظہر، عصر، مغرب، عشاء، اور صبح کی نمازیں واجب ہیں۔ حضرتؑ نے ان نمازوں کے اوقات، فضیلت اور تعداد رکعات کے بارے میں فرمایا ہے۔

ان فرض صلواہ الظھر اربع و فقتھا بعد زوال الشمس و وقت صلاہ العصر آخر وقت الظھر الی وقت مھبط الشمس وان المغرب ثلث رکعات وقتھا حین وقت الغروب الی ادبار الشفق والحمرہ وان وقت صلاہ العشاء الاخرہ ھی اربع رکعات واول وقتھا حین اشتباک النجوم وغیبوبتہ الشفق وانسباط الظلام الی ثلث اللیل والصبح رکعتان و وقتھا طلوع الفجرا الی اسفارالصبح۔ (وسائل الشیعہ)

نماز ظہر کی چار رکعتیں ہیں اور اس کا وقت زوال آفتاب کے بعد ہے اور نماز عصر کا وقت ظہر کے وقت آخر سے سورج کے افق مغرب کی طرف جھکاؤ تک ہے اور مغرب کی تین رکعتیں ہیں اور اس کا وقت غروب آفتاب سے شفق کے اوجھل اور مغرب کی سرخی کے زائل ہونے تک ہے اور عشاء کی چار رکعتیں ہیں اور اس کا وقت ستاروں کے جال بچھنے مغرب کی سمت کی سرخی کے غائب ہونے اور تاریکی کے پھیلاؤ سے تہائی رات تک ہے اور صبح کی دو رکعتیں ہیں اور اس کا وقت طلوع فجر سے مشرق کی سمت سے سرخی کے ظاہر ہونے تک ہے۔

یہ پانچوں نمازیں سترہ رکعتوں اور پچانویں تکبیروں پر مشتمل ہیں۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

خمس وتسعون تکبیرہ فی الیوم واللیلتہ للصلوات منھا تکبیر القنوت۔ (فصول)

ہر شب روز میں نمازوں کی پچانویں تکبیریں ہیں ان میں قنوت کی تکبیریں بھی شامل ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ صبح کی دو رکعتوں میں گیارہ تکبیریں، ظہر کی چار رکعتوں میں اکیس، عصر کی چار

رکعتوں میں اکیس، مغرب کی تین رکعتوں میں سولہ اور عشاء کی چار رکعتوں میں اکیس اور پانچ تکبیریں، پانچ قنوتوں کی، یہ کل بچانوے تکبیریں ہوئیں۔ نماز کی پہلی تکبیر سے جسے تکبیرۃ الاحرام کہتے ہیں نماز شروع ہوتی ہے اور سلام پر ختم ہو جاتی ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

تحریمها التکبیر و تحلیلها التسلیم۔ (وسائل الشیعہ) نماز کی پابندی کا آغاز تکبیر سے ہوتا ہے اور سلام سے پابندی بر طرف ہو جاتی ہے۔

تکبیرۃ الاحرام اور دوسری تکبیروں کے وقت دونوں ہاتھوں کو کانوں تک اٹھانا چاہیئے۔ چنانچہ حضرتؑ نے **وانحر** کی تفسیر میں فرمایا ہے۔

النحر رفع الیدین فی الصلاہ نحوالوجہ۔ (مستدرک الوسائل) نحر سے یہ مراد ہے کہ نماز میں دونوں ہاتھوں کو چہرے کی طرف بلند کیا جائے۔

اور اسے عبودیت کا شعار قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے۔

رفع الیدین فی التکبیر هوالعبودیته۔ (وسائل) تکبیر کے وقت دونوں ہاتھوں کو اٹھانا عبودیت کا شعار ہے۔

• تکبیرۃ الاحرام کے وقت جسم میں جھکاؤ نہ ہونا چاہیئے بلکہ بالکل سیدھا رو بقبلہ کھڑا ہونا چاہیئے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من لم لقم صلبه فی الصلواه فلا صلواه له۔ (وسائل الشیعہ) جو شخص کمر کے جھکاؤ کے بغیر سیدھا کھڑا نہیں ہوتا اس کی نماز نہیں ہے۔

حالت قیام میں سورہ فاتحہ اور ایک دوسرا سورہ پڑھے۔ امیرالمومنین علیہ السلام اکثر سورہ اخلاص پڑھتے تھے۔ چنانچہ عمران ابن حصین بیان کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک لشکر حضرت علی علیہ السلام کی قیادت میں بھیجا جب لشکر پلٹ کر آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں پوچھا۔ ان لوگوں نے کہا کہ اور تو تمام باتیں معمول کے مطابق تھیں مگر یہ بات نئی تھی کہ آپ جب بھی نماز پڑھاتے تو سورہ اخلاص ضرور پڑھتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے اس کے بارے میں پوچھا تو آپ نے کہا کہ میں اس سورہ کو دوست رکھتا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

مااحببتها حتی احبک الله۔ (مجمع البیان) تم اسے اس لئے دوست رکھتے ہو کہ اللہ تمہیں دوست رکھتا ہے۔

قیام کے بعد رکوع کرے اس طرح کے دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھ کر اتنا جھکے کہ سر کمر کے جھکاؤ کے برابر ہو جائے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ان علیا کان یعتدل فی الرکوع مستویا حتی یقال لوصب الماء علی ظھرہ لاستمسک۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام رکوع میں اتنا جھکتے کہ کمر کی سطح بالکل برابر ہو جاتی یہاں تک کہ یہ کہا جاتا کہ اگر پشت پر پانی ڈالا جائے تو وہ وہیں پر رک جائے۔

رکوع میں ذکر واجب ہے اگر عمداً ترک کرے گا تو نماز باطل ہو گی اور اگر بھولے سے ایسا ہو تو نماز صحیح ہے۔ چنانچہ حضرتؑ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے رکوع کیا مگر ذکر رکوع بھول گیا کیا اس کی نماز ہو گئی فرمایا۔

تمت صلاتہ۔ (وسائل الشیعہ)

ہاں اس کی نماز ہو گئی۔

رکوع کے بعد سیدھا کھڑا ہو اور پھر دو سجدے بجا لائے اور دوسرے سجدہ کے بعد سیدھا اٹھنے کے بجائے کچھ وقفہ کے لئے بیٹھے اور پھر کھڑا ہو۔ اصبغ ابن نباتہ کہتے ہیں۔

کان امیرالمومنین اذا رفع راسہ من السجود قعد حتی یطمئن ثم یقوم۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام جب سجدہ سے سر اٹھاتے تو سکون و اطمینان سے بیٹھتے پھر کھڑے ہوتے۔

جب سجدوں سے فارغ ہو کر کھڑا ہونے لگے تو **بحول اللہ وقوتہ اقوم واقعد** (میں اللہ کی دی ہوئی قوت و طاقت سے اٹھتا بیٹھتا ہوں) کہے۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔

کان امیرالمومنین یبرء من القدریۃ فی کل رکعتہ ویقول بحول اللہ وقوتہ اقوم واقعد۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام فرقہ قدریہ سے اظہار برأت کرتے ہوئے ہر رکعت میں **بحول اللہ وقوتہ اقوم و اقعد** پڑھتے۔

دوسری رکعت میں رکوع میں جانے سے پہلے ہاتھ اٹھا کر دعائے قنوت پڑھے۔ عبدالرحمن ابن اسود کاہلی کہتے ہیں۔

صلی بنا علی ابن ابی طالب علیہ السلام فی مسجد بنی کاھل الفجر فقنت بنا۔ (مستدرک الوسائل)

علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے مسجد بنی کاہل میں نماز پڑھائی اور اس میں دعائے قنوت پڑھی۔

جب نماز ختم کرے تو تسبیح فاطمہ (سلام اللہ علیہا) پڑھے۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ہمیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعلیم دی کہ ہم ہر نماز کے بعد ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر ۳۳ مرتبہ الحمدللہ اور ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ پڑھا کریں۔ اس ارشاد نبوی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد میں نے اسے کبھی ترک نہیں کیا۔

تسبیح و تعقیبات سے فارغ ہو کر دعا مانگے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

اذا فرغ احد کم من الصلواہ فلیرفع یدیہ الی السماء ولینصب فی الدعاء۔ (مستدرک الوسائل) جب تم میں سے کوئی نماز سے فارغ ہو تو اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور دعا مانگے۔

دعا کے بعد سجدہ شکر بجا لائے۔ میثم تمار کہتے ہیں کہ امیرالمومنین علیہ السلام نے مسجد جعفی میں نماز ادا کی اور تسبیح و دعا کے بعد

سجد و عفہ وقال العفو ساہ سرہ (مستدرک الوسائل) آپ نے خاک پیشانی رکھ کر سجدہ کیا ور سو مرتبہ العفو کہا۔

نماز کے چند مبطلات ہیں۔ چنانچہ اگر دوران نماز میں ریح وغیرہ صادر ہو تو نماز باطل ہو جائے گی۔ لہٰذا پھر سے وضو کر کے نماز پڑھے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

من احدث فی صلواتہ فلیقطع ولیبدی۔(مستدرک الوسائل) اگر نماز میں حدث صادر ہو تو نماز کو قطع کر دے اور از سر نو نماز پڑھے۔

اگر نماز پڑھتے ہوئے آنکھ لگ جائے تو نماز باطل ہو جائے گی۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

اذ اغلبتک عینک وانت فی الصلواہ فاقطع ونم۔ (وسائل الشیعہ) جب نماز میں تمہاری آنکھوں پر نیند کا غلبہ ہو جائے تو نماز قطع کر دو اور سو جاؤ۔

اگر نماز میں قرآن یا دعا کے علاوہ کوئی دو حرفی لفظ خواہ با معنی ہو یا بے معنی یا یک حرفی لفظ جو با معنی ہو زبان سے نکالے تو نماز باطل ہو جائے گی۔ حضرت فرماتے ہیں۔

من تکلم فی صلواتہ اعاد۔(مستدرک الوسائل) جو نماز میں کلام کرے وہ پھر سے نماز پڑھے۔

نماز میں قہقہ لگا کر ہنسنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

لا یقطع الصلواہ التبسم ویقطعها القهقهه۔ (بحار ج ۱۰ ص ۱۰۷)

تبسم سے نماز باطل نہیں ہوتی البتہ قہقہ لگانے سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔

نماز میں ہاتھوں کو نہ باندھے۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لا یجمع المسلم یدیه فی صلواته وهو قائم بین یدیه یتشبه باهل الکفر یعنی المجوس۔(وسائل الشیعہ)

مسلمان کا یہ شیوہ نہیں کہ وہ نماز میں ہاتھ باندھے اور مجوسیوں کے سے طرز عمل کے ساتھ اللہ کے سامنے کھڑا ہو۔

ان چیزوں کے علاوہ بھی چند چیزیں ایسی ہیں جن سے اگرچہ نماز باطل نہیں ہوتی تاہم ان کے مکروہ ہونے کی بنا پر ان سے اجتناب کرنا چاہئے۔ ان مکروہات میں سے ایک یہ ہے کہ نماز میں سر کو ادھر ادھر حرکت نہ دے اور نہ دائیں بائیں دیکھے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

الالتفات فی الصلواہ اختلاس من الشیطان فایا کم والالتفات فی الصلواہ۔ (وسائل الشیعہ)

نماز میں ادھر ادھر مڑنا شیطان کے تسلط کا نتیجہ ہے لہٰذا اس سے اجتناب کرو۔

نماز میں بے معنی و بیکار حرکات سے اجتناب کرے۔ اس لئے کہ یہ چیز خضوع و خشوع اور رجوع الی اللہ کے منافی ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

لایعبث الرجل فی صلواته بلحیته ولا بما یشغله عن صلواته۔ (وسائل شیعہ)

آدمی نماز میں ڈاڑھی سے نہ کھیلے اور نہ ایسی حرکت کرے جو اس کی توجہ نماز سے ہٹا دے۔

اگر نماز پڑھتے ہوئے انسان یا حیوان سامنے سے گزرے تو اگرچہ اس سے نماز میں خلل پیدا نہیں ہوتا تاہم جہاں تک ہو سکے اس کی روک تھام کرے۔ چنانچہ حضرتؑ سے کسی نے پوچھا کہ ایک شخص نماز پڑھتا ہے اور اس کے سامنے سے عورت، مرد اور جانور سب گزرتے ہیں اسے کیا کرنا چاہئے فرمایا۔

ان الصلواۃ لا یقطعها شئی ولکن اوروا ما استطعتم۔ (حر عاملی)

(ان چیزوں میں سے) کوئی چیز نماز کو باطل نہیں کرتی لیکن جہاں تک ہو سکے انہیں روکنے کی کوشش کرو۔

لوہے کے ہتھیار تلوار وغیرہ سجا کر نماز پڑھے اور نہ تلوار اپنے سامنے رکھے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لایصلی احد کم وبین یدیہ سیف فان للقبلت امن ۔ (علل الشرائع)

تم میں سے کوئی شخص نماز کے دوران تلوار اپنے سامنے نہ رکھے اس لئے کہ سمت قبلہ امن کا نشان ہے۔

نماز کے چند آداب ہیں کچھ ظاہر سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ باطن سے۔ ظاہری آداب یہ ہیں کہ تمام اعمال و ارکان سکون و طمانیت سے بجا لائے۔ ادھر ادھر جھانکنے کے بجائے نظر جائے سجدہ پر رکھے۔ نماز کے لئے متبرک مقامات مساجد یا مشاہد کا انتخاب کرے اور پاک و پاکیزہ اور بقدر وسعت اچھا لباس پہنے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

النظیف من الشباب یذھب الھم والحزن وھو طھور للصلواہ۔

نظیف و پاکیزہ لباس غم و حزن کو دور کرتا ہے اور نماز کے لئے پاکیزگی کا باعث ہے۔

باطنی آداب یہ ہیں کہ صرف الفاظ کے دہرانے پر اکتفا نہ کرے بلکہ ان کے معانی کو سمجھے اور حضور قلب کے ساتھ تمام ارکان بجا لائے۔ خیالات کو ادھر ادھر بھٹکنے نہ دے۔ عجز و فروتنی کی کیفیت پیدا کرے اور یہ تصور کرے کہ وہ اس سلطان السلاطین کے روبرو کھڑا ہے جو ظاہر کو بھی دیکھتا ہے اور باطن پر بھی نظر رکھتا ہے۔ کوئی چیز اس سے ڈھکی چھپی ہوئی اور اس کے دائرہ اختیار و اقتدار سے باہر نہیں ہے۔ اگر نماز میں توجہ و یکسوئی نہ ہو تو وہ در حقیقت نماز ہی نہیں ہے۔ اس لئے کہ نماز صرف سیدھا کھڑا ہونے، رکوع میں جھکنے اور سجدہ میں سر رکھنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ جب تک ان اعمال و اذکار کے پیکر میں روح اخلاص کار فرما نہ ہو گی وہ نماز، نماز کہے جانے کے قابل نہ ہو گی۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لیست الصلواہ قیامک و قعودک انما الصلواہ اخلاصک

نماز تمہارے اٹھنے بیٹھنے کا نام نہیں ہے بلکہ نماز وہ ہے جس میں خلوص نیت ہو۔

خشوع و نیت اخلاص روح اعمال است
عمل چو دور شد از روح طاعش مشمار

امیرالمومنین علیہ السلام سے نماز کے مختلف اعمال کے بارے میں دریافت کیا جاتا تو آپ ان کی ظاہری ہیئت و صورت کے بیان کرنے پر اکتفا نہ کرتے بلکہ ان کے اسرار و حکم کی بھی نشاندہی کرتے۔ چنانچہ آپؑ سے تکبیرۃ الاحرام کے معنی پوچھے گئے تو آپؑ نے فرمایا۔

اللہ اکبر یعنی الواحد الاحد الذی لیس کمثلہ شئی ولا یلتبس بالا جناس ولا یدرک بالحواس۔ (علل الشرائع)

اللہ اکبر کے معنی یہ ہیں کہ وہ واحد و یکتا ہے نہ اس کے مانند کوئی شے ہے نہ کسی جنس سے اس کا اشتباہ ہو سکتا ہے۔ اور نہ وہ حواس سے جانا جا سکتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ اس اعتبار سے بزرگ و برتر ہے کہ نہ اس کا کوئی شریک ہے نہ کوئی مثل نہ حواس سے جانا جا سکتا ہے اور نہ آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر وہ کسی کے مشابہ ہو گا یا کوئی اس سے مماثل ہو گا تو وہ اس کی سطح پر آجائے گا اور یہ اس کی بزرگی و کبریائی کے منافی ہے۔

آپؑ سے پوچھا گیا کہ رکوع میں گردن کو خم کرنے کا مطلب کیا ہے فرمایا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ۔

آمنت بوحدانیتک ولو ضربت عنقی۔(علل الشرائع) — میں اللہ کی وحدت و یکتائی پر ایمان لایا ہوں (اور اس سے منحرف نہیں ہوں گا) خواہ میری گردن کاٹ دی جائے۔

آپؑ سے دریافت کیا گیا کہ سجدہ کا مطلب کیا ہے فرمایا کہ پہلا سجدہ اس امر کا اعتراف ہے کہ "**اللھم انک منھا خلقتنا**" بارالہا تو نے ہمیں زمین سے پیدا کیا ہے "اور سجدہ سے سر اٹھانے کے معنی یہ ہیں "**منھا اخرجتنا**" اسی زمین سے تو نے ہمیں نکالا ہے" اور دوسرے سجدہ کے معنی یہ ہیں **ومنھا تعیدنا؟** اسی زمین کی طرف تو ہمیں پلٹائے گا" اور اس سے سر اٹھانے کے معنی یہ ہیں **ومنھا تخرجنا تارہ اخری** اسی زمین سے تو ہمیں دوبارہ اٹھائے گا۔ حضرت نے ان جوابات میں قرآن مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

منھا خلقنا کم وفیھا نعید کم ومنھا نخرجکم تارہ اخری۔ — ہم نے اسی زمین سے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی کی طرف پلٹائیں گے اور اسی سے دوسری بار تمہیں نکالیں گے۔

آپ سے پوچھا گیا کہ تشہد میں دایاں پیر بائیں پیر پر کیوں رکھا جاتا ہے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ۔

اللھم امت الباطل و اقم الحق۔ — خدایا باطل کو نیست و نابود کر اور حق کو قائم و برقرار رکھ۔

پوچھا گیا کہ آخر نماز میں السلام علیکم کا مطلب کیا ہے فرمایا کہ امام جماعت اللہ کی اس نوید کی ترجمانی کرتا ہے کہ۔

امان لکم من عذاب اللہ یوم القیامتہ۔ (الفقیہ) — قیامت کے دن تمہارے لئے عذاب سے امان و سلامتی ہے۔

باب الصوم

ماہ رمضان میں ہر بالغ و عاقل مسلمان پر طلوع صبح صادق سے غروب آفتاب تک روزہ رکھنا واجب ہے۔ روزہ ایک طرح سے زکواۃ بدن ہے جو قوت صبر، ضبط نفس اور ترک خواہشات ایسے اوصاف کی تخلیق میں قوی ترین اور مؤثر ہے۔ روزہ خداوند عالم کی خوشنودی کا باعث اور عذاب جہنم سے بچاؤ کا ذریعہ ہے چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

صوم شهر رمضان جنته من النار۔ (مستدرک الوسائل) — ماہ رمضان کے روزے جہنم کی آگ سے سپر کا کام دیں گے۔

ماہ رمضان کا چاند رویت سے یا شعبان کے تیس دن پورے ہونے سے ثابت ہو گا لہٰذا جب ماہ رمضان کا چاند نظر آئے روزہ رکھا جائے اور جب شوال کا چاند دکھائی دے روزہ چھوڑ دیا جائے۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

صم لرویت و افطر لرویته وایاک والشک وانطن فان خفی علیکم فاتموا الشهر الاول ثلثین۔ (وسائل الشیعہ) — چاند دیکھو تو روزہ رکھو اور چاند دیکھو تو روزہ چھوڑ دو اور شک و ظن پر بنا نہ کرو اگر رویت مخفی رہے تو پہلے مہینے کے تیس دن پورے کرو۔

اگر تیس دن پورے نہ ہوں اور چاند بھی نہ دیکھے تو دو عادل گواہوں کی شہادت پر رویت تسلیم کی جائے گی حضرتؑ فرماتے ہیں۔

لاتجوز شهادہ النساء فی رویته الهلال ولا یجوز الا شهادہ رجلین عدلین۔ (وافی) — رویت ہلال کے سلسلہ میں دو عادل مردوں کی گواہی معتبر ہے اور عورتوں کی گواہی قابل قبول نہ ہو گی۔

اگر ان چیزوں میں سے کسی ایک سے رویت ثابت نہ ہو اور عمومی شہرت بھی نہ ہو تو ماہ رمضان کی نیت سے روزہ رکھنے کا جواز نہیں ہے البتہ قضا یا استحباب کی نیت سے روزہ رکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے یوم الشک کے روزہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا۔

لان اصوم یوما من شعبان احب الی من ان افطر یوما من شهر رمضان۔ (وافی) — شعبان کا ایک روزہ رکھ لینا مجھے اس سے کہیں زیادہ پسند ہے کہ میں ماہ رمضان میں ایک دن بغیر روزہ کے رہوں۔

مطلب یہ ہے کہ یوم الشک کا روزہ آخر شعبان کی نیت سے رکھنا بے روزہ رہنے سے بہتر ہے اس لئے کہ

اگر آخر شعبان کی نیت سے روزہ رکھا جائے اور واقع میں بھی آخر شعبان ہو تو وہ روزہ مستحب قرار پائے گا اور اگر روزہ نہ رکھا جائے اور واقع میں ماہ رمضان شروع ہو چکا ہو تو ماہ رمضان کے روزوں میں سے ایک روزہ چھوٹ جائے گا۔ اگرچہ اس کے چھوٹنے پر کوئی گرفت نہ ہو گی کیونکہ ماہ رمضان کے شروع ہونے کا علم نہیں ہو سکا اور احکام شرعیہ علم و یقین پر مترتب ہوتے ہیں لہٰذا جب تک شعبان کے ختم ہونے اور ماہ رمضان کے شروع ہونے کا علم نہ ہو جائے ماہ رمضان کی نیت سے روزہ صحیح نہیں ہو گا بلکہ بعد میں اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ واقع میں ماہ رمضان شروع ہو چکا تھا جب بھی روزہ باطل ہو گا اور قضا واجب ہو گی۔

اگر روزہ دار روزہ میں بھولے چوکے سے کچھ کھا پی لے تو اسے یہ سمجھ کر کہ اب تو کھا پی چکا ہوں روزہ کو ختم نہیں کرنا چاہئے کیونکہ روزہ میں بھول چوک معاف ہے۔ چنانچہ حضرتؐ کا ارشاد ہے۔

من صام فنسی فاکل و شرب فلا یفطر من اجل انہ نسی فانما ھو رزق رزقہ اللہ فلیتم صومہ۔ (وافی)

جو شخص روزہ رکھے اور بھول کر کھا پی لے تو اسے اس خیال سے روزہ نہیں چھوڑنا چاہئے کہ وہ بھول گیا یہ تو ایک رزق تھا جو اللہ نے اسے دیا اسے روزہ پورا کرنا چاہئے۔

روزہ کی حالت میں مسواک کی جاسکتی ہے بلکہ بہتر ہے۔ چنانچہ کتب احادیث میں ہے کہ۔

کان علی یستاک وھو صائم فی اول النھار وفی آخرہ فی شھر رمضان۔ (وسائل)

حضرت علیؑ ماہ رمضان میں روزہ کی حالت میں صبح و شام دونوں وقت مسواک کرتے تھے۔

حضرتؐ دودھ سے روزہ افطار کرنا پسند کرتے تھے اور جب روزہ افطار کرتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے۔

بسم اللہ اللھم لک صمنا و علی رزقک افطرنا فتقبل منا انک انت السمیع العلیم۔ (وافی)

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں اے اللہ ہم نے تیرے لئے روزہ رکھا اور تیرے رزق سے افطار کیا تو اسے قبول فرما بیشک تو (دعاؤں کا) سننے والا اور (نیتوں کا) جاننے والا ہے۔

باب الحج

حج چند اعمال کے مجموعہ کا نام ہے جو مکہ معظمہ میں مخصوص دنوں میں بجا لائے جاتے ہیں مکہ اور اطراف مکہ کے رہنے والوں پر حج افراد اور حج قران واجب ہے اور جو مکہ اور اطراف مکہ کے رہنے والے نہ ہوں ان پر حج تمتع واجب ہے جس میں عمرہ حج ہی کا ایک جزو ہوتا ہے حج تمتع میں پہلے عمرہ تمتع کی نیت سے احرام باندھا جاتا ہے اور طواف و سعی اور تقصیر کے بعد احرام کھول دیا جاتا ہے اور پھر آٹھ ذی الحجہ کو حج کی نیت سے احرام باندھا جاتا ہے اور وقوف عرفات و مشعر الحرام اور رمی جمرات وغیرہ اعمال حج بجا لائے جاتے ہیں اس حج تمتع کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے۔

فمن تمتع بالعمره الی الحج فما استیسر من الهدی۔ جو شخص حج تمتع کا عمرہ بجا لائے تو جیسی قربانی ممکن ہو کرے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حجتہ الوداع کے موقع پر حکم دیا کہ جن لوگوں کے ہمراہ قربانی کے جانور نہیں ہیں وہ احرام کھول دیں اور حج تمتع بجا لائیں اور عمرہ کو حج میں شامل کرنے کا حکم دیا۔ ترمذی نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

دخلت العمره فی الحج الی یوم القیامته۔ اب قیامت تک عمرہ حج میں شامل کر دیا گیا ہے۔ (صحیح ترمذی ج ۱ ص ۱۴۴)

کچھ لوگوں کی طبیعتوں پر یہ حکم گراں گزرا اور کچھ لوگوں نے علانیہ اس کی مخالفت کی کیونکہ قبل اسلام حج ماہ ذی الحجہ میں اور عمرہ ماہ رجب میں بجا لایا جاتا تھا اور وہ اسی سابقہ طرز عمل سے مانوس تھے جسے چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بار بار کہنے سے احرام تو کھول دئے مگر آپ کے بعد کھل کر اس کی مخالفت کی گئی۔ ان مخالفت کرنے والوں میں حضرت عمرؓ پیش پیش تھے جنہوں نے حکم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف حرمت کا فتویٰ صادر کر دیا۔ حضرت عثمانؓ نے بھی انہی کا تتبع کیا اور اس سے مانع ہوئے حالانکہ امیرالمومنین علیہ السلام نے انہیں ارشاد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف متوجہ کرتے ہوئے اس کی خلاف ورزی سے منع کیا مگر وہ اپنی رائے پر جمے رہے۔ چنانچہ محمد ابن اسمٰعیل بخاری تحریر کرتے ہیں۔

اختلف علی و عثمان بعسفان فی المتعہ فقال علی ماترید انہ تنہی عن امر فعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال عثمان دعنی عنک۔ (صحیح بخاری پارہ ٦ ص ٨٢)

حضرت علی علیہ السلام اور حضرت عثمان نے مقام عسفان میں حج تمتع کے بارے میں اختلاف کیا حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا تمہارا مقصد کیا ہے کہ تم اس امر سے منع کرتے ہو جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دیا۔ حضرت عثمان نے کہا کہ اس ذکر کو چھوڑئے۔

ایک شخص نے عبداللہ ابن عمر سے حج تمتع کے بارے میں پوچھا انہوں نے کہا کہ جائز ہے اس نے کہا کہ آپ کے والد حضرت عمرؓ تو اس سے منع کرتے تھے عبداللہ نے کہا۔

رأیت ان کان ابی نہی عنہا وصنعہا رسول اللہ امرا یتبع ام امر رسول اللہ فقال الرجل بل امر رسول اللہ فقال لقد صنعہا رسول اللہ۔ (ترمذی ج ا ص ١٣٢)

تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر میرے باپ نے حج تمتع سے منع کیا اور رسول اللہ نے اس کا حکم دیا تو میرے باپ کی پیروی کی جائے گی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کی کہا کہ پیروی تو حکم رسول ہی کی ہو گی عبداللہ ابن عمر نے کہا کہ پھر حج تمتع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے نافذ ہوا۔

اعمال حج میں پہلا عمل یہ ہے کہ میقات پر پہنچ کر عمرہ تمتع کی نیت سے احرام باندھا جائے اور صدائے تلبیہ بلند کی جائے۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

جاء جبرئیل الی النبی فقال لہ ان التلبیہ شعار المحرم فارفع صوتک للتلبیہ۔ (الفقیہ)

جبرئیل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ احرام باندھنے والے کا شعار تلبیہ ہے لہذا بلند آواز سے تلبیہ کہو۔

اور اگر گونگا ہو تو زبان کو حرکت دے اور ہاتھ سے اشارہ کرے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

یجزیہ تحریک لسانہ واشارہ باصبعہ۔ (مستدرک الوسائل)

اس کے لئے زبان کو حرکت دینا اور انگلی سے اشارہ کرنا کافی ہے۔

جامہ احرام سفید ہو یا رنگین دونوں میں احرام باندھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے عبداللہ ابن جعفر کو رنگین احرام باندھے دیکھا تو اس پر اعتراض کیا۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا ہمیں سنن واحکام کی تعلیم دینے کی

ضرورت نہیں ہے۔ رنگین لباس میں احرام باندھا جاسکتا ہے اور اس پر اعتراض غلط ہے۔

احرام کی حالت میں چند چیزیں ممنوع و حرام ہیں۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

ان المحرم ممنوع من الصید والجماع والطیب ولبس الثیاب المخیطہ۔ (مستدرک الوسائل)

احرام باندھنے والے کے لئے شکار کرنا عورت کے قریب جانا خوشبو لگانا اور سلے ہوئے کپڑے پہننا منع ہے۔

صید سے مراد صحرائی جانوروں کا شکار ہے چنانچہ احرام کی حالت میں شکار کرنا شکار کے سلسلہ میں مدد دینا شکار بتلانا اور اس کا گوشت کھانا حرام ہے خواہ شکار کرنے والا احرام باندھے ہوئے نہ ہو۔ علامہ مجلسی نے بحار میں مسند احمد ابن حنبل سے نقل کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ اور ان کے چند ہمراہی احرام باندھے ہوئے تھے کہ ایک عراقی نے چند بھنے ہوئے تیتر ان کے سامنے پیش کئے حضرت عثمانؓ نے اپنے ہمراہیوں سے کھانے کے لئے کہا مگر انہوں نے انکار کیا حضرت عثمانؓ نے کہا کہ بیشک یہ شکار ہے مگر شکار کرنے والا احرام باندھے ہوئے نہ تھا اور نہ ہم نے اسے شکار کرنے کے لئے کہا تھا ان لوگوں نے کہا کہ حضرت علی علیہ السلام اسے جائز نہیں سمجھتے چنانچہ حضرتؑ کی طرف رجوع کیا گیا آپ نے فرمایا کہ تم میں ضرور کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو اس واقعہ کی گواہی دیں گے کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم احرام باندھے ہوئے تھے تو کچھ لوگ ایک وحشی جانور کی ران آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس لائے آپؐ نے فرمایا کہ ہم محرم ہیں یہ ان لوگوں کو دو جو احرام باندھے ہوئے نہیں ہیں۔ اس واقعہ کی بارہ صحابیوں نے گواہی دی۔ حضرت عثمانؓ سے کوئی جواب بن نہ پڑا پیچ و تاب کھا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے خیمہ میں چلے آئے۔

محرم کے لئے صحرائی جانوروں کے انڈے اٹھانا اور انہیں کھانا بھی حرام ہے خواہ وہ حدود حرم میں داخل ہوا ہو یا داخل نہ ہوا ہو۔ محمد ابن زبیر کہتے ہیں کہ میں نے جامع دمشق میں ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا۔ اور اس سے کہا کہ تم نے ایک زمانہ دیکھا ہے کوئی دیکھا سنا واقعہ بیان کرو اس نے کہا کہ ہم ایک مرتبہ حج کے لئے گئے اور احرام باندھنے کے بعد شترمرغ کے کچھ انڈے اٹھالئے جب فریضہ حج سے فارغ ہو کر واپس آئے تو حضرت عمرؓ سے اس کا ذکر کیا وہ ہمیں حضرت علی علیہ السلام کے پاس لے گئے اور ان سے کہا کہ ان لوگوں نے احرام باندھنے کے بعد شترمرغ کے انڈے اٹھالئے تھے ان کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ انہوں نے جتنے انڈے اٹھائے تھے اتنے نر اونٹوں کو اونٹنیوں پر چھوڑیں اور ان سے جو بچے پیدا ہوں وہ کفارہ میں دے دیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ اونٹنی گابھن نہیں ہوتی فرمایا کہ انڈے بھی تو گندے نکل آیا کرتے ہیں۔

محرم پر صرف صحرائی جانوروں کا شکار کرنا اور کھانا حرام ہے۔ اگر دریائی جانور کا شکار کرے یا کھائے تو اس

میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

لاباس ان یصید المحرم الحیتان۔ (مستدرک الوسائل)

اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ محرم مچھلی کا شکار کرے۔

عورت سے جہاں مباشرت حرام ہے وہاں نکاح پڑھنا اور نکاح کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

المحرم لا ینکح ولا ینکح فان نکح فنکاحہ باطل۔ (مستدرک الوسائل)

محرم نہ نکاح پڑھے اور نہ خود نکاح کرے اگر نکاح کرے گا تو نکاح باطل ہو گا۔

خوشبو لگانا جہاں ممنوع ہے وہاں خوشبو سونگھنا اور عطر فروش کے پاس جہاں عطر کی خوشبو آ رہی ہو بیٹھنا بھی ممنوع ہے۔ چنانچہ حضرتؑ سے پوچھا گیا کہ کیا حالت احرام میں عطر فروش کے پاس بیٹھا جا سکتا ہے۔ فرمایا۔

لاالا ان یکون ماوا (مستدرک الوسائل)

نہیں مگر اس کی طرف سے گزر سکتا ہے۔

احرام کی حالت میں ناخن اور بال کاٹنا منع ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ان المحرم ممنوع من تقلیم الاظفار و حلق الراس۔ (مستدرک الوسائل)

محرم کے لئے ناخن کاٹنا اور سر مونڈنا منع ہے۔

احرام کی حالت میں گالی گلوچ بکنا لڑائی جھگڑا کرنا اور اپنی برتری جتلانا جائز نہیں ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

التنزہ عن کل شئی نہی اللہ عنہ من الرفث والفسوق والجدال وان لا یمازی بہ رفیقا وغیرہ۔ (مستدرک الوسائل)

محرم کو ان چیزوں سے بچنا چاہئے جن سے اللہ سبحانہ نے منع کیا ہے نہ عورت کے قریب جائے نہ گناہ و فسق کے کام کرے اور نہ لڑائی جھگڑا کرے اور نہ اپنے ہمراہی اور نہ کسی اور پر اپنی برتری جتلائے۔

جب محرم مکہ میں وارد ہو تو عمرہ تمتع کی نیت سے طواف کرے۔ طواف کی صورت یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے گرد سات چکر لگائے اور چکر کا آغاز حجر اسود سے کرے اگر کوئی شخص بھولے سے سات چکروں سے آگے بڑھ جائے تو اگر آٹھواں چکر تمام کرنے کے بعد اسے یاد آئے تو چاہے تو اس زیادتی کو شمار نہ کرے اور طواف تمام کر دے اور چاہے تو طواف مستحب کی نیت سے چھ چکر اور لگائے اس طرح پہلے سات چکر طواف واجب کے ہوں گے اور دوسرے سات چکر طواف مستحب کے شمار ہوں گے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اذا طاف الرجل بالبیت ثمانیۃ اشواط الفریضۃ فاستیقن ثمانیۃ اضاف الیھا ستا۔ (وافی)

جب کوئی شخص خانہ کعبہ کے گرد طواف واجب کے (سات کے بجائے) آٹھ چکر لگائے اور اسے چکروں کے آٹھ ہونے کا یقین ہو جائے تو چھ چکر اور لگالے۔

طواف کے بعد نماز طواف پڑھے اور سعی و تقصیر کے بعد احرام کھول کر عمرہ تمام کردے پھر آٹھ ذی الحجہ کو حج کی نیت سے احرام باندھے اور نو ذی الحجہ کو عرفات میں غروب آفتاب تک وقوف کرے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ دفع من عرفۃ حین غربت الشمس۔ (مستدرک الوسائل)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ جب سورج غروب ہوا تو عرفات سے روانہ ہوئے۔

عرفات سے روانہ ہو کر مزدلفہ میں طلوع آفتاب تک وقوف کرے اور وہیں پر مغرب و عشاء کی نمازیں ایک ساتھ پڑھے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لما دفع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ من عرفات مرجعتی الزدلفۃ فجمع بھابین الصلواتین باذان و اقامتین۔ (مستدرک الوسائل)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ عرفات سے مزدلفہ میں آئے تو آپ نے دونوں نمازوں کو جمع کیا اور دونوں کے لئے ایک اذان اور دو اقامتیں کہیں۔

دس ذی الحجہ کو مزدلفہ سے منی میں آئے اور جمرہ عقبہ پر رمی کرنے کے بعد قربانی دے۔ قربانی کے جانور کو لاغر، کمزور اور عیب دار نہ ہونا چاہئے۔ چنانچہ حضرتؑ نے۔

نھی ان الا ضحیۃ بمکسور القرن والعرجاء المبین عرجھا والمھز ولما لبین ھزالھا و المقطوعۃ الاذان المصطلمۃ۔ (مستدرک الوسائل)

اس جانور کی قربانی سے منع فرمایا ہے جس کا سینگ ٹوٹا ہوا ہو یا نمایاں طور پر لنگڑاتا ہو یا نمایاں طور پر لاغر و کمزور ہو یا کان کٹا ہوا ہو۔

جب قربانی کر چکے تو اگر اس سے پہلے حج کر چکا ہے تو تھوڑے سے بال کٹوا لینا کافی ہے اور اگر پہلا حج ہو تو سر منڈوانا واجب ہے اور اگر سر پر بال نہ ہوں تو پھر بھی سر پر استرا پھیر لینا چاہئے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

الاقرع رسم الموسی علی راسہ۔ (وافی)

گنجا آدمی اپنے سر پر استرا پھیر لے۔

اسی دن اعمال منٰی سے فارغ ہو کر مکہ معظمہ میں آئے اور طواف زیارت و نماز طواف بجا لائے۔ چنانچہ حضرتؑ نے آیہ قرآنی "ولیطوفوا بالبیت العتیق ان لوگوں کو چاہئے کہ وہ خانہ کعبہ کا طواف کریں"۔ کی تفسیر میں فرمایا۔

هو طواف الزیارہ بعد الذبح والحلق۔ (مستدرک الوسائل) اس سے مراد طواف زیارت ہے جو قربانی اور سر منڈوانے کے بعد کیا جاتا ہے۔

طواف کے بعد صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے اور طواف النساء دو رکعت نماز سمیت بجا لائے اور پھر منیٰ میں پلٹ آئے اور گیارھویں اور بارھویں رات منیٰ میں گزارے۔ چنانچہ حضرتؑ نے۔

نھی اذا یبیت احد من الحجیج لیالی منی الابمنی۔ (مستدرک الوسائل) اس سے منع فرمایا ہے کہ کوئی شخص منیٰ کی راتوں میں سے کوئی رات منیٰ سے باہر گزارے۔

گیارہویں اور بارہویں ذی الحجہ کو رمی جمرات کرے اور بارہویں ذی الحجہ کو ظہر کے بعد منیٰ سے چل دے جس کے بعد حج تمام ہو جائے گا۔

باب الزکواۃ

زکواۃ ایک مالی عبادت ہے جو ہر صاحب نصاب پر مقررہ مقدار میں واجب ہے۔ یہ اسلام کے فرائض میں سے ایک اہم فریضہ ہے اس کا تارک فاسق اور منکر دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ان الزکواۃ جعلت مع الصلواۃ قربانا لا ھل الاسلام ومن لم یعطھا طیب النفس بھا یرجو بھا من الثمن ما ھو افضل منھا فانہ جاھل بالسنتہ مغبون الاجرضال العمر طویل الندم بترک امر اللہ عزوجل والرغبتہ عما علیہ صالحو عباداللہ۔ (وافی)

اہل اسلام کے لئے نماز کے ساتھ زکواۃ کو تقرب خداوندی کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے جو شخص بہتر اجر کی امید رکھتے ہوئے قلبی رضا مندی کے ساتھ زکواۃ ادا نہیں کرتا وہ حکم خدا کی خلاف ورزی اور اللہ کے نیک بندوں کے طریق کار سے روگردانی کی وجہ سے سنت سے بے خبر اجر کے اعتبار سے نقصان رسیدہ گمراہی میں عمر کھونے والا اور طویل ندامت و پشیمانی اٹھانے والا ہے۔

زکواۃ نو چیزوں پر واجب ہے۔ سونا' چاندی' گیہوں' جو' کشمش' کھجور' اونٹ' گائے' بیل اور گوسفند (بھیڑ' بکری' دنبہ) سونے' چاندی اور چوپایوں پر زکواۃ اس وقت عائد ہو گی جب وہ گیارہ مہینے ایک آدمی کی ملکیت میں رہیں اور بارہواں مہینہ شروع ہو گا تو زکواۃ دی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لیس فی مال مستفاد زکواہ حتی یحول علیہ الحول۔ (مستدرک الوسائل)

حاصل کردہ مال پر زکواۃ نہیں ہے جب تک اس پر حول نہ گزرے۔

سونے اور چاندی کے لئے ضروری ہے کہ وہ سکہ کی صورت میں ہوں۔ اگر سونے کا سکہ ہو تو اس کا پہلا نصاب بیس دینار (پانچ تولے ساڑھے سات ماشے) ہے اور چاندی کا سکہ ہو تو اس کا پہلا نصاب دو سو درہم (اکتالیس تولے ساڑھے دس ماشے) ہے اگر اس مقدار سے کم ہوں تو زکواۃ واجب نہ ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من کان عندہ ذھب لا یبلغ عشرین دینار اوفضتہ لا تبلغ مائتی درھم فلیس علیہ زکواۃ۔ (مستدرک الوسائل)

جس کے پاس سونے کے بیس دینار یا چاندی کے دو سو درہم نہ ہوں اس پر زکواۃ نہیں ہے۔

جب سونے یا چاندی کے سکے بقدر نصاب ہوں تو ۴۰ زکواۃ کے طور پر دینا واجب ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ان کان مالہ فضل علی مائی درھم فلیعط خمستہ دراھم۔ (مستدرک الوسائل)

جس کا مال دو سو درہم تک بڑھ جائے وہ پانچ درہم (بطور زکواۃ) دے۔

اگر کسی کے پاس سونے اور چاندی کے سکے ہوں اور وہ اپنے مقررہ نصاب سے کم ہوں تو ان پر زکواۃ نہیں ہے۔ اگرچہ ان دونوں کی مجموعی مالیت بقدر نصاب ہو یا نصاب سے بڑھ جاتی ہو۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لا یجب علیہ ان یضم الذھب الی الفضتہ (مستدرک الوسائل)

زکواۃ دینے والے ضروری نہیں ہے کہ وہ سونے کو چاندی سے منضم کرے۔

گیہوں، جو، کشمش اور خرما پر زکواۃ اس وقت واجب ہو گی جب وہ بقدر نصاب ہوں اور ان کا نصاب ۳۰۰ صاع یعنی اکیس من چوبیس سیر ہے۔ اگر یہ چیزیں بارش یا سیلاب سے سینچی گئی ہوں تو زکواۃ ۱۰ را ہو گی اور اگر ڈول یا رہٹ وغیرہ سے آبپاشی کی گئی ہو تو زکواۃ ۲۰را ہو گی۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

ماسقت السماء او سقی سیحافقیہ العشر وما سقی بالغرب اوالدالیتہ ففیہ نصف العشر۔ (مستدرک الوسائل)

جو بارش یا زمین پر بہنے والے پانی سے سیراب ہو اس کی زکواۃ دسواں حصہ ہے اور جو ڈول یا رہٹ سے سیراب کی جائے اس کی زکواۃ بیسواں حصہ ہے۔

چوپایوں میں حول و نصاب کے علاوہ دو شرطیں زائد ہیں۔ ایک یہ کہ وہ سال بھر چراگاہوں میں چریں اور مالک پر ان کی خوراک کا بار نہ ہو اور دوسرے یہ کہ ان سے بار برداری، کھیتی باڑی، آب کشی وغیرہ کا کام نہ لیا جاتا ہو۔

اونٹوں کا پہلا نصاب پانچ ہے۔ پانچ اونٹوں پر ایک بھیڑ یا بکری دی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اذا بلغ مالہ خمسا من الابل ففیھا شاۃ۔ (مستدرک الوسائل)

جب اونٹوں کی تعداد پانچ تک پہنچ جائے تو ایک بکری بطور زکواۃ دی جائے گی۔

گائے، بیل کا پہلا نصاب تیس ہے۔ تیس گائے، بیلوں پر ایک بچھڑا یا ایک بچھڑی جو دوسرے سال میں داخل ہو چکی ہو بطور زکواۃ دی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لیس فی البقر شئی حتی یبلغ ثلثین فاذا بلغت ثلثین و کانت سائمہ لیست من العوامل ففیھا تبیع او تبیعتہ (مستدرک الوسائل)

جب تک گائے بیل کی تعداد تیس نہ ہو جائے ان پر زکواۃ نہیں ہے اور جب ان کی گنتی تیس ہو جائے اور وہ چرائی پر بسر کرتی ہوں اور بیکار ہوں تو ان کی زکواۃ ایک بچھڑا یا ایک بچھڑی ہے جو دوسرے سال میں داخل ہو چکی ہو۔

بھیڑ، بکریوں کا پہلا نصاب، چالیس ہے چالیس بھیڑوں پر ایک بھیڑ زکواۃ میں دی جائے گی۔

باب الخمس

خمس بھی ایک مالی فریضہ ہے جس کی ادائیگی لازم و واجب ہے۔ خمس اولاد عبدالمطلب ہی کو دیا جائے گا کیونکہ شارع نے ان کے لئے زکواۃ کو حرام کیا ہے اور اس کا عوض خمس کی صورت میں دیا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

نحن واللہ عنی بزوی القربی والذین قرنهم اللہ بنفسہ ونبیہ فقال فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربی و الیتمی والمساکین وابن لسبیل منا خادتہ ولم یجعل لنا فی سم الصدقہ تضیبا اکرم اللہ نبیہ و اکرسنا ان یطعمنااو ساخ ایدی الناس۔ (وافی)

خدا کی قسم (قرآن مجید میں) ذوی القربیٰ سے ہم ہی مراد ہیں جنہیں اللہ نے اپنے اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ (خمس میں) شریک کیا ہے چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے مال کا پانچواں حصہ اللہ رسول اور قرابتداروں یتیموں مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے" یہ سب ہم ہی میں سے ہیں اللہ نے ہمارے لئے صدقہ میں حصہ نہیں رکھا اور ہمیں اس سے بالا تر قرار دیا ہے کہ ہمیں لوگوں کے ہاتھوں کا میل کھلائے۔

خمس جنگ کے ذریعہ حاصل ہونے والے اموال' کانوں سے نکلنے والی اشیاء' دفینوں اور سمندر میں غوطہ لگا کر دستیاب ہونے والی چیزوں پر واجب ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

الخمس یجری من اربعتہ وجوہ من الغنائم التی یصیبھا المسلمون من المشرکین و من المعادن ومن الکنوز ومن الغوص۔ (وسائل الشیعہ)

خمس چار وجوہ پر عائد ہوتا ہے اس مال پر جو مسلمانوں کو (جنگ کے دوران) مشرکوں سے دستیاب ہو اور کانوں اور دفینوں سے جو چیزیں ملیں اور غوطہ لگا کر جو اشیاء حاصل ہوں۔

ان اشیاء کے علاوہ ذرائع کسب و معیشت سے سال کے اخراجات وضع کرنے کے بعد جو بچے اور اس زمین سے جو کافر ذمی مسلمان سے خریدے اور اس مال میں سے جس میں حلال و حرام ملا جلا ہو خمس نکالنا ضروری ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے امیرالمومنین علیہ السلام سے عرض کیا کہ یاامیرالمومنین میں حلال و حرام کا امتیاز کئے بغیر کمائی کرتا رہا ہوں اور بعد میں تائب ہو چکا ہوں اور میرے پاس مال حلال بھی ہے اور مال حرام بھی مگر میں ان دونوں میں امتیاز نہیں کر سکتا اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ حضرتؑ نے فرمایا۔

اخرج خمس مالک فان اللہ عزو جل فذ رضی عن الانسان بالخمس وسائر المال کلہ لک حلال۔
(الفقیہ)

اپنے مال میں سے خمس نکال ڈالو باقی مال تمہارے لئے حلال ہے اس لئے کہ خدائے بزرگ و برتر خمس دینے پر آدمی سے راضی ہو جاتا ہے۔

خمس کی تقسیم اس طرح ہو گی کہ اس کے چھ حصے کئے جائیں گے تین حصے اللہ' رسول اور امام کے یہ حصے سہم امام کہلاتے ہیں اور تین حصے اولاد عبدالمطلب کے یتیموں مسکینوں اور مسافروں کے یہ حصے سہم سادات کہلاتے ہیں پہلے تینوں حصوں کے مالک امام زمانہ علیہ السلام ہیں اور ان کی غیبت میں یہ تینوں حصے مجتہد جامع الشرائط کے سپرد کئے جائیں گے تاکہ وہ ان موارد پر صرف کرے جن سے دین کو نشرو فروغ حاصل ہواور بقیہ تین حصے بنی ہاشم کے یتیموں فقیروں اور ان مسافروں کو جو مسافرت میں ضرورت مند ہو گئے ہوں دے جائیں گے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ھذا الخمس علی ستتہ اجزاء فیاخذ الامام منھا سھم اللہ وسھم الرسول وسھم ذی القربی ثم یقسم الثلثتہ السھام الباقیتہ بین یتامی آل محمد ومساکینھم وابناء سبیلھم۔ (وسائل الشیعہ)

خمس کے چھ حصے ہیں اللہ رسول اور ذی القربیٰ کا حصہ یہ تینوں حصے امام لے گا اور باقی تین حصے سادات کے یتیموں مسکینوں اور مسافروں پر تقسیم کئے جائیں گے۔

باب الجہاد

کفار و مشرکین اور امام برحق سے بغاوت کرنے والوں کے خلاف حرب و پیکار کا نام جہاد ہے۔ یہ ایک ایسا فریضہ ہے جس سے حوزہ اسلام کو دشمن کی تاخت و تاراج سے محفوظ رکھا جا سکتا اور اسلام کی ترقی و ترویج کی راہیں ہموار کی جا سکتی ہیں۔ اگر دشمن کی قوت و طاقت کو کچلا اور ان کے شرانگیز اقدامات کو روکا نہ جائے تو نہ دین فروغ پا سکتا ہے اور نہ امن و سکون بحال ہو سکتا ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

واللہ ماصلحت دنیا ولا دین الابہ۔ (وافی)
خدا کی قسم جہاد کے بغیر نہ دنیا سدھر سکتی ہے اور نہ دین۔

جہاد کے صحیح مورد و محل کی تشخیص نبی یا امام ہی کر سکتا ہے اس لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد اذن امام علیہ السلام ضروری ہے تاکہ غلط کشت و خون سے محفوظ رہا جا سکے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

یا کمیل لاغزو الامع امام عادل۔ (مستدرک الوسائل)
اے کمیل جہاد امام عادل ہی کے ساتھ ہو کر کیا جا سکتا ہے۔

جہاد صرف بالغ اور آزاد مردوں پر واجب ہوتا ہے اور غلاموں، عورتوں اور بچوں پر سے ساقط ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

لیس علی العبید جہاد ما استغنو اعنھم ولا علی النساء ولا علی من لم یبلغ الحلم۔ (مستدرک الوسائل)
غلاموں پر جبکہ ان کے بغیر کام نکل سکتا ہو اور عورتوں اور نابالغ بچوں پر جہاد واجب نہیں ہے۔

جہاد سے منہ موڑنا غضب الٰہی کا باعث اور میدان جنگ سے فرار کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

الفرار من الزحف من الکبائر۔ (مستدرک الوسائل)
جنگ سے فرار کبائر میں داخل ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے فرار کو کفر سے بھی تعبیر کیا ہے چنانچہ جنگ احد میں جب رسول اللہ نے لوگوں کو میدان چھوڑتے دیکھا تو حضرت علی علیہ السلام سے کہا اے علی علیہ السلام تم ان بھاگنے والوں کے ساتھ کیوں نہیں گئے آپؑ نے کہا۔

یا رسول اللہ ارجع کافر ابعد اسلامی۔ (مستدرک الوسائل)

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا اسلام کے بعد میں کفر کی طرف پلٹ جاتا۔

یونہی دشمن کے آگے ہتھیار ڈالنا اور اپنے کو اس کے حوالے کر دینا حمیت اسلامی کے خلاف ہے ایسے لوگوں کو قید و بند سے آزاد کرانے کے لئے فدیہ بیت المال سے نہیں دیا جائے گا۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

من استا سر من غیر جراحتہ مثقلہ فلا یفدی من بیت المال ولکن یفدی من مالہ ان احب اھلہ۔ (وافی)

جو شخص شدید زخمی ہوئے بغیر خود کو دشمن کے قبضہ میں دے دے تو اسے آزاد کرانے کے لئے فدیہ کی رقم بیت المال سے نہیں دی جائے گی البتہ اس کے گھر والے چاہیں تو اس کے مال میں سے دے سکتے ہیں۔

جن لوگوں کے مقابلہ میں محاذ جنگ قائم کیا جاتا ہے وہ تین گروہوں پر منقسم ہیں۔

پہلا گروہ کفار و مشرکین کا ہے ان کے مقابلہ میں اترنے سے پہلے ضروری ہے کہ انہیں اسلام لانے کے لئے کہا جائے۔ اگر وہ دعوت اسلام رد کر دیں تو پھر ان سے جنگ کا جواز پیدا ہو جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لایغزی قوم حتی یدعوا۔ (مستدرک الوسائل)

جب تک کفار کو دعوت اسلام نہ دی جائے ان سے جنگ نہیں کی جائے گی۔

امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے یمن روانہ کیا تو فرمایا۔

یا علی لاتقاتل احدا حتی تدعوہ الی الاسلام۔ (وافی)

اے علی علیہ السلام جب تک اسلام کی دعوت نہ دے لو کسی سے جنگ نہ چھیڑو۔

اسلام نے جنگ و قتال میں ان حربوں سے بشدت منع کیا ہے جو دور جاہلیت میں بروئے کار لائے جاتے تھے چنانچہ دشمن کی ہلاکت و تباہی کے لئے کنوؤں چشموں اور جانوروں کو سیراب کرنے والے تالابوں میں زہر کی آمیزش کر دی جاتی تھی۔ اسلام نے اس کی قطعا" اجازت نہیں دی ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

نہی رسول اللہ ان یلقی السم فی بلاد المشرکین۔ (وافی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین کے شہروں میں زہر ڈالنے سے منع فرمایا ہے۔

زمانہ جاہلیت میں حریف کے لاشہ کو عریاں کر کے گھسیٹا جاتا اور ناک کان اور دوسرے اعضاء کاٹ کر گلے

میں آویزاں کئے جاتے۔ اسلام اس قسم کی بہیمانہ حرکات کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

لاتکشفوا عورۃ ولا تمثلوا القتیل۔ (وافی)

کسی کی پردہ داری نہ کرو اور نہ مرنے کے بعد کسی کے اعضاء و جوارح کاٹو

دشمن کو امان دینے اور جان کے تحفظ کا وعدہ کرنے کے بعد اس پر ہاتھ اٹھانا ناجائز ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من ائتمن رجلا علی دمہ ثم خاس بہ فانا من القاتل بری وان کان المقتول فی النار۔ (وافی)

جو کسی کو امان دے اور پھر دھوکے سے اسے قتل کر دے تو میں اس سے بیزار ہوں اگرچہ مقتول دوزخ ہی میں جائے گا۔

دوسرا گروہ اہل کتاب (یہود' نصاری اور مجوس) کا ہے اگر یہ دعوت اسلام قبول کر لیں تو بہتر ورنہ ان پر جزیہ عائد کیا جائے گا۔ اگر جزیہ سے انکار کر دیں یا جزیہ قبول کرنے کے بعد اس کی خلاف ورزی کریں تو ان سے جنگ کی جائے گی اور در صورتیکہ معاہدہ کے پابند رہیں ان کے مال و جان کی حفاظت کی جائے گی اور ان سے جنگ کرنا جائز نہ ہو گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اوفو البعهد من عاهد تم۔ (مستدرک الوسائل)

جن سے کوئی معاہدہ کیا ہو اس معاہدہ کو پورا کرو۔

تیسرا گروہ ان باغیوں کا ہے جو امام برحق کے خلاف آمادہ بغاوت ہو کر میدان جنگ میں اتر آئیں ان باغیوں میں سے ایک گروہ وہ ہے جس کے پیچھے فوجی طاقت کا ذخیرہ نہ ہو جیسے اصحاب جمل کہ ان کے پیچھے نہ قوت و طاقت تھی اور نہ انہیں تسلط و اقتدار حاصل تھا کہ وہاں سے انہیں کمک پہنچ سکتی ان کے بارے میں حضرتؑ کا طرز عمل یہ رہا کہ جب تک ان کی طرف سے ابتداء نہیں ہوئی آپ نے اپنی سپاہ کو لڑنے کی اجازت نہیں دی اور اسے ہدایات دیتے ہوئے فرمایا۔

لاتقا تلو هم حتی یبلؤ کم فانکم بحمدالله علی حجتہ وترککم ایاهم حتی یبلؤ کم حجتہ اخری لکم علیهم۔ (مستدرک الوسائل)

جب تک وہ پہل نہ کریں تم ان سے جنگ نہ کرنا کیونکہ تم بحمداللہ دلیل و حجت رکھتے ہو اور تمہارا انہیں چھوڑ دینا کہ وہ پہل کریں یہ ان پر دوسری حجت ہو گی۔

ان باغیوں کے پسپا ہونے کے بعد بھاگنے والوں کا تعاقب کرنے' زخمیوں کو ٹھکانے لگانے اور اسیروں کو قتل

کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ چنانچہ حضرتؑ نے جنگ کے فورا" بعد اعلان کیا۔

لا تجیزو اعلی جریح ولا تتبعوا مدبرا ومن اغلق بابہ فھو آمن ومن القی سلاحہ فھو آمن۔ (وافی)

کسی زخمی پر ہاتھ نہ اٹھانا کسی پیٹھ پھرانے والے کا پیچھا نہ کرنا جو دروازہ بند کر لے اور جو ہتھیار رکھ دے وہ محفوظ ہے۔

ان کے مردوں کو غلام اور عورتوں کو کنیز بنانے کا بھی جواز نہیں ہے چنانچہ جنگ جمل کے خاتمہ پر کچھ لوگوں نے حضرتؑ سے کہا کہ ان باغیوں کے بال بچوں اور عورتوں کو ہماری غلامی و کنیزی میں دے دیجئے۔ آپؑ نے فرمایا۔

لیس لکم علیھن ولا علی الذراری من سبیل۔ (متدرک الوسائل)

تمہیں عورتوں اور ان کی آل اولاد پر حق تصرف نہیں ہے۔

اس پر ان لوگوں نے تکرار کیا تو فرمایا کہ تم میں کون ہے جو اپنی ماں عائشہؓ کو اپنے حصہ میں لینا چاہتا ہے یہ سن کر سب خاموش ہو گئے۔

ان کے املاک و اموال کو بھی نہیں لیا جا سکتا۔ البتہ وہ چیزیں جن سے انہوں نے جنگ میں مدد لی ہو اور میدان جنگ میں چھوڑ گئے ہوں انہیں قبضہ میں لیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرتؑ نے اپنے لشکر والوں سے فرمایا۔

ما اجلبوا بہ علیکم واستعانوا بہ علی حربکم وضمہ عسکر ھم و حواہ فھو لکم۔ (متدرک الوسائل)

جن چیزوں کے ساتھ انہوں نے تم پر لشکر کشی کی ہے اور جنگ میں مدد لی ہے اور جو چیزیں میدان جنگ میں ہوں وہ تمہاری ہیں۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے اس استحقاق سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا اور ان پر ایک طرح کا احسان کرتے ہوئے جنگ میں سمیٹا ہوا مال بھی واپس کروا دیا۔ چنانچہ جنگ کے بعد آپ نے موسیٰ ابن طلحہ کو نام لے کر پکارا۔ اسے اور اس کے ساتھیوں کو یقین ہو گیا کہ اسے قتل کرنے کے لئے پکارا جا رہا ہے۔ وہ لرزاں و ترساں حضرتؑ کے سامنے حاضر ہوا آپؑ نے فرمایا اے موسیٰ اللہ سے استغفار کرو اس نے توبہ و استغفار کی اس کے بعد آپؑ نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے چھوڑ دو اور اس سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

اذھب حیث شئت وما وجدت فی عسکرنا من سلاح اوکراع فخذہ واتق اللہ فیما تستقبل من امرک واجلس فی بیتک۔ (متدرک الوسائل)

جہاں جانا چاہتے ہو چلے جاؤ اور ہمارے لشکر میں اپنے ہتھیار اور چوپائے دیکھو تو وہ بھی لے لو اور پیش آئند حالات میں اللہ سے ڈرو اور اپنے گھر میں جا کر بیٹھو۔

دوسرا گروہ وہ ہے جس کے پیچھے قوت و طاقت ہو جیسے اہل شام ان کی پشت پر امیر شام تھا جو تسلط و اقتدار

رکھتا تھا اور شام کا علاقہ اس کے زیر تصرف تھا جہاں سے مزید کمک بھی حاصل کی جا سکتی تھی اور شکست و ہزیمت کی صورت میں انہیں پناہ بھی مل سکتی تھی۔ اس لئے انہیں صرف منتشر کر دینا کافی نہ تھا کیونکہ منتشر ہونے کے بعد وہ اپنی کھوئی ہوئی قوت و طاقت کو دوبارہ جمع کر کے صف آرا ہو سکتے۔ تھے اس بنا پر امکانی حدود تک ان کی سرکوبی ضروری تھی چنانچہ حضرتؑ نے ان کے بارے میں فرمایا۔

یقاتل اھل البغیٰ ویقتلون بکل ما یقتل بہ المشرکون ویستعان بکل ما امکن ان یستعان بہ علیھم من اھل القبلتہ ویوسرون کما یوسرالمشرکون اذا قدر علیھم۔ (مستدرک الوسائل)

باغیوں سے جنگ کی جائے گی اور ہر اس چیز سے انہیں قتل کیا جائے گا جس سے مشرکین کو قتل کیا جاتا ہے اور ان کے خلاف اہل قبلہ سے ہر ممکن مدد لی جائے گی اور جہاں تک بس چلے گا انہیں مشرکوں کی طرح اسیر بنایا جائے گا۔

امیرالمومنین علیہ السلام کے دور خلافت کے غزوات اس امر کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ اگر اسلام لانے کے بعد کچھ لوگ جمیعت یا اقتدار کا سہارا لے کر امام برحق کے خلاف بغاوت پر اتر آئیں تو ان سے کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے اور کن لوگوں کو منتشر و پراگندہ کر دینا کافی ہے اور کن لوگوں کا استیصال ضروری ہے اور ان کے املاک و اموال اور اسراء سے کیا سلوک کیا جانا چاہیئے۔ اگر حضرت کا یہ طرز عمل سامنے نہ ہوتا تو یہ معلوم نہ ہوتا کہ باغیوں سے جنگ چھڑ جانے کی صورت میں اسلامی طریق کار کیا ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

لو لم یقاتلھم علی علیہ السلام لم یدر احد بعدہ کیف یسیر۔ (وافی)

اگر علی علیہ السلام ان لوگوں سے جنگ و قتال نہ کرتے تو کسی کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ اگر آپ کے بعد یہ صورت پیش آئے تو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

نیکی کا حکم دینا امر بالمعروف اور برائی سے منع کرنا نہی عن المنکر کہلاتا ہے۔ یہ اسلام کا ایک اہم ترین فریضہ ہے کیونکہ اسلام کا مقصد اولین نیکی کا شیوع اور برائی کا انسداد ہے اور اس مقصد تک پہنچنے کا یہی ذریعہ ہے کہ ہر شخص جہاں تک ممکن ہو دوسروں کو نیکی کی راہ دکھائے اور برائی سے روکے تاکہ اسلامی خطوط پر ایک مثالی معاشرہ کی تشکیل ہو سکے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

غایتہ الدین الامر با لمعروف والنھی عن المنکر۔ (الغرر آمدی)
دین کی غرض و غایت یہ ہے کہ نیکی کا حکم دیا جائے اور برائی سے منع کیا جائے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی افادیت ایک فرد یا چند افراد تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک روشن منارہ ہے۔ جس کی روشنی چار سو پھیلتی اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو منزل کی راہ دکھاتی ہے۔ اسی ہمہ گیرافادیت کی بنا پر اسے دوسرے اعمال پر فوقیت دی گئی ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

الامر با لمعروف افضل اعمال الخلق۔ (مستدرک الوسائل)
اعمال خلق میں بہترین عمل امر بالمعروف ہے۔

ہر شخص کو بقدر امکان اپنا یہ فرض ادا کرنا چاہئے اگر قوت و طاقت رکھتا ہو تو زور بازو سے برائیوں کی روک تھام کرے۔ اگر ہاتھ سے منع کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے کہے سنے اور اگر زبان میں بھی جرأت اظہار نہ ہو تو دل سے برا سمجھے اور اپنے تیوروں سے اظہار تنفر کرے۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

من ترک انکار المنکر بقلبہ ویدہ ولسانہ فھو میت بین الاحیاء۔ (وافی)
جو شخص دل، ہاتھ اور زبان سے نہی عن المنکر کا فریضہ انجام نہ دے وہ زندوں میں چلتی پھرتی لاش ہے۔

قلبی تنفر اگرچہ نہی عن المنکر کا ادنیٰ درجہ ہے مگر یہ بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی کے احساسات مردہ نہ ہوں تو دوسروں کی پیشانیوں کی شکنیں اور ان کا تنفرانہ رویہ دیکھ کر اپنے اندر محاسبہ کا ایک جذبہ پیدا کرتا ہے جو ایک وقت اسے برائیوں سے دستبردار ہونے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ اسی بنا پر امیرالمومنین علیہ السلام نے عصیاں کاروں سے خندہ روئی و کشادہ پیشانی سے پیش آنے سے منع فرمایا ہے تاکہ ان کا ضمیر انہیں جھنجھوڑے اور گناہ کے ارتکاب کی جرأت و جسارت نہ بڑھے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ادنی الانکار ان تلقی اهل المعاصی بوجوه مکفهرہ۔
(تہذیب)

نہی عن المنکر کا ادنی درجہ یہ ہے کہ بدکرداروں سے تیوریاں چڑھا کر پیش آؤ۔

ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فائدہ ہی کیا جب کہ ہر شخص اپنے افعال و اعمال کا خود جوابدہ ہے۔ اگر کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اس کا فائدہ اسی کو پہنچتا ہے اور کوئی برے کام کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ خود ہی اس کی پاداش سے دوچار ہوتا ہے۔ ہمیں نہ کسی کے اچھے کاموں سے فائدہ پہنچتا ہے اور نہ کسی کے برے کاموں سے نقصان لہٰذا کسی اچھائی کا حکم دے کر یا برائی سے منع کر کے اس کے کاموں میں دخل انداز ہونے اور اس کی خفگی و ناراضگی مول لینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ نظریہ سراسر غلط ہے اس لئے کہ ایک غلط معاشرہ میں انسان خود بھی بے راہ ہوئے بغیر نہیں رہتا اور اگر برائیوں کی آلودگیوں سے پاک و صاف رہنا بھی چاہے تو اس کے لئے معاشرہ کے گرد و پیش کے اثرات سے بچ نکلنا انتہائی مشکل ہو گا۔ اس لئے کہ اچھی زندگی اچھے ماحول میں پروان چڑھتی ہے اور غیر اخلاقی ماحول میں اخلاقی زندگی کی سانسیں اکھڑ جاتی ہیں اور اچھا معاشرہ اسی صورت میں تشکیل پذیر ہو سکتا ہے جب اپنی سود و بہبود کے ساتھ دوسروں کی صلاح و فلاح کی بھی فکر کی جائے اور نیکی کو فروغ دینے اور برائی کو ختم کرنے کے لئے امکانی مساعی سے دریغ نہ کیا جائے۔ تاکہ جس معاشرہ میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے وہ اخلاقی برائیوں سے پاک و صاف رہے۔ اگر نیکی کی طرف دعوت دینے اور برائی کو روکنے کا سلسلہ ختم ہو جائے تو پھر برائیوں کے سیل رواں پر بند نہ باندھا جا سکے گا اور ہر قسم کی برائی اپنے عروج پر پہنچ جائے گی اور جس معاشرہ میں برائیاں عام ہو جائیں وہ قانون فطرت کے ماتحت تباہ و برباد ہوئے بغیر نہیں رہتا اور ظالم حکمرانوں کے شکنجے میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لا تترکوا الامر بالمعروف والنهی عن المنکر فیولی الله اسور کم شرار کم ثم تدعون فلا یستجاب لکم دعاؤ کم۔ (مستدرک الوسائل)

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ترک نہ کرو ورنہ تم میں سے بد ترین لوگوں کو اللہ تم پر مسلط کر دے گا پھر دعائیں مانگتے رہو گے اور تمہاری دعائیں شرف قبولیت حاصل نہ کریں گی۔

ولایت و برائت

ولایت کے معنی یہ ہیں کہ دوستان خدا (انبیاء و آئمہ) سے محبت و دوستی رکھی جائے اور براءت کے معنی یہ ہیں کہ دشمنان خدا (کفار و منافقین) سے نفرت و بیزاری کا اظہار کیا جائے۔ اس ولایت و براءت کو تولا و تبرا سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے کہ دوستان خدا و دشمنان خدا دونوں ایک

دوسرے کی ضد اور ان کے اطوار و اعمال ایک دوسرے کے مخالف و متضاد ہیں۔ اس لئے ایک سے وابستگی کا تقاضا یہ ہے کہ دوسرے سے علیحدگی اختیار کی جائے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک سے دوستی کا دم بھرا جائے اور اس کے دشمن سے بھی دوستی کی پینگیں بڑھائی جائیں بلکہ ایک سے ملا جائے گا تو دوسرے کو چھوڑنا پڑے گا کیونکہ دوست کا دشمن اور دشمن کا دوست، دوست نہیں ہو سکتا کہ دونوں سے رابطہ اتحاد و الفت قائم رکھا جا سکے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

اصدقاؤک ثلاثہ واعداؤک ثلاثہ فاصد قاؤک صدیقک و صدیق صدیقک وعدو عدوک واعداؤک فعدوک وعدو صدیقک و صدیق عدوک۔ (نہج البلاغہ)

تین قسم کے تمہارے دوست ہیں اور تین قسم کے دشمن، دوست یہ ہیں تمہارا دوست تمہارے دوست کا دوست اور تمہارے دشمن کا دشمن اور دشمن یہ ہیں تمہارا دشمن تمہارے دوست کا دشمن اور تمہارے دشمن کا دوست۔

ایک شخص نے امیرالمومنین علیہ السلام سے کہا کہ آپ کو بھی دوست رکھتا ہوں اور فلاں شخص کو بھی۔ آپؑ نے یہ سنا تو فرمایا۔

الآن انت اعور اما ان تعمی و اما ان تبصر۔

اس صورت میں تم یک چشم ہو یا دوسری آنکھ کو پھوڑ کر نابینا ہو جاؤ یا دونوں آنکھوں سے دیکھو۔

مقصد یہ تھا کہ اگر میرے ساتھ میرے دشمن و مخالف کو بھی دوست رکھتے ہو تو مجھے بھی دشمن رکھو اور اس طرح مکمل طور پر اندھے ہو جاؤ یا صرف مجھے دوست رکھو اور پورے بینا و بابصیرت ہو جاؤ۔

ایک طبقہ سے دوستی اور اس کے حریف و مخالف طبقہ سے اظہار بیزاری میں یہ حکمت مضمر ہے کہ انسان جس کو دوست رکھتا ہے اس کے طرز بود و ماند، رفتار و گفتار اور عمل و کردار کو بھی دوست رکھتا ہے اور جس کی طرف سے تنفر رکھتا ہے اس کے حرکات و سکنات کو بھی نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے لہٰذا جسے دوست رکھے گا اس کے اخلاق و عادات اور افعال و اعمال کی پیروی بھی کرے گا اور جس سے متنفر ہو گا اس کے طور طریقوں سے بھی اجتناب برتے گا۔

اسلام میں اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت و وابستگی کا حکم اسی لئے دیا گیا ہے کہ ان کے قول و فعل کا اتباع کیا جائے اور ان کے مخالفین کے طرز عمل سے علیحدگی اختیار کی جائے۔ کیونکہ محبت کا تقاضا اتباع ہے اگر ہم محبت اہل بیت کا دعویٰ کریں اور ان کے احکام کی پابندی نہ کریں یا ان کے دشمنوں سے اظہار نفرت کریں اور طرز عمل انہی کا سا اختیار کریں تو ہم نے نہ محبت کے تقاضوں کو پورا کیا اور نہ نفرت و بیزاری کے تقاضوں سے

عہدہ برآ ہوئے۔ اس لئے کہ اتباع ہے تو محبت و دوستی بھی ہے اور اتباع نہیں تو محبت و دوستی بے سند ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام نے اتباع کو محبت کا معیار قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے۔

من احبنا فليعمل بعملنا۔

جو ہمیں دوست رکھتا ہے اسے چاہئے کہ ہمارے اعمال کے مطابق عمل کرے۔

باب التجارة

تجارت کے معنی خرید و فروخت اور تبادلہ اشیاء کے ہیں اور یہ اجتماعی زندگی کے لئے از بس ضروری ہے کیونکہ کوئی شخص بھی اپنے تمام ضروریات خود مہیا نہیں کر سکتا۔ بلکہ ایک گروہ کی پیدا کردہ چیزیں ہم استعمال کرتے ہیں اور ہماری پیدا کردہ اشیاء دوسروں کے استعمال میں آتی ہیں اور اس طرح معاشرہ کے تمام افراد باہمی احتیاج کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ابتداء میں اشیاء کا تبادلہ اشیاء سے ہوتا تھا۔ پھر اشیاء کا تبادلہ سکہ سے شروع ہوا۔ جس میں طلب و رسد کے رد عمل سے اتار چڑھاو اور قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ یہ خرید و فروخت کبھی اپنی ضرورت اور ذاتی استعمال کے لئے ہوتی ہے اور کبھی کار و کسب کے لئے تاکہ اپنے ضروریات کے لئے نفع کمانے کے ساتھ دوسروں کے ہاتھوں میں ان کی مطلوبہ اشیاء بآسانی پہنچ سکیں۔

اسلام نے فقرو احتیاج کو دور کرنے کے لئے حتی المقدور سعی و طلب لازم و واجب قرار دی ہے۔ تاکہ انسان اپنی اقتصادی حالت بہتر بنائے اور اہل و عیال کی کفالت کے ساتھ مالی عبادات، زکواۃ، خمس، حج وغیرہ بجا لا سکے۔ ان ذرائع معیشت میں سرفہرست تجارت ہے جو آسودہ حالی اور مالی وسعت کا پیش خیمہ ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

تعرضو اللتجارہ فان فیھا غناکم عما فی ایدی الناس۔ (وافی)

تجارت کرو اس لئے کہ تجارت تمہیں ان چیزوں سے مستغنی بنا دے گی جو دوسروں کے ہاتھوں میں ہیں۔

تجارت کا پیشہ اختیار کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے تجارت کے احکام سیکھ لئے جائیں تاکہ بیع و ربا میں فرق اور جائز و ناجائز میں امتیاز کر سکے۔ چنانچہ ایک شخص نے امیرالمومنین علیہ السلام سے کہا کہ میرا ارادہ کاروبار کرنے کا ہے۔ فرمایا کیا دین کے احکام میں تمہیں کچھ سوجھ بوجھ ہے کہا کہ بعد میں ایسا ہو جائے گا۔آپؑ نے فرمایا۔

ویحک الفقہ ثم المتجر فانہ من باع واشتری ولم یسئل عن حرام و حلال ارتطم فی الربوا ثم ارتطم۔ (دعائم الاسلام)

پہلے مسائل سیکھو پھر تجارت کرو کیونکہ جو شخص خرید و فروخت کرتا ہے اور حرام و حلال کے بارے میں دریافت نہیں کرتا وہ سود میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

ذیل میں خرید و فروخت کے چند احکام حضرتؑ کے ارشادات کی روشنی میں درج کئے جاتے ہیں۔

نجس العین اشیاء کی خرید و فروخت ناجائز ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

بائع الخبیثات و مشتر بھا فی الاثم سواء۔ (مستدرک الوسائل) ناپاک چیزوں کا بیچنے والا اور خریدنے والا دونوں گناہ میں برابر ہیں۔

جن چیزوں کی خرید و فروخت ناجائز ہے ان کی فروخت سے جو رقم حاصل ہو گی اس میں بھی تصرف ناجائز ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من السحت ثمن المیتۃ و ثمن الکلب و ثمن الخنزیر۔ (مستدرک الوسائل) مردار کتے اور خنزیر کی فروخت کی رقم حرام ہے۔

البتہ شکاری کتے کی بیع جائز ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لا باس بثمن کلب الصید۔ (مستدرک الوسائل) شکاری کتے کی رقم فروخت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

آلات لہو و لعب کی خرید و فروخت بھی ناجائز ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ومن السحت ثمن الشطرنج والنرو۔ (مستدرک الوسائل) شطرنج اور نرو کی رقم فروخت حرام ہے۔

اگر کوئی پاک چیز نجس ہو جائے اور اس کا پاک کرنا ممکن نہ ہو تو اسے ایسے کام کے لئے جس میں طہارت شرط نہ ہو فروخت کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے نجس ہو جانے والے تیل کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔

یبیعہ لمن یعملہ صابونا۔ (مستدرک الوسائل) ایسے شخص کے ہاتھ بیچ ڈالے جو اسے صابن بنانے کے کام میں لانا چاہتا ہو۔

اگر مالک اپنے مملوکہ مال کو خریدار کے سپرد کرنے پر قدرت نہ رکھتا ہو تو وہ بیع صحیح نہ ہو گی۔ حضرت فرماتے ہیں۔

لایجوز بیع العبد الآبق والدابتہ الضالتہ۔ (مستدرک الوسائل) بھاگے ہوئے غلام اور گم شدہ جانور کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

جو چیز بیچی جائے اور جو چیز اس کے تبادلہ میں لی جائے وہ کمیت و کیفیت کے اعتبار سے بائع و مشتری کے علم

میں ہونا چاہئے۔ اگر اس کا وزن یا پیمائش یا عدد معلوم نہ ہو گا تو بیع جائز نہ ہو گی۔ چنانچہ حضرتؑ سے دریافت کیا گیا کہ وہ مچھلی جو کسی جوہڑ وغیرہ میں ہو یا وہ دودھ جو تھنوں کے اندر ہو یا وہ اون جو بھیڑ، بکری سے الگ نہ کی گئی ہو اس کی بیع جائز ہے۔ آپؑ نے فرمایا۔

ھذا کلہ لایجوز لانہ مجھول غیر معروف یقل اویکثر۔ (مستدرک الوسائل)	ان تمام چیزوں کی بیع ناجائز ہے خواہ کم ہوں یا زیادہ کیونکہ (وزن و مقدار میں) انجانی ہیں۔

دو شخص حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان میں سے ایک نے کہا کہ میں نے اپنے اس ساتھی کے ہاتھ چند ٹوکریاں فروخت کیں اور ان میں سے پانچ ٹوکریاں مستثنیٰ کر دیں۔ ان میں کچھ بڑھیا ہیں اور کچھ گھٹیا۔ کیا یہ بیع صحیح ہے؟ حضرتؑ نے فرمایا کہ یہ بیع فاسد ہے۔ کیونکہ جن ٹوکریوں کو مستثنیٰ کیا گیا تھا وہ متعین و معلوم نہ تھیں۔

جب ایک جنس کو جو تول یا ناپ سے بکتی ہو اسی جنس کے عوض بیچا جائے تو دونوں جنسوں کو مساوی و ہموزن ہونا چاہئے اور اگر کمی بیشی کے ساتھ فروخت کیا جائے گا تو یہ زیادتی ربا میں شمار ہو گی مثلاً" ایک من گیہوں کو ایک من ایک سیر گیہوں کے عوض بیچا جائے تو ایک سیر ربا قرار پائے گا اور ربا حرام ہے۔ لہٰذا جنس کا اسی جنس سے کمی بیشی کے ساتھ معاملہ صحیح نہ ہو گا۔ اسی طرح اگر دونوں جنسیں ناپ تول میں برابر ہوں مگر ایک جنس نقد ہو اور ایک جنس ادھار مثلاً" آج ایک من جو دیا جائے اور اس کے عوض ایک من جو یا ایک من گیہوں کچھ عرصہ کے بعد دینا قرار پائے تو یہ بیع بھی صحیح نہ ہو گی اس لئے کہ زیادتی خواہ مقدار میں ہو یا مدت کے اعتبار سے ہو وہ ربا میں شمار ہو گی۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لاتبع الحنطتہ بالشعیر الایدا بید ولاتبع قیفزا من حنطہ بقفزین من شعیر۔ (وافی)	گیہوں کو جو کے عوض نہ بیچو مگر اس طرح کہ ایک ہاتھ سے دو اور ایک ہاتھ سے لو اور گیہوں کی ایک مقدار کو جو کی دوگنی مقدار کے عوض فروخت نہ کرو۔

حضرتؑ نے گیہوں اور جو کے تبادلہ کا ذکر فرمایا ہے اور گیہوں اور جو سودی معاملات میں ایک ہی جنس شمار ہوتے ہیں۔ چنانچہ کافی میں ہے۔

کان امیرالمومنین علیہ السلام یعد الشعیر بالحنطتہ۔	امیرالمومنین علیہ السلام گیہوں اور جو کو ایک ہی جنس شمار کرتے تھے۔

اگر سونے کو سونے یا چاندی کے عوض یا چاندی کو چاندی یا سونے کے عوض فروخت کیا جائے تو یہ معاملہ اس صورت میں صحیح ہو گا جب بائع و مشتری ایک دوسرے سے الگ ہونے سے پہلے مال ایک دوسرے کے سپرد کر دیں۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لا یبتاع رجل فضتہ بذھب الایدا بید ولا یبتاع ذھبا بفضتہ الایدا بید۔ (وافی)

کوئی چاندی کو سونے کے بدلے اور سونے کو چاندی کے عوض نہ خریدے مگر موقع ہی پر ایک ہاتھ سے دے اور ایک ہاتھ سے لے۔

اگر خریدار قیمت ادا کر دے اور مال کچھ عرصہ کے بعد دینا قرار پائے تو یہ بیع سلف ہے جو اس صورت میں صحیح ہے جب مال کی مقدار اور مال دینے کی مدت متعین ہو۔ اگر مدت کی تعیین نہ ہو مثلاً" یہ کہہ دیا جائے کہ جب فصل کٹے گی یا جب فصل اٹھائی جائے گی تو مال دیا جائے گا تو یہ مدت مبہم ہو گی اور معاملہ صحیح نہ ہو گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لا باس بالبیع السلف بکیل معلوم الی اجل معلوم ولا یسلم الی دیاس او حصاد۔ (وافی)

بیع سلف میں کوئی مضائقہ نہیں ہے مگر مال کی مقدار اور مدت مقرر ہونا چاہئے فصل کے کٹنے یا بالیوں سے دانوں کے نکلنے پر نہ چھوڑا جائے۔

اگر بائع مقررہ وقت پر مال مہیا نہ کر سکے اور خریدار مزید توقف نہ کرنا چاہتا ہو تو وہ اپنی دی ہوئی رقم واپس لے سکتا ہے اور اگر بائع بازار کے اتار چڑھاؤ کے پیش نظر اس رقم پر کچھ اضافہ کر کے دینا چاہے تو وہ اضافہ ربا میں شمار ہو گا۔ لہٰذا اس کا لینا جائز نہ ہو گا۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

من اشتری طعاما او علفا الی اجل فان لم یجد شرطہ واخذور قالا محالہ قبل ان یاخذ شرط فلا یا خذ الا راس مالہ۔ (استبصار)

جو شخص مدت کی تعیین کے ساتھ غلہ یا چارہ خریدے اور وقت پر یہ چیزیں حسب معاہدہ مہیا نہ ہو سکیں اور مزید توقف نہ کرنا چاہتا ہو تو وہ صرف اصل رقم کے واپس لینے کا مجاز ہو گا۔

اگر خریدار بائع کو پابند کرنے کے لئے کچھ رقم پیشگی دے تو یہ رقم قیمت میں وضع ہو گی اور معاملہ صحیح قرار پائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لا یجوز العربون الاان یکون ھنا من الثمن (تہذیب)

پیشگی دی ہوئی رقم اسی صورت میں جائز ہو گی جب وہ قیمت میں شامل کی جائے۔

باب الودیعہ

کسی کے پاس کوئی چیز بطور امانت رکھنا ودیعت کہلاتا ہے۔ جب امین اس کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کر لے تو اس پر اس کی حفاظت لازم اور مالک کے طلب کرنے پر فوراً واپس کرنا ضروری ہے خواہ امانت رکھوانے والا مسلمان ہو یا کافر۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لا ایمان لمن لا دیانۃ لہ۔ (مستدرک الوسائل) جس میں امانتداری نہیں وہ ایمان سے عاری ہے۔

اگر حفاظت کے سروساماں کے باوجود وہ چیز ضائع ہو جائے تو امانت رکھنے والا اس کا ضامن نہ ہو گا۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لیس علی المؤتمن ضمان۔ (مستدرک الوسائل) امانت رکھنے والا (کھو جانے کی صورت میں) ضامن نہیں ہے۔

ایک مرتبہ امیرالمومنین علیہ السلام غسل کے لئے حمام میں گئے اور کپڑے حمام کے مالک کے پاس رکھ دیئے۔ جب نہا کر باہر نکلے تو دیکھا کہ کپڑے غائب ہیں۔ آپؑ نے فرمایا کہ کپڑے حمام والے کے پاس بطور امانت تھے لہٰذا وہ ضامن نہیں ہے۔

دو آدمیوں نے کسی کے پاس کچھ رقم امانت رکھوائی۔ ایک کا ایک دینار تھا اور دوسرے کے دو دینار۔ ان میں سے ایک دینار کھو گیا۔ یہ معاملہ حضرت کے سامنے پیش کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا کہ جس کے دو دینار تھے اسے ایک دینار دے دیا جائے اور دوسرا دینار دونوں میں آدھا آدھا تقسیم کیا جائے۔

حضرتؑ نے یہ فیصلہ اس بنا پر کیا کہ یہ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ ایک دینار والے کا دینار ضائع ہوا ہے یا دو دینار والے کا۔ مگر ایک دینار بہرحال دو دینار والے کا تھا اس لئے ایک دینار اسے دے دیا گیا اور دوسرے دینار کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ ان دونوں میں سے کس کا ہے۔ لہٰذا وہ دونوں میں آدھوں آدھ بانٹ دیا گیا کیونکہ تقاضائے عدل کو بروئے کار لانے کی اس کے علاوہ کوئی صورت نہ تھی۔

دو آدمیوں نے ایک قرشیہ عورت کے پاس سو دینار بطور امانت رکھے اور کہا کہ اگر ہم دونوں ایک ساتھ آئیں تو یہ امانت واپس کی جائے اور اگر ہم میں سے ایک آئے تو اسے یہ رقم نہ دی جائے۔ جب اس امانت پر ایک سال کا عرصہ گزرا تو ان میں سے ایک اس قرشیہ کے پاس آیا اور کہا کہ میرا ساتھی انتقال کر چکا ہے لہٰذا وہ امانت مجھے واپس دی جائے۔ اس قرشیہ نے کہا کہ یہ معاہدہ کے خلاف ہے اور رقم کے دینے سے انکار کیا۔ جب اس نے اصرار

کیا اور اس قرشیہ کے عزیز و اقارب سے بھی کہلوایا تو اس نے وہ دینار اس کے حوالے کر دیئے۔ اس واقعہ کے ایک سال بعد دوسرا آدمی اس قرشیہ کے پاس آیا اور امانت کی واپسی کا مطالبہ کیا اس نے کہا کہ تمہارا ساتھی یہ کہہ کر امانت واپس لے جا چکا ہے کہ تم مر چکے ہو۔ کہا کہ میں تمہارے سامنے زندہ و سلامت موجود ہوں وہ دینار میرے حوالے کرو جب یہ جھگڑا بڑھا تو تصفیہ کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس آئے۔ حضرت عمرؓ نے اس قرشیہ کے خلاف فیصلہ کیا اور اسے ادائے امانت کا ذمہ دار قرار دیا۔ اس قرشیہ نے کہا کہ آپ اس کا فیصلہ حضرت علیؑ کے سپرد کریں وہ جو فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہو گا۔ جب یہ معاملہ حضرتؑ کے سامنے پیش ہوا تو آپ سمجھ گئے کہ ان دونوں نے دوبارہ رقم وصول کرنے کے لئے یہ کھیل کھیلا ہے۔ آپؑ نے اس شخص سے کہا کہ کیا تم نے یہ طے نہیں کیا تھا کہ تم دونوں ایک ساتھ آؤ گے تو امانت کے واپس لینے کے حقدار ہو گے۔ کہا کہ ہاں یہ طے پایا تھا۔ فرمایا کہ پھر تم اپنے ساتھی کو لاؤ اور اپنی امانت واپس لے جاؤ۔ وہ یہ دیکھ کر کہ اس کے فریب کا پردہ چاک ہو چکا ہے اپنے دعویٰ سے دستبردار ہو گیا۔

باب الوصیتہ

وصیت یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی میں ایسی چیز کی سفارش کر جائے جس پر اپنے مرنے کے بعد عملدر آمد چاہے۔ اس وصیت کا تعلق کبھی کسی کام کی انجام دہی سے ہوتا ہے جیسے تجہیز و تکفین' ادائے صوم و صلواۃ وغیرہ اور کبھی مال سے تعلق ہوتا ہے۔ جیسے یہ کہ اس کے مرنے کے بعد فلاں شخص کو اتنا مال دیا جائے۔ اسلام نے امور خیر کے سلسلہ میں اگرچہ وصیت کو بڑی اہمیت دی ہے۔ مگر اس کے ساتھ وارثوں کے مالی حقوق کا تحفظ بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اس طرح کہ ترکہ کی ایک تہائی سے زائد کی وصیت کو ناقابل عمل قرار دیا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

من اوصی بوصیتہ نفذت من ثلثہ۔ (متدرک الوسائل)

جو شخص وصیت کرے تو وہ اس کے ترکہ کے تہائی حصہ میں نافذ ہو گی۔

البتہ اگر وارث اجازت دے دیں تو ایک تہائی سے زائد میں بھی وصیت کا نفاذ ہو سکتا ہے اور در صورتیکہ مرنے والے کا کوئی وارث ہی نہ ہو تو وہ تمام مال کی وصیت کر سکتا ہے۔ چنانچہ حضرتؑ نے اس شخص کے بارے میں جس کا دور و نزدیک کا کوئی رشتہ دار نہ تھا فرمایا۔

یوصی بما لہ حیث شاء من المسلمین فی المساکین وابن السبیل۔ (متدرک الوسائل)

وہ مسلمان کے ناداروں اور مسافروں کے لئے جہاں چاہے اپنے مال کے بارے میں وصیت کرے۔

اگر میت کے ذمہ قرض ہو تو مخارج تجہیز و تکفین اور ادائے قرض کے بعد وصیت پر عمل کیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اول مایبداء من ترکتہ المیت بعد الکفن بالدین ثم الوصیتہ ثم المیراث۔ (متدرک الوسائل)

دفن و کفن کے اخراجات کے بعد میت کے ترکہ میں سے پہلے قرضہ ادا کیا جائے گا پھر وصیت پر عمل ہو گا اور پھر میراث کی نوبت آئے گی۔

اگر وصیت کرنے والا تہائی مال کی وصیت کرے اور پھر غلطی سے کسی کے ہاتھوں قتل ہو جائے تو اس کی دیت کے تہائی حصہ میں بھی وصیت نافذ ہو گی۔ چنانچہ ایک ایسے شخص کے بارے میں حضرتؑ نے فرمایا۔

ثلث دیتہ داخل فی وصیتہ۔ (متدرک الوسائل)

دیت کا تہائی حصہ بھی وصیت میں داخل ہو گا۔

اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ مرنے والا میرے لئے اتنے مال کی وصیت کر گیا ہے تو اس کا دعویٰ دو

مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں یا چار عورتوں کی گواہی سے ثابت ہو گا اور اگر تین عورتیں گواہی دیں تو تین چوتھائی میں، دو عورتیں گواہی دیں تو نصف میں اور ایک عورت گواہی دے تو ایک چوتھائی میں وصیت نافذ ہو گی۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کے سامنے وصیت کا ایک دعویٰ پیش ہوا اور وصیت کی گواہی ایک عورت نے دی۔ آپؑ نے ایک چوتھائی میں وصیت نافذ کی اور تین چوتھائی میں اسے کالعدم قرار دیا۔

اگر وصیت مبہم الفاظ میں ہو اس طرح کہ واضح طور پر مال کی مقدار معین کرنے کے بجائے یہ کہے کہ میرے مال میں سے ایک سہم (حصہ) یا ایک جزء یا ایک شے صدقہ کر دی جائے یا فلاں شخص کو دی جائے تو پہلی صورت میں مال کا آٹھواں حصہ حسب وصیت صرف کیا جائے گا۔ چنانچہ ایک شخص نے وصیت کی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے مال کا ایک حصہ صدقہ کر دیا جائے مگر حصہ کی تعیین نہ کی اس کے وارثوں نے حضرتؑ کی طرف رجوع کیا۔ آپؑ نے فرمایا کہ مال کا آٹھواں حصہ صدقہ میں دے دیا جائے اور اس آیت کی تلاوت کی۔

انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیها والمولفة قلوبهم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل الله وابن السبیل۔

صدقہ فقیروں محتاجوں اور اس کے کارندوں کے لئے ہے اور ان کے لئے جن کی دلجوئی مقصود ہے اور غلاموں کو چھڑانے قرضداروں کا قرضہ چکانے خدا کی راہ میں صرف کرنے اور پردیسیوں کے لئے۔

پھر فرمایا کہ اس آیت میں صدقات کے آٹھ حصے بیان کئے گئے ہیں لہٰذا مال کا ایک حصہ اس کا آٹھواں حصہ ہو گا۔

دوسری صورت میں ساتواں حصہ دیا جائے گا۔ چنانچہ ایک شخص نے اپنے مال کے ایک جزء کی وصیت کی مگر اس جزء کی مقدار بیان نہ کی اس کے مرنے کے بعد اس کے وارثوں میں جزء کے بارے میں اختلاف ہوا جب کسی نتیجہ پر نہ پہنچے تو حضرتؑ سے استفسار کیا آپؑ نے فرمایا کہ اس کے مال کا ساتواں حصہ وصیت کے مطابق صرف کیا جائے اور یہ آیت پڑھی۔

لها سبعة ابواب لکل باب منهم جزء مقسوم۔

اس کے سات دروازے ہوں گے ان میں سے ہر گروہ کے حصے میں ایک دروازہ آئے گا۔

پھر فرمایا کہ اس آیت میں ساتویں حصے پر جزء کا اطلاق ہوا ہے۔

تیسری صورت میں چھٹا حصہ دیا جائے گا۔ چنانچہ امام زین العابدین علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے اپنے مال میں سے شے کی وصیت کی ہے اس شے کا اطلاق کتنی مقدار پر ہو گا۔ آپؑ نے فرمایا۔

الشئی فی کتاب علی واحد من ستتہ۔ (الفقیہ) کتاب علی میں شے سے مراد چھٹا حصہ ہے۔

ایک شخص نے وصیت کی کہ میرے بعد میرے قدیم غلاموں کو آزاد کر دیا جائے مگر وارث یہ طے نہ کر سکے کہ کتنی مدت کے گزرنے پر وہ قدیم کہے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے حضرتؑ کی طرف رجوع کیا۔ آپؑ نے فرمایا کہ ہر وہ غلام آزاد کر دیا جائے جو چھ مہینے تک اس کی ملکیت میں رہ چکا ہو اور اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

والقمر قدرنا منازل حتی عاد کالعرجون القدیم۔ ہم نے چاند کی منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ وہ کھجور کی پرانی ٹہنی کے مانند پلٹ آتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ قدیم کا اطلاق چھ ماہ کے گزرنے پر ہوتا ہے۔ چنانچہ شاخ خرما کو قدیم کہا گیا ہے اور اس پر سے پھل اتار لینے کے بعد اس کے خشک ہونے اور پرانی صورت اختیار کرنے میں چھ ماہ لگتے ہیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے وصیت کی کہ اس کے غلاموں میں سے ایک تہائی غلام آزاد کر دئے جائیں۔ ان میں سے کسے آزاد کیا جائے اور کسے غلامی میں رہنے دیا جائے۔ فرمایا کہ۔

کان علی علیہ السلام یسھم بینھم۔ (ارشاد) حضرت علی اس صورت میں ان میں قرعہ ڈالتے تھے۔

ایک شخص نے اپنے ایک رفیق کو دس ہزار درہم دئے اور اسے وصیت کی کہ جب میرا بیٹا بالغ ہو جائے تو جو تم چاہو وہ اسے دے دینا۔ جب وہ بچہ بالغ ہوا تو اس نے حضرتؑ سے فیصلہ چاہا۔ آپؑ نے وصی کو بلا کر دریافت کیا کہ تم اسے کیا دینا چاہتے ہو۔ کہا ایک ہزار درہم۔ فرمایا کہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ تم نو ہزار چاہتے ہو اور اس کے باپ کی وصیت یہ تھی کہ جو تم چاہو وہ اسے دینا۔ لہٰذا نو ہزار درہم اسے دو اور ایک ہزار درہم تم لو۔

باب المیراث

قبل اسلام عرب میں میراث کا حقدار صرف بڑے لڑکے کو سمجھا جاتا تھا اور دوسری اولاد محروم رہتی تھی اور جس دولت کو مختلف ہاتھوں میں بٹنا چاہئے تھا وہ ایک ہاتھ سے نکل کر پھر ایک ہاتھ میں جمع ہو جاتی تھی۔ جس سے سرمایہ داری کی ہمت افزائی ہوتی تھی اور معاشرتی برائیاں فروغ پاتی تھیں اور بیویوں کو میراث دئے جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس لئے کہ خود ان کا شمار متروکہ اموال میں ہوتا تھا۔ جن پر مرنے والے کے ورثاء قابض و متصرف ہو جاتے تھے۔ بعض دوسرے مذاہب میں بھی صرف اولاد نرینہ وارث ہوتی ہے اور لڑکیوں کو ورثہ نہیں دیا جاتا۔ مگر اسلام کا طریق کار ان مذاہب کے طریق کار سے مختلف ہے اور گردش زر کے اصول پر مبنی ہے۔ تاکہ ایک متوازن و معتدل معاشی نظام تشکیل پا سکے۔ اس نے کسی کو حق میراث سے محروم نہیں کیا۔ عورت کو باپ کا ترکہ بھی دلوایا ہے اور شوہر کا بھی اور اولاد چھوٹی ہو یا بڑی، لڑکی ہو یا لڑکا سب کا حصہ رکھا ہے اور کسی کو نظرانداز نہیں کیا۔ کیونکہ تمام اولاد تعلق و قرابت کے اعتبار سے برابر ہوتی ہے اور قرابت ہی سے میراث کا استحقاق پیدا ہوتا ہے قرابت کے درجات مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی قریب ہوتا ہے اور کوئی قریب تر۔ اسی تفاوت اور قرابت کے درجات کے اعتبار سے وارثوں کے طبقے مقرر کئے ہیں اور میراث کے ضوابط ترتیب دیئے ہیں۔ البتہ چند امور ارث سے محرومی کا باعث ہوتے ہیں۔ ان امور کو موانع ارث سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پہلا مانع کفر ہے۔ اگر وارث غیر مسلم ہو تو وہ مسلمان کا ورثہ نہیں پائے گا۔ البتہ مسلمان غیر مسلم کا وارث ہو گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

المسلم یرث الذمی والذمی لایرث المسلم۔ (مستدرک الوسائل)

مسلمان کافر کا وارث ہو گا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہو گا۔

دوسرا مانع غلامی ہے۔ اگر وارث غلام ہو تو وہ ورثہ سے محروم رہے گا اور درصورتیکہ غلام کے علاوہ کوئی وارث نہ ہو تو مورث کے مال سے خرید کر اسے آزاد کر دیا جائے گا اور پھر بقیہ مال اسے ورثتہ" دیا جائے گا۔ چنانچہ حضرتؑ سے ایک شخص کے بارے میں جس کا وارث فقط ایک غلام تھا دریافت کیا گیا۔ آپؑ نے فرمایا۔

یشتری من ترکتہ فیعتق ویعطی باقی الترکتہ۔ (مستدرک الوسائل)

مرنے والے کے ترکہ میں سے اسے خرید کر آزاد کر دیا جائے اور باقی ترکہ اسے دے دیا جائے۔

اگر میراث کے تقسیم ہونے سے پہلے کافر مسلمان ہو جائے یا غلام آزاد کر دیا جائے تو انہیں میراث دی جائے گی۔ چنانچہ حضرتؑ سے ان کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا۔

لھا حظھما منہ وان کان ذلک بعد موت المیت مالم یقسم المیراث فاذا قسم فلاحظ لھما فیہ۔ (مستدرک الوسائل)

وہ دونوں ترکہ میں سے حصہ پائیں گے اگرچہ ان کا اسلام اور آزادی مورث کے مرنے کے بعد ہو بشرطیکہ میراث تقسیم نہ ہوئی ہو اور اگر تقسیم ہو چکی ہو تو پھر ان کا حصہ نہیں ہو گا۔

تیسرا مانع قتل ہے۔ اگر وارث اپنے مورث کو عمداً" قتل کر دے تو وہ ورثہ سے محروم قرار پائے گا۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

القاتل لا یرث ممن قتلہ۔ (مستدرک الوسائل)

قاتل مقتول کا وارث نہیں ہو گا۔

اگر قتل غلطی سے واقع ہوا ہو تو اس صورت میں ورثہ سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ ایک شخص نے اپنی ماں کو قتل کر دیا۔ حضرتؑ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا۔

ان کان خطاء فان لہ میراثھا وان کان قتلھا متعمدا" فلا یرثھا۔ (استبصار)

اگر ماں کو غلطی سے قتل کر دیا ہے تو اس کا وارث ہو گا اور اگر جان بوجھ کر قتل کیا ہے تو وارث نہیں ہو گا۔

قرابت و عزیز داری کی بنا پر ورثہ پانے والوں کے تین طبقے ہیں۔

پہلے طبقہ میں ماں، باپ اور بیٹا، بیٹی ہیں اور اگر بیٹا، بیٹی نہ ہو تو ان کی اولاد، ان کے قائم مقام ہو گی۔ ان میں سے کسی ایک فرد کے ہوتے ہوئے کوئی اور ترکہ کا حقدار نہ ہو گا۔ البتہ بیوی شوہر کے ترکہ میں سے اور شوہر بیوی کے ترکہ میں سے مقررہ حصہ لے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لا یرث مع الولد الا الابوان والزوج والمراہ۔ (وافی)

اولاد کے ساتھ ماں باپ بیوی اور شوہر کے علاوہ اور کوئی ورثہ نہ پائے گا۔

اگر مرنے والے کا صرف ایک لڑکا ہو تو تمام مال اسے ملے گا۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

ان لم یترک غیر ولد واحد فالمیراث کلہ لہ۔ (مستدرک الوسائل)

اگر مرنے والا ایک لڑکے کے علاوہ کوئی وارث نہ چھوڑے تو وہ لڑکا تمام مال کا وارث ہو گا۔

اگر مرنے والے کی اکیلی لڑکی ہو تو اسے آدھا ترکہ مقررہ حصہ کی بنا پر اور آدھا حصہ قرابت کی بنا پر دیا جائے گا۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

ان ترک بنتا واحدہ فللہ بنتہ النصف بالمیراث المسمی ویرد علیھا النصف الثانی بالرحم۔ (مستدرک الوسائل)

اگر مرنے والا ایک لڑکی چھوڑ جائے تو اسے نصف مقررہ حصہ کی بنا پر اور بقیہ نصف قرابت کی بنا پر ملے گا۔

اگر دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو انہیں ترکہ میں سے دو تہائی مقررہ حصہ کی بنا پر اور بقیہ ایک تہائی قرابت کی بنا پر دی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ان ترک ابنتین فلکل واحدہ منھما الثلث بالمیراث کما قال اللہ عزو جل ویرد علیھما الثلث الباقی بالرحم۔ (مستدرک الوسائل)

اگر دو بیٹیاں چھوڑ جائے تو ان میں سے ہر ایک کو ایک ایک تہائی مقررہ حصہ کی بنا پر جیسا کہ قرآن مجید میں ہے دی جائے گی اور بقیہ ایک تہائی قرابت کی بنا پر۔

اہلسنت کے نزدیک ایک لڑکی کو اس کا مقررہ حصہ نصف اور دو یا دو سے زیادہ لڑکیوں کو ان کا مقررہ حصہ دو تہائی دینے کے بعد بقیہ پدری رشتہ داروں میں تقسیم کیا جائے گا۔ اس کا نام تعصیب ہے جو مذہب شیعہ میں باطل ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

اذا کان وارث ممن لہ فریضتہ فھو احق بالمال۔ (وافی)

اگر کسی وارث کا حصہ مقرر ہو تو فریضہ سے زائد کا بھی وہی حقدار ہو گا۔

اگر کسی کے اولاد نہ ہو اور وارث صرف ماں باپ ہوں تو ترکہ کو تین حصوں پر تقسیم کر کے دو تہائی باپ کو اور ایک تہائی ماں کو دیا جائے گا۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ قال فی الرجل اذا ترک ابویہ فلامہ الثلث و للاب الثلثان۔ (مستدرک الوسائل)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ کا ارشاد ہے کہ جب کوئی شخص ماں باپ چھوڑ جائے تو ماں کا حصہ ایک تہائی اور باپ کا حصہ دو تہائی ہو گا۔

اگر ماں باپ کے ساتھ مرنے والے کے دو بھائی یا چار بہنیں یا ایک بھائی اور دو بہنیں حقیقی یا پدری ہوں تو اگرچہ ماں باپ کی موجودگی کی وجہ سے انہیں کچھ نہیں ملے گا مگر ان کا وجود ماں کے لئے تہائی ترکہ سے مانع ہو گا۔ اس صورت میں ماں کو چھٹا حصہ اور باپ کو بقیہ پانچ حصے دیئے جائیں گے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لایحجب الام عن الثلث الا الولد والاخوہ۔ (وافی)

مرنے والے کی اولاد اور بھائی ماں کے لئے ایک تہائی سے مانع ہوتے ہیں۔

اگر کوئی شخص ایک لڑکی اور ماں باپ چھوڑے تو ترکہ کو پانچ حصوں پر تقسیم کیا جائے گا تین حصے لڑکی کو ایک حصہ ماں کو اور ایک حصہ باپ کو دیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

یقسم المال علی خمستہ اسھم فما اصاب ثلثتہ فللابنتہ وما اصاب سھمین فللابوین۔ (وسائل الشیعہ)

مال کو پانچ حصوں پر تقسیم کیا جائے گا تین حصے لڑکی کو ایک حصہ باپ کو اور ایک حصہ ماں کو ملے گا۔

اگر کوئی شخص ایک لڑکی اور باپ چھوڑے تو ترکہ کو چار حصوں میں تقسیم کیا جائے گا تین حصے لڑکی کو اور ایک حصہ باپ کو دیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

یقسم المال علی اربعتہ اسھم فما اصاب ثلثتہ فللابنتہ وما اصاب سھما فللاب۔ (وسائل الشیعہ)

مال کو چار حصوں پر تقسیم کیا جائے گا تین حصے لڑکی کو اور ایک حصہ باپ کو ملے گا۔

اگر کوئی شخص ایک لڑکی اور ماں چھوڑے تو ترکہ کو چار حصوں پر تقسیم کر کے تین حصے لڑکی کو اور ایک حصہ ماں کو دیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

یقسم المال علی اربعتہ اسھم فما اصاب ثلثہ اسھم فللابنتہ وما اصاب سھما فللام۔ (وسائل الشیعہ)

ترکہ کو چار حصوں پر تقسیم کیا جائے گا تین حصے لڑکی کو اور ایک حصہ ماں کو ملے گا۔

اگر کوئی عورت، شوہر ماں اور باپ چھوڑے تو اس کے ترکہ کو چھ حصوں پر تقسیم کیا جائے گا تین حصے شوہر کو اور دو حصے ماں کو ملیں گے اور باقی ایک حصہ باپ کو دیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

امرأۃ ماتت و ترکت زوجھا وابویھا فللزوج النصف ثلثتہ اسھم وللام الثلث تاما سھمان وللاب السدس سھم۔ (وافی)

جو عورت مر جائے اور اپنے پیچھے شوہر اور ماں باپ چھوڑ جائے تو اس کے ترکہ میں سے شوہر کو چھ حصوں میں سے آدھا، ماں کو تہائی اور باپ کو چھٹا حصہ ملے گا۔

اگر وارثوں میں ماں باپ اور دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں اور شوہر یا بیوی ہو تو شوہر کو اس کا چوتھائی حصہ یا بیوی کو اس کا آٹھواں حصہ اور ماں اور باپ ہر ایک کو چھٹا حصہ دیا جائے گا اور باقی لڑکیوں میں برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔ چنانچہ عبیدہ سلمانی کہتے ہیں کہ۔

انہ اعطی الزوج الربع مع الابنتین وللابوین السد سین والباقی رد علی البنتین۔ (وسائل الشیعہ)

حضرت نے دو لڑکیوں کی موجودگی میں شوہر کو چوتھائی حصہ اور ماں اور باپ کو چھٹا چھٹا حصہ دیا اور باقی دونوں لڑکیوں کو دے دیا۔

ان حصص کی تقسیم کا طریقہ یہ ہو گا کہ ترکہ کو چوبیس حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ چھ حصے شوہر کو' چار حصے باپ کو' چار حصے ماں کو اور دس حصے دونوں لڑکیوں کو دیئے جائیں گے۔ جو ان میں مساوی تقسیم ہوں گے اور اگر شوہرکے بجائے بیوی ہو تو چوبیس حصوں میں سے تین حصے بیوی کو' چار حصے باپ کو' چار حصے ماں کو اور باقی تیرہ حصے دونوں لڑکیوں میں برابر تقسیم ہوں گے۔

مقررہ حصص کے اعتبار سے ماں باپ کا حصہ ایک تہائی اور دو یا دو سے زیادہ لڑکیوں کا حصہ دو تہائی ہوتا ہے۔ مگر انہیں ان کا مقررہ حصہ دے دینے کے بعد بیوی یا شوہر کے لئے کچھ نہیں بچتا۔ لہٰذا اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لڑکیوں کے حصہ میں سے شوہر یا بیوی کے حصہ کے بقدر کمی کر کے شوہر یا بیوی کا حصہ نکالا جاتا ہے۔ چنانچہ پہلی صورت میں شوہر کی شمولیت کی وجہ سے لڑکیوں کے حصہ میں سے چھ حصوں کی اور دوسری صورت میں بیوی کی شمولیت کی وجہ سے تین حصوں کی کمی کر دی گئی ہے۔ یہ کمی ماں' باپ اور شوہر یا بیوی کے حصہ میں نہیں ہو گی۔ اہلسنت کے نزدیک اس کمی کو پورا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اصل فریضہ کو بڑھا کر تمام ورثاء کے حصوں میں کمی کر دی جاتی ہے۔ تاکہ بیوی یا شوہر کا حصہ نکل سکے مثلاً" جب ماں باپ اور دو لڑکیوں کے ساتھ بیوی ہو تو اصل ترکہ کو چوبیس پر تقسیم کرنے کے بجائے اس پر تین کا اضافہ کر کے ستائیس حصے قرار دے لئے جاتے ہیں۔ جن میں سے آٹھ ماں' باپ کو سولہ دونوں لڑکیوں کو اور تین حصے بیوی کو دے کر تقسیم حصص کی تکمیل کر لی جاتی ہے۔ مگر اصل فریضہ پر تین بڑھا دینے کے نتیجہ میں ہر ایک کے حصہ میں کمی واقع ہو گی یہ کمی جو تمام وارثوں کے حصہ میں ہوتی ہے "عول" کہلاتی ہے اور عول مذہب امامیہ میں باطل ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

ان السهام لاتعول۔ (وافی)

تمام ورثاء کے حصے میں کمی نہیں کی جاتی۔

اگر میت کے ورثاء میں ماں کے ساتھ حقیقی یا پدری یا مادری بھائی ہوں تو تمام ترکہ ماں کو ملے گا اور بھائیوں کو طبقہ مابعد میں ہونے کی بنا پر کچھ نہیں ملے گا۔ چنانچہ حماد ابن عثمان کہتے ہیں کہ میں نے امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے پوچھا کہ ایک شخص ماں اور بھائی چھوڑ گیا۔ ان کے حصص کی تقسیم کیسے ہو گی۔ آپ نے فرمایا کہ امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام ترکہ اسے دیتے تھے جو میت سے زیادہ نزدیک ہوتا تھا۔ حماد نے کہا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بھائی کو کچھ نہیں ملے گا۔ فرمایا۔

قد اخبرتک ان علیا کان یعطی المال الاقرب فالاقرب۔ (وسائل الشیعہ)

میں تمہیں بتا چکا کہ علی ابن ابی طالب ترکہ قریب تر کو دیتے تھے۔

حضرت عمرؓ کا ایک فیصلہ یہاں پر درج کیا جاتا ہے جس میں انہوں نے ماں کے ساتھ پہلے مادری بھائیوں کو اور پھر حقیقی بھائیوں کو شریک قرار دے لیا۔ چنانچہ ابن شیبہ اور بیہقی نے اپنے سنن میں تحریر کیا ہے کہ کچھ لوگ حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور کہا کہ ایک عورت نے شوہر' ماں' دو مادری اور دو حقیقی بھائی چھوڑے ہیں' آپ ان کے حصص کی تعیین کر کے مال تقسیم کر دیجئے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ آدھا حصہ شوہر کو' چھٹا حصہ ماں کو اور باقی ایک تہائی دونوں مادری بھائیوں کو دے دیا جائے۔ میت کے حقیقی بھائیوں نے یہ سنا تو ان میں سے ایک نے کہا کہ آپ نے دونوں مادری بھائیوں کو چھٹا چھٹا حصہ دلوایا ہے اور ہمیں محروم کر دیا ہے حالانکہ جس قرابت کی بنا پر انہیں ترکہ دلوایا ہے اس قرابت میں ہم بھی شریک ہیں۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ان کی بات وزن رکھتی ہے کہا کہ اچھا نصف شوہر کو چھٹا حصہ ماں کو اور باقی حقیقی اور مادری بھائیوں میں مساوی تقسیم کر دیا جائے۔ ایک شخص نے یہ تضاد و اختلاف دیکھا تو کہا کہ آپ نے پہلے تو حقیقی بھائیوں کو محروم الارث قرار دیا اور پھر انہیں ورثاء میں شریک کر لیا یہ کیوں؟ کہا کہ پہلا حکم پہلے دن کے لئے تھا اور دوسرا حکم دوسرے دن کے لئے ہے۔ اس موقع پر یہ نہیں کہتے کہ پہلا حکم اشتباہ کی بنا پر تھا اور دوسرا حکم صحیح ہے بلکہ ایک طرح سے دونوں فیصلوں کو صحیح قرار دیتے ہیں اور پہلے حکم کی تردید ضروری نہیں سمجھتے۔ اسی بنا پر مشہور فقہا' ابو حنیفہ' احمد' زفر اور ابن ابی لیلی نے حضرت عمرؓ کے پہلے قول کو اختیار کیا اور مالک اور شافعی نے دوسرے قول کو قبول کیا اور اس طرح تضاد بیانی نے فقہی اختلاف کی بنیاد رکھ دی۔ حالانکہ حضرت عمرؓ اگر آیہ قرآنی **واولو الارحام بعضهم اولی ببعض فی کتاب اللہ** "جو لوگ آپس میں قرابت رکھتے ہیں وہ کتاب اللہ کی رو سے ایک دوسرے کے ترکہ کے زیادہ حقدار ہیں" پر نظر کرتے تو نہ مادری بھائیوں کو ترکہ دلواتے اور نہ حقیقی بھائیوں کو اس لئے کہ ماں طبقہ اولی میں ہے اور اس کی موجودگی میں بھائیوں کو وہ مادری ہوں یا حقیقی ترکہ میں سے کچھ نہیں ملتا۔ البتہ بیوی اور شوہر ہر طبقہ کے ساتھ اپنے مقررہ حصے کے وارث ہوتے ہیں۔ لہذا نصف ترکہ شوہر کو ملے گا اور نصف ماں کو۔

دوسرا طبقہ دادا' دادی' نانا' نانی اور بھائی بہن کا ہے۔ اگر دادا' دادی نہ ہوں تو پڑدادا' پڑدادی اور بھائی بہن نہ ہوں تو بھتیجے بھانجے وارث ہوں گے۔ یونہی اس سلسلہ بالا و پائین میں جو مرنے والے سے زیادہ نزدیک ہو گا وہ ورثہ پائے گا۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

ان کل ذی رحم بمنزلہ الرحم الذی یجربہ الا ان یکون وارث اقرب الی المیت فیحجبہ۔ (وافی)

ہر قرابتدار اس فرد کی جگہ لیتا ہے جس کے واسطہ سے اسے قرابت حاصل ہوئی ہو مگر یہ کہ کوئی وارث میت سے قریب تر ہو اس صورت میں اقرب اس

کے وارث ہونے میں حائل ہو گا۔

اگر مرنے والے کے سگے بھائی، بہن بھی ہوں اور پدری بھائی، بہن بھی تو صرف سگے بھائی، بہن وارث ہوں گے اور پدری بھائی بہن کچھ نہیں پائیں گے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اعیان بنی الام یرثون دون بنی العلات (وسائل الشیعہ)

سگے بھائی وارث ہوں گے اور سوتیلی ماں کی اولاد وارث نہ ہو گی۔

اگر بھائی کے ساتھ دادا بھی ہو تو دونوں نصف نصف کے وارث ہوں گے اور اگر دادا کے ساتھ متعدد بھائی ہوں تو سب کا حصہ مساوی ہو گا۔ چنانچہ ابن عباس کہتے ہیں۔

کتب الی علی ابن ابی طالب فی ستة اخوه وجد ان اجعله کا حلهم۔ (وسائل الشیعہ)

علی ابن ابی طالب نے چھ بھائیوں اور دادا کی میراث کے بارے میں مجھے تحریر فرمایا کہ میں دادا کو وہی حصہ دوں جو ہر بھائی کا ہے۔

اگر سگے بھائی نہ ہوں تو پدری بھائی، دادا کے ساتھ برابر کے وارث ہوں گے۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

کان علی یورث الاخ من الاب مع الجد۔ (وافی)

حضرت علی دادا کے ساتھ پدری بھائی کو وارث قرار دیتے تھے۔

اگر میت کے بھائی، بہن نہ ہوں تو ان کی اولاد وہ حصہ لے گی جو ان کے ماں، باپ کا تھا۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ان علیا علیہ السلام کان یورث ابن الاخ مع الجد میراث ابیہ۔ (وافی)

علی علیہ السلام دادا کے ساتھ بھتیجے کو اس کے باپ کا حصہ دلواتے۔

اگر دادا کے ساتھ ایک مادری بھائی یا بہن ہو تو اسے چھٹا حصہ دیا جائے گا اور باقی دادا کو اور اگر متعدد ہوں تو انہیں ایک تہائی دیا جائے گا اور دو تہائی دادا کو۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ان الاخوه من الام یرثون مع لجد الثلث۔ (وسائل الشیعہ)

دادا کے ساتھ مادری بھائیوں کو ایک تہائی ترکہ دیا جائے گا۔

تیسرے طبقہ میں چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ ہیں۔ اگر پہلے اور دوسرے طبقہ کے وارث نہ ہوں تو انہیں

میراث ملے گی۔

اگر مرنے والے کے وارث صرف چچا اور ماموں ہوں تو دو تہائی ترکہ چچا اور ایک تہائی ماموں کو ملے گا۔ چنانچہ حضرتؑ سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص مرگیا اور اس نے چچا اور ماموں چھوڑے اس کا ترکہ کیسے تقسیم ہو گا۔ فرمایا۔

العم الثلثان وللخال الثلث۔ (مستدرک الوسائل) دو تہائی چچا کو اور ایک تہائی ماموں کو دی جائے گی۔

اگر مرنے والے کے وارث پھوپھی اور خالہ ہوں تو دو تہائی پھوپھی اور ایک تہائی خالہ کو دی جائے گی حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

للعمتہ الثلثان وللخالتہ الثلث۔ (مستدرک الوسائل) دو تہائی پھوپھی اور ایک تہائی خالہ پائے گی۔

اگر مرنے والے کے چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ نہ ہوں تو ان کا حصہ ان کی اولاد کو ملے گا البتہ اگر کسی کا باپ کی طرف سے چچا ہو اور ایسے چچا کی اولاد بھی ہو جو ماں باپ دونوں کی طرف سے چچا ہوتا ہے تو اس صورت میں ترکہ صرف سگے چچا کی اولاد کو ملے گا۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اعیان بنی الام اقرب من بنی العلات۔ (وسائل الشیعہ) پدری و مادری رشتہ دار پدری رشتہ داروں سے زیادہ نزدیک ہوتے ہیں۔

شوہر اور بیوی ہر طبقہ میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں۔ اگر شوہر کے اولاد ہو تو اس کے ترکہ میں سے بیوی کو آٹھواں حصہ اور اولاد نہ ہو تو چوتھائی حصہ دیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لایزاد الزوج علی النصف و نما ینقص من الربع ولا تزا والمراۃ علی الربع ولا تنقص من الثمن۔ (وسائل الشیعہ) شوہر کا حصہ نصف ترکہ سے زائد نہیں ہوتا اور ایک چوتھائی سے کم نہیں ہوتا اور عورت کا حصہ ایک چوتھائی سے زائد اور آٹھویں حصہ سے کم نہیں ہوتا۔

اگر بیویاں متعدد ہوں تو چوتھے یا آٹھویں حصہ کو ان پر مساوی طور پر تقسیم کیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ان کن اربعا او دون ذلک فھن فیہ سواء۔ (وسائل الشیعہ) اگر بیویاں چار یا اس سے کم ہوں ان کے مقررہ حصہ میں سب کا حصہ مساوی ہو گا۔

اگر بیوی کے علاوہ کوئی وارث نہ ہو تو بیوی صرف اپنا مقررہ حصہ لے گی اور باقی تین چوتھائی حق امام علیہ

السلام ہے اور اگر وارث صرف شوہر ہو تو وہ تمام ترکہ لے گا۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

الزوج یحوز المال کلہ اذا لم یکن غیرہ۔ (وافی) — اگر شوہر کے علاوہ کوئی اور وارث نہ ہو تو وہ تمام مال لے گا۔

اگر شوہر نے بیوی سے مجامعت نہ کی ہو جب بھی شوہر بیوی کا اور بیوی شوہر کی وارث ہو گی۔ چنانچہ حضرتؑ سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص مرگیا اور غیرمدخولہ بیوی چھوڑ گیا۔ کیا وہ عدہ رکھے گی؟ فرمایا۔

نعم علیھا العدہ ولھا المیراث کاملہ۔ (مستدرک الوسائل) — ہاں وہ عدہ بھی رکھے گی اور پوری میراث بھی پائے گی۔

اگر طلاق رجعی واقع ہونے کے بعد شوہر یا بیوی مدت عدہ کے اندر مر جائے تو دونوں میں جو زندہ ہو وہ دوسرے کا وارث ہو گا۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ھی ترث و تورث ماکانت فی الدم فی التطلیقتین الاولتین۔ (مستدرک الوسائل) — جب تک عورت پہلی یا دوسری طلاق کے عدہ کے اندر ہو شوہر کی وارث ہو گی اور شوہر بھی اس کا وارث ہو گا۔

ایک مرتبہ ایک عورت اپنی سوت کے ساتھ حضرت عثمانؓ کے پاس آئی اور کہا کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دی تھی اور طلاق کے تھوڑے عرصے بعد انتقال کر گیا۔ میری مدت عدہ ابھی ختم نہیں ہوئی لہٰذا اس کے ترکہ میں سے مجھے حصہ ملنا چاہیے۔ حضرت عثمانؓ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے کہا کہ اس کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام سے دریافت کیا جائے۔ جب حضرتؑ کی طرف رجوع کیا گیا تو آپؑ نے اس عورت کا دعویٰ سننے کے بعد فرمایا کہ اس سے قسم لی جائے کہ اس نے طلاق کے بعد تین حیض نہیں دیکھے۔ اگر یہ قسم کھائے تو اسے ترکہ میں سے اس کا حصہ دیا جائے۔ اس عورت نے قسم کھانے سے انکار کیا اور میراث سے دستبردار ہو گئی۔

بیوی کو باغ، کھیت، مکان وغیرہ کی زمین سے کچھ نہیں ملے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ان النساء لیس لھن من عقار الرجل اذا توفی عنھن شئی۔ (وسائل الشیعہ) — شوہر اگر بیوہ چھوڑ کر مرجائے تو اسے شوہر کی زمین سے ترکہ نہیں ملے گا۔

اگر وارثوں میں کوئی ہیجڑا ہو اور یہ معلوم نہ ہو سکے کہ وہ مردوں میں شامل ہے یا عورتوں میں تو اگر وہ مردانہ عضو سے پیشاب کرتا ہو تو اسے مرد قرار دے کر مردوں والا حصہ دیا جائے گا اور زنانہ عضو سے پیشاب کرتا ہو تو اسے عورتوں والا حصہ دیا جائے گا۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

كان امير المومنين عليه السلام يورث الخنثى من حيث يبول۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام ہیجڑے کو جس عضو سے پیشاب کرتا تھا اس کے اعتبار سے میراث دیتے تھے۔

ایک مرتبہ چند شامی حضرتؑ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ ہم ایک الجھن میں پڑے ہوئے ہیں۔ آپؑ سے اس کا حل چاہتے ہیں۔ فرمایا وہ الجھن کیا ہے۔ کہا کہ ہمارا باپ مال کثیر چھوڑ کر مرگیا ہے اور ہم چند بھائی ہیں۔ ان میں سے ایک کے اندر عورت و مرد دونوں کی علامتیں موجود ہیں۔ ہم نے اسے دوسرے بھائیوں سے آدھا حصہ دینا چاہا مگر وہ مصر ہے کہ اسے دوسرے بھائیوں کے مساوی حصہ دیا جائے۔ فرمایا کہ تم نے اس کا حل معاویہ سے بھی دریافت کیا ہے۔ کہا کہ ہم ان کے پاس گئے تھے مگر وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اور ہمیں مشورہ دیا کہ ہم آپؑ کی طرف رجوع کریں اور یہ ظاہر نہ کریں کہ ہم ان کے ایما سے آپؑ کے ہاں آئے ہیں۔ حضرتؑ نے یہ سنا تو فرمایا۔

لعن الله قوما يرضون بقضاء نا و يطعنون علينا فى ديننا۔ (مستدرک الوسائل)

ان لوگوں پر اللہ کی پھٹکار ہو جو ہمارے فیصلوں پر تو راضی ہو جاتے ہیں اور دین کے سلسلہ میں ہم پر طعن و تشنیع کرتے ہیں۔

تم ایسا کرو کہ اپنے بھائی سے کہو کہ وہ پیشاب کرے اگر پیشاب مردانہ عضو سے نکلے تو اسے مرد قرار دے کر پورا حصہ دو اور اگر زنانہ عضو سے پیشاب کرے تو اسے آدھا حصہ دو۔ جب ایسا کیا گیا تو اس نے مردانہ عضو سے پیشاب کیا۔ جس پر حضرتؑ نے اسے دوسرے بھائیوں کے برابر میراث کا حقدار قرار دیا۔

اگر مردانہ و زنانہ دونوں جگہوں سے پیشاب نکلتا ہو تو پھر جس عضو سے پہلے پیشاب نکلتا ہو اس کے مطابق اسے میراث دی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اذا بال منهما جميعا ورث بابهما سبق۔ (مستدرک الوسائل)

اگر دونوں جگہوں سے پیشاب کرے تو اس عضو کا اعتبار کیا جائے گا جس سے پہلے پیشاب نکلے۔

اگر ان علامات سے تشخیص نہ ہو سکے اور یہ طے نہ کیا جا سکے کہ وہ مردوں کے زمرہ میں شمار ہوتا ہے یا عورتوں کے۔ تو ایک دفعہ اسے مرد فرض کر کے اور ایک دفعہ عورت فرض کر کے حصہ نکالا جائے اور پھر ان دونوں حصوں کا نصف اسے دیا جائے مثلاً" کسی کا وارث ایک لڑکا ہو اور ایک ہیجڑا تو اس ہیجڑے کو لڑکا ہونے کی صورت میں بارہ حصوں میں سے چھ حصے ملتے اور لڑکی ہونے کی صورت میں چار حصے ملتے۔ لہٰذا پہلے اسے چھ حصوں کا نصف یعنی تین حصے دیئے جائیں گے اور پھر چار حصوں کا نصف یعنی دو حصے اسے دیئے جائیں گے اس طرح لڑکے کو سات حصے اور ہیجڑے کو پانچ حصے ملیں گے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فان خرجا جمیعا ورث نصف میراث الرجل و نصف میراث المراہ (مستدرک الوسائل)

اگر دونوں جگہوں سے ایک ساتھ پیشاب نکلتا ہو تو اسے آدھا حصہ مرد کی میراث کا اور آدھا حصہ عورت کی میراث کا دیا جائے گا۔

اگر ہیجڑا پیدا ہونے کے بعد مرجائے اور پیشاب کرنے کی نوبت ہی نہ آئے تو اس صورت میں عورت و مرد دنوں کے حصہ کا نصف نصف اس کی طرف منتقل کیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فان لم یبل من واحد منھما حتی یموت فنصف میراث المراہ و نصف میراث الرجل۔ (وسائل الشیعہ)

اگر کسی ایک جگہ سے بھی پیشاب نہ کرے یہاں تک کہ مرجائے تو آدھی میراث عورت کے اعتبار سے اور آدھی میراث مرد کے اعتبار سے اس کی طرف منتقل کی جائے گی۔

اگر کسی مولود کے دو سر اور ایک دھڑ ہو تو اگر دونوں سر ایک ساتھ بیدار ہوں تو ایک کی ورنہ دو کی میراث پائے گا۔ چنانچہ حضرتؑ کے دور خلافت میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کے دو سر تھے۔ آپؑ سے دریافت کیا گیا کہ وہ میراث کے سلسلہ میں ایک تصور ہو گا یا دو۔ فرمایا کہ جب وہ سوئے تو شور مچا کر اسے بیدار کرو اگر ان میں سے ایک سوتا رہے اور ایک جاگ اٹھے تو دو کی میراث پائے گا اور اگر دونوں سر بیک وقت بیدار ہوں تو ایک کی میراث پائے گا۔

اگر دو یا چند افراد جن میں باہمی توارث ہو ڈوب کر یا کسی دیوار کے نیچے دب کر مرجائیں اور یہ معلوم نہ ہو سکے کہ پہلے کون مرا ہے تو انہیں آپس میں ایک دوسرے کا وارث قرار دے کر ان کا مقررہ حصہ ان کی طرف منتقل کر دیا جائے گا۔ جو مرنے والوں کے زندہ وارثوں میں تقسیم ہو گا۔ چنانچہ ایک مرد اور اس کی بیوی گھر کی چھت بیٹھنے سے ہلاک ہو گئے۔ حضرتؑ سے ان کی میراث کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ تو آپؑ نے فرمایا۔

یرث کل واحد منھما زوجہ۔ (وسائل الشیعہ)

دونوں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔

یہ باہمی توارث صرف اس مال میں ہو گا جو مرنے سے پہلے ان کی ملکیت میں تھا اور وہ مال جواب ان کی طرف منتقل ہوا ہے اس میں توارث نہیں ہو گا۔ چنانچہ ایک ہی گھر کے چند افراد دریا میں غرق ہو گئے۔ حضرتؑ سے ان کی میراث کے بارے میں پوچھا گیا۔ تو آپؑ نے فرمایا۔

یورث ھولاء من ھولاء و ھولاء من ھولاء ولا یرث ھولاء مما ورثوا من ھولاء شیاء ولا یورث ھولاء مما ورثوا من ھولاء شیاء۔ (وسائل الشیعہ)

ان میں ہر ایک دوسرے کا وارث ہو گا لیکن جو مال اب ان کی طرف منتقل ہوا ہے اس میں ایک دوسرے کا وارث نہیں ہو گا۔

اگر یہ معلوم نہ ہو سکے کہ پہلے کون مرا ہے لیکن آثار و قرائن سے یہ ظاہر ہو کہ ان میں سے فلاں پہلے مرا ہو گا اور فلاں بعد میں تو بعد میں مرنے والے کو وارث قرار دیا جائے گا چنانچہ ایک عورت اور ایک مرد طاعون میں مبتلا ہو کر ایک بستر پر مردہ پائے گئے۔ اس صورت میں کہ مرد کے ہاتھ پیر عورت کے اوپر تھے۔ حضرت نے اس عورت کی میراث مرد کو منتقل کی اور فرمایا۔

انہ مات بعدھا۔ (وسائل الشیعہ)

مرد عورت کے بعد مرا ہے۔

یہ بظاہر اس لئے کہ مرد کے ہاتھ پیر کا عورت کے اوپر ہونا اس امر کا قرینہ تھا کہ وہ بعد میں مرا ہے۔ حضرتؑ نے ایک مورد پر قرعہ سے بھی کام لے کر وارث کی تعیین کی ہے۔ چنانچہ یمن میں ایک مکان کی چھت بیٹھ گئی اور گھر کے تمام افراد اس کے نیچے دب کر ہلاک ہو گئے۔ مگر دو بچے زندہ بچ رہے ان میں ایک آزاد تھا اور ایک غلام۔ مگر آزاد اور غلام کی تمیز نہ ہو سکی۔ حضرت کے سامنے یہ قضیہ پیش ہوا۔ آپؑ نے قرعہ ڈالا اور ایک کو آزاد قرار دے کر وارث ٹھہرایا اور دوسرے کو آزاد کر دیا۔

باب الیمین

یمین کے معنی قسم و سوگند کے ہیں۔ قسم کبھی کسی امر کے وقوع کی یقین دہانی کے لئے اور کبھی کسی فعل یا ترک کی پابندی اپنے اوپر عائد کرنے کے لئے کھائی جاتی ہے۔ وہ قسم جو کسی واقعہ کی یقین دہانی کے لئے ہو اگر خلاف واقع ہو تو قسم کھانے والا گنہگار ہو گا۔ اس لئے کہ سچی قسم کھانا مکروہ اور جھوٹی قسم کھانا حرام ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

ان الیمین الکاذبتہ وقطیعتہ الرحم تذران الد یار بلاقع من اھلھا۔ (مستدرک الوسائل)

جھوٹی قسم اور قطع رحمی گھروں کو ان کے رہنے والوں سے خالی و ویران کر دیتی ہے۔

اور وہ قسم جس کے ذریعہ انسان مستقبل میں اپنے کو پابند کرتا ہے۔ اگر اس کی پابندی نہ کرے تو اس پر کفارہ عائد ہو گا۔ کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کرے یا دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا کپڑا پہنائے اور یہ نہ ہو سکے تو تین روزے رکھے۔ یہ قسم "**یمین العقد**" کہلاتی ہے اور صرف اللہ اور اس کے مخصوص اسماء ہی سے منعقد ہوتی ہے۔ اگر اللہ کے اسماء کے علاوہ کسی اور نام کی قسم کھائی جائے یا صرف کہا جائے کہ میں قسم کھاتا ہوں یا حلف اٹھاتا ہوں تو قسم منعقد نہ ہو گی۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

اذا قال الرجل اقسمت او حلفت فلیس بشئی حتی یقول اقسمت باللہ او حلفت باللہ۔ (وافی)

جب کوئی شخص یہ کہے کہ میں قسم کھاتا ہوں یا حلف اٹھاتا ہوں تو یہ قسم نہ ہو گی قسم اس وقت ہو گی جب یہ کہے کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں یا اللہ کے نام پر حلف اٹھاتا ہوں۔

قسم کے انعقاد کے لئے ضروری ہے کہ قسم کے الفاظ زبان پر جاری کئے جائیں۔ لیکن قسم کھانے والا گونگا ہو تو اشارہ سے قسم کھائی جا سکتی ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام دعاوی و خصومات میں گونگے سے اس طرح قسم لیتے تھے کہ کاغذ کے پرزہ پر قسم کے الفاظ تحریر کرتے اور اسے پانی میں گھول دیتے اور اسے پینے کے لئے کہتے اگر وہ پی لیتا تو اسے قسم قرار دیتے اور پینے سے انکار کرتا تو اسے قسم سے انکار سمجھتے۔ چنانچہ ایک شخص نے امیرالمومنین علیہ السلام کے سامنے ایک گونگے کو پیش کیا اور کہا کہ اس نے مجھ سے کچھ رقم بطور قرض لی تھی اور اب قرض سے انکار کرتا ہے۔ حضرتؑ نے قرض خواہ سے ثبوت طلب کیا مگر اس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ اس صورت میں گونگے پر قسم عائد ہوتی تھی۔ حضرتؑ نے اس گونگے کے بھائی کو بلا کر اس کے پاس بٹھا دیا اور قرآن مجید طلب کر کے اس گونگے سے پوچھا کہ یہ کیا ہے اس نے سر آسمان کی طرف اٹھایا اور اشارہ سے بتایا کہ یہ کتاب اللہ ہے۔ پھر آپ نے کاغذ کے پرزے پر قسم کے الفاظ تحریر کئے اور اسے پانی سے دھویا اور اس سے کہا کہ یہ پانی پی لو۔ اس نے پینے سے انکار کیا۔ حضرتؑ

نے فرمایا کہ یہ قسم سے انکار ہے۔ لہٰذا قرضہ اس کے ذمہ واجب الادا ہے۔

قسم کے موقع پر تبرکاً انشاء اللہ کہنا مستحب ہے اور اگر قسم کے موقع پر انشاء اللہ نہ کہے تو جب یاد آئے کہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

الاستثناء فی الیمین متی ماذکر بعد وان کان بعد اربعین صباحا(ثم تلا ھذہ الایتہ) واذکرر بک اذا نسیت۔ (مستدرک الوسائل)

جب بھی یاد آئے قسم کے سلسلہ میں انشاء اللہ کہے اگرچہ چالیس دنوں کے بعد یاد آئے (پھر اس آیت کی تلاوت کی) اپنے پروردگار کا ذکر کرو جب تم بھول جاؤ۔

اگر انشاء اللہ بطور تبرک نہ کہے بلکہ واقعاً قسم کو مشیت الٰہی پر معلق کرے تو اس صورت میں قسم کی خلاف ورزی پر کفارہ نہ ہو گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من استثنی فی الیمین فلا حنث ولا کفارہ۔ (وسائل الشیعہ)

جو شخص قسم کو اللہ کی مشیت سے وابستہ کرے وہ قسم شکنی کا مرتکب نہ سمجھا جائے گا اور نہ اس پر کفارہ عائد ہو گا۔

باب النذر والعہد

نذر یہ ہے کہ انسان کسی ایسی چیز پر عمل پیرا ہونے یا اس سے اجتناب کرنے کی پابندی مخصوص الفاظ کے ذریعہ اپنے اوپر عائد کرے جس کا کرنا اور نہ کرنا اس کے دسترس میں ہو اور اس میں شرعاً رجحان بھی پایا جاتا ہو۔ لہٰذا کسی مستحب و واجب کے ترک کرنے یا کسی مکروہ و حرام کے بجا لانے کی نذر مانی جائے گی تو نذر صحیح نہ ہو گی۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لا نذر فی معصیت۔ (وسائل الشیعہ)　　معصیت کے کاموں میں نذر نہیں مانی جائے گی

ایک شخص نے حضرتؑ سے کہا کہ میں نے منت مانی تھی کہ اگر میں فلاں کام سے باز نہ رہا تو اپنے بیٹے کو مقام ابرہیم علیہ السلام پر ذبح کروں گا۔ مگر میں اس فعل کا مرتکب ہوا ہوں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ تم ایک مینڈھا ذبح کرو اور اس کا گوشت مسکینوں اور ناداروں پر صدقہ کر دو۔

صاحب استبصار و وسائل نے تحریر کیا ہے کہ اسے استحباب پر محمول کیا جائے گا کیونکہ یہ فعل ناجائز تھا اور فعل ناجائز میں نذر منعقد نہیں ہوتی۔

ایک عورت نے نذر مانی کہ وہ اپنے چاروں ہاتھ پیروں پر چل کر طواف کرے گی۔ حضرتؑ سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ وہ سات چکر اپنے دونوں ہاتھوں کے لئے اور سات چکر اپنے دونوں پیروں کی لئے لگائے۔

یہ حکم بھی استحباب پر محمول کیا جائے گا کیونکہ یہ صورت طواف غیر مشروع ہے جو نذر کے انعقاد سے مانع ہے۔

نذر کا اس طرح ادا کرنا واجب ہے جس طرح مانی گئی ہو۔ لہٰذا کوئی شخص حج یا زیارت کے لئے پیادہ پا جانے کی نذر مانے تو اسے پیادہ پا ہی جانا ہو گا۔ اگر سوار ہو کر جائے گا تو نذر سے عہدہ برآ نہ ہو گا۔ البتہ اگر راہ میں دریا حائل ہو جائے جسے کشتی کے بغیر عبور نہ کیا جا سکتا ہو تو کشتی پر سوار ہو سکتا ہے۔ مگر جہاں تک ممکن ہو کشتی میں کھڑا رہے۔ چنانچہ حضرتؑ سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے پیادہ پا حج کرنے کی نذر مانی تھی مگر راستے میں نہر پڑتی ہے اس صورت میں اسے کیا کرنا چاہیئے فرمایا کہ وہ کشتی میں کھڑا ہو کر نہر کو عبور کرے۔

یہ اس صورت میں جب اسے یہ علم نہ ہو کہ راستے میں نہر یا دریا سے واسطہ پڑے گا اور اگر اسے یہ معلوم ہو کہ راستے میں دریا پڑتا ہے اور اسے کشتی کے بغیر عبور نہیں کیا جا سکتا اور خشکی کا کوئی متبادل راستہ بھی نہیں ہے تو

یہ نذر منعقد نہ ہو گی کیونکہ نذر کے لئے ضروری ہے کہ اس پر مقدرت ہو۔

اگر روزہ' نماز یا صدقہ کی نذر مانے اور تعداد یا مقدار کی تعیین نہ کرے تو اتنی مقدار یا تعداد میں اسے ادا کرے جس پر روزہ' نماز یا صدقہ صادق آ سکے مثلاً" روزہ کی نذر مانے اور عدد کی تعیین نہ کرے تو ایک روزہ رکھنا یا نماز کی نذر مانے تو دو رکعت نماز پڑھ لینا یا صدقہ کی منت مانے تو کسی مسکین کو ایک روٹی دے دینا نذر سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کافی ہے اور اگر صرف نذر مانے اور کسی شے کی تعیین نہ کرے تو اس صورت میں مذکورہ چیزوں میں سے کسی ایک پر عمل کرنا کافی ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے نذر مانی اور کسی چیز کی تعیین نہیں کی اسے کیا کرنا چاہئے فرمایا۔

ان شاء صلی رکعتین وان شاء صام یوما وان شاء تصدق برغیف(وسائل الشیعہ)

چاہے دو رکعت نماز پڑھے چاہے ایک دن روزہ رکھے اور چاہے ایک روٹی صدقہ کر دے۔

صاحب وسائل نے اسے استحباب پر محمول کیا ہے۔

ایک شخص نے نذر مانی کہ **ان یصوم حینا** (وہ ایک حین (وقت) تک روزہ رکھے گا) مگر حین کی تعیین نہ کی۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ وہ چھ ماہ روزے رکھے اور اس آیت کی تلاوت کی۔

توتی اکلھا کل حین باذن ربھا۔

وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ہمہ وقت پھل دیتا ہے

اور یہ چھ مہینے کا عرصہ ہوتا ہے۔

عہد یہ ہے کہ اللہ کے نام پر کسی کام کے انجام دینے یا ترک کرنے کی پابندی اپنے اوپر عائد کرے۔ اگرچہ وہ امر مباح ہو۔ اس لئے کہ عہد میں رجحان کا اعتبار نہیں ہے۔ تاہم جس چیز کا عہد کیا جائے اس کی سمت مخالف کو اس سے اولی و بہتر نہ ہونا چاہئے۔ عہد کے احکام بھی وہی ہیں جو نذر کے ہیں اور اس کی پابندی بھی اسی طرح لازم ہے جس طرح نذر کی پابندی واجب ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من ولائل الایمان الوفاء بالعھد۔(مستدرک الوسائل)

ایمان کی علامتوں میں سے ایک علامت وفائے عہد ہے۔

اگر کوئی شخص اپنے ارادہ و اختیار سے نذر یا عہد پر عمل نہ کرے تو اس پر کفارہ عائد ہو گا۔

باب الصید

اسلام نے غذائی ضروریات کے پیش نظر شکار کی اجازت دی ہے۔ کیونکہ بعض علاقوں میں غذا کا انحصار ہی شکار پر ہوتا ہے۔ لہٰذا ضرورت کی بنا پر شکار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اسے مشغلہ یا تفریح طبع کے طور پر اختیار نہ کرنا چاہیئے اس لئے کہ بے مقصد اتلاف جان غیر مستحسن عمل ہے۔

شکار صرف سدھائے ہوئے کتوں اور چھری تلوار اور تیر ایسے کاٹنے والے ہتھیاروں سے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے آیہ قرآنی **وما علمتم من الجوارح مکلبین**۔ (وہ شکاری جانور جو تم نے شکار کے لئے سدھائے ہوں) کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔

ھی الکلاب (متدرک الوسائل)

شکاری جانوروں سے مراد کتے ہیں۔

کتوں کے شکار کئے ہوئے جانور ان شرائط کے ماتحت حلال ہوتے ہیں جو کتب فقہ میں درج ہیں ان میں سے ایک شرط یہ ہے کہ کتے کو شکار کے پیچھے چھوڑنے والا مسلمان ہو خواہ اس کا سدھانے والا غیر مسلم ہو۔ حضرت کا ارشاد ہے۔

ان ارسلہ المسلم جاز اکل ما اسسک وان لم یکن علمہ۔ (متدرک الوسائل)

اگر مسلمان، کتے کو شکار پر چھوڑے تو اس شکار کا کھانا جائز ہو گا اگرچہ سدھانے والا مسلمان نہ ہو۔

اگر کتا شکار پر جھپٹے اور مالک کے پہنچنے پر وہ زندہ ہو تو اگر ذبح کرنے کا وقت ہو تو اسے ذبح کئے بغیر کھانا جائز نہیں ہے اور اگر دم توڑ چکا ہو تو حلال ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ما اسسکت الکلاب المعلمۃ اکل وان قتلتہ (متدرک الوسائل)

سدھائے ہوئے کتوں کا کیا ہوا شکار کھایا جا سکے گا اگرچہ اسے جان سے ختم کر دیا ہو۔

اگر شکرہ، عقاب، باز، چیتا، تیندوا وغیرہ کے ذریعہ کسی جانور کا شکار کیا جائے اور دم توڑنے سے پہلے اسے ذبح کر لیا جائے تو وہ حلال ہو گا اور ذبح کرنے سے پہلے مرجائے تو حرام ہو گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ما اخذ البازی والصقر فقتل فلا تاکل منہ الاما ادرکت ذکواتہ۔ (وسائل الشیعہ)

جو شکار باز یا شکرہ کرے اور اسے مار ڈالے وہ نہ کھاؤ مگر یہ کہ تم اسے زندہ پاؤ اور اسے ذبح کر لو۔

اسی طرح اگر شکار جال میں پھنس کر دم توڑ دے تو وہ حلال نہ ہو گا اور اگر اسے زندہ نکال کر ذبح کر لیا

جائے تو اس کا کھانا حلال ہو گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ما اخذت الحبالہ من صید فقطعت منہ یدا او رجلا فذروہ فانہ میت و کلوا مما ادرکتم حیا و ذکر تم اسم اللہ علیہ۔ (وسائل الشیعہ)

جو شکار جال میں پھنس جائے اور اس کا ہاتھ یا پیر ٹوٹ کر الگ ہو جائے تو اسے چھوڑ دو' وہ مردار ہے اور اگر اسے زندہ پاؤ اور اللہ کا نام لے کر اسے ذبح کرو تو اس میں سے کھاؤ۔

اگر کسی جانور کا شکار ہتھیار سے کیا جائے تو اسے دھار دار ہونا چاہئے اور ایسے اوزار سے شکار حلال نہ ہو گا جو کاٹنے کے بجائے کچل دینے والا ہو خواہ وہ اینٹ پتھر ہو یا ایسی گولی جو کاٹنے کے بجائے کچل دینے والی ہو البتہ اگر اسے زندہ پکڑ کر ذبح کر لیا جائے تو وہ حلال ہو گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لاتا کل ماقتل الحجر والبندق والمعراض الا ما ذکیت۔ (وسائل الشیعہ)

وہ شکار جو پتھر غلیل یا بے پھل کے تیر سے کیا جائے وہ اسی صورت میں حلال ہو گا جب اسے زندہ پا کر ذبح کر لو۔

اگر کسی جانور پر تیر چلایا جائے اور وہ لڑکھڑا کر بلندی سے نیچے گرے یا پانی یا آگ میں جا پڑے تو زندہ ہونے کی صورت میں اسے ذبح کر لیا جائے تو حلال ہو گا اور مرجائے اور یہ شک ہو کہ اس کی موت صرف تیر سے نہیں ہوئی تو اس کا کھانا جائز نہ ہو گا۔ چنانچہ حضرتؑ نے ایسے شکار کے بارے میں فرمایا۔

لا یؤکل الا ان یدرک ذکوانہ۔ (مستدرک الوسائل)

اس کا کھانا جائز نہیں ہے مگر یہ کہ اسے ذبح کر لیا جائے۔

جب ٹڈی کو زندہ پکڑ لیا جائے تو بے روح ہونے کے بعد اس کا کھانا حلال ہے یا مچھلی کو زندہ پانی سے نکال لیا جائے یا خود بخود پانی سے باہر نکل آئے اور اسے زندہ پکڑ لیا جائے تو اس کا کھانا جائز ہے کیونکہ ٹڈی کو زندہ پکڑ لینا اور مچھلی کو زندہ پانی سے نکال لینا ہی ان کے لئے ذبح ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

الجراد ذکی والحیتان ذکی کلہ وما ھلک فی البحر فلاتا کل۔ (وسائل الشیعہ)

ٹڈی اور مچھلی کا پکڑا جانا ہی ان کا ذبح ہونا ہے لہٰذا انہیں کھاؤ اور جو مچھلی پانی میں مرجائے وہ نہ کھاؤ۔

اگر کسی پرندے کے پر کٹے ہوئے ہوں تو یہ اس امر کی علامت ہے کہ اس کا کوئی مالک ہے۔ لہٰذا اسے پکڑ لیا جائے اور اس کے مالک کا علم ہو جائے تو اس کے سپرد کرنا ضروری ہے اور اگر اس کے پر صحیح و سالم ہوں اور یہ علم نہ ہو کہ وہ کسی کی ملکیت ہے تو وہ حلال ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ان الطائر اذا ملک جناحیہ فھو صید و ھو حلال لمن اخذہ۔(وسائل الشیعہ) وہ پرندہ جو پرواز کر سکتا ہو وہ شکار ہے اور جو اسے پکڑے وہ اس کے لئے حلال ہے۔

اگر کوئی شخص پرندے کا پیچھا کرے تو جب تک اسے پکڑ نہ لے اس کی ملکیت میں داخل نہیں ہو گا۔ چنانچہ ایک شخص نے ایک پرندے کو دیکھا اور اسے پکڑنے کے لئے اس کا پیچھا کیا وہ پرندہ ایک درخت پر بیٹھ گیا اور ایک دوسرے آدمی نے اسے پکڑ لیا۔ پہلے شخص نے کہا کہ یہ میرا شکار ہے اس لئے کہ میں نے اس کا پیچھا کیا ہے اور دوسرے نے کہا کہ یہ میرا شکار ہے کیونکہ میں نے اسے پکڑا ہے۔ یہ قضیہ حضرتؑ کے سامنے پیش ہوا تو آپؑ نے فرمایا۔

للعین مارأت ولليد مااخذت۔(وسائل الشیعہ) آنکھ کا حصہ وہ ہے جو اس نے دیکھا اور ہاتھ کا حصہ وہ ہے جو اس نے پکڑا۔

باب الاطعمتہ والاشربہ

یہ امر مشاہدہ و تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ انسانی طبائع پر غذائی اثرات طاری ہوتے ہیں اور وہ جس قسم کی غذا کھاتا ہے اسی قسم کے اچھے یا برے اثرات ظہور میں آتے ہیں۔ اگر غذا صاف ستھری اور پاک ہو گی تو صحت و اخلاق پر اچھا اثر پڑے گا اور غلیظ و ناپاک ہو گی تو برے اثرات مرتب ہوں گے۔ چنانچہ شراب جسے اسلام نے حرام کیا ہے انتہائی مضر و مہلک ثابت ہو چکی ہے اور طب جدید نے الکحل کو جو شراب کا اہم جزو ہے زہر قاتل قرار دیا ہے جو زندگی کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ اسی طرح خنزیر کا گوشت کھانے سے ایسے خلیوں[1] کی تولید ہوتی ہے جو بے حیائی و بے غیرتی کے محرک ہوتے ہیں اور مردار جانور یا ایسے حیوان کا گوشت کھانے سے جس کا گلا گھونٹا گیا ہو ایسے خلئے پیدا ہوتے ہیں جو اعضاء بدن کے لئے مضر و نقصان دہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ ایسے جانوروں میں دوران خون رک جاتا ہے اور خون کے کثیف ذرے رگوں میں منجمد ہو کر رہ جاتے ہیں جو گوشت کو مسموم کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ذبیحہ جانور کا خون چونکہ ٹھنڈا ہونے سے پہلے ہی نکل جاتا ہے اس لئے گوشت مضر اور مسمی اجزاء سے پاک و صاف رہتا ہے۔ یونہی گوشت خوار حیوانوں کا گوشت کھانے سے نظام ہضم درہم و برہم ہو جاتا ہے کیونکہ گوشت خوار جانوروں کے گوشت میں عفونت و گندگی پیدا ہو جاتی ہے اور انسانی معدہ اسے قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ انسان تو انسان' گوشت خوار حیوان بھی گوشت خوار جانوروں کی طرف رخ نہیں کرتے اور عموماً" انہی جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں جو سبزی خوار ہوتے ہیں۔ اسلام نے انہی چیزوں کو حلال قرار دیا ہے جن سے جسم کی صحیح نشو و نما ہوتی ہے اور انہی اشیاء کو حرام کیا ہے جن میں ضرر و نقصان مضمر ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس نے مفاد و مضرت کو نظر انداز کر کے جس چیز کو چاہا حلال کر دیا ہو اور جس چیز کو چاہا حرام کر دیا ہو۔ کیونکہ یہ اسلام کی حکمت پسندی و مصلحت آفرینی کے منافی ہے۔ اسلام میں بہت سی چیزیں حرام ہیں اور بہت سی اشیاء ایسی ہیں جن کے کھانے پینے کی اجازت ہے اور اکثر حلال و حرام چیزوں کو بیان کر دیا ہے اور جن چیزوں کی حلت و حرمت پر نص نہیں کی ان کے واضح علامات بیان کر

---

[1] زندگی کی اکائی کو جس میں مادہ حیات سمویا ہوتا ہے خلیہ کہا جاتا ہے یہ خود بھی ایک زندہ جسم ہے اور تمام زندہ اجسام انہی خلیوں کی ترکیب و ترتیب سے وجود میں آتے ہیں ان خلیوں میں مسلسل تغیرات ہوتے رہتے ہیں اور تعمیر و تخریب کا عمل جاری رہتا ہے اگر ٹوٹنے والے خلیوں کی جگہ دوسرے خلئے پیدا نہ ہوں تو نشوونما کا سلسلہ رک جائے اور زندگی کی لو دم توڑ دے۔ ان خلیوں کی تولید ہوا' پانی اور غذا سے وابستہ ہے اگر ہوا' پانی اور غذا میسر نہ آئے تو نہ ان خلیوں کی تخلیق ہو گی اور نہ قوت توانائی اور زندگی برقرار رہے گی کیونکہ یہ خلئے ہی وٹامن اور پروٹین حاصل کر کے جسم کو توانا اور صحت مند رکھتے ہیں۔

دیئے ہیں جن سے حلال و حرام اور جائز و ناجائز میں امتیاز ہو جاتا ہے۔ ذیل میں امیرالمومنین علیہ السلام کے ارشادات کی روشنی میں چند حلال و حرام چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

دریائی جانوروں میں صرف مچھلی حلال ہے اور وہ بھی وہ جس پر چھلکے ہوں۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

الا لا تاکلو اولا تبیعو امالم یکن لہ قشر۔ (وسائل الشیعہ)

خبردار وہ مچھلی نہ کھانا اور نہ بیچنا جس پر چھلکے نہ ہوں۔

وہ مچھلی جو مچھلی کے پیٹ سے نکلے حلال ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے اس کے بارے میں پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ دونوں کا کھانا حلال ہے۔

وہ مچھلی جو پانی کے اندر مرجائے حرام ہے خواہ اس پر چھلکے ہوں۔ چنانچہ حضرتؑ سے منقول ہے کہ۔

انہ نھی من المطافی۔ (مستدرک الوسائل)

حضرت نے اس مچھلی کے کھانے سے منع فرمایا ہے جو پانی کے اندر مرجائے۔

صحرائی حیوانوں میں ہرن، گائے وغیرہ کے علاوہ دوسرے جانور حرام ہیں۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے ہاتھی، ریچھ اور بندر کے گوشت کے بارے میں پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا۔

لیس ھذا من بھیمتہ الانعام التی توکل۔ (وسائل الشیعہ)

یہ ان چوپاؤں میں داخل نہیں ہیں جن کا گوشت کھایا جاتا ہے۔

اسی طرح وہ درندے جو ناخنوں اور دانتوں سے چیر پھاڑ دیتے ہیں اور وہ پرندے جو چنگال رکھتے ہیں جیسے باز، شکرہ، شاہین وغیرہ حرام ہیں۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اتقوا کل ذی ناب من السباع و مخلب من الطیر۔ (وسائل الشیعہ)

دانتوں سے چیرنے پھاڑنے والے درندوں اور چنگال رکھنے والے پرندوں کے گوشت سے اجتناب کرو۔

وہ پرندے جن کی حلت و حرمت پر نص نہ ہو ان کی حلت و حرمت کو دو علامتوں سے جانا جا سکتا ہے۔ پہلی علامت یہ ہے کہ اگر پرواز کے وقت اپنے پروں کو پھیلاتے ہوں اور یہ پھیلاؤ پروں کے پھڑ پھڑانے سے زیادہ ہو تو وہ حرام ہیں اور اگر پروں کو پھڑ پھڑاتے ہوں اور یہ پھڑ پھڑانا پروں کو پھیلانے سے زیادہ ہو تو وہ حلال ہیں۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

کل مادف ولا تاکل ماصف۔ (وسائل الشیعہ)

جو اڑتے ہوئے پروں کو پھڑ پھڑائیں وہ کھاؤ اور جو پروں کو پھیلائیں وہ نہ کھاؤ۔

دوسری علامت یہ ہے کہ اگر اس میں پوٹا یا سنگدانہ ہو یا اس کے پیروں کے عقبی حصہ میں کانٹا سا ہو تو وہ حلال ہے اور اگر ان علامتوں میں سے کوئی علامت نہ ہو تو وہ حرام ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

تنزھوا عن اکل الطیر الذی لیست لہ قانصتہ ولا صیصیتہ ولا حوصلہ۔ (وسائل الشیعہ)

ان پرندوں کے گوشت سے اجتناب کرو جن میں سنگدانہ یا پیروں کے عقبی حصہ میں کانٹا اور پوٹا نہ ہو۔

بعض صورتوں میں حلال جانور بھی حرام ہو جاتا ہے۔ اس حرمت کے تین سبب ہیں۔

پہلا سبب یہ ہے کہ بھیڑ، بکری، گائے یا اونٹ کا بچہ مادہ خنزیر کا دودھ اتنی مقدار میں پئے جس سے گوشت پیدا ہو اور ہڈیوں میں مضبوطی آئے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

لاتا کلہ من لحم حمل رضع من لبن خنزیرہ۔ (وسائل الشیعہ)

اس بھیڑ، بکری کے بچہ کا گوشت نہ کھاؤ جس نے سورنی کا دودھ پیا ہو۔

اگر اتنی کم مقدار میں پئے کہ جس سے ہڈیوں میں مضبوطی نہ آئے تو اس کا گوشت اور دودھ مکروہ ہے۔ یہ کراہت استبراء سے زائل ہو جاتی ہے اس استبراء کی صورت یہ ہے کہ اگر وہ دودھ کے بغیر رہ سکتا ہو تو سات دن تک اسے چارہ وغیرہ دیا جائے اور اگر دودھ کے بغیر نہ رہ سکتا ہو تو اسے بکری وغیرہ کے تھنوں پر چھوڑا جائے۔ چنانچہ حضرتؑ سے ایسے جانور کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا۔

قید وہ واعلفوہ الکسب والنوی والشعیر والخبزان کان استغنی عن اللبن وان لم یکن استغنی عن اللبن فیلقی علی ضرع شاہ سبعہ ایام ثم یوکل لحمہ۔ (وسائل الشیعہ)

اسے بند رکھو اگر اسے دودھ کی احتیاج نہ ہو تو اسے کھل، گٹھیاں، جو، روٹی کھانے کو دو اور اگر اسے دودھ کی ضرورت ہو تو اسے سات دن تک بکری کے تھنوں پر چھوڑ دو پھر اس کا گوشت کھایا جا سکتا ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ انسان اس کے ساتھ وطی کا مرتکب ہو جب وطی ثابت ہو جائے تو اس کا گوشت اور دودھ حرام ہو جاتا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے ایسے چوپائے کے بارے میں پوچھا گیا۔ تو آپ نے فرمایا۔

حرام لحمھا ولبنھا۔ (وسائل الشیعہ)

اس کا گوشت اور دودھ حرام ہے۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ اس کی غذا انسانی فضلہ ہو۔ ایسا جانور اس وقت تک حلال نہیں ہوتا جب تک اتنا

عرصہ نہ گذر جائے کہ نجاست کے اثرات زائل ہو جائیں۔ یہ عرصہ جسے شرعی اصطلاح میں استبراء کہا جاتا ہے مختلف جانوروں کی جسامت کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

الدجاجتہ الجلالتہ لا یوکل لحمها حتی تقید ثلثہ ایام وللسبط الجلالتہ بخمستہ ایام والنشاۃ الجلالہ عشرین یوما والناقہ الجلالہ اربعین یوما۔ (وسائل الشیعہ)

نجاست خوار مرغی، بطخ، بکری، گائے اور اونٹنی کا گوشت اس وقت تک کھایا نہیں جائے گا جب تک ان نجاست خوار جانوروں کو بالترتیب تین، پانچ، دس، بیس اور چالیس دن تک بند نہ رکھا جائے۔

امیرالمومنین علیہ السلام کا یہ ارشاد اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ نجس غذا اپنا اثر چھوڑجاتی ہے اور وہ ایسا اثر ہے جو غذا کے تحلیل ہونے سے زائل نہیں ہوتا بلکہ اس کا ازالہ اس غذا سے پیدا ہونے والے اثرات یعنی خلیوں کے ازالہ پر منحصر ہے اور اس ازالہ کی مدت مختلف حیوانات کی جسامت اور غذا کی مقدار کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ جو حضرت کے ارشاد کے مطابق تین دن سے لے کر چالیس دن تک ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مدت سے تحلیل غذا کی مدت مراد نہیں لی جا سکتی کیونکہ وہ چند گھنٹوں سے زائد نہیں ہوتی۔ بلکہ غذا سے پیدا ہونے والے خلیوں کے بارے ہی میں ہو سکتی ہے جن کے ٹوٹنے اور ان کی جگہ پر نئے خلیوں کے پیدا ہونے میں تین دن سے لے کر چالیس دن تک کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ حضرتؑ نے اس دور میں ان غیر مرئی خلیوں کی نشاندہی کی کہ جب نہ خلیوں کا کسی کو علم تھا اور نہ ان کا کوئی تصور پیدا ہوا تھا۔

حلال جانوروں میں چند چیزیں حرام بھی ہوتی ہیں۔ جن سے اجتناب کرنا چاہیے۔ چنانچہ ایک مرتبہ امیرالمومنین علیہ السلام کوفہ کے بازار میں آئے اور قصابوں کو خون، غدود، حرام مغز، خصتین، قضیب اور تلی وغیرہ کے فروخت کرنے سے منع کیا۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ یا امیرالمومنین علیہ السلام تلی اور کلیجی میں فرق ہی کیا ہے دونوں ایک ہی تو ہیں فرمایا کہ ایسا نہیں ہے پھر ان دونوں کا فرق ظاہر کرنے کے لئے دو برتن منگوائے ایک میں کلیجی کو اور دوسرے میں تلی کو رکھا اور ان دونوں پر پانی ڈالا کچھ دیر کے بعد دیکھا گیا کہ تلی خون بن کر پانی میں مخلوط ہو گئی ہے اور بالائی پوست اور رگوں کے سوا اس میں کچھ نہیں رہا اور کلیجی کے اجزاء جوں کے توں باقی ہیں صرف اس کی رنگت سفید ہو گئی ہے۔ فرمایا کہ ان دونوں میں یہی فرق ہے کہ کلیجی گوشت ہے اور تلی خون ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے کہ۔

لاتکلوا الطحال فانہ بیت الدم الفاسد۔ (وسائل الشیعہ)

تلی نہ کھاؤ اس لئے کہ یہ فاسد خون ہے جو منجمد ہو گیا ہے۔

شراب خواہ انگور سے بنائی گئی ہو یا کھجور سے یا جو سے اس کا پینا کشید کرنا بیچنا سب حرام ہے۔ امیرالمومنین

علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

مد من الخمر یلقی اللہ حین یلقاہ کعابد و ثن۔
(وسائل الشیعہ)

شراب خوار جب اللہ کے حضور میں آئے گا تو بت پرستوں میں شمار ہو گا۔

حضرت سے کہا گیا کہ آپ کا خیال یہ ہے کہ شراب نوشی' زنا اور چوری سے بڑھ کر جرم ہے فرمایا کہ ہاں ایسا ہی ہے اس لئے کہ زانی' زنا تک محدود رہتا ہے اور شراب خوار جب نشہ میں مست ہوتا ہے تو زنا' چوری اور قتل تک کا ارتکاب کر گزرتا ہے۔

انگور کا پانی جسے عصیر عنبی کہا جاتا ہے جب جوش کھا جائے تو اس وقت تک اس کا استعمال جائز نہیں ہے جب تک اس کا دو تہائی حصہ جل نہ جائے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام نے اسوء ابن قرطبہ کو تحریر فرمایا۔

واطبخ للمسلمین قبلک من الطلاما یذھب ثلثاہ و یبقی ثلثہ۔(بحار الانوار)

انگور کا پانی مسلمانوں کے لئے جوش دو اس طرح کہ اس کے دو حصے جل جائیں اور ایک حصہ باقی رہ جائے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ دو تہائی حصہ جلنے کے بعد وہ شیرہ ہو جائے گا اور دو تہائی حصہ کے خشک ہونے سے پہلے اسے رکھا رہنے دیا جائے تو اس میں نشہ آور کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

باب النکاح

انسان طبعاً" اجتماعی زندگی کا محتاج ہے اس کے بغیر نہ معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے اور نہ متمدن زندگی کی تشکیل ہو سکتی ہے۔ اس اجتماعی حیات کا ابتدائی مقام گھر ہے اور گھر کی تشکیل عائلی زندگی سے وابستہ ہے۔ اسی سے اولاد، کنبہ اور قوم و قبیلہ وجود میں آتا ہے اور نسل انسانی کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ بیشک ازدواجی زندگی سے ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں مگر ان ذمہ داریوں کے ساتھ جو ماحول اس کے گرد و پیش تعمیر ہوتا ہے وہ اسے ان ذمہ داریوں کی تلخی کا احساس نہیں ہونے دیتا اور وہ خوشدلی سے اہل و عیال کی کفالت اور اولاد کی تربیت کا بار اٹھانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اگر انسان تجرد کی زندگی بسر کرے تو وہ ذہنی پراگندگی و پریشاں خیالی کا شکار ہو جاتا ہے اور عبادات و فرائض میں دلجمعی و یکسوئی پیدا نہیں کر سکتا۔ اسی لئے اسلام نے متاہل کی عبادت کو غیر متاہل کی عبادت پر فوقیت دی ہے اور بقائے نسل کے لئے ازدواجی زندگی پر زور دیا ہے۔ اس کے ساتھ چند پابندیاں بھی عائد کی ہیں اور جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی حد بندی کر دی ہے تاکہ خواہشات کی تکمیل ہو تو مقررہ حدود کے اندر اور احکام کی پابندی کے ساتھ۔ ان احکام میں سے چند احکام تحریر کئے جاتے ہیں۔

اگر باپ یا دادا اپنے نابالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح کر دے تو وہ عقد لازم ہو گا اور لڑکے اور لڑکی کو بالغ ہونے کے بعد اس نکاح کو رد کرنے کا اختیار نہ ہو گا۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

تزویج الآباد علی البنین والبنات جائز اذا کانو اصغار اولیس لھم خیار اذا کبروا۔ (مستدرک الوسائل)

باپ دادا کا اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو بیاہ دینا جائز ہے جبکہ وہ نابالغ ہوں اور بالغ ہونے کے بعد (انہیں عقد کو ختم کرنے کا) اختیار نہ ہو گا۔

اگر لڑکی بالغ ہو تو اس سے پوچھے بغیر باپ کو اس کا عقد نہ کرنا چاہیئے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

لاینکح احد کم ابنتہ حتی لیستامرھا فی نفسھا فھی اعلم بنفسھا۔ (مستدرک الوسائل)

کوئی شخص اپنی لڑکی کا نکاح اس وقت تک نہ کرے جب تک لڑکی سے اس کی آزادنہ رائے دریافت نہ کر لے کیونکہ وہ اپنے حالات سے زیادہ واقف ہے۔

اگر کوئی عورت دو آدمیوں کو اپنا وکیل نکاح قرار دے اور ان میں سے ایک ایک سے اور دوسرا دوسرے شخص سے اس کا نکاح پڑھ دے تو پہلا نکاح صحیح ہو گا اور دوسرا باطل۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اذا وکلت المرأة الولیین فوضت الیھما فانکمھا لکل واحد منھما رجلا فالنکاح الاول۔ (مستدرک الوسائل)

جب کوئی عورت دو آدمیوں کو نکاح کا اختیار سونپ کر اپنا وکیل بنائے اور وہ دونوں اس کا نکاح کر دیں تو پہلے آدمی سے نکاح صحیح ہو گا۔

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق رجعی دے دے تو مدت عدہ کے اندر اس کی بہن سے عقد نہیں کر سکتا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اذا طلق الرجل المراہ لم یتزوج اختھا حتی تنقضی عدتھا (مستدرک الوسائل)

جب کوئی شخص اپنی عورت کو طلاق دے دے تو اس کا عدہ گزرنے سے پہلے اس کی بہن سے نکاح نہیں کر سکتا۔

اگر کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرے اور پھر وفات پا جائے یا اسے طلاق دے دے تو وہ عورت اس مرد کے بیٹوں پر حرام رہے گی خواہ ہم بستری ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اذا نکح الرجل امرأة ثم توفی عنھا اوطلقھا لم تحل لا حد من ولدہ کان دخل بھا اولم یدخل۔ (مستدرک الوسائل)

جب کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرے پھر مر جائے یا اسے طلاق دے تو وہ اس شخص کی اولاد پر حلال نہ ہو گی خواہ اس نے ہم بستری کی ہو یا نہ کی ہو۔

اگر کوئی شخص کسی عورت سے عقد کرے تو اس عورت کی ماں اس شخص پر حرام ہو جائے گی خواہ ہم بستری کی نوبت نہ آئی ہو اور اس کی بیٹی بھی حرام رہے گی درصورتیکہ اس سے ہم بستری ہو چکی ہو۔

ایک مرتبہ ابن مسعود سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے ایک عورت سے عقد کیا اور ہم بستری کی نوبت نہ آئی تھی کہ انتقال کر گئی کیا وہ شخص اس کی ماں سے نکاح کر سکتا ہے کہا کہ ہاں اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ امیرالمومنین علیہ السلام کے پاس آئے اور صورت مسئلہ اور اپنا جواب بیان کیا۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ تم نے یہ حکم کہاں سے اخذ کیا ہے کہا قرآن مجید کی اس آیت سے۔

وامھات نساء کم وربائبکم اللاتی فی حجور کم من نساء اللاتی و دخلتم بھن فان لم تکونوا دخلتم بھن فلا جناح علیکم۔

(تم پر حرام کی گئی ہیں) تمہاری بیویوں کی مائیں اور وہ لے پالک لڑکیاں جو تمہاری ان بیویوں سے ہوں جن سے تم ہم بستری کر چکے ہو اور اگر تم نے ان بیویوں سے ہم بستری نہ کی ہو تو ان لڑکیوں سے نکاح کرنے میں تم پر کوئی گناہ نہیں۔

حضرت نے فرمایا کہ لے پالک لڑکیوں کے بارے میں تو آیت میں یہ قید ہے کہ وہ اس صورت میں حرام ہوں
گی جب ان کی ماؤں سے ہم بستری ہو چکی ہو مگر بیویوں کی ماؤں کے بارے میں تو یہ قید نہیں ہے لہٰذا بیویوں کے عقد
میں آجانے کے بعد ان کی مائیں حرام ہو جائیں گی خواہ ہم بستری ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ اگر کوئی عورت ایسے مرد سے
عقد کر لے جو اپنے کو آزاد ظاہر کرے اور اس کے بعد یہ معلوم ہو کہ وہ غلام ہے تو عورت کو فسخ نکاح کا حق ہے۔
چنانچہ ایک غلام نے اپنے کو آزاد ظاہر کر کے ایک آزاد عورت سے عقد کر لیا جب اس کا انکشاف ہوا تو اس نے
امیرالمومنین علیہ السلام کی طرف رجوع کیا۔ آپ نے فرمایا کہ عورت چاہے تو نکاح کو فسخ کر سکتی ہے۔

اگر کسی لڑکی کا ولی اس کے ایسے عیب کو چھپا کر جو موجب فسخ ہوتا ہے کسی شخص سے نکاح کر دے تو وہ
شخص اس عورت کے ولی سے مہر کی واپسی کا حق رکھتا ہے۔ کیونکہ اس نے فریب و تدلیس کاری سے کام لیا ہے۔
چنانچہ ایک لڑکی کے ولی نے یہ جانتے ہوئے کہ لڑکی مبروص ہے ایک شخص سے بیاہ دی جب اسے علم ہوا تو اس نے
حضرتؑ کی طرف رجوع کیا۔ آپؑ نے فرمایا کہ اس عورت کا مہر اس کے ولی کے ذمہ ہے۔

اگر کوئی شخص خواستگاری کے موقع پر ایسے الفاظ کہے جن سے تبادر کچھ اور ہوتا ہو اور مراد وہ ہو جس کی
طرف تبادر نہیں ہوتا مگر الفاظ اسے بھی شامل ہوں تو اس پر تدلیس کا حکم جاری نہ ہو گا۔ چنانچہ ایک شخص نے ایک
اجنبی قبیلہ میں خواستگاری کی تو انہوں نے پوچھا کہ تم کیا کاروبار کرتے ہو کہا کہ میں چوپاؤں کی خرید و فروخت کا دھندا
کرتا ہوں جب نکاح ہو چکا تو معلوم ہوا کہ وہ بلیاں بیچتا ہے۔ یہ معاملہ امیرالمومنین علیہ السلام کے سامنے پیش ہوا۔
آپ نے فرمایا کہ بلیاں بھی چوپاؤں میں داخل ہیں۔

اس مبحث کے ذیل میں چند مسائل جو ولادت اور اولاد سے تعلق رکھتے ہیں درج کئے جاتے ہیں۔

اگر کسی عورت کے ہاں مباشرت کے چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہو تو وہ اسی کے شوہر کا قرار پائے گا اور چھ ماہ کی
مدت سے قبل اس طرح پیدا ہو کہ نمو کا کوئی درجہ باقی نہ ہو تو اس کے شوہر کا قرار نہیں دیا جائے گا۔ اس لئے کہ
حمل کی کم سے کم مدت چھ ماہ ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لا تلد المرأۃ لاقل من ستۃ اشھر۔ (وسائل الشیعہ)

عورت چھ ماہ سے کم مدت میں بچہ نہیں جنتی۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے پاس ایک عورت کو لایا گیا جس کے ہاں نکاح کے چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہوا تھا۔
حضرت عمرؓ نے اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ امیرالمومنین علیہ السلام کو معلوم ہوا تو آپ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ اس
عورت کو غلط کار قرار دے کر سنگسار نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت عمرؓ نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ حمل اور دودھ بڑھائی کی
مدت تیس مہینے ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

وحملہ و فصالہ ثلثون شھرا۔ اس کے پیٹ میں رہنے اور اس کی دودھ بڑھائی کی مدت تیس مہینے ہے۔

اور دودھ پلانے کی مدت دو سال یعنی چوبیس مہینے ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین۔ مائیں اپنے بچوں کو دو سال کامل دودھ پلائیں۔

جب تیس مہینوں سے چوبیس مہینے دودھ پلائی کے منہا کئے جائیں گے تو باقی چھ مہینے بچیں گے اور یہ حمل کی کم سے کم مدت ہے۔ لہٰذا یہ بچہ اسی عورت کے شوہر کا ہے۔

اگر شوہر مباشرت کر چکا ہو اور بچے کا الحاق اس سے ہو سکتا ہو تو اسی کا بچہ قرار دیا جائے گا۔ چنانچہ ایک بوڑھے شخص نے ایک جوان عورت سے عقد کیا اور مقاربت کی حالت میں مرگیا وہ عورت حاملہ ہو گئی اور نو مہینے کے بعد بچہ جنا۔ جب اس بچے نے ہوش سنبھالا تو اس بوڑھے کے دوسرے بیٹوں نے حضرت عمرؓ کے پاس مرافعہ دائر کیا اور کہا کہ یہ بچہ ان کے باپ کا نہیں ہے بلکہ اس کی ماں نے غلط کاری کے نتیجہ میں اسے جنا ہے اور چند گواہ بھی پیش کر دیئے۔ حضرت عمرؓ نے اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا اس عورت نے یہ حکم سنا تو امیرالمومنینؑ سے فریاد کی اور اپنے عقد اور ازدواجی تعلق کی کیفیت بیان کی۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ یہ عورت ہر چیز واضح طور سے بتاتی ہے لہٰذا اسے سزا دینے میں جلدی نہ کی جائے۔دوسرے دن آپ نے چند بچوں کو جمع کیا اور اس بچے سے کہا کہ تم ان بچوں کے ساتھ مل کر کھیلو جب وہ بچے کھیلنے لگے تو آپ نے ایک دم حکم دیا کہ سب بیٹھ جائیں وہ بچے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے ان کے بیٹھتے ہی پھر حکم دیا کہ کھڑے ہو جائیں تمام بچے فوراً کھڑے ہو گئے مگر اس بچے نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیکے اور ہاتھوں کا سہارا لے کر کھڑا ہوا۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ اسی مرنے والے بوڑھے کا بیٹا ہے لہٰذا اس کے ترکہ میں سے اسے حصہ دیا جائے اور اس کے بھائیوں کو افترا پردازی کی سزا دی جائے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپؑ نے یہ فیصلہ کس بنا پر کیا ہے فرمایا کہ اس کا ہاتھ ٹیک کر کھڑا ہونا بتاتا ہے کہ یہ اسی کمزور اور ضعیف باپ کا بیٹا ہے۔

حضرتؑ نے اس بچے کی کمزوری و ناتوانی کو اس بوڑھے کی اولاد ہونے کے ثبوت میں پیش کیا یہ صرف ان لوگوں کو مطمئین کرنے کے لئے تھا ورنہ قول پیغمبرؐ **الولد للفراش۔** (بچہ اسی کا ہو گا جس کے بستر پر پیدا ہو) اس امر کی واضح دلیل ہے کہ وہ بچہ اسی بوڑھے کا ہے۔

اگر کوئی شخص مادہ منویہ باہر پھینکے اور پیشاب کئے بغیر پھر اسی صورت سے مقاربت کرے اور بچہ پیدا ہو جائے تو وہ اسی کا بچہ ہو گا کیونکہ یہ احتمال موجود ہے کہ پہلی مباشرت کے نتیجہ میں کچھ اجزاء منویہ نالی کے اندر رہ گئے ہوں جو انعقاد حمل کا باعث ہوئے ہوں۔ چنانچہ ایک شخص نے حضرتؑ سے عرض کیا کہ میں مقاربت کے موقع پر مادہ منویہ باہر پھینکتا تھا مگر اس کے باوجود اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے۔ آپؑ نے فرمایا کہ تم نے مقاربت کے بعد دوبارہ

مقاربت کی تھی۔ کہا کہ ہاں۔ فرمایا کہ کیا دوسری مقاربت سے پہلے پیشاب کیا تھا۔ کہا نہیں فرمایا کہ وہ بچہ تمہارا ہے۔

اگر ماں باپ اور بچے کی رنگت میں فرق ہو تو بچے کو ناجائز اولاد قرار نہیں دیا جائے گا۔ اس لئے کہ بعض اوقات خارجی اسباب کے زیر اثر رنگت میں تفاوت ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک حبشی مرد اپنی حبشیہ بیوی کو لے کر حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور کہا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں سیاہ فام ہوں اور میری بیوی بھی سیاہ فام ہے اس نے ایک بچہ جنا ہے جو سرخ رنگ کا ہے۔ حضرت عمرؓ کے پوچھنے پر اس عورت نے کہا کہ میں کسی خیانت کی مرتکب نہیں ہوئی۔ یہ لڑکا اسی کا ہے۔ حضرت عمرؓ حیران و پریشان ہوئے اور کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ آخر امیرالمومنینؑ کی طرف رجوع کیا گیا آپ نے اس مرد سے کہا کہ میں تم سے کچھ پوچھوں تو تم صحیح صحیح جواب دو گے۔ اس نے کہا کہ ہاں فرمایا کہ تم نے اپنی بیوی سے حالت حیض میں مقاربت تو نہیں کی۔ اس نے اس کا اعتراف کیا۔ فرمایا کہ جب نطفہ خون کے ساتھ ملا تو اس سے ایسا بچہ پیدا ہوا جو سرخ رنگت لئے ہوئے ہے لہذا تم اس کے بیٹا ہونے سے انکار نہ کرو یہ تمہاری غلطی کا نتیجہ ہے اس میں تمہاری بیوی کا کوئی گناہ نہیں ہے۔

حضرتؑ نے بعض صورتوں میں طبیعی آثار کی بنا پر بھی اولاد کا فیصلہ کیا ہے۔ چنانچہ ایک شخص قاضی شریح کے پاس آیا اور کہا کہ فلاں آدمی دو عورتیں ایک آزاد اور ایک کنیز میرے پاس چھوڑ گیا۔ ان دونوں کے ہاں ولادت ہوئی ایک کے ہاں لڑکا پیدا ہوا اور ایک کے ہاں لڑکی۔ مگر وہ دونوں لڑکی سے انکار کرتی ہیں اور ہر ایک یہ کہتی ہے کہ اس کی کوکھ سے لڑکا پیدا ہوا ہے۔ شریح کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ اور حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ بیان کیا حضرتؑ نے ایک تنکا زمین سے اٹھایا اور فرمایا کہ اس کا فیصلہ اس تنکے کے اٹھانے سے بھی آسان تر ہے پھر آپ نے ان دونوں عورتوں کو طلب کیا اور ان سے کہا کہ وہ الگ الگ پیالیوں میں اپنا دودھ نکالیں جب انہوں نے دودھ نکالا تو حضرت نے دونوں کا دودھ الگ الگ تولا ایک کا دودھ بھاری اور دوسری کا دودھ ہلکا نکلا۔ جس کا دودھ بھاری تھا اس کے حوالے لڑکا کیا اور جس کا دودھ ہلکا تھا اسے لڑکی دی اور فرمایا کہ جس طرح لڑکی لڑکے کے مقابلہ میں میراث' دیت' شہادت اور عقل میں کمتر ہوتی ہے اسی طرح اس کے دودھ کا وزن بھی لڑکے کے دودھ سے ہلکا ہوتا ہے۔

بچے کی ولادت کے سلسلہ کے چند احکام و آداب یہ ہیں۔

بچے کی ولادت کے سلسلہ کے چند احکام و آداب یہ ہیں۔

بچے کی ولادت سے پہلے ہی اس کا نام تجویز کر دینا چاہیے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

سموا اولاد کم قبل ان یولدوا۔(وسائل الشیعہ) اپنی اولاد کا نام ان کی پیدائش سے پہلے رکھ دو

سر مونڈتے وقت سر کے وسط یا کنارے میں چوٹی کی صورت میں بال نہ چھوڑے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

لاتحلقوا الصبیان القزع۔(وسائل الشیعہ) بچوں کے سر' وسط سر میں کچھ بال چھوڑ کر نہ مونڈو

ساتویں دن عقیقہ کرے خواہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

عقوا عن اولاد کم یوم السابع۔(وسائل الشیعہ) ساتویں دن اپنے بچوں کا عقیقہ کرو۔

بچوں کا ختنہ کروائے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

اختنوا اولادکم یوم السابع لایمنعکم حرو لا بردفانہ طھور للجسد۔(وسائل الشیعہ) سردی کا موسم ہو یا گرمی کا' ساتویں دن اپنے بچوں کا ختنہ کرو اس لئے کہ یہ جسم کی پاکیزگی کا باعث ہے۔

بچے کو اس کی ماں کا دودھ پلوائے۔ یہ دودھ بچے کی نشو و نما کے لئے زیادہ موثر اور مفید ہے کیونکہ یہ اسی خون کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے جو شکم مادر میں اس کی غذا فراہم کرتا رہا ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

مامن لبن رضع بہ الصبی اعظم برکتہ علیہ من لبن امہ۔(وسائل الشیعہ) بچے کے لئے اس کی ماں کا دودھ ہر دودھ سے زیادہ بابرکت ہے۔

اگر ماں کے علاوہ کسی اور عورت کا دودھ پلوانا پڑ جائے تو ایسی عورت کا انتخاب کیا جائے جو خوش اطوار اور عقلمند ہو۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

تو قوا علی اولاد کم لبن البغی من النساء والمجنونہ فان البن یعدی۔(بحارالانوار) اپنی اولاد کو فاحشہ اور دیوانی عورت کا دودھ نہ پلاؤ اس لئے کہ دودھ طبیعت پر اثر انداز ہوتا ہے۔

باب الطلاق

رشتہ زوجیت کو قطع کرنے کا نام طلاق ہے۔ اگرچہ یہ مستحسن عمل نہیں ہے تاہم ازدواجی زندگی میں ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ زن و مرد میں یکجہتی باقی نہیں رہتی اور مرد کو عورت سے یا عورت کو مرد سے علیحدگی کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا اور ان کی فلاح و بہبود اسی میں ہوتی ہے کہ وہ احسن طریق سے نکاح کے بندھن کو توڑ دیں اور ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں۔ صحت طلاق کے لئے ضروری ہے کہ طلاق دہندہ طلاق کا قصد و ارادہ رکھتا ہو اور جس عورت کو طلاق دی جا رہی ہو وہ حیض و نفاس سے پاک و صاف ہو چکی ہو اور پاک ہونے کے بعد اس سے مباشرت واقع نہ ہوئی ہو۔ اور اجرائے طلاق کے وقت دو عادل گواہ موجود ہوں۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لایکون الطلاق طلاقا حتی یجتمع الحدود الاربعہ فاولها ان تکون المرأۃ طاہرہ من غیر جماع یقع بھا من بعد خروجھا من طمثھا الذی طھرت فیہ والثانی ان یکون الرجل نریدا بالطلاق غیر مکرہ ولا مجبر علیہ والثالث ان یحضر شاھد ین عد لین فی وقت تطلیقہ ایاھا والرابع ان ینطق لسانہ عند الشاھدین بالطلاق۔ (مستدرک الوسائل)

اس وقت تک طلاق واقع نہ ہو گی جب تک چار شرطیں جمع نہ ہو جائیں پہلی شرط یہ ہے کہ عورت خون سے پاک ہو اور خون حیض سے پاک ہونے کے بعد اس سے مباشرت واقع نہ ہوئی ہو دوسری یہ کہ بغیر کسی جبرو اکراہ کے طلاق کا ارادہ کرے تیسری یہ کہ طلاق دیتے وقت دو عادل گواہ موجود ہوں چوتھی یہ کہ ان دو گواہوں کے روبرو صیغہ طلاق اپنی زبان پر جاری کرے۔

ایک شخص کوفہ میں حضرتؑ کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو جبکہ وہ حیض سے پاک ہو چکی تھی اور اس کے بعد میں نے مقاربت بھی نہیں کی تھی طلاق دے دی۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ کیا دو عادل گواہوں کے روبرو طلاق دی تھی۔ کہا نہیں۔ فرمایا۔

اذھب فان طلاقک لیس بشئی۔ (وسائل الشیعہ)

جاؤ یہ تمہاری طلاق کچھ نہیں ہے۔

طلاق میں عورتوں کی گواہی صحیح نہیں ہے خواہ چار عورتیں ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لایجوز شهاده النساء فی الطلاق۔(مستدرک الوسائل) طلاق میں عورتوں کی گواہی صحیح نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص طلاق پر مجبور کر دیا جائے یا ہذیانی حالت میں طلاق کے الفاظ زبان پر لائے یا ابھی نابالغ ہو تو اس کی طلاق صحیح نہ ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لایجوز طلاق صاحب ہذیان ولا مکرہ ولا صبی حتی یحتلم۔(مستدرک الوسائل) ہذیان بکنے والے اور مجبور کئے جانے والے اور بچے کی طلاق صحیح نہیں ہے جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے۔

اگر کوئی شخص خواب میں طلاق دے تو وہ بھی باطل ہو گی۔ چنانچہ ایک شخص نے حضرتؑ سے بیان کیا کہ اس نے خواب میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہیں۔ آپؑ نے فرمایا۔

انما الطلاق فی الیقظہ ولیس الطلاق فی النوم۔ (مستدرک الوسائل) طلاق بیداری ہی میں ہو سکتی ہے نیند کی حالت میں نہیں ہوتی۔

اگر طلاق میں مدت عدہ کے اندر رجوع کیا جا سکتا ہو تو وہ طلاق رجعی کہلاتی ہے۔ چنانچہ وہ طلاق جو شرائط طلاق کی پابندی کے ساتھ دی جائے اس میں طلاق دہندہ کو حق رجوع ہوتا ہے اور اگر اس میں رجوع کی گنجائش نہ ہو تو وہ طلاق بائن ہے۔ چنانچہ عورت کی عمر نو سال تمام نہ ہوئی ہو یا یائسہ ہو یا اس سے مباشرت نہ ہوئی ہو یا خلع کی صورت ہو یا تین مرتبہ طلاق دی گئی ہو تو ان تمام صورتوں میں حق رجوع ساقط ہو جاتا ہے۔ ان تین طلاقوں کی شرعی صورت یہ ہے کہ شرائط طلاق کے ساتھ عورت کو پہلی مرتبہ طلاق دے پھر مدت عدہ کے اندر رجوع کر لے یا عدہ کے بعد نکاح جدید کرے پھر دوبارہ انہی شرائط کے ساتھ طلاق دے اور مدت عدہ کے اندر رجوع کر لے یا عدہ کے بعد نکاح کر لے پھر سہ بارہ طلاق دے دے تو یہ تین طلاقیں ہو جائیں گی۔ پہلی اور دوسری طلاق' رجعی ہو گی اور تیسری طلاق' بائن ہو گی کیونکہ اس تیسری طلاق کے بعد نہ رجوع کر سکتا ہے اور نہ اس وقت تک از سر نو عقد کر سکتا ہے جب تک وہ کسی اور مرد سے نکاح کر کے اس سے طلاق نہ لے لے یا بیوہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

ان طلقها واحده ثم ترکها حتی یخلوا جلها ان شاء ان یخطب مع الخطاب فعل وانی راجعها قبل ان یخلو اجلها او بعده کانت عنده علی تطلیقه فان لطقها الثانیه ایضا فشاء ان یحطبها مع الخطاب ان کان ترکها حتی یخلوا جلها فان شاء راجعها قبل ان ینقضی اجلها فان فعل فهی عنده علی تطلیقتین فان

اگر وہ عورت کو ایک طلاق دے اور پھر اسے نظر انداز کر دے یہاں تک کہ اس کی مدت عدہ گزر جائے تو چاہے تو اس سے نکاح کر لے اور چاہے تو مدت عدہ کے گزرنے سے پہلے رجوع کر لے اس صورت میں وہ ایک دفعہ کی طلاق یافتہ ہو گی اور اگر دوسری دفعہ طلاق دے تو مدت عدہ کے گزرنے کے

طلقها الثالثہ فلا تحل لہ حتی تنکح زوجا غیرہ۔ (وافی)

بعد اس سے نکاح کرنا چاہے تو نکاح کر لے اور مدت عدہ کے گزرنے سے پہلے رجوع کرنا چاہے تو رجوع کر لے، اس صورت میں وہ دو دفعہ کی طلاق یافتہ ہو گی اور اگر تیسری دفعہ طلاق دے دے تو وہ اس وقت تک حلال نہ ہو گی جب تک کسی اور شخص سے نکاح نہ کر لے۔

اسلام کے تمام احکام مبنی بر حکمت ہیں۔ اس نے طلاق میں دو مرتبہ رجوع کا حق دے کر طلاق دہندہ کے لئے یہ موقع فراہم کیا ہے کہ اگر وہ اپنی غلطی پر متنبہ ہو کر اپنے کئے پر پچھتائے تو عدہ کے اندر رجوع کر لے یا عدہ کے بعد دوبارہ نکاح کر لے اور ان دو موقعوں کے بعد تیسری مرتبہ طلاق دیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ سابقہ تجربہ سے اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اب نباہ ناممکن ہے ورنہ یہ جانتے ہوئے کہ اب نہ رجوع ہو سکے گا اور نہ تحلیل کی بے غیرتی برداشت کئے بغیر نکاح ہو سکے گا وہ یہ اقدام کیوں کرتا۔

سواد اعظم کے نزدیک اگر کوئی شخص ایک ہی نشست میں تین مرتبہ لفظ طلاق دہرا دے ا طلاق کے ساتھ تین کا ہندسہ لگا دے تو پہلے مرحلہ ہی پر عورت حرام ہو جاتی ہے نہ رجوع کا حق رہتا ہے اور نہ اس وقت تک اس سے نکاح کر سکتا ہے جب تک اس کے حلال کرنے کا سروسامان نہ کرے۔ اسلام ایسا حکمت پسند و فطرت شناس دین موقع دئے بغیر اس قسم کی سزا تجویز نہیں کر سکتا۔ چنانچہ شارع اسلام نے اس قسم کی تین طلاقوں کو جو بیک وقت دی جاتی ہیں صریحاً غلط کہا ہے اور صحاح اہلسنّت میں متعدد احادیث اس غیر اسلامی طریق کار کی مد میں درج ہیں۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں کسی نے ایک ہی نشست میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپؐ نے پر غضب لہجے میں فرمایا۔

ایلعب بکتاب اللہ وانا بین اظہر کم۔(سنن نسائی ج ۲ ص ۹۹)

کیا اللہ کی کتاب سے کھیلا جا رہا ہے حالانکہ میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔

اس یکبارگی تین طلاق کو طلاق ثلاث قرار دینے کی ابتداء حضرت عمرؓ کے دور سے ہوئی اور انہی کے حکم سے اس کا نفاذ ہوا۔ چنانچہ ابن عباس کہتے ہیں کہ۔

کان الطلاق علی عهد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و ابی بکر و سنتین من خلافتہ عمر طلاق الثلاث واحدہ فقال عمر ابن الخطاب ان الناس قد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر کے عہد میں اور عمر کے دور خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاقوں کو ایک ہی مانا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ

استعجلوا فی امر کانت لھم فیہ اناہ فلوا مضینا علیھم فامضا علیھم۔ (صحیح مسلم ج ا ص ۴۷۷)۔

لوگوں نے ایسے امر میں جلد بازی شروع کر دی ہے جس میں ان کے لئے مہلت فراہم کی گئی تھی اب اگر اسی کو نافذ کر دیا جائے تو کیا ہرج ہے چنانچہ انہوں نے ایک ساتھ دی ہوئی تین طلاقوں کو تین طلاقیں قرار دینے کا حکم جاری کر دیا۔

اس حکم کی تائید نہ قرآن سے ہوتی ہے اور نہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے۔ بلکہ قرآن و سنت دونوں نے اس کی نفی کی ہے۔ مگر اس کے باوجود سواد اعظم کا اسی پر عملدر آمد ہے۔ بہرحال قرآن و سنت اور آئمہ اہل بیت علیہ السلام کے اقوال کی روشنی میں ایک ساتھ تین طلاقیں کہہ دینے سے تین طلاقیں واقع نہیں ہوتیں بلکہ پہلی اور دوسری اور دوسری اور تیسری طلاق کے درمیان رجوع کی صورت پیدا ہو تو تین طلاقیں ہوں گی۔

اگر کسی آزاد عورت کا شوہر غلام ہو تو وہ بھی تین طلاقوں کے بعد اسی طرح حرام ہو جائے گی جس طرح آزاد سے بیاہی ہوئی آزاد عورت حرام ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حضرتؑ سے غلام سے بیاہی ہوئی آزاد عورت کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ وہ کتنی طلاقوں کے بعد حرام ہو گی۔ فرمایا۔

الطلاق والعدہ بالنساء۔(وانی) طلاق اور عدہ میں دوسری عورتوں کے برابر ہو گی۔

یعنی تیسری طلاق کے بعد حرام ہو جائے گی اور اس کی مدت عدہ بھی تین طہر ہے۔ اگر عورت کنیز ہو تو دوسری طلاق کے بعد حرام ہو جائے گی۔ چنانچہ دو آدمیوں نے حضرت عمرؓ سے کنیز کی طلاق کے بارے میں پوچھا۔ وہ ان دونوں کو لے کر امیرالمومنین علیہ السلام کے پاس آئے اور کنیز کی طلاق کے بارے میں پوچھا آپ نے انگلیوں کے اشارے سے بتایا کہ دو یعنی دو طلاقوں کے بعد وہ اپنے شوہر پر حرام ہو جائے گی۔

اگر کوئی شخص مباشرت کے بعد اپنی بیوی کو طلاق دے تو وہ پورے مہر کی ادائیگی کا ذمہ دار ہو گا اور اگر مباشرت سے پہلے طلاق دے تو عورت نصف مہر کی حقدار ہو گی۔ چنانچہ حضرتؑ سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے کنیز کو مہر قرار دے کر ایک عورت سے عقد کیا اور مباشرت سے پہلے اسے طلاق دے دی اب ادائے مہر کی کیا صورت ہو گی فرمایا کہ وہ کنیز کی آدھی قیمت اس عورت کو بطور مہر ادا کرے۔ اسی طرح ایک شخص نے اپنی کنیز کی آزادی کو مہر قرار دے کر اس سے عقد کیا اور مباشرت سے قبل اسے طلاق دے دی فرمایا کہ وہ کنیز محنت مزدوری کر کے اپنی نصف قیمت اس شخص کو واپس کرے۔

باب العدہ

عورت کو طلاق کے ملنے یا بیوہ ہونے پر کچھ عرصہ کے لئے نکاح ثانی سے توقف کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ ایک رشتہ کے ختم ہوتے ہی دوسرا رشتہ قائم کر لیا جائے تو اس سے ازدواجی رشتہ بے وقعت و بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے۔ علاوہ بریں اس میں یہ مصلحت بھی کارفرما ہے کہ یہ امر واضح طور پر معلوم ہو جائے کہ عورت حاملہ تو نہیں ہے اور یہ معلوم ہونا اس لئے ضروری ہے کہ اگر رشتہ کے قطع ہونے یا شوہر کے مرنے کے فوراً بعد دوسرا نکاح کر لے گی تو حمل کے ظاہر ہونے کی صورت میں یہ پتا نہ چل سکے گا کہ یہ حمل پہلے شوہر سے ہے یا دوسرے شوہر سے۔ کیونکہ ابتدائے حمل میں حمل کا احساس نہیں ہوتا اور ہوتا ہے تو غیر یقینی طور پر۔ اس بنا پر جن عورتوں میں حمل کا امکان نہیں ہوتا جیسے صغیرہ یائسہ اور غیر مدخولہ' ان پر سے عدہ ساقط کر دیا گیا ہے اور وہ طلاق کے بعد جب چاہیں عقد ثانی کر سکتی ہیں۔ البتہ عدہ وفات ان پر بھی ہے۔ کیونکہ ازدواجی روابط میں تفریق کے باوجود شوہر کی موت کا صدمہ سب کو یکساں ہوتا ہے اور غم کے اثرات جب تک تازہ رہتے ہیں انسان فطرۃً خوشی کی کسی تقریب کو گوارا نہیں کرتا اور اسلام کا ہر قانون چونکہ فطرت کے عین مطابق ہے اس لئے اس نے بیوہ کو سوگوارانہ طرز عمل اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے اور بے ضرورت گھر سے باہر نکلنے' زیور اور رنگین لباس پہننے اور زینت کرنے سے منع کیا ہے اور اس کی ایک حد بھی مقرر کر دی ہے تاکہ زندگی کے معمولات میں ناقابل برداشت عرصہ تک خلل رونما نہ ہو۔ اس مقررہ حد کا نام عدہ ہے جس میں مطلقہ ہو یا بیوہ عقد ثانی نہیں کر سکتی۔

اگر عورت طلاق یافتہ ہو تو اس کا عدہ تین طہر ہیں اس میں وہ طہر بھی شامل ہے جس میں طلاق واقع ہوئی ہو۔ قرآن مجید میں ہے۔

والمطلقات یتربصن بانفسھن ثلثہ قروء۔

جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو وہ تین طہروں تک اپنے کو نکاح سے روکیں۔

قروء قرء کی جمع ہے اس کے معنی حیض کے بھی ہیں اور طہر کے بھی طہر سے مراد دو حیضوں کا درمیانی عرصہ ہے اور آیت میں قرء سے مراد یہی پاکیزگی کے ایام ہیں چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

انما القرء مابین الحفتین۔ (وسائل الشیعہ)

قرء سے مراد دو حیضوں کا درمیانی عرصہ ہے۔

لہٰذا جب تیسرے طہر کے بعد خون حیض دیکھے گی تو اس کے ساتھ ہی مدت عدہ ختم ہو جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اذا رأت الدم من الحيضة الثالثة فقدا نقضت عدتها۔ (وسائل الشیعہ)

جب عورت تیسرا خون حیض دیکھے گی تو اس کی مدت عدہ ختم ہو جائے گی۔

اگر مطلقہ حاملہ ہو تو مدت عدہ وضع حمل ہے۔ خواہ طلاق کے تھوڑی دیر بعد بچہ پیدا ہو جائے وقت پر پیدا ہو یا قبل ازوقت گر جائے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اماالمطلقة الحامل فاجلها كما قال الله عزو جل ان تضع حملها وكل شئى وضعته يستبين انه حمل تم اولم يتم فقد انقضت به عدتها۔ (متدرک الوسائل)

مطلقہ حاملہ کی مدت عدہ فرمان الٰہی کے مطابق وضع حمل ہے اور وہ جو کچھ جنے اس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ حمل تھا خواہ جو جنا ہے وہ تمام ہو یا ناتمام۔ اس کا عدہ ختم ہو جائے گا۔

اگر جڑواں بچوں کے ساتھ حاملہ ہو تو ایک بچے کی پیدائش سے عدہ ختم نہیں ہو گا بلکہ دوسرے بچے کے جننے پر تمام ہو گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لا تنقضى عدتها الابالولد الاخير منهما۔ (متدرک الوسائل)

اس کا عدہ آخری بچے کی پیدائش پر تمام ہو گا۔

طلاق رجعی میں عورت عدہ کے ختم ہونے تک نان و نفقہ کی حقدار ہو گی اور اسی گھر میں ٹھہرے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

المطلقة لهاالسكنى والنفقة مادامت فى عدتها كانت حاملا اوغير حامل مادامت الزوج عليها رجعته۔ (متدرک الوسائل)

عورت جب تک عدہ میں ہے اور شوہر رجوع کر سکتا ہے وہ حاملہ ہو یا غیر حاملہ اسے سکونت اور نفقہ کا حق ہے۔

اور عورت کے لئے بھی شدید ضرورت کے بغیر گھر سے نکلنا جائز نہیں ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

المطلقة لاتعتد الافى بيت زوجها ولا تخرج منه حتى يخلوا جلها۔ (متدرک الوسائل)

مطلقہ اپنے عدہ کے ایام شوہر کے گھر میں پورے کرے اور عدہ ختم ہونے سے پہلے گھر سے نہ نکلے۔

اگر عورت بیوہ ہو جائے تو مدت عدہ چار ماہ دس دن ہو گی۔ صغیرہ ہو یا یائسہ' مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ اگر ایک عورت کا شوہر ہم بستر ہونے سے پہلے مرجائے تو عورت عقد ثانی کے لئے کتنا عرصہ توقف کرے۔ فرمایا۔

لا تنکح حتی تعتد باربعتہ اشھر و عشرہ ایام۔ (الفقیہ)

وہ جب تک چار ماہ دس دن تک عدہ نہ رکھے دوسرا نکاح نہ کرے۔

اگر بیوہ حاملہ ہو تو چار ماہ دس دن اور وضع حمل میں جو مدت طویل تر ہوگی وہ مدت عدہ قرار پائے گی۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

تعتد ابعد الا جلین ان وضعت قبل اربعتہ اشھر وعشر وان مضت لھا اربعتہ اشھر وعشر قبل ان تضع تربصت حتی تضع۔(متدرک الوسائل)

وہ بیوہ جو حاملہ ہو اسے چار ماہ دس دن اور وضع حمل میں جو مدت طویل تر ہو گی عدہ رکھنا ہوگا اگر چار ماہ دس دن سے پہلے وضع حمل ہو جائے تو وہ چار ماہ دس دن پورے کرے اور اگر چار ماہ دس دن گزر جائیں اور وضع حمل نہ ہو تو وضع حمل تک توقف کرے۔

قرآن مجید میں عدہ کی ان دونوں مدتوں کا ذکر ہے۔ چنانچہ پہلی مدت عدہ کے بارے میں فرمان الٰہی ہے۔

والذین یتوفون منکم و یذرون ازواجا یتربصن بانفسھن اربعتہ اشھر و عشرا۔

وہ لوگ جو بیویاں چھوڑ کر مرجائیں تو بیویاں چار مہینے دس دن تک اپنے کو روک کر رکھیں۔

اور دوسری مدت کے بارے میں ارشاد ہے۔

و اولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن۔

حاملہ عورتوں کی مدت عدہ ان کے بچہ جننے تک ہے۔

ابن مسعود کا قول ہے کہ پہلی آیت منسوخ اور دوسری آیت ناسخ ہے اور بیوہ کی مدت عدہ صرف وضع حمل ہے۔ مگر امیرالمومنین علیہ السلام نے ان دو آیتوں کو جمع کرتے ہوئے فرمایا کہ ان دونوں مدتوں میں سے جو مدت طویل تر ہو گی وہی مدت عدہ ہو گی اور یہی قول مسلم و معتمد ہے۔

علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں دوسری آیت کو مطلقہ عورتوں کے بارے میں قرار دیا ہے اس لئے کہ مطلقہ اگر حاملہ ہو تو اس کی مدت عدہ صرف وضع حمل ہے۔

عدہ طلاق کی ابتداء طلاق کے واقع ہونے سے ہوتی ہے۔ خواہ عورت کو اس کا علم ہو یا نہ ہو اور عدہ وفات کی ابتداء اس وقت سے ہوتی ہے جب اسے شوہر کے مرنے کا علم ہو جائے۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

المطلقة تعتد من یوم طلقها زوجها والمتوفی عنها زوجها تعتد من یوم یبلغها الخبر۔(الفقیہ)

مطلقہ اس دن سے عدہ شروع کرے جس دن سے اسے طلاق ہوئی ہے اور بیوہ اس دن سے عدہ کی ابتداء کرے جس دن اسے شوہر کے مرنے کی اطلاع ملے۔

اگر کوئی عورت طلاق رجعی کے عدہ میں ہو اور اسی عدہ کے دوران اس کا شوہر فوت ہو جائے تو وہ عدہ طلاق کے بجائے عدہ وفات رکھے گی۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ ایک شخص اپنی بیوی کو پہلی یا دوسری طلاق دے دیتا ہے اور عورت کے عدہ کے دوران خود مر جاتا ہے اس عورت کو کیا کرنا چاہیے۔ فرمایا۔

تعتد عدة المتوفی عنها زوجها اربعة اشهر و عشرا۔(مستدرک الوسائل)

وہ چار مہینے دس دن عدہ رکھے جو اس عورت کا عدہ ہے جس کا شوہر مر جائے۔

باب القضاء

شرعی احکام کے مطابق باہمی تنازعات و خصومات کے تصفیہ کا نام قضا ہے۔ اس کام کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ عدل و انصاف کا حصول حقوق عامہ کا تحفظ اور تمدنی نظم کا قیام اسی سے وابستہ ہے۔ لیکن جتنا یہ فریضہ اہم ہے اتنا ہی اپنی گوناگوں پیچیدگیوں کی وجہ سے کٹھن اور دشوار ہے اور اچھے اچھے ذی فہم صحیح نتیجہ تک پہنچنے سے قاصر رہتے ہیں اور اگر پہنچ بھی جائیں تو مالی مفاد اور تعلقات و روابط کی فولادی دیواریں ان کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں اور انصاف و حق رسی کے بجائے تضیع حقوق پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ صرف وہی افراد اس سے عہدہ برآمد ہو سکتے ہیں جن کا قلب و ضمیر مادی آلائشوں سے پاک و صاف ہو اور احساس فرض کے پیش نظر اس منصب کی ذمہ داریوں کی تکمیل میں فرق نہ آنے دیں۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام نے قاضی شریح کو اس منصب اور اس منصب کی ذمہ داریوں کی طرف ملتفت کرتے ہوئے فرمایا۔

یا شریح قد جلست مجلسا لا یجلسه الا نبی او وصی نبی او شقی۔(وسائل الشیعہ)

اے شریح جس مسند پر تم بیٹھے ہو اس پر نبی یا وصی نبی بیٹھتا ہے یا وہ جو شقی و بدبخت ہوتا ہے۔

اس منصب کا تقاضا یہ ہے کہ انسان جو فیصلہ کرے پوری دیانت داری سے کرے اور بے جا رو رعایت، جنبہ داری اور خیانت و بے راہروی سے کنارہ کش رہے۔ حضرتؑ نے رفاعہ ابن شداد کو اہواز میں قاضی مقرر کیا تو انہیں ہدایات دیتے ہوئے تحریر فرمایا۔

ان هذه الاطسقه امانته فمن جعلها خیانته فعلیه لعنته الله الی یوم الاقیامه۔(مستدرک الوسائل)

یہ منصب ایک امانت ہے جو اس میں خیانت کا مرتکب ہوگا وہ قیامت تک اللہ کی لعنت کا مستحق قرار پائے گا۔

قضا کے سلسلہ میں رشوت لینے کا کوئی جواز نہیں ہے خواہ صحیح فیصلہ ہی کرنا ہو۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ومن السحت الرشوه فی الحکم۔(مستدرک الوسائل)

فیصلہ کے سلسلہ میں رشوت حرام ہے۔

رشوت کبھی تحفہ و ہدیہ کے نام سے بھی پیش کی جاتی ہے۔ لہٰذا ان لوگوں سے جنہوں نے اس کے ہاں کوئی مرافعہ دائر کر رکھا ہو تحفہ و تحائف کے قبول کرنے کا بھی جواز نہیں ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ایاک و قبول التحف من الخصوم۔(مستدرک الوسائل)

داد خواہوں سے کوئی تحفہ قبول نہ کرو۔

جب تک دعوی و جواب دعوی سن کر معاملہ کی تہ تک نہ پہنچے فیصلہ نہ کرے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لایدخل فی اعجاب یکتفی بادنی فهم دون اقصا۔
(مستدرک الوسائل)

اپنی معاملہ فہمی پر مغرور نہ ہو کہ تھوڑا بہت سمجھنے پر اکتفاء کر لے بلکہ اصل معاملہ کی پوری چھان بین کرے۔

غصہ اور اونگھ کی حالت میں فیصلہ نہ کرے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

لاتقض وانت غضبان ولا من النوم سکران۔
(مستدرک الوسائل)

غصہ کی حالت میں اور نیند کی مدہوشی میں فیصلہ نہ کرو۔

قضا کے سلسلے میں مشورہ و رائے نہ لے۔ اس لئے کہ دین کے احکام و ضوابط مشورہ کے محتاج نہیں ہیں اور نہ قیاس و رائے سے طے پاتے ہیں۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لا تشاور فی القضاء فان المشورہ فی الحرب و مصالح العاجل والدین لیس بالرای انما ھوالاتباع۔
(مستدرک الوسائل)

قضا کے سلسلہ میں مشورہ نہ کرو اس لئے کہ مشورہ جنگ اور دنیوی مصالح کے سلسلہ میں ہوتا ہے اور دین رائے کے تابع نہیں ہے بلکہ (احکام شرع کے) اتباع کا نام ہے۔

فریقین میں سے ایک فریق کو اپنی توجہ کا مرکز قرار نہ دے بلکہ دونوں سے یکساں رویہ رکھے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

من ابتلی بالقضاء فلیواس بینھم فی الاشارہ وفی النظر وفی المجلس۔(وسائل الشیعہ)

جس شخص پر قضا کا بار آپڑے اسے چاہئے کہ اشارہ نظر اور جائے نشست میں سب سے یکساں برتاؤ کرے۔

امیرالمومنین علیہ السلام کی ذات والاصفات میں صحیح علمی ذوق اور قوت فیصلہ کے امتزاج نے واقعات سے اخذ نتائج کا ملکہ بدرجۂ اتم پیدا کر دیا تھا اور آپ ان پیچیدہ گتھیوں کو جنہیں سلجھانے میں دوسرے عاجز و درماندہ ہو جاتے تھے اس طرح حل کر دیتے کہ اصل واقعہ کا ایک ایک گوشہ بے نقاب ہو کر سامنے آجاتا۔ یہ حضرتؑ کا وہ امتیازی وصف تھا جس میں کوئی آپؑ کا مثل و نظیر نہ تھا۔ چنانچہ اکابر صحابہ حل قضایا و فصل خصومات میں آپؑ سے رابطہ قائم کرتے اور آپؑ کے فیصلہ پر مطمئن ہو جاتے۔

حضرت علی علیہ السلام کی قوت فیصلہ اور مہارت قضا کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اعلم امتی بالسنتہ والقصاء بعدی علی ابن ابی طالب۔کفایتہ الطالب ص ۱۹۰)

میری امت میں میرے بعد سب سے بڑھ کر سنت و قضا کے جاننے والے علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہیں۔

حضرت عمرؓ کا قول ہے۔

علی اقضانا۔(صواعق محرقہ ص ۱۲۶)

علی علیہ السلام ہم سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں۔

ابن مسعود کہتے ہیں۔

کنانتحدث ان اقضی اهل المدینتہ علی۔(استیعاب ج ۳ ص ۴۱)

ہم یہ تذکرہ کیا کرتے تھے کہ اہل مدینہ میں علی علیہ السلام سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں۔

ابو سعید خدری اور قتادہ انصاری کہتے ہیں۔

اقضا هم علی۔(فتح الباری ج ۸ ص ۱۳۶)

سب لوگوں سے بڑھ کر فیصلہ کرنے والے علی علیہ السلام ہیں۔

حضرتؑ کے سامنے جو قضایا پیش ہوتے آپ ان کا فیصلہ قرآن و سنت کی روشنی میں کرتے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ماوایت علیا قضی قضاء الا وجدت لہ اصلافی السنتہ۔(امالی مفید ح)

اصل و بنیاد سنت میں موجود پائی۔

حضرتؑ کا ہر فیصلہ چونکہ قرآن و سنت کی بنیاد پر ہوتا تھا اس لئے وہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا تھا جس میں نہ رد و بدل کی گنجائش ہوتی تھی اور نہ ترمیم و تنسیخ کی۔ چنانچہ حضرتؑ خود فرماتے ہیں۔

لو اختصم الی رجلان فقضیت بینهما ثم مکثااحوالا کثیره ثم امتیانی فی ذلک الامر اقضیت بینهما قضاء واحد الان القضاء لا یحول ولا یزول ابدا۔(مستدرک الوسائل)

اگر میرے پاس دو شخص کوئی جھگڑا نمٹانے کے لئے آئیں اور میں کوئی فیصلہ کروں اور پھر ایک طویل مدت کے بعد دوبارہ اسی قضیہ کو لے کر آئیں تو میرا فیصلہ وہی ہو گا جو پہلے تھا کیونکہ فیصلہ میں نہ رد و بدل ہوتا ہے اور نہ حکم کبھی بر طرف ہوتا ہے۔

فصل خصومات کے سلسلہ میں امیرالمومنین علیہ السلام کا طریق کار یہ تھا کہ اگر ایک چیز کی ملکیت کے دو دعویدار ہوتے اور دونوں کا قبضہ ہوتا یا ان میں سے کسی ایک کا قبضہ نہ ہوتا تو دونوں کو نصف نصف کا مالک قرار دیتے چنانچہ دو آدمیوں نے ایک اونٹ کے بارے میں دعویٰ کیا اور دونوں نے اپنی ملکیت کے گواہ پیش کئے۔ حضرتؑ نے دونوں کو نصف نصف کا مالک قرار دیا۔

اگر دو دعویداروں میں سے ایک کا قبضہ ہوتا تو قبضہ کو دلیل ملکیت قرار دے کر اس کے حق میں فیصلہ فرماتے۔ چنانچہ دو شخصوں نے ایک چوپایہ کے بارے میں دعوی کیا اور دونوں نے اپنی اپنی ملکیت کے گواہ پیش کئے۔ حضرت نے اس شخص کے حق میں فیصلہ کیا جس کا قبضہ تھا اور فرمایا کہ اگر اس کا قبضہ نہ ہوتا تو میں ان دونوں کو نصف نصف کا مالک قرار دیتا۔

اگر دونوں کے پاس برابر کے گواہ ہوتے تو ان دونوں سے دوسرے حق کی نفی کے سلسلہ میں قسم بھی لیتے۔ چنانچہ دو آدمیوں نے ایک چوپایہ کی ملکیت کا دعویٰ کیا اور دونوں نے گواہ پیش کئے حضرت نے ان دونوں سے قسم کا مطالبہ کیا ان میں سے ایک نے قسم کھانے سے انکار کیا اور دوسرے نے قسم کھائی۔ آپ نے وہ چوپایہ قسم کھانے والے کے حوالے کر دیا۔

اگر دونوں گواہ پیش کرتے مگر ان کی تعداد میں فرق ہوتا تو ان کی کمی بیشی کے اعتبار سے فیصلہ کرتے۔ چنانچہ دو شخصوں نے ایک خچر کی ملکیت کا دعویٰ کیا ایک نے پانچ گواہ اور دوسرے نے دو گواہ ملکیت کے ثبوت میں پیش کئے۔ حضرتؑ نے پانچ گواہ پیش کرنے والے کو پانچ حصوں کا اور دو گواہ پیش کرنے والے کو دو حصوں کا مالک قرار دیا۔

اگر کوئی پیچیدہ صورت پیش آتی تو قرعہ سے کام لیتے۔ چنانچہ یمن میں ایک چھت کے بیٹھنے سے گھر کے افراد دب کر ہلاک ہو گئے مگر دو کمسن بچے زندہ بچ رہے۔ ان میں سے ایک آزاد تھا اور ایک غلام مگر آزاد اور غلام میں تمیز نہ ہو سکی۔ حضرتؑ کے سامنے یہ قضیہ پیش ہوا آپؑ نے قرعہ ڈالا اور ایک کو آزاد قرار دے کر وارث ٹھہرایا اور دوسرے کو آزاد کر دیا۔

باب الشہادہ

عدلیہ کے روبرو کسی واقعہ کو ثابت یا رد کرنے کے لئے جو بیان دیا جائے شہادت کہلاتا ہے تاکہ حاکم اس شہادت کی روشنی میں مجرم کو اس کے جرم کی سزا دے یا کسی کا حق متاثر ہوتا ہو تو اس کی حق رسی کرے۔ لہٰذا اگر کسی واقعہ یا حق کا اثبات کسی کی شہادت پر منحصر ہو اور اسے گواہی کے لئے طلب کیا جائے تو اسے اپنے علم و مشاہدہ کے مطابق گواہی دینا چاہیئے اور اس سے پہلو تہی نہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔

ولا یاب الشہداء اذاما دعوا۔ جب گواہ (گواہی کے لئے) طلب کئے جائیں تو انکار نہ کریں۔

اسلام میں گواہ کے لئے عادل اور صحیح العقیدہ ہونا ضروری ہے تاکہ اس کی گواہی پر اعتماد کیا جا سکے اور کسی کی حق تلفی نہ ہونے پائے اگر وہ فاسد العقیدہ اور غیر عادل ہو گا تو اس کی گواہی قابل قبول نہ ہو گی۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لایجوز شہادہ حروری ولا قدری ولا مرجئ ولا اموی ولا ناصب ولا فاسق۔ (متدرک الوسائل) خارجی، قدری، مرجی، اموی، ناصبی اور فاسق کی گواہی صحیح نہیں ہے۔

البتہ اگر فاسق صدق دل سے تائب ہو چکا ہو تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کے سامنے ایک ایسے شخص نے گواہی دی جس کا ایک ہاتھ اور پیر چوری کے جرم میں کاٹا جا چکا تھا۔ حضرتؑ نے اس کی گواہی کو قابل قبول سمجھا کیونکہ وہ صدق دل سے توبہ کر چکا تھا اور لوگوں نے اس کی نیک چلنی کی تصدیق کی تھی۔

اگر گواہ غلام ہو مگر عادل ہو تو یہ غلامی گواہی کے قبول کرنے سے مانع نہ ہو گی۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لا باس فی شہادہ المملوک اذا کان عدلا۔ (وسائل الشیعہ) غلام کی گواہی میں کوئی ہرج نہیں جبکہ وہ عادل ہو۔

ایک مرتبہ عبداللہ ابن قفل تمیمی کا گزر حضرتؑ کی طرف ہوا آپؑ نے اس کے پاس ایک زرہ دیکھی جو بصرہ میں مال غنیمت کے یکجا ہونے سے پہلے اس نے اٹھالی تھی۔ آپؑ نے بلا کر فرمایا کہ یہ طلحہ کی زرہ ہے جس پر تم نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔ عبداللہ نے کہا کہ یہ میری زرہ ہے اور آپ چاہیں تو قاضی شریح سے اس کا فیصلہ کرا لیں۔ حضرت نے قاضی شریح کو فیصلہ پر مامور کیا اور اس سے فرمایا کہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ یہ طلحہ کی زرہ ہے جو مال غنیمت

میں خیانت کر کے حاصل کی گئی ہے۔ قاضی شریح نے ثبوت طلب کیا حضرت نے امام حسن علیہ السلام کو بطور گواہ پیش کیا۔ جنہوں نے شہادت دی کہ واقعاً" یہ طلحہ کی زرہ ہے۔ شریح نے کہا کہ یہ ایک گواہی ہے اور ایک گواہی کافی نہیں ہے۔ حضرتؑ نے قنبر کو طلب کیا انہوں نے بھی گواہی دی کہ یہ طلحہ کی زرہ ہے۔ شریح نے کہا کہ یہ غلام ہے اور غلام کی گواہی قابل قبول نہیں ہے۔ اب حضرتؑ کے تیور بدلے۔ چہرے پر غیض و غضب کے آثار ظاہر ہوئے اور شریح سے فرمایا کہ تم نے اس مقام پر تین غلطیاں کی ہیں۔ پہلی غلطی یہ کہ تم نے گواہ طلب کئے حالانکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر مال غنیمت میں کسی نے کچھ چوری چھپے اٹھا لیا ہو تو وہ بغیر گواہوں کی گواہی کے واپس لے لیا جائے گا۔ دوسری غلطی یہ کہ میں نے حسن علیہ السلام کو بطور گواہ پیش کیا اور تم نے یہ کہہ کر ان کی گواہی رد کر دی کہ وہ اکیلے گواہ ہیں حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک گواہ اور قسم پر فیصلہ کر دیا کرتے تھے اور تیسری یہ کہ میں نے قنبر کو پیش کیا اور تم نے غلام ہونے کی بنا پر ان کی گواہی قبول نہ کی حالانکہ گواہ عادل ہو تو اس کی گواہی قابل قبول ہوتی ہے۔ اور پھر یہ کہ زرہ تو ایک معمولی چیز ہے اور امام المسلمین پر بڑی سے بڑی چیز میں اعتماد و اطمینان کیا جا سکتا ہے۔اگر دو گواہوں کی گواہی میں اختلاف ہو تو اسے رد کر دیا جائے گا۔ اور اگر دونوں شہادتوں کا عنوان تو مختلف ہو مگر ان میں باہمی تلازم ہو تو وہ قابل قبول ہوں گی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے سامنے قدامہ ابن مظعون کو پیش کیا گیا اور عمرو تمیمی اور معلی ابن جارود نے گواہی دی کہ اس نے شراب پی ہے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں نے اسے شراب پیتے دیکھا ہے۔ اور دوسرے نے کہا کہ میں نے اسے شراب کی قے کرتے دیکھا ہے۔ حضرت عمر نے امیرالمومنین علیہ السلام سے دریافت کیا کہ آپؑ اس کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جبکہ دونوں گواہوں کی گواہی مختلف ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ گواہی میں کوئی اختلاف نہیں ہے اس نے شراب پی ہے جب ہی تو شراب کی قے کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ کیا خصی کی شہادت قابل قبول ہے (عمرو تمیمی خصی تھا) فرمایا۔

ماذھاب انثیہ الا کذھاب بعض اعضائہ۔ (الفقیہ) خصیوں کا نہ ہونا ایسا ہی ہے جیسے کوئی عضو بدن جاتا رہے۔

اگر دو گواہ کسی شخص کے بارے میں گواہی دیں کہ اس نے چوری کی ہے اور اس کی پاداش میں اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے اور پھر ان گواہوں میں سے ایک گواہ منحرف ہو جائے اور یہ کہے کہ مجھے اشتباہ ہو گیا تھا تو اسے قطع ید کی آدھی دیت دینا ہو گی۔ چنانچہ دو آدمیوں نے ایک شخص کے بارے میں چوری کی گواہی دی جس پر اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا کہ مجھے اشتباہ ہو گیا تھا۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ وہ ہاتھ کی آدھی دیت ادا کرے۔

اگر دونوں گواہ چوری کی گواہی دینے کے بعد یہ کہیں کہ ہمیں اشتباہ ہو گیا تھا تو وہ پوری دیت دیں گے۔ چنانچہ دو آدمیوں نے ایک شخص کے بارے میں چوری کی شہادت دی۔ حضرتؑ نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا کچھ دنوں کے

بعد وہ ایک اور شخص کو لائے اور کہا کہ ہمیں اشتباہ ہو گیا وہ چور نہ تھا جس کا ہاتھ کاٹا گیا تھا بلکہ یہ چور ہے۔ حضرت نے حکم دیا کہ وہ دونوں پہلے شخص کے قطع ید کی دیت دیں اور دوسرے شخص کے بارے میں ان کی گواہی رد کر دی۔

اگر کسی شخص کے بارے میں قتل یا زنا کی گواہی دی جائے اور اس کے نتیجہ میں اسے قتل یا سنگسار کر دیا جائے اور بعد میں گواہ یہ کہیں کہ ہمیں اشتباہ ہو گیا تھا تو ان پر قتل کی دیت عائد ہو گی اور اگر یہ کہیں کہ ہم نے عمداً غلط شہادت دی تھی تو وہ قتل کے سزا وار ہوں گے۔ چنانچہ چار آدمیوں نے ایک شخص کے بارے میں زنا کی گواہی دی اور اس شہادت کی بنا پر اسے سنگسار کر دیا گیا۔ بعد میں ایک گواہ منحرف ہو گیا۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ اگر وہ یہ کہتا ہے کہ مجھے اشتباہ ہو گیا تھا تو وہ ایک چوتھائی دیت دے اور اگر دو گواہ یہ کہیں کہ ہمیں اشتباہ ہو گیا تو وہ نصف دیت دیں اور اگر تین گواہ کہیں کہ ہمیں اشتباہ ہو گیا تھا تو تین چوتھائی دیت دیں اور اگر چاروں گواہ کہیں کہ ہمیں اشتباہ ہو گیا تھا تو پوری دیت ادا کریں اور اگر یہ کہیں کہ ہم نے جھوٹی گواہی دی تھی تو وہ قتل کے سزاوار ہوں گے۔

اگر یہ اندیشہ ہو کہ گواہوں سے ایک دوسرے کے روبرو گواہی طلب کی گئی تو ایک کی گواہی دوسرے کی گواہی پر اثر انداز ہو گی تو اس صورت میں گواہوں سے الگ الگ گواہی لینا چاہیے۔ امیرالمومنین علیہ السلام ایسے موارد پر گواہوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے گواہی لیتے تاکہ ان کے اتفاق یا اختلاف سے اصل واقعہ کی صحت یا عدم صحت واضح ہو سکے۔ چنانچہ ایک شخص سفر میں تھا اور اس کے گھر میں بیوی اور ایک یتیم لڑکی تھی۔ اس کی بیوی کو یہ خیال ہوا کہ کہیں اس کا شوہر اس لڑکی سے عقد نہ کر لے اس نے نشہ آور چیز اس لڑکی کو پلائی اور اپنی چند ہمسائیوں کی مدد سے اس کی بکارت زائل کر دی جب اس کا شوہر سفر سے پلٹ کر آیا تو اسے بتایا کہ یہ لڑکی فعل بد کی مرتکب ہوئی ہے اور اپنی شریک کار ہمسائیوں سے بھی کہلوایا۔ اس شخص نے یہ معاملہ حضرت عمر کے سامنے پیش کیا مگر وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے اور یہ کہا کہ اس کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام سے دریافت کیا جائے۔ چنانچہ آپ کی طرف رجوع کیا گیا آپ نے اس عورت کو بلا کر پوچھا کہ تیرے پاس اس الزام کا کیا ثبوت ہے۔ اس نے اپنی ہمسائیوں کو گواہی کے لئے پیش کیا آپ نے انہیں ایک دوسرے سے الگ کر کے ان میں سے ایک کو طلب کیا اور اس سے کہا کہ اگر تو نے صحیح واقعہ نہ بتایا تو میری تلوار سے بچ نہ سکے گی۔ اس نے جان کی امان مانگی اور صحیح صحیح واقعہ بیان کر دیا۔ جب اس عورت کی فریب کاری ظاہر ہو گئی تو آپؑ نے اس عورت اور اس کی ہمسائیوں سے چار سو درہم اس لڑکی کو دلوائے اور اس شخص سے کہا کہ وہ اس عورت کو طلاق دے کر علیحدہ کر دے اور اس لڑکی کو اپنے عقد میں لے لے اور پھر فرمایا۔

اللہ اکبر انا اول من فرق بین الشھود الا دانیال النبی۔(وسائل الشیعہ)

اللہ بزرگ و برتر ہے میں حضرت دانیال علیہ السلام کے بعد وہ پہلا فرد ہوں جس نے گواہوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے گواہی کے لئے طلب کیا۔

باب الحدود

اصلاح معاشرہ اور انسداد جرائم کے لئے مجرموں کی سرکوبی از بس ضروری ہوتی ہے چنانچہ ہر حکومت جرائم کے سدباب اور امن و امان کی بحالی کے پیش نظر جرائم پیشہ لوگوں کو مختلف سزائیں دیتی ہے۔ اگر سزا کا اندیشہ نہ ہو تو نہ جرائم کی روک تھام ہو سکتی ہے اور نہ نظم و انضباط برقرار رہ سکتا ہے۔ اسلام جو افرادی اصلاح کے ساتھ پر امن معاشرہ کے قیام کا داعی ہے وہ قانون معاشرت کے تحفظ کے لئے مجرم کو سزا دینا ضروری سمجھتا ہے اور کسی جرم کو نظرانداز نہیں کرتا تاکہ کسی کو کھلے بندوں ارتکاب جرم کی جرأت نہ ہو سکے۔ ایک طبقہ کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام کی سزائیں انتہائی سخت ہیں۔ بیشک اسلام کی تجویز کردہ سزائیں اپنے اندر سختی لئے ہوئے ہیں لیکن جرائم کے انسداد کے لئے اس کے سوا چارہ کار ہی کیا تھا جبکہ یہ مشاہدہ ہے کہ معمولی سزائیں جرائم کی روک تھام میں ناکام ثابت ہو چکی ہیں اور سزاؤں کے باوجود جرائم بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ لہٰذا جرائم کے انسداد کے لئے یہی تدبیر کارگر ہو سکتی تھی کہ سخت سے سخت سزا تجویز کی جائے تاکہ سزا کی ہولناکی ارتکاب جرم سے مانع ہو۔

اسلام میں دو قسم کی سزائیں ہیں۔ ایک وہ جو شارع کی طرف سے متعین ہیں جیسے سو تازیانوں یا ہاتھ کاٹنے کی سزا۔ انہیں حدود سے تعبیر کیا جاتا ہے اور دوسری سزائیں وہ جو قاضی کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی ہیں کہ وہ جرم کی سبکی و سنگینی اور مجرم کی ذہنی کیفیت کو دیکھتے ہوئے تجویز کرے چاہے اسے قید کرے چاہے جسمانی سزا دے یا ڈانٹ ڈپٹ کر کے چھوڑ دے انہیں تعزیرات کہا جاتا ہے۔ حدود کے اجراء کے لئے ضروری ہے کہ مجرم کے خلاف شرعی شہادت قائم ہو یا وہ خود اقرار جرم کرے۔ اگر بینہ شہادت سے جرم ثابت ہو جائے تو پھر حد کے اجراء میں تاخیر روا نہیں ہے۔ چنانچہ حضرتؑ کے پاس تین آدمیوں نے گواہی دی کہ فلاں شخص زنا کا مرتکب ہوا ہے فرمایا کہ چوتھا گواہ کہاں ہے کہا کہ وہ ابھی آیا چاہتا ہے فرمایا۔

لیس فی الحدود نظرہ بساعۃ۔ (وسائل الشیعہ)

حدود کے سلسلہ میں ایک ساعت کا بھی انتظار نہیں کیا جا سکتا۔

یونہی سفارش کی بنا پر عفو و درگزر کا بھی جواز نہیں ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لا یشفعن احد فی حد اذا بلغ الامام فانہ لا یملکہ۔ (وسائل الشیعہ)

جب معاملہ امام تک پہنچ جائے تو حد کے بارے میں کوئی شخص سفارش نہ کرے کیونکہ امام اس (کے رد و بدل) پر اختیار نہیں رکھتا۔

چنانچہ ایک مرتبہ بنی اسد کا ایک آدمی کسی جرم میں ماخوذ ہوا اس کے قبیلہ کے کچھ لوگ حضرت حسین ابن

علی علیہ السلام کی خدمت میں آئے اور کہا کہ آپؑ ہمارے آدمی کے بارے میں امیرالمومنین علیہ السلام سے سفارش کریں مگر آپؑ نے انکار کر دیا اب وہ لوگ امیرالمومنین علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا کہ ہم اپنے آدمی کی سفارش کرنے کے لئے آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ حضرتؑ نے فرمایا۔ کہ جو چیز میرے بس میں ہو گی میں اس سے دریغ نہیں کروں گا۔ وہ لوگ یہ سمجھ کر کہ ان کی سفارش مؤثر ثابت ہوئی ہے۔ خوشی خوشی واپس پلٹے۔ واپسی پر امام حسین علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو ان سے کہا کہ امیرالمومنین علیہ السلام نے ہماری سفارش قبول فرما لی ہے۔ آپؑ نے فرمایا کہ شاید اس عرصہ میں اس پر حد جاری ہو چکی ہو۔ یہ سن کر وہ لوگ دوبارہ امیرالمومنین علیہ السلام کے پاس آئے دیکھا کہ اس پر حد جاری کی جا رہی ہے۔ ان لوگوں نے کہا کہ یا امیرالمومنینؑ کیا آپؑ نے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ جو چیز میرے اختیار میں ہو گی اس سے دریغ نہیں کروں گا۔ فرمایا۔

قد وعد تکم ما املک وھذا شئی للہ لست املکہ۔ (مستدرک الوسائل)

میں نے تو اس چیز کے لئے وعدہ کیا تھا جس پر مجھے اختیار ہو گا اور ہر چیز صرف اللہ کے لئے ہے جس پر مجھے اختیار نہیں ہے۔

شرع نے جن جرائم کے ارتکاب پر مختلف حدود کے اجراء کا حکم دیا ہے۔ ان میں سے چند حدوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حد زنا:۔ زنا ایک ایسا عمل شنیع ہے جو ہر قوم و ملت میں انتہائی برا سمجھا جاتا ہے اور کوئی مذہب جو اخلاقی قدروں کا پاس رکھتا ہو اس کی اجازت نہیں دیتا اور اسلام میں اسے گناہائے کبیرہ میں شمار کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

لا تقربو الزنا انہ کان فاحشتہ وساء سبیلا۔

زنا کے قریب نہ جاؤ یہ سراسر بے حیائی اور بد چلنی ہے۔

زنا کے ثبوت کے لئے چار گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ تعداد پوری ہو جائے تو اسے سو کوڑوں یا رجم کی سزا دی جائے گی۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لا یرجم رجل ولا مراۃ حتی یشھد علیہ اربعتہ شھد و علی الا یلاج والاخراج۔ (وسائل الشیعہ)

کسی مرد یا عورت کو اس وقت تک سنگسار نہیں کیا جائے گا جب تک چار گواہ وقوع فعل کی عینی شہادت نہ دیں۔

اگر گواہ نہ ہوں اور وہ خود چار مرتبہ اس فعل کے ارتکاب کا اقرار کرے تو اس صورت میں بھی اسے

کوڑوں یا رجم کی سزا دی جائے گی۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

اذا اقر الرجل علی نفسه بالزنا اربع مرات و کان محصنا رجم۔(مستدرک الوسائل)

اگر کوئی شخص چار مرتبہ زنا کا اقرار کرے اور بیوی رکھتا ہو تو اسے سنگسار کیا جائے گا۔

ایک شخص امیرالمومنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ یا امیرالمومنینؑ میں فعل زنا کا مرتکب ہوا ہوں مجھے شرعی سزا دے کر پاک کر دیجئے۔ حضرتؑ نے فرمایا کیا تمہارا ذہنی توازن درست ہے۔ کہا ہاں فرمایا کیا قرآن کی تلاوت کر سکتے ہو کہا ہاں فرمایا کس قبیلہ سے ہو کہا قبیلہ جہنیہ سے فرمایا تم اس وقت جاؤ میں لوگوں سے تمہارے بارے میں دریافت کروں گا۔ حضرتؑ نے اس کے بارے میں لوگوں سے دریافت کیا تو بتایا گیا کہ وہ صحیح العقل اور مسلمان ہے۔ جب وہ دوبارہ آیا اور اقرار زنا کے بعد اجرائے حد کی خواہش کی تو آپ نے پوچھا کیا تم بیوی رکھتے ہو کہا ہاں فرمایا کیا تم اس تک پہنچ سکتے تھے یا وہ کسی دور و دراز جگہ پر تھی۔ کہا کہ وہ گھر میں موجود تھی فرمایا جاؤ ہم تمہارے بارے میں مناسب فیصلہ کریں گے۔ جب وہ تیسری مرتبہ آیا اور مثل سابق اقرار کیا تو حضرتؑ نے پھر اسے واپس جانے کے لئے کہا آخر چوتھی مرتبہ حاضر ہوا اور زنا کا اعتراف کیا۔ جب حضرتؑ نے دیکھا کہ یہ چار مرتبہ اقرار کر چکا ہے۔ جس کے بعد حد کا اجراء ضروری ہو گیا ہے تو آپؑ نے اسے زیر حراست رکھنے کا حکم دیا اور اعلان فرمایا کہ کل اس پر حد شرعی جاری ہو گی جو آنا چاہے وہ آئے اور گھر سے اس طرح نکلے کہ ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے۔ دوسرے دن امیرالمومنین علیہ السلام منہ اندھیرے گھر سے نکلے۔ دو رکعت نماز ادا کی اور ایک گڑھا کھود کر اس میں اسے کھڑا کیا اور لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے لوگو یہ اللہ کا حق ہے اس کام کے لئے وہ آگے بڑھے جس کے ذمہ خود اس حق کا مطالبہ نہ ہو۔ کیونکہ جس پر خود حد عائد ہوتی ہو اسے حد جاری کرنے میں حصہ نہ لینا چاہیے۔ یہ سن کر کچھ لوگ پلٹ گئے اور کچھ پیچھے ہٹ گئے۔ حضرتؑ نے چار مرتبہ تکبیر کی آواز بلند کرنے کے بعد پتھر پھینکا پھر حسن اور حسین علیہما السلام نے پتھر پھینکے۔ جب اس نے دم توڑ دیا تو حضرت نے اسے گڑھے سے باہر نکالا' نماز جنازہ پڑھی اور اسے دفن کر دیا۔ لوگوں نے کہا کہ آپ نے اسے غسل نہیں دیا فرمایا کہ اس کا غسل یہی تھا جس نے اسے ہمیشہ کے لئے پاک کر دیا ہے۔ اس کے بعد حضرتؑ نے فرمایا۔

من اتی من القاذوره فلیتب الی الله تعالی فیما بینه و بین الله فوالله توبته الی الله فی السر افضل من ان یفضح نفسه و یهتک ستره۔(تفسیر برہان)

جو شخص کسی فعل قبیح کا مرتکب ہو تو وہ اس معاملہ میں جو اس کے اور اللہ کے مابین ہے اللہ تعالی کی بارگاہ میں توبہ کرے خدا کی قسم درپردہ اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ رسوائی مول لے اور اپنا پردہ چاک کرے۔

اسی طرح ایک عورت نے حضرت کے سامنے زنا کا اقرار کیا جب اقرار کی تکمیل ہو گئی تو آپ نے اعلان

فرمایا کہ کل اس عورت پر حد جاری کی جائے گی اور جو آنا چاہیں وہ آئیں۔دوسرے دن امیرالمومنین علیہ السلام اس عورت کو لے کر نکلے اور دوسرے لوگ بھی جمع ہو گئے جب اجراء حد کا وقت آیا تو آپ خچر پر سوار ہوئے اور باواز بلند فرمایا کہ اے لوگو اللہ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عہد لیا اور انہوں نے مجھ سے عہد و پیمان لیا کہ وہی شخص حد جاری کرے جو خود حد کا سزاوار نہ ہو۔ لہٰذا تم میں سے جو فعل زنا کا مرتکب ہوا ہو وہ حد کے اجراء میں حصہ نہ لے یہ سنتے ہی اکثر لوگ پلٹ گئے اور امیرالمومنین علیہ السلام' امام حسن اور امام حسین علیہم السلام نے حد جاری کی۔ فعل زنا کے محرکات کہیں قوی ہوتے ہیں کہیں کمزور کہیں شہوانی قوت کی تسکین کا سامان ہوتا ہے کہیں نہیں ہوتا۔ کہیں فریق ثانی کی رضا مندی ہوتی ہے اور کہیں جبر کار فرما ہوتا ہے کہیں یہ جرم مجرم کی ذات تک محدود رہتا ہے اور کہیں اس سے معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے۔ ان مختلف صور و حالات کے پیش نظر اسلام نے جرم کی نوعیت یکساں ہونے کے باوجود مرتکبین جرم کو ایک سطح پر نہیں رکھا بلکہ کہیں نرم' کہیں سنگین اور کہیں سنگین تر سزائیں تجویز کی ہیں۔ان سزاؤں کی صورت یہ ہے کہ۔

اگر ایسا مرد جو بیوی رکھتا ہو یا ایسی عورت جو بیاہی ہوئی ہو زنا کا ارتکاب کریں تو انہیں سنگسار کیا جائے گا امیرالمومنین فرماتے ہیں۔

یرجم المحصن والمحصنتہ۔(مستدرک الوسائل)

شادی شدہ مرد اور بیاہی ہوئی عورت کو سنگسار کیا جائے گا۔

اور اگر وہ بڑھاپے کے حدود میں قدم رکھ چکے ہوں تو انہیں سنگسار کرنے سے پہلے سو کوڑے مارے جائیں گے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اذا زنی الشیخ والشیختہ جلد کل واحد منھما و علیھما الرجم۔(مستدرک الوسائل)

جب سن رسیدہ مرد اور سن رسیدہ عورت زنا کا ارتکاب کریں تو ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگائے جائیں گے اور پھر سنگسار کیا جائے گا۔

اگر بن بیاہا ہو تو اسے سو کوڑے لگائے جائیں گے۔ چنانچہ حضرتؑ سے بن بیاہے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا۔

جلد مائہ لقول اللہ عز وجل الزانیہ والزانی فاجلاو اکل واحد منھما مائتہ جلدہ۔(مستدرک الوسائل)

اسے فرمان باری "بدکار مرد اور بدکار عورت ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ" کے مطابق سو کوڑے لگائے جائیں گے۔

اگر شادی شدہ ہو مگر ہم بستری کی نوبت نہ آئی ہو تو اسے سو کوڑے لگائے جائیں گے اور ایک سال کے لئے شہربدر کردیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

علی البکر جلد مائۃ ونفی سنتہ فی غیر مصرہ۔
(مستدرک الوسائل)

وہ بیاہا ہوا جس نے ابھی مقاربت نہ کی ہو اسے سو کوڑوں اور ایک سال کی جلاوطنی کی سزا دی جائے گی۔

چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جو زنا کا اقرار کرتا تھا۔ حضرتؑ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم شادی شدہ ہو اس نے کہا کہ ہاں فرمایا کہ پھر تمہیں سنگسار کیا جائے گا ابھی اسے سنگسار نہ کیا گیا تھا کہ ایک شخص نے کہا کہ یا امیرالمومنین اس کا عقد تو ہو چکا ہے مگر ابھی مقاربت نہیں کی۔ فرمایا کہ اس صورت میں اسے رجم کے بجائے سو کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔

اگر کوئی شخص قید خانہ میں ہو یا گھر سے دور ایسی جگہ پر ہو جہاں سے بیوی تک نہ پہنچ سکتا ہو تو اسے سنگسار کرنے کے بجائے سو کوڑے لگائے جائیں گے۔ چنانچہ ایک شخص قید و بند میں تھا اور بیوی تک نہ پہنچ سکتا تھا اس نے قید خانہ میں زنا کا ارتکاب کیا۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ اسے سنگسار نہیں کیا جائے گا بلکہ سو کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔

ایک مرد یمنی مدینہ میں زنا کا مرتکب ہوا۔ حضرت عمر نے اسے سنگسار کرنا چاہا حضرتؑ کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ اسے سنگسار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ یہاں مدینہ میں ہے اور اس کی بیوی دوسرے شہر میں ہے اسے سو کوڑے لگائے جائیں۔

ایک شخص کی بیوی بصرہ میں تھی اور وہ کوفہ میں زنا کا مرتکب ہوا۔ حضرتؑ نے اسے سنگسار کرنے کے بجائے سو کوڑے لگوائے۔

اگر کوئی شخص بیٹی، بہن وغیرہ سے زنا کرے تو اسے قتل کیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من اتی ذات محرم قتل۔ (مستدرک الوسائل)

اگر کوئی شخص محرم کے ساتھ زنا کرے تو اسے قتل کیا جائے گا۔

اگر کوئی شخص سوتیلی ماں کے ساتھ زنا کا مرتکب ہو۔ اسے سنگسار کیا جائے گا خواہ بیوی رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو چنانچہ حضرتؑ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جو اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ زنا کا مرتکب ہوا تھا۔ حضرتؑ نے اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا۔

اگر کوئی شخص کسی عورت سے زبردستی زنا کرے تو اسے قتل کیا جائے گا۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

من کابر امراۃ علی نفسھا فوطئھا غصبا قتل۔
(مستدرک الوسائل)

جو شخص کسی عورت کو بے دست و پا کر کے اس سے بدکاری کرے اسے قتل کیا جائے گا۔

جو عورت زنا پر مجبور کر دی گئی ہو اس پر سے حد ساقط ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

جو شخص کسی عورت کو بے دست و پا کر کے اس سے بدکاری کرے اسے قتل کیا جائے گا۔

لیس علی المستکرحت حد ذا قالت انی اسلکرحت
(مستدرک الوسائل)

جو عورت مجبور و بے بس کر دی گئی ہو اور مجبوری کا اظہار کرے اس پر حد نہیں ہے۔

چنانچہ حضرتؑ کے پاس ایک مرد اور عورت کو لایا گیا جو زنا کرتے دیکھے گئے تھے۔ حضرتؑ کے دریافت کرنے پر اس عورت نے کہا کہ یا امیرالمومنین میں رضا مندی سے اس فعل پر آمادہ نہیں ہوئی بلکہ مجھے مجبور کر دیا گیا۔ حضرتؑ نے اس پر حد جاری نہ کی اور اسے چھوڑ دیا۔

اگر کوئی کافر ذمی کسی مسلمان عورت کے ساتھ زنا کرے تو اسے قتل کیا جائے گا۔ چنانچہ حضرت عمر کے سامنے پانچ آدمی پیش کئے گئے جو زنا میں ماخوذ تھے۔ حضرت عمر نے حکم دیا کہ ان پانچوں پر حد زنا جاری کی جائے۔ امیرالمومنین علیہ السلام وہاں موجود تھے۔ آپؑ نے فرمایا کہ ان سب کا حکم یکساں نہیں ہے حضرت عمرؓ نے کہا کہ پھر آپؑ ہی ان کی سزا تجویز کریں۔ آپؑ نے فرمایا کہ ان میں سے ایک کو قتل اور ایک کو سنگسار کیا جائے ایک کو سو کوڑے اور ایک کو پچاس کوڑے مارے جائیں اور پانچویں کو تعزیر کر کے چھوڑ دیا جائے۔ اس پر حضرت عمر متعجب ہوئے اور دوسرے لوگوں کو بھی حیرت ہوئی کہ ایک ہی جرم کی مختلف سزائیں کیوں؟ حضرت عمر نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ پہلا مجرم کافر ذمی ہے اس نے ایک مسلمان عورت سے زنا کیا جس کی وجہ سے وہ ذمی ہونے سے خارج ہو گیا۔ لہٰذا اسے قتل کی سزا دی جائے گی' دوسرا شخص بیوی رکھتا ہے اس لئے اسے سنگسار کیا جائے گا' تیسرا بیوی نہیں رکھتا اس لئے اسے سو کوڑے لگائے جائیں گے' چوتھا غلام ہے اس لئے اسے نصف سزا دی جائے گی اور پانچواں مخبوط الحواس ہے اس لئے اسے تعزیر کر کے چھوڑ دیا جائے گا۔

اگر کوئی حالت دیوانگی میں زنا کا مرتکب ہو تو اس پر نہ حد جاری ہو گی اور نہ اسے سنگسار کیا جائے گا۔ چنانچہ ایک دیوانی عورت جو زنا میں ماخوذ تھی حضرت عمر کے پاس لائی گئی۔ جب شہادت سے زنا ثابت ہو گیا تو حضرت عمر نے اسے کوڑے لگانے کا حکم دیا۔ امیرالمومنین نے اسے کچھ لوگوں کے حصار میں جاتے دیکھا تو پوچھا کہ یہ کون ہے اور واقعہ کیا ہے۔ بتایا کہ یہ فلاں قبیلہ کی دیوانی عورت ہے جسے حضرت عمر نے کوڑے لگانے کا حکم دیا ہے۔ حضرت نے

فرمایا کہ اسے واپس لے جاؤ اور عمر سے کہو کہ۔

اما علمت ان ھذہ مجنونۃ آل فلاں وقال النبی رفع القلم عن المجنون حتی یفیق۔(وسائل الشیعہ)

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ فلاں قبیلہ کی دیوانی عورت ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دیوانہ مرفوع القلم ہے یہاں تک کہ دیوانگی زائل ہو۔

اگر عورت حاملہ ہو تو جب تک بچہ پیدا نہ ہو جائے اسے سنگسار نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ ایک شوہر دار عورت نے اپنے کو بے شوہر کا ظاہر کر کے ایک دوسرے قبیلہ میں نکاح کر لیا جب اس کا انکشاف ہوا تو حضرتؑ نے فرمایا کہ جب وہ بچہ جن لے تو اسے سنگسار کیا جائے۔

حضرت عمر کے پاس ایک حاملہ عورت کو لایا گیا جو زنا کی مرتکب ہوئی تھی انہوں نے حکم دیا کہ اسے سنگسار کر دیا جائے۔امیرالمومنین علیہ السلام کو معلوم ہوا تو آپؑ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ یہ عورت تو اپنے جرم کی وجہ سے سزا کی مستحق ہے مگر اس بچے کا کیا قصور ہے جو اس کے شکم میں ہے جب اس کے بچہ پیدا ہو جائے اس وقت اسے سنگسار کیا جائے۔

اگر کوئی عورت زنا سے حاملہ ہو کر بچہ جنے اور پھر اسے مار ڈالے تو اسے دوہرے جرم کی وجہ سے دوہری سزا دی جائے گی۔ چنانچہ حضرتؑ کے سامنے ایسی عورت کو پیش کیا گیا جس نے زنا کے ارتکاب کے بعد بچے کو مار ڈالا تھا آپؑ نے فرمایا کہ اسے سو کوڑے لگائے جائیں اور پھر سنگسار کر دیا جائے۔

اگر کوئی شوہر دار عورت نابالغ بچے سے زنا کرائے اس بچے کو تعزیر کی جائے گی اور عورت کو رجم کی بجائے سو کوڑے لگائے جائیں گے چنانچہ ایک شوہر دار عورت کو جو ایک نابالغ بچے سے بدکاری کی مرتکب ہوئی تھی حضرت عمر کے پاس لایا گیا انہوں نے حکم دیا کہ اسے سنگسار کر دیا جائے۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ اسے سنگسار نہیں کیا جائے گا بلکہ اس پر حد جاری ہو گی اس لئے کہ جس بچے سے یہ مرتکب زنا ہوئی ہے وہ ابھی بلوغ کی عمر کو نہیں پہنچا۔

اگر غلام زنا کا مرتکب ہو تو اسے ہر صورت میں پچاس کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔ چنانچہ امام محمد باقر علیہ السلام راوی ہیں کہ۔

قضی امیرالمومنین فی العبید اذا زنی احدھم ان یجلد خمسین جلدہ و ان کان مسلما او کافر اونصرانیا ولا یرجم ولا ینفی۔(وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام نے غلاموں کے بارے میں یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر ان میں سے کوئی زنا کا مرتکب ہو تو اسے پچاس کوڑے لگائے جائیں خواہ مسلمان ہو یا کافر یا نصرانی اسے نہ سنگسار کیا جائے گا اور نہ شہربدر کیا جائے گا۔

اگر ایسا شخص زنا کرے جس کا کچھ حصہ آزاد ہو چکا ہو اور کچھ حصہ غلام ہو تو آزاد حصہ کے بقدر اس پر پوری حد اور غلام حصہ کے بقدر نصف حد جاری کی جائی گی مثلاً" نصف آزاد ہو اور نصف غلام تو آزاد حصہ کے حساب سے پچاس کوڑے اور غلام حصہ کے حساب سے پچیّس کوڑے لگائے جائیں گے۔

حضرت عثمان کے دور میں ایک کنیز جو تین چوتھائی آزاد ہو چکی تھی زنا کی مرتکب ہوئی۔ حضرت عثمان نے اس کے بارے میں امیرالمومنین علیہ السلام سے دریافت کیا آپ نے فرمایا کہ اسے تین چوتھائی آزادی کے حساب سے اور ایک چوتھائی غلامی کے حساب سے سزا دی جائے گی۔ زید بن ثابت نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ اسے صرف غلامی کے حساب سے سزا ملنا چاہئے۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ چار حصوں میں سے تین حصے آزاد ہو چکے ہیں اور صرف ایک حصہ غلامی میں ہے۔ کہا کہ پھر اسے میراث بھی آزادی کے بقدر ملنا چاہئے فرمایا کہ ہاں ایسا ہی ہے اور اسے میراث بھی آزادی کے بقدر ملے گی۔ شیخ مفید رحمہ اللہ نے تحریر کیا ہے۔

خلاف عثمان امیرالمومنین وصار الی قول زید ولم یصغ الی عاقال بعد ظھور الحجتہ علیہ۔(ارشاد ص ۱۰۰)

عثمان نے امیرالمومنین علیہ السلام کے قول کی مخالفت کرتے ہوئے زید کے قول پر عمل کیا اور حضرت کی بات پر کان نہ دھرا حالانکہ ان پر دلیل و حجت واضح ہو چکی تھی۔

اگر وقوع زنا میں شبہ کی گنجائش ہو تو شک کا فائدہ مجرم کو دیتے ہوئے حد جاری نہیں کی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ادرؤا الحدود بالشبھات۔(وسائل الشیعہ)

شک و شبہ کی صورت میں حدود ساقط کر دو۔

چنانچہ ایک مرد اور عورت کو زنا کا ارتکاب کرتے دیکھا گیا اور انہیں حضرتؑ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپؑ نے اس مرد سے دریافت کیا تو اس نے کہا کہ یہ میری بیوی ہے اور اس عورت سے پوچھا تو وہ خاموش رہی۔ کچھ لوگوں نے اس عورت سے کہا کہ ہاں کہہ دو اور کچھ لوگوں نے کہا کہ انکار کر دو۔ اس عورت نے کہا کہ ہاں یہ میرا

شوہر ہے۔ حضرتؑ نے اس احتمال کی بنا پر کہ شاید یہ اس کی بیوی ہو حد ساقط کر دی اور اس مرد سے کہا کہ جب تک تم نکاح کا ثبوت پیش نہ کرو گے یہ عورت تم سے علیحدہ رکھی جائے گی۔

حد قذف :۔ کسی بالغ و عاقل مسلمان پر زنا یا لواطت کی تہمت لگانا یا اسے ولدالزنا کہنا قذف کہلاتا ہے۔اسلام نے جس طرح مسلمان کے مال و جان کا تحفظ کیا ہے اسی طرح اس کی عزت و آبرو کا بھی نگہبان ہے وہ شہادت کے علاوہ جبکہ نصاب شہادت مکمل ہو قطعاً" اس کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کی عصیاں کاری کا پردہ چاک کر کے یا کسی پر بہتان تراشی کر کے اسے معاشرہ میں رسوا و بدنام کیا جائے۔اس رسوائی پر یہ اثر بھی مرتب ہوتا ہے کہ انسان گناہ کے ارتکاب میں جسور و بیباک ہو جاتا ہے اور اگر گناہ ڈھکا چھپا رہتا ہے تو اپنے معاشرتی وقار کو بحال رکھنے کے لئے اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔

اسلام نے اس جرم کی سنگینی کے پیش نظر جب دو گواہوں کی گواہی یا اقرار سے قذف ثابت ہو جائے تو اسی (۸۰) کوڑوں کی سزا تجویز کی ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ان الفریۃ ثلث اذا رمی الرجل بالزنا و اذا قال ان امہ زانیۃ واذا دعی لغیرابیہ فذلک فیہ حد ثمانون۔(وسائل الشیعہ)

بہتان تراشی تین طرح کی ہوتی ہے ایک یہ کہ کسی کو زناکار کہے یا یہ کہے کہ اس کی ماں زانیہ ہے یا باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کرے اس کی سزا اسی کوڑے ہے۔

قذف کی یہ سزا آزاد ہو یا غلام مرد ہو یا عورت سب کے لئے یکساں ہے۔ چنانچہ ایک عورت نے اپنی سوت کو غلط کار ثابت کرنے کے لئے اس کے بستر پر انڈے کی سفیدی ڈال دی اور اپنے شوہر سے کہا کہ ایک اجنبی مرد اس کے ہاں شب باش ہوا ہے۔ اس کے بستر کا جائزہ لو جب اس نے بستر پر نظر کی تو اسے سفیدی نظر آئی جس سے اسے اپنی بیوی کے بے راہ ہونے کا یقین ہوگیا۔ اس نے حضرت عمر سے اس کا ذکر کیا انہوں نے اسے سزا دینے کا حکم دیا امیرالمومنین کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس بستر کو دیکھنا چاہا جب بستر پر نظر ڈالی تو فرمایا کہ اس پر کھولتا ہوا گرم پانی ڈالو جب پانی ڈالا گیا تو سفیدی پھول کر ابھر آئی فرمایا کہ اس نے اپنی سوت کو متہم کرنے کے لئے یہ چال چلی ہے۔ لہٰذا اسے الزام تراشی کی سزا دی جائے۔ چنانچہ اس پر حد قذف جاری کی گئی۔

اگر کوئی نابالغ لڑکے یا لڑکی یا دیوانے پر تہمت لگائے تو اس پر حد جاری کرنے کے بجائے تعزیر کی جائے گی۔ چنانچہ حضرتؑ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا۔

لاحد لمن لاحد له ولكن القاذف اثم۔(متدرک الوسائل)

جس پر خود حد جاری نہ ہوتی ہو اس پر تہمت لگانے سے بھی حد جاری نہ ہو گی البتہ تہمت لگانے والا گنہگار ہے۔

اگر باپ، بیٹے پر تہمت لگائے تو اس پر حد جاری نہیں ہو گی اور اگر بیٹا، باپ پر تہمت باندھے تو اس پر حد جاری کی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

یحد الولد ولا یحد الوالد اذا قذف الولد۔(متدرک الوسائل)

بیٹے پر حد جاری ہو گی اور باپ پر حد نہ ہو گی جب وہ بیٹے پر تہمت لگائے۔

اگر کوئی شخص متعدد آدمیوں پر اجتماعی طور پر تہمت لگائے تو اس پر ایک ہی حد جاری ہو گی۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

قضی امیرالمومنین فی رجل افتری علی نفر جمیعا فجلده حدا واحدا۔(وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام نے اس شخص پر جس نے ایک جماعت پر تہمت لگائی تھی ایک ہی حد کا فیصلہ فرمایا۔

اگر کوئی عورت یہ کہے کہ فلاں آدمی مجھ سے زنا کا مرتکب ہوا ہے تو وہ دوہری سزا کی مستحق ہو گی ایک سزا اقرار زنا کی بنا پر اور دوسری قذف کی بنا پر۔ چنانچہ حضرتؑ سے ایک ایسی ہی عورت کے بارے میں پوچھا۔ تو آپ نے فرمایا۔

حد د نا ها حد ین حد بفریتها علی المسلم وحد باقرارها علی نفسها۔(متدرک الوسائل)

ہم اس پر دو حدیں جاری کریں گے ایک مرد مسلم پر افتراء باندھنے کی اور دوسرے اقرار زنا کی۔

ایک شخص نے اپنی بیوی کو زانیہ کہا۔ اس کے جواب میں اس نے کہا کہ تو مجھ سے زیادہ زنا کار ہے۔ یہ معاملہ حضرت عمر کے سامنے پیش ہوا انہوں نے حکم دیا کہ دونوں کو قذف کی پاداش میں کوڑے لگائے جائیں۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے یہ حکم سنا تو فرمایا کہ جلدی نہ کی جائے اس عورت پر ایک کے بجائے دو حدیں جاری ہوں گی۔ ایک حد اس بات کی کہ اس نے مرد کو یہ کہہ کر کہ تو مجھ سے زیادہ زناکار ہے اس پر زنا کی تہمت لگائی ہے اور دوسری حد اس امر کی کہ اس نے اپنے زنا کا اقرار کیا ہے۔ اس اقرار کی بنا پر مرد پر سے حد ساقط ہو جائے گی اور عورت کو بھی زنا کی پوری سزا نہیں دی جائے بلکہ تعزیر پر اکتفاء کی جائے گی(یہ اس لئے کہ زنا کی حد کے لئے چار

مرتبہ اقرار ضروری ہے اور اس نے ایک ہی مرتبہ اقرار کیا تھا)

اگر کوئی شخص کسی پر زنا کی تہمت لگائے اور پھر اس کی تردید کر دے تو اس پر سے حد ساقط نہیں ہو گی۔ چنانچہ ایک عورت نے اپنے شوہر کو حضرتؑ کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اس نے میری کنیز سے زنا کیا ہے۔ اس شخص نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ میں نے اس کنیز سے مقاربت کی ہے مگر اس نے وہ کنیز مجھے ہبہ کر دی تھی۔ حضرتؑ نے اس سے ہبہ کا ثبوت طلب کیا۔ وہ کوئی ثبوت پیش نہ کر سکا تو حضرتؑ نے اسے سزا دینے کا حکم دیا۔ جب اس عورت نے یہ دیکھا کہ اس کا شوہر سزا سے بچ نہیں سکتا تو اس نے ہبہ کا اعتراف کیا۔ حضرتؑ نے حکم دیا کہ اس عورت پر حد قذف جاری کی جائے۔

اگر دو آدمی ایک دوسرے پر تہمت لگائیں تو ان پر سے حد ساقط ہو گی البتہ انہیں تعزیر کی جائے گی۔ چنانچہ حضرتؑ کے پاس دو آدمیوں کو لایا گیا جنھوں نے ایک دوسرے پر زنا کی تہمت لگائی تھی۔ آپؑ نے ان پر حد جاری کرنے کے بجائے انہیں تعزیر کر کے چھوڑ دیا۔

اگر کوئی شخص حد قذف جاری ہونے کے بعد یہ کہے کہ میں نے وہی بات کہی تھی جو صحیح تھی تو اس پر دوبارہ حد جاری نہیں کی جائیگی۔ چنانچہ حضرت عمر کے دور کا واقعہ ہے کہ مغیرہ ابن شعبہ جو ان کی طرف سے حاکم بصرہ تھا قبیلہ بنی ہلال کی ایک عورت ام جمیل بنت محجن کے ہاں اکثر آتا جاتا تھا۔ ایک دن ابو بکرہ نے اسے جاتے دیکھا تو پوچھا کہ تم اکیلے کہاں جارہے ہو کہا کہ میں اپنے بعض دوستوں کی ملاقات کے لئے جا رہا ہوں۔ کہا کہ دوستوں کو تمہارے پاس آنا چاہئے نہ یہ کہ تم ان کے ہاں جاؤ۔ ابو بکر کے دل میں شک گزرا اور اس نے مغیرہ کا تعاقب کیا۔ مغیرہ گرد و پیش سے بے خبر ام جمیل کے گھر میں داخل ہوا۔ ابو بکرہ نے یہ دیکھا تو وہ ساتھ والے مکان کی چھت پر چڑھا اور ام جمیل کے مکان کی طرف نظر دوڑائی دیکھا کہ وہ مغیرہ کے پہلو میں بیٹھی ہے وہ وہاں سے اٹھا اور شبل ابن معبد نافع ابن حارث اور زیاد ابن سمیہ کو اپنے ہمراہ لے کر اسی جگہ پر آیا ان چاروں نے جھانک کر دیکھا تو دونوں کو ناگفتہ حالت میں پایا۔ اس واقعہ کے بعد ابو بکرہ مدینہ آیا اور حضرت عمر سے کہا کہ مغیرہ زنا کار ہے۔ حضرت عمر نے کہا کہ کیا تم نے اسے زنا کرتے دیکھا ہے کہا کہ ہاں اور میرے ساتھ شبل نافع اور زیاد نے بھی دیکھا ہے۔ حضرت عمر نے مغیرہ اور ان تینوں آدمیوں کو مدینہ طلب کیا۔ سب سے پہلے ابو بکرہ نے گواہی دی اور پھر نافع اور شبل نے شہادت دی۔ آخر میں زیاد ابن سمیہ گواہی کے لئے کھڑا ہوا۔ حضرت عمر نے دیکھا کہ اگر اس نے بھی پہلے گواہوں کی طرح عینی شہادت دی تو مغیرہ رجم سے بچ نہ سکے گا۔ انہوں نے زیاد سے مخاطب ہو کر کہا۔

والله انی لاری وجھا خلیقا ان لایخزی علیه الیوم رجل من اصحاب محمد۔(انساب الاشراف ج ا ص ۴۹۱)

خدا کی قسم میں ایک ایسا چہرہ دیکھ رہا ہوں جواس لائق ہے کہ ایک صحابی رسول کی رسوائی کا باعث نہیں ہو گا۔

حضرت عمر کے ان الفاظ سے زیاد سمجھ گیا کہ گواہی کیسی ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس نے گواہی دیتے ہوئے کہا کہ میں نے ان دونوں کو یکجا دیکھا سانسوں کی آوازیں بھی سنیں مگر جو خصوصی کیفیت سابقہ گواہوں نے بیان کی ہے میں نے نہیں دیکھی۔ اس بیان سے مقدمہ کا رخ پلٹ گیا۔ مغیرہ کی بن آئی وہ تلوار لے کر ابو بکرہ اور پہلے دونوں گواہوں پر جھپٹا۔ حضرت عمر نے اسے روک دیا اور تینوں گواہوں کو اسی اسی درے لگوائے۔ جب درے لگوا چکے تو ان سے توبہ کے لئے کہا دو نے تو توبہ کر لی مگر ابوبکرہ نے کہا کہ میں کبھی سچی بات کو جھوٹ نہیں کہہ سکتا۔ حضرت عمر نے چاہا کہ اسے پھر کوڑے لگوائیں۔ حضرت علی علیہ السلام کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اگر ابوبکرہ کو دوبارہ کوڑے لگائے گئے تو ہم مغیرہ کو رجم کریں گے۔ مقصد یہ تھا کہ گواہی تو ہو چکی جس پر اسے سزا دی گئی ہے۔ اگر ان الفاظ کو بھی گواہی کا درجہ دے دیا گیا تو چار شہادتیں مکمل ہو جائیں گی اور مغیرہ رجم کا سزاوار ہو گا اور اگر یہ صرف پہلی شہادت کی صحت کا اظہار ہے تو اس پر حد جاری نہیں ہو سکتی۔

اگر کوئی شخص کسی سے بدزبانی کرے اور اسے گدھا' خنزیر' فاسق' فاجر خبیث ایسے الفاظ کہے تو اسے تعزیر کی جائے گی۔ چنانچہ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

ففی ھذا کلہ ادب لایبلغ بہ الحد۔(مستدرک الوسائل)

ایسے الفاظ پر تعزیر کی جائے گی جو حد کی سزا سے کم ہو گی۔

حد شراب نوشی:۔ شراب نوشی وہ مذموم عادت ہے جو دوسری قبیح عادتوں اور مہلک بیماریوں کو اپنے ساتھ لے کر آتی ہے اور کیا جسمانی اور کیا اخلاقی ہر اعتبار سے تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ ایکطرف شراب خوار اپنی صحت و توانائی کو مینا و جام کی نذر کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے مسمی ذرات پہلے خون میں سرایت کرتے ہیں اور پھر تمام جسم میں پھیل کر رعشہ' فالج' دماغی' اختلال' تشنج اور دوسرے اعصابی امراض کی تولید کا باعث ہوتے ہیں اور دوسری طرف اخلاقی اعتبار سے اتنا گر جاتا ہے کہ شرم و حیا' عزت و آبرو اور غیرت و ناموس کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے اور ایسے ناشائستہ افعال کر گزرتا ہے جو عادی زندگی میں اس سے سرزد نہ ہوتے کیونکہ افعال قبیحہ سے مانع عقل اور اخلاقی وجدان ہوتا ہے اور نشہ و بدمستی میں نہ عقل کام کرتی ہے اور نہ اخلاقی وجدان ساتھ دیتا ہے اس لئے بے جھجک نفسانی و شہوانی خواہشات کی رو میں بہتا چلا جاتا ہے اور آخر اپنے ہاتھوں خود اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتا ہے۔

اسلام نے جس کے اوامر و نواہی کی بنیاد مصالح و مفاسد واقعیہ پر ہے۔ انہی مفاسد کے پیش نظر ہر قسم کی شراب کو وہ پھلوں سے بنائی گئی ہو یا غلوں سے، قطعی طور پر حرام قرار دیا ہے اور اس کے لئے اسی کوڑوں کی سزا تجویز کی ہے۔ چنانچہ حضرت عمر کے برادر نسبتی قدامہ ابن مظعون پر شراب نوشی ثابت ہو گئی تو انہوں نے امیرالمومنین علیہ السلام سے سزا کے بارے میں دریافت کیا۔ آپؑ نے فرمایا کہ اسے اسی کوڑے لگائے جائیں۔ قدامہ نے کہا کہ مجھ پر حد جاری نہیں ہو سکتی کیونکہ قرآن مجید میں ہے۔

لیس علی الذین آمنوا و عملوا الصالحات جناح فیما طعموا۔

جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہ جو کچھ کھا پی چکے ان پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

حضرتؑ نے فرمایا۔

لست من اھلھا ان طعام اھلھا لھم حلال لیس یاکلون ولایشربون الاما احل اللہ لھم۔(وسائل الشیعہ)

تم اس آیت کے مصداق نہیں ہو اس آیت کے مصداق وہ ہیں جن کا کھانا پینا حلال ہوتا ہے اور وہ وہی چیزیں کھاتے پیتے ہیں جو اللہ نے ان کے لئے حلال کی ہیں۔

اگر کوئی شخص شراب نوشی کے ساتھ شعائر اسلامی کی توہین کا بھی مرتکب ہو تو اس سے جرم سنگین تر ہو جائے گا۔ چنانچہ حارثی نجاشی اور ابو سماک اسدی نے ماہ رمضان میں شراب پی اور نشہ میں دھت ہو کر غل غپاڑہ مچایا۔ حضرتؑ کو اطلاع دی گئی تو آپؑ نے چند آدمیوں کو بھیجا۔ جنہوں نے ان کو گھیرے میں لے لیا۔ ابو سماک تو بھاگ نکلا اور نجاشی کو پکڑ لیا گیا۔ جب اسے حضرتؑ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپؑ نے اسے اسی کوڑے لگائے اور رات بھر بند رکھا دوسرے دن پھر بیس درے لگائے اس نے کہا کہ اسی درے تو لگ چکے یہ بیس درے کیوں؟ فرمایا۔

ھذالجراتک علی شرب الخمر فی شھر رمضان۔ (الفقیہ)

یہ اس لئے کہ تم نے ماہ رمضان میں شراب پینے کی جسارت کی ہے۔

حد شرعی کے اجراء کے لئے ضروری ہے کہ شراب خوار کے اقرار یا دو گواہوں کی متفقہ شہادت سے شراب نوشی ثابت ہو جائے۔ اگر گواہوں کے بیان میں اختلاف ہو گا تو حد جاری نہیں ہو گی البتہ اگر یہ اختلاف اس نوعیت کا ہو جس سے وقوع فعل مشتبہ نہ ہوتا ہو تو حد جاری کی جائے گی چنانچہ حضرت عمر کے سامنے عمرو تمیمی اور معلی ابن جارود نے گواہی دی کہ قدامہ ابن مظعون نے شراب پی ہے ان میں سے ایک نے کہا کہ میں نے اسے شراب پیتے دیکھا ہے اور دوسرے نے کہا کہ میں نے اسے شراب کی قے کرتے دیکھا ہے۔ حضرت عمر نے امیرالمومنین علیہ السلام

سے دریافت کیا کہ آپؑ اس کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جبکہ ان دونوں گواہوں کی گواہی مختلف ہے فرمایا کہ گواہی میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس نے شراب پی ہے جب ہی تو شراب کی قے کی ہے۔ حضرت عمر نے کہا کیا خصی کی شہادت قابل قبول ہے۔ (عمرو تمیمی خصی تھا) فرمایا۔

ماذھاب انثیہ الاکذھاب بعض اعضائہ۔ (الفقیہ)

خصیوں کا نہ ہونا ایسا ہی ہے جیسے کوئی عضو بدنی جاتا رہے۔

یہ حد سب کے لئے یکساں ہے خواہ مرد ہو یا عورت' آزاد ہو یا غلام' کافر ہو یا مسلم۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

کان علی یجلد الحرو العبدو الیھودی والنصرانی فی الخمر ثمانین (وسائل الشیعہ)

حضرت علی علیہ السلام شراب نوشی کے جرم میں آزاد' غلام' یہودی' نصرانی سب کو اسی کوڑے لگاتے تھے۔

اگر کسی کو شراب نوشی کی پاداش میں دو دفعہ حد لگ چکی ہو تو تیسری دفعہ کوڑوں کے بجائے اسے قتل کی سزا دی جائے گی۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

کان امیرالمومنین یجلد فی قلیل النبیذ کما یجلد فی قلیل الخمر و یقتل فی الثالث من النبیذ کما یقتل فی الثالثہ من الخمر۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام جس طرح تھوڑی سی خمر (شراب انگوری) کے پینے پر کوڑے لگاتے تھے اسی طرح نبیذ (شراب خرط) کے پینے پر کوڑے لگاتے تھے اور جس طرح تیسری مرتبہ خمر کے پینے پر قتل کرتے تھے اسی طرح نبیذ کے پینے پر قتل کرتے تھے۔

اگر کوئی شخص نیا مسلمان ہوا ہو یا اسلامی شہروں سے دور رہتا ہو اور اسے یہ معلوم ہی نہ ہو سکے کہ شراب حرام ہے تو اس پر شراب نوشی کی حد جاری نہیں ہو گی۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے شراب پی تھی۔ حضرت ابوبکر نے اس سے پوچھا کہ کیا تو نے شراب پی ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ کہا کیوں پی ہے۔ جبکہ اسلام نے اسے حرام قرار دیا ہے؟ کہا کہ میں ان لوگوں میں رہتا ہوں جو شراب پیتے ہیں اور اسے حلال سمجھتے ہیں مجھے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ شراب حرام ہے کہ اس سے اجتناب کرتا۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمر سے اس کے بارے میں پوچھا انہوں نے کہا کہ اس مسئلہ کو علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہی حل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ دونوں اس شخص کو لے کر حضرتؑ کے پاس لائے اور واقعہ بیان کیا آپؑ نے فرمایا کہ اسے مہاجرین و انصار کے پاس لے جاؤ اور ان سے پوچھو کہ کسی نے تحریم خمر کی آیت اس کے سامنے پڑھی ہے۔ اگر کسی نے پڑھی ہو تو یہ عقوبت کا سزاوار ہے اور اگر

کسی نے نہ پڑھی ہو تو یہ قابل مواخذہ نہیں ہے۔ جب اسے مہاجرین و انصار کے سامنے پیش کیا گیا تو ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہ کہا کہ میں نے اس کے روبرو یہ آیت پڑھی تھی۔ چنانچہ اسے چھوڑ دیا گیا۔

حد سرقہ :۔ کسی کا مال چوری چھپے اٹھا لینا سرقہ کہلاتا ہے۔ یہ وہ مذموم عادت ہے جس سے نفس کی دنائت اور اخلاقی معیار کی پستی ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک بلند نفس انسان یہ گوارا نہیں کرتا کہ وہ دوسرے کی کمائی ہوئی دولت لے اڑے' اسے بے دردی سے ضائع کرے اور معاشرے میں ذلیل نگاہوں سے دیکھا جائے۔ بیشک کچھ لوگ اپنی ضروریات کے پورا کرنے کے لئے جب کوئی چارہ نہیں پاتے تو چوری ایسے جرم کے مرتکب ہو جاتے ہیں لیکن ہر موقع پر چوری کا ارتکاب ضرورت و احتیاج کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ شروع میں کسی جائز یا ناجائز ضرورت کی بنا پر چوری کی جاتی ہے پھر رفتہ رفتہ اس کی عادت پڑ جاتی ہے اور ضرورت ہو یا نہ ہو عادت کی تسکین کے لئے چوری کا ارتکاب کیا جاتا ہے بہرحال یہ ایک اخلاقی و معاشرتی جرم ہے جس کی روک تھام کے لئے اسلام نے کہیں پر حد اور کہیں پر تعزیری عقوبت تجویز کی ہے تاکہ معاشرہ میں امن و سکون کی فضا پیدا کی جا سکے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

والسارق والسارقہ فاقطعوا ایدیھا۔

چور مرد ہو یا عورت تم ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔

لفظ ایدی ید کی جمع ہے اور ید کا اطلاق انگلیوں سے گٹے' کہنی اور کاندھے کے جوڑ تک سب پر ہوتا ہے اور صرف انگلیاں بھی مراد لی جاتی ہیں۔ چنانچہ فخرالدین رازی تحریر کرتے ہیں۔

ان الید اسم یتناول الاصابع فقط الا تری انہ لو حلف لا یمس فلانا بیدہ فمسہ باصابعہ فانہ یحنث فی یمینہ۔
(تفسیر کبیر ج ۱۱ ص ۲۲۴)

لفظ ید کا اطلاق فقط انگلیوں پر بھی ہوتا ہے چنانچہ اگر کوئی شخص قسم کھائے کہ فلاں کو ہاتھ سے مس نہیں کرے گا اور وہ انگلیوں سے مس کرے تو وہ قسم شکنی کا مرتکب قرار پائے گا۔

اسی بنا پر فقہی مکاتب میں ید کے معنی مراد میں اختلاف ہے بعض گٹے تک بعض کہنی تک اور خوارج کاندھے تک قطع کی سزا تجویز کرتے ہیں۔ مگر آئمہ اہل بیتؑ کے نزدیک صرف داہنے ہاتھ کی چار انگلیاں قطع کی جائیں گی اور یہی قرین صواب ہے کیونکہ چوری میں زیادہ تر دخل انگلیوں ہی کا ہوتا ہے چنانچہ

ان امیرالمومنین علیہ السلام قطع السارق من مفصل الا صابع و ترک ابھا مامع الکف۔ (مستدرک الوسائل)

امیرالمومنین علیہ السلام چور کی انگلیاں جڑ سے کاٹتے اور انگوٹھے کو ہتھیلی سمیت باقی رہنے دیتے۔

اگر کسی کا ہاتھ چوری کے جرم میں قطع ہو چکا ہو اور وہ پھر چوری کرے تو اس کا بایاں پیر وسط سے کاٹ دیا۔

جائے گا اور اس سزا کے بعد تیسری مرتبہ چوری کرے تو اسے حبس دوام کی سزا دی جائے گی چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے چوری کی تھی آپ نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا پھر دوبارہ چوری کے جرم میں ماخوذ ہوا حضرتؑ نے اس کا بایاں پیر وسط سے قطع کیا پھر تیسری مرتبہ چوری کا مرتکب ہوا حضرت نے اسے حبس دوام کی سزا دی اور فرمایا۔

کلیتہ اصنع رسول اللہ لا اخالفہ۔(وسائل الشیعہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہی طریق کار تھا میں اس کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔

ایک مرتبہ حضرت عمر کے سامنے ایک شخص کو پیش کیا گیا جو سرقہ کا مرتکب ہوا تھا۔ حضرت عمر نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا پھر دوبارہ چوری کے جرم میں پکڑا گیا انہوں نے اس کا بایاں پیر کاٹنے کا حکم دیا پھر تیسری مرتبہ چوری کی حضرت عمر نے اس کا دوسرا ہاتھ کاٹنا چاہا امیرالمومنین علیہ السلام کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ اب اس کا ہاتھ یا پیر کاٹا نہیں جائے گا بلکہ اسے قید کی سزا دی جائے گی۔

اگر کوئی شخص چوری کے جرم میں قید کی سزا بھگت رہا ہو اور قید خانہ میں چوری کا مرتکب ہو تو اسے سزائے قتل دی جائے گی۔چنانچہ ۔

کان امیرالمومنین اذا اتی بہ فی الثالثہ بعد ان قطع یدہ و رجلہ فی المرتین خلدہ فی السجن وانفق علیہ من فی المسلمین فان سرقہ فی السجن قتلہ۔ (مستدرک الوسائل)

امیرالمومنین علیہ السلام کے پاس چور کو تیسری مرتبہ لایا جاتا جبکہ پہلی دو چوریوں میں اس کا ہاتھ اور پیر قطع کر چکے ہوتے تو آپ اسے حبس دوام کی سزا دیتے اور اس کا خرچہ بیت المال پر ڈالتے اور اگر قید خانہ میں چوری کرتا اسے قتل کر دیتے۔

اگر غلطی سے کسی کا بایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے تو پھر اس کا دایاں ہاتھ کاٹا نہیں جائے گا۔ چنانچہ حضرتؑ نے ایک شخص کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا مگر داہنے ہاتھ کے بجائے اس کا بایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ جب ہاتھ کاٹنے والوں کو اپنی غلطی کا علم ہوا تو انہوں نے حضرتؑ سے کہا کہ ہم نے غلطی سے اس کا بایاں ہاتھ کاٹ ڈالا ہے کیا اب اس کا دایاں ہاتھ بھی کاٹ دیا جائے۔ آپؑ نے فرمایا۔

لاتقطع یمینہ قد قطعت شمالہ۔ (وسائل الشیعہ)

اس کا دایاں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا جبکہ اس کا بایاں ہاتھ کاٹا جا چکا ہے۔

شرع اسلام نے ہر سرقہ پر قطع ید کی سزا تجویز نہیں کی بلکہ اس پر چند شروط و قیود عائد کر کے اسے محدود کر

دیا ہے لہٰذا انہی موارد پر یہ سزا دی جائے گی۔ جہاں یہ شرائط پائی جائیں اور جہاں یہ شرائط نہ ہوں وہاں صرف تادیب و تعزیر پر اکتفا کی جائے گی۔ حد شرعیٰ کے اجراء میں جن امور کا اعتبار کیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔

پہلے یہ کہ چوری کی گواہی دو عادل مرد دیں یا چور خود اقرار کرے اگر بینہ موجود نہ ہو اور نہ وہ اقرار کرے تو اس صورت میں حد جاری نہیں ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من عرفه فی یده سرقه فقال اشتریتها ولم یقر بالسرقه ولم یقیم علیه البینته لم تقطع ید۔ (مستدرک الوسائل)

جس کے ہاتھ میں چوری کی کوئی چیز دیکھی جائے اور وہ یہ کہے کہ میں نے اسے خریدا ہے اور چوری کا اقرار نہ کرے اور اس کے خلاف شہادت بھی نہ ہو تو اس کا ہاتھ قطع نہیں کیا جائے گا۔

اگر دو گواہوں کی گواہی سے چوری ثابت ہو جائے تو امام کو حق عفو نہیں ہے اور اگر کوئی چوری سے تائب ہو کر چوری کا اقرار کرے اور اس کے خلاف گواہی نہ ہو تو اس صورت میں امام کو حق عفو حاصل ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر چوری کا اقرار کیا۔ آپؑ نے فرمایا کہ کیا تمہیں قرآن مجید میں سے کچھ یاد ہے کہا کہ ہاں سورہ بقرہ یاد ہے۔ فرمایا کہ۔

قد و هبت یدک لسوره البقره۔ (وسائل الشیعہ)

میں سورہ بقرہ کی وجہ سے تمہیں قطع ید سے معاف کرتا ہوں۔

اس پر اشعث ابن قیس نے کہا کہ آپ کو اللہ کے مقررہ حدود کے معطل کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ فرمایا تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جب شہادت سے چوری ثابت ہو تو امام کو حق عفو نہیں ہے اور اگر کوئی خود اقرار کرے تو امام کو اختیار ہے کہ وہ قطع ید کرے یا معاف کر دے۔

دوسرے یہ کہ ایک چوتھائی دینار یا اس سے زیادہ کی چوری ہو اور اس سے کم کی چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

ان امیرالمومنین کان یقطع السارق فی ربع دینار۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام چوتھائی دینار کی چوری میں چور کا ہاتھ قطع کر دیتے تھے۔

تیسرے یہ کہ چوری کرنے والا بالغ ہونا بالغ پر حد جاری نہیں کی جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

انعلام لا یجب علیہ الحد حتی یحتلم۔ (مستدرک الوسائل)

بچہ اگر نابالغ ہو تو اس پر حد جاری نہیں کی جائے گی۔

ایک مرتبہ حضرتؑ کے پاس ایک نابالغ لڑکی کو لایا گیا جس نے چوری کی تھی آپ نے اسے تعزیری سزا دی مگر اس کا ہاتھ نہ کاٹا۔

چوتھے یہ کہ عاقل ہو دیوانے اور مخبوط الحواس پر حد جاری نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ حضرتؑ کے پاس ایک دیوانے کو لایا گیا جس نے چوری کی تھی آپؑ نے اسے چھوڑ دیا اور فرمایا کہ۔

لاقطع علی مجنون۔ (مستدرک الوسائل)

دیوانے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

پانچویں یہ کہ کسی محفوظ اور بند جگہ سے چوری کرے۔ اگر ایسی جگہ سے کوئی چیز اٹھائے جہاں آنے جانے کی عام اجازت ہوتی ہے جیسے حمام مسجد' سرائے وغیرہ تو حد جاری نہیں کی جائے گی۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

کل مد خل ید خل فیہ بغیر اذن نسرقہ منہ السارق فلا قطع فیہ۔ (وسائل الشیعہ)

اگر چور ایسی جگہ سے چوری کرے جس میں داخل ہونے کے لئے اجازت کی ضرورت نہ ہو تو اس کا ہاتھ قطع نہیں کیا جائے گا۔

اگر کوئی شخص کسی کو اپنے گھر میں مہمان ٹھہرائے اور وہ اس کے ہاں سے چوری کرے تو اس کا ہاتھ قطع نہیں کیا جائے گا۔ بشرطیکہ مال کسی محفوظ جگہ میں بند نہ ہو۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لاقطع علی ضیفہ۔ (مستدرک الوسائل)

مہمان کا ہاتھ کاٹا نہیں جائے گا۔

بیرونی لباس کی جیب بھی غیر محفوظ جگہ متصور ہوتی ہے۔ لہٰذا اس میں سے کوئی چیز نکال لی جائے تو اس پر قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی۔ چنانچہ حضرتؑ کے سامنے ایک جیب تراش کو پیش کیا گیا جس نے ایک شخص کی جیب سے کچھ درہم نکال لئے تھے۔ آپؑ نے فرمایا۔

ان کان طر من قمیصہ الاعلی لم اقطعہ وان کان طرمن قمیصہ السافل قطعتہ۔ (وسائل الشیعہ)

اگر اس نے اوپر والے لباس سے درہم نکالے ہیں تو اسے قطع ید کی سزا نہیں دوں گا اور اگر اندرونی جامہ سے درہم نکالے ہیں تو اس کا ہاتھ کاٹ دوں گا۔

اگر کوئی شخص امانت میں خیانت کرے تو اس پر بھی حد سرقہ جاری نہیں ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لا اقطع علی من ائتمن علی شئی فخان فیہ۔ (مستدرک الوسائل)

جسے کسی شے کا امین بنایا گیا ہو اور وہ اس میں خیانت کرے تو اسے قطع ید کی سزا نہیں دوں گا۔

چھٹے یہ کہ چور چوری کا مال گھر سے باہر نکالے اگر تالہ توڑے یا نقب لگائے اور مال باہر نکالنے سے پہلے پکڑا جائے تو اس پر حد جاری نہیں ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لیس علی السارق قطع حتی یخرج بالسرقہ من البیت۔ (وسائل الشیعہ)

چور کو ہاتھ کاٹنے کی سزا اس وقت تک نہیں دی جائے گی جب تک وہ چوری کا مال گھر سے باہر نہ نکالے۔

ساتویں یہ کہ چوری چھپے مال اٹھائے اگر علانیہ اور سینہ زوری سے مال چھینے تو اسے قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی البتہ اسے تعزیر کی جائے گی۔ چنانچہ ایک شخص نے بھرے بازار میں ایک دکان پر سے ایک پارچہ اٹھالیا۔ حضرتؑ سے کہا گیا کہ اس نے چوری کی ہے لہذا اس کا ہاتھ کاٹ دینا چاہئے۔ آپؑ نے فرمایا۔

لیس علی الطرار والمختلس قطع۔ (وسائل الشیعہ)

جیب کترے اور جھپٹا مار کر چھین لینے والے کا ہاتھ کاٹا نہیں جائے گا۔

ایک شخص ایک لڑکی کے کانوں سے گوشوارے اتار کر بھاگ نکلا لوگوں نے اسے پکڑ کر حضرتؑ کے سامنے پیش کیا آپ نے فرمایا کہ اس نے چھپ چھپا کر تو چوری کی نہیں کہ اس کا ہاتھ کاٹا جائے البتہ اسے تعزیر کی جائے گی۔ چنانچہ زد و کوب کے بعد اسے قید کر دیا۔

آٹھویں یہ کہ مسروقہ مال میں خود اس کا حصہ نہ ہو اگر حصہ ہو اور اپنے حصہ کے بقدر یا اس سے کم کی چوری کرے تو اس پر حد جاری نہ ہو گی۔ چنانچہ ایک شخص نے بیت المال میں سے کچھ اٹھا لیا جب اسے حضرت کے سامنے پیش کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا۔

لایقطع فان لہ ویہ نصیبا۔ (وسائل الشیعہ)

اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ بیت المال میں اس کا بھی حصہ ہے۔

ایک شخص نے مال غنیمت میں سے ایک خود چوری کر لیا۔ حضرتؑ سے کہا گیا کہ اس نے چوری کی ہے لہذا اس کا ہاتھ کاٹ دینا چاہئے۔ آپؑ نے فرمایا۔

انی لا اقطع احدالہ فیمااخذ شرک۔ (وسائل الشیعہ)

میں کسی ایسے شخص کا ہاتھ نہیں کاٹوں گا جس نے اس مال میں سے چوری کی ہو جس میں وہ حصہ دار ہو۔

نویں یہ کہ مجبور و مضطر نہ ہو مگر قحط سالی میں بھوک کے ہاتھوں تنگ آکر چوری کرے تو اسے قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی۔امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

کان امیرالمومنین لا یقطع السارق فی ایام المجاعتہ۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام قحط کے دنوں میں چور کا ہاتھ نہیں کاٹتے تھے۔

دسویں یہ کہ پرندوں کے علاوہ دوسری اشیاء کی چوری کرے۔ اگر پرندوں کی چوری کرے تو قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی۔ چنانچہ کوفہ میں حضرتؑ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے کسی کے ہاں سے کبوتر چرائے تھے۔ آپؑ نے اس کا ہاتھ کاٹنے سے انکار کیا اور فرمایا۔

لا اقطع فی الطیر۔ (وسائل الشیعہ)

میں پرندوں کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹوں گا۔

گیارہویں یہ کہ غلام اپنے مالک کے علاوہ کسی اور کی چوری کرے۔ اگر مالک کے مال کی چوری کرے تو اسے قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

عبدی اذا سرقنی لم اقطعہ و عبدی اذاسرق غیری قطعتہ۔(وسائل الشیعہ)

اگر میرا غلام میری چوری کرے تو اس کا ہاتھ قطع نہیں کروں گا اور کسی اور کے ہاں چوری کرے تو اس کا ہاتھ قطع کروں گا۔

اسی طرح اگر بیت المال کا غلام بیت المال میں سے چوری کرے تو اس کا ہاتھ قطع نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ حضرتؑ کے سامنے دو آدمیوں کو پیش کیا گیا جنہوں نے بیت المال میں چوری کی تھی۔ ایک ان میں بیت المال کی ملکیت تھا اور دوسرا کسی دوسرے کی ملکیت میں تھا آپ نے بیت المال کے غلام کے بارے میں فرمایا۔

اما ھذا فمن مال اللہ ولیس علیم شئی مال اللہ اکل بعضہ بعضا۔ (وسائل الشیعہ)

یہ اللہ کا مال ہے اس پر حد نہیں ہے کیونکہ اللہ کا مال اللہ کے مال ہی نے کھایا ہے۔

ان موارد میں سے جہاں قطع ید کی سزا دی جاتی ہے دو موارد یہ بھی ہیں۔

ایک یہ کہ کفن کی چوری کی جائے۔ چنانچہ حضرتؑ کے دور میں ایک شخص نے کفن چوری کیا۔ آپؑ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ آپؑ مردے کا مال چوری کرنے پر بھی یہ سزا تجویز کرتے ہیں۔ فرمایا۔

انا نقطع لامو اتنا کما نقطع لا حیاء نا۔ (وسائل الشیعہ)

جس طرح ہم زندوں کی چوری پر ہاتھ کاٹتے ہیں اسی طرح مردوں کی چوری پر بھی یہ سزا دیتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ کسی آزاد مرد یا عورت کو غلام یا کنیز کہہ کر بیچ دیا جائے۔ چنانچہ حضرتؑ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے ایک آزاد مرد کو غلام کہہ کر فروخت کر دیا تھا۔ آپؑ نے حکم دیا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔

امیرالمومنین علیہ السلام جن لوگوں کے ہاتھ چوری کے جرم میں کاٹتے تھے ان کی دیکھ بھال کا بھی حکم دیتے اور علاج کی سہولتیں بھی بہم پہنچاتے۔ چنانچہ حرث ابن حضیرہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے مدینہ میں ایک دست بریدہ حبشی کو پانی بھرتے دیکھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تمہارا ہاتھ کس نے کاٹا ہے۔ اس نے کہا کہ ہم آٹھ آدمیوں نے مل کر چوری کی اور اس جرم میں ہمیں امیرالمومنین علیہ السلام کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تمہیں علم تھا کہ چوری حرام ہے۔ ہم نے کہا کہ ہاں۔ فرمایا کہ پھرت سزا کے مستحق ہو۔ چنانچہ سب کی چار چار انگلیاں کاٹ دیں اور انگوٹھے چھوڑ دیئے۔ پھر چند دنوں تک ہماری دیکھ بھال کی گئی زخموں کی مرہم پٹی کی گئی اور اچھے سے اچھا کھانا دیا گیا۔ جب ہمارے زخم بھر گئے تو ہمیں عمدہ قسم کے کپڑے دئے اور فرمایا کہ اگر تم نے توبہ کی اور نیکی کی راہ اختیار کی تو یہ تمہارے لئے بہتر ہو گا اور اگر ایسا نہ کیا تو آگ میں جھونک دئے جاو گے۔

باب القصاص

اسلام کا ہر قانون عدل و انصاف کی بنیادوں پر استوار ہے اور کوئی قانون ایسا نہیں ہے جس سے عدل کے تقاضے مجروح ہوتے ہوں۔ اسی بنیادی تقاضے کے پیش نظر قانون قصاص کا اجراء کیا گیا ہے جو قیام عدل میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ قصاص کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو قتل کرے یا جسمانی گزند پہنچائے تو اسے بھی ویسی ہی سزا و عقوبت دی جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

ان النفس بالنفس والعین بالعین والا نف بالا نف والاذن بالاذن والسن بالسن والجروح قصاص۔

جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں کے بدلے ویسا ہی بدلہ ہے۔

بعض ترقی پسند عناصر اسلام کے قانون قصاص پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قصاص جرم کے مقابلہ میں جرم کا اعادہ ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص وقتی ہیجان کے نتیجہ میں قتل یا کسی اور جنایت کا ارتکاب کر گزرتا ہے تو اسے تادیبی سزا تو دی جا سکتی ہے مگر قتل کی سزا دے کر جرم قتل کا اعادہ نہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ بعض ممالک میں قتل کی سزا قتل کی صورت میں نہیں دی جاتی بلکہ صرف قید و بند پر اکتفاء کی جاتی ہے۔ لیکن ایک مختصر مدت کے لئے سلب آزادی کی سزا قطع حیات ایسے سنگین جرم کی قرار واقعی سزا نہیں ہو سکتی۔ اس سے نہ عدل کا تقاضا پورا ہوتا ہے اور نہ اسے انسداد جرائم کے لئے موثر قرار دیا جا سکتا ہے اور یہ اعتراض کہ قصاص اعادہ جرم ہے کوئی وزن نہیں رکھتا۔ اس ئے کہ ایک ہی چیز بعض حالتوں میں مذموم ہوتی ہے اور بعض حالتوں میں مستحسن قرار پاتی ہے مثلاً" تکبر بری چیز ہے مگر متکبر کے مقابلہ میں ہو تو اچھی چیز ہے۔ ہمدردی ایک عمدہ صفت ہے مگر کسی ظالم و سفاک سے ہمدردی کی جائے تو بری سمجھی جائے۔ گی اسی طرح قتل و جنایت کا ارتکاب ابتداءً ہو یا قصاصاً" اگرچہ دونوں صورتاً" برابر ہیں مگر دونوں کو ایک سطح پر سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ عقل سلیم کا قطعی فیصلہ ہے کہ بلاوجہ قتل قبیح ہے اور قتل کے عوض قتل مذموم نہیں ہے بلکہ ایک حد تک ضروری ہے۔ اس لئے کہ معاشرتی امن اور قتل و خونریزی کا انسداد اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ جب مجرم کو یہ یقین ہو کہ جس ظلم و جور کا وہ مرتکب ہو رہا ہے اسے بھی ویسی ہی عقوبت سے دو چار ہونا پڑے گا اور قصاص کا مقصد بھی یہی ہے کہ پاداش عمل کا ڈر ارتکاب جرم سے مانع ہو اور شرپسند عناصر کی تخریبی کاروائیوں کا سدباب کرے۔ امیرالمومنینؑ کا ارشاد ہے۔

من خاف القصاص کف عن ظلم الناس۔ (تحف العقول)

جسے قصاص کا ڈر ہوتا ہے وہ لوگوں پر ظلم کرنے سے باز رہتا ہے۔

قصاص کا تعلق صرف اس قتل سے ہوتا ہے جو جان بوجھ کر کیا جائے اور اگر ورثہ مقتول چاہیں تو دیت لے کر یا بغیر دیت کے درگزر بھی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

ولی الدم بالخیار ان شاء قتل وان شاء قبل الدیہ وان شاء عفا۔ (مستدرک الوسائل)

مقتول کے ورثہ کو اختیار ہے چاہے قتل کریں چاہے دیت لے لیں چاہے معاف کر دیں۔

اگر ارادہ قتل کے بغیر قتل واقع ہو جائے اس طرح کہ کسی کو لاٹھی وغیرہ سے اس طرح پیٹے کہ موت واقع ہو جائے مگر جان سے مارنے کا قصد نہ ہو یا غلطی و اشتباہ سے قتل ہو جائے اس طرح کہ تیر وغیرہ سے کسی جانور کو نشانہ بنائے اور وہ کسی انسان کے لگ جائے تو ان دونوں صورتوں میں ورثہ مقتول کو قصاص کے بجائے صرف دیت کا حق ہو گا۔ قصاص اس لئے نہیں کہ پہلی صورت میں اگرچہ فعل کا وقوع عمداً" ہے مگر قتل کا قصد نہیں ہے اور دوسری صورت میں نہ فعل کا وقوع قصداً" ہے اور نہ قتل کا ارادہ ہے اور دیت اس لئے ہے کہ اسلام یہ گوارا نہیں کرتا کہ کسی کا خون رائیگاں جائے خواہ قتل کا ارادہ ہو یا نہ ہو جیسا کہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

لا یبطل دم امرء مسلم۔ (وسائل الشیعہ)

کسی مسلمان کا خون رائیگاں نہیں ہو گا۔

قصاص کا جواز اسی صورت میں ہے جب مندرجہ ذیل شرائط پائی جائیں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ مقتول آزاد ہو۔ اگر مقتول غلام ہو تو اس کے قصاص میں آزاد کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اس سے غلام کی قیمت وصول کی جائے گی اور اسے سزا بھی دی جائے گی۔ چنانچہ حضرتؑ سے اس آزاد کے بارے میں جس نے ایک غلام کو قتل کر دیا تھا دریافت کیا گیا۔ تو آپؑ نے فرمایا۔

انما هو سلعه تقوم علیه قیمته عدل ولاوکس ولا شطط و یعاقب۔ (مستدرک الوسائل)

غلام ایک متاع ہے جس کی صحیح صحیح قیمت لگائی جائے گی اس طرح کہ نہ کم ہو اور نہ زیادہ اور قاتل کو سزا بھی دی جائے گی۔

اگر کوئی شخص اپنے غلام کو مار ڈالے تو اس سے غلام کی قیمت لے کر تصدق کر دی جائے گی اور اسے سزا بھی دی جائے گی۔ چنانچہ حضرتؑ کے سامنے ایک شخص کو پیش کیا گیا جس نے اپنے غلام کو اتنا مارا کہ اس نے دم توڑ دیا۔ آپؑ نے اس سے غلام کی قیمت وصول کر کے تصدق کر دی اور اسے سو تازیانے لگوائے اور قید کی سزا دی۔

اگر غلام اپنے آقا کو قتل کر دے تو اسے قصاصاً" قتل کیا جائے گا۔ چنانچہ صدوق رحمتہ اللہ نے تحریر کیا

ہے۔

اذا قتل عبد مولاہ قتل بہ فان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و علی علیہ السلام قضیا بذلک۔ (مستدرک الوسائل)

جب غلام اپنے آقا کو قتل کر ڈالے تو اس کے عوض اسے بھی قتل کر دیا جائے گا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ اور علی علیہ السلام نے یہی فیصلہ فرمایا ہے۔

اگر کوئی شخص اپنے غلام سے کسی کو قتل کروائے تو اس شخص کو قتل کی اور غلام کو حبس دوام کی سزا دی جائے۔ گی چنانچہ ایک غلام نے اپنے مالک کے کہنے سے ایک شخص کو قتل کر دیا۔ حضرتؑ نے فرمایا۔

هل عبدالرجل الاکسو طہ و کسیفہ یقتل السید و یستودع العبد السجن۔ (وسائل الشیعہ)

غلام کی حیثیت تو تازیانے اور تلوار کی ہے آقا کو قتل کیا جائے اور غلام کو قید خانہ میں ڈال دیا جائے۔

دوسری شرط اسلام ہے لہٰذا اگر کوئی مسلمان کسی کافر کو قتل کر دے تو اسے کافر کے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا اور اگر کافر، کافر کو قتل کر دے تو اسے قصاصاً قتل کیا جا سکتا ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

یقتص الیهودی والنصرانی والمجوسی بعضهم من بعض و یقتل بعضهم ببعض اذا قتلوا عمدا۔ (مستدرک الوسائل)

اگر یہودیوں نصرانیوں اور مجوسیوں میں سے بعض، بعض کو جان بوجھ کر قتل کر ڈالیں تو انہیں بھی قصاص میں قتل کیا جائے گا۔

تیسری شرط یہ ہے کہ قاتل مقتول کا باپ نہ ہو۔ اگر باپ، بیٹے کو قتل کر دے تو اسے قصاصاً قتل نہیں کیا جائے گا اور اگر بیٹا باپ کو قتل کر دے تو اسے قتل کیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لا یقتل والد بولدہ اذا قتلہ و یقتل الولد بالوالد اذا قتلہ۔ (وسائل الشیعہ)

اگر باپ بیٹے کو قتل کر دے تو باپ کو اس کے عوض قتل نہیں کیا جائے گا اور اگر بیٹا باپ کو قتل کر دے تو اسے قتل کیا جائے گا۔

چوتھی شرط عقل و بلوغ ہے اگر دیوانہ یا بچہ کسی کو قتل کر دے تو ان سے قصاص کے بجائے ان کے اقرباء سے دیت لی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ماقتل المجنون و المغلوب علی عقلہ والصبی فعمد ھما خطاء علی عاقلتھا۔ (مستدرک الوسائل)

دیوانے اور بچے کو قتل نہیں کیا جائے گا اس لئے کہ ان کا عمداً ارتکاب قتل بھی غلطی و اشتباہ کے حکم میں ہے لہٰذا مقتول کی دیت ان کے اقرباء پر عائد ہو گی۔

پانچویں شرط یہ ہے کہ مقتول ارتداد حد یا قصاص کے سلسلہ میں قتل نہ کیا گیا ہو اور درصورتیکہ اس کا خون بہانا شرعاً جائز ہو اس پر نہ قصاص ہے اور نہ دیت۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من مات فی حد اوقصاص فھو قتیل القرآن فلاشئی علیہ۔ (مستدرک الوسائل)

جو شخص حد یا قصاص کے سلسلہ میں مارا جائے اس پر (دیت یا قصاص) کوئی چیز نہ ہو گی۔

اگر کسی شخص پر کوئی حملہ کرے اور وہ بچاؤ کے لئے حملہ آور کو قتل کر دے تو اس قتل کا نہ قصاص ہو گا اور نہ دیت۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

من شھر سیفہ فدمہ ھدر۔ (مستدرک الوسائل)

جو شخص تلوار کھینچ کر حملہ آور ہو اس کا خون رائیگاں قرار پائے گا۔

اگر ایک آدمی کسی کو جکڑے اور دوسرا اسے قتل کر دے اور تیسرا دیکھ رہا ہو اور اسے بچانے کی فکر نہ کرے تو قاتل کو قتل کیا جائے گا اور جکڑنے والے کو حبس دوام کی سزا دی جائے گی اور دیکھنے والے کی آنکھیں پھوڑ دی جائیں گی۔ چنانچہ حضرتؑ کے سامنے تین آدمی پیش کئے گئے جو قتل کے جرم میں ماخوذ تھے۔ ان میں سے ایک نے مقتول کو جکڑے رکھا اور دوسرے نے اسے قتل کر دیا اور تیسرا دیکھ رہا تھا مگر قتل سے مانع نہ ہوا۔ آپؑ نے حکم دیا کہ جکڑنے والے کو عمر قید کی سزا دی جائے اور قاتل کو قتل کیا جائے اور دیکھنے والے کی دونوں آنکھیں پھوڑ دی جائیں۔

اگر دو یا دو سے زیادہ مرد کسی مرد کو قتل کر دیں تو ان سب کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قتل کی صورت میں ولی مقتول کو ایک سے زائد افراد کی دیت بھی دینا ہو گی۔ چنانچہ دو آدمی کسی کو قتل کر دیں اور ان دونوں کو قصاصاً قتل کر دیا جائے تو ایک آدمی کی دیت دینا ہو گی جو دونوں قاتلوں کے ورثہ میں نصف نصف تقسیم کر دی جائے گی اگر ان دو میں سے ایک کو قتل کیا جائے تو دوسرا شریک قتل اس مقتول کے ورثہ کو نصف دیت دے گا اور اگر تین قاتل ہوں اور ان میں سے ایک کو قتل کیا جائے تو باقی دو قاتلوں سے دو تہائی دیت لی جائے گی جو قصاصاً قتل ہونے والے کے ورثہ کو دی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ان کانوا ثلاثہ فقتل احدھم بالقود رد الا ثنان الباقیان علی اولیائہ ثلثی الدیت و یوجعان عقوبۃ۔ (مستدرک الوسائل)

اگر قاتل تین ہوں اور ان میں سے ایک قصاصاً" قتل کیا جائے تو باقی دو افراد قصاصاً" قتل ہونے والے کے وارثوں کو دو تہائی دیت دیں گے اور انہیں عقوبت بھی کی جائے گی۔

اگر کوئی مرد کسی عورت کو قتل کر دے تو چونکہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہوتی ہے اس لئے عورت کے ورثاء چاہیں تو قاتل کے ورثاء کو آدھی دیت دے دیں اور اسے قتل کر دیں اور چاہیں تو آدھی دیت لے کر اس کی جان بخشی کر دیں۔

چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

یخیر اولیاء المراۃ ان یقتلوا الرجل و یعطوا اولیاء نصف الدیت او ان یاخذوا نصف الدیت من الرجل۔ (مستدرک الوسائل)

عورت کے ورثاء کو اختیار ہے کہ وہ مرد کو قتل کر دیں اور اس کے وارثوں کو آدھی دیت دیں یا یہ کہ مرد قاتل سے نصف دیت لے لیں۔

اگر مقتول کے ورثاء نابالغ ہوں تو ان کے بالغ ہونے کے بعد قصاص' دیت یا عفو کا فیصلہ ہو گا۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

انتظروا الذین قتل ابوھم ان یکبروا فاذا بلغوا خیر وفان احبوا قتلوا او عفوا اوصالحوا۔ (وسائل الشیعہ)

جن بچوں کا باپ قتل کر دیا گیا ہو ان کے بالغ ہونے کا انتظار کیا جائے جب وہ حد بلوغ کو پہنچ جائیں تو انہیں اختیار ہو گا کہ چاہے وہ قاتل کو قتل کریں یا معاف کر دیں یا مصالحت کر لیں۔

اگر مقتول کے وارث دو ہوں اور ان میں سے ایک قصاص چاہے اور دوسرا عفو کرنا چاہے' تو قصاص کی صورت میں طالب قصاص آدھی دیت قاتل کے ورثاء کو دے گا۔ چنانچہ حضرتؑ کے سامنے دو آدمی پیش ہوئے' ان میں سے ایک قصاص کا طالب تھا اور دوسرا عفو کرنا چاہتا تھا۔ آپؑ نے فرمایا۔

ان اراد الذی لم یعف ان یقتل ورد نصف الدیت علی اولیاء المقتول المقاد منہ۔ (وسائل الشیعہ)

جو عفو کے بجائے قتل کرنا چاہے اگر قتل کرے تو مقتول کے ورثاء کو آدھی دیت دے۔

اگر کسی کو قصاصاً" قتل کرنے کے لئے ضرب لگائی جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ مر گیا ہے۔ مگر بعد میں معلوم ہو کہ وہ مرا نہ تھا تو پھر اس صورت میں اسے قتل کیا جا سکتا ہے جب ضرب لگانے والے کی ضرب کا قصاص

لے لیا جائے۔ چنانچہ ایک شخص نے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ مقتول کے بھائی نے حضرت عمر سے مرافعہ کیا۔ انہوں نے حکم دیا کہ قاتل کو مقتول کے بھائی کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ اسے قتل کرے۔ مقتول کے بھائی نے قتل کے ارادہ سے اس پر تلوار کا وار کیا اور اپنے خیال میں اسے ختم کر دیا۔ اس کے عزیز و اقارب اسے اٹھا کر گھر لائے تو دیکھا کہ اس میں رمق جان باقی ہے۔ چند دن اس کا علاج معالجہ ہوا اور وہ تندرست ہو گیا۔ ایک دن مقتول کے بھائی نے اسے دیکھا تو اسے پکڑ کر حضرت عمر کے پاس لایا۔ حضرت عمر نے حکم دیا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ اس شخص نے شور مچایا کہ ایک دفعہ تو مجھے قتل کیا جا چکا ہے۔ اب دوبارہ کیوں؟ مگر اس کی بات نہ سنی گئی۔ جب اسے قتل کے ارادہ سے لے کر چلے تو امیرالمومنین علیہ السلام کی طرف سے گذر ہوا۔ آپ نے واقعہ سنا تو ان لوگوں کو لے کر حضرت عمر کے پاس آئے اور فرمایا کہ اب اس کا قتل ناروا ہے کیونکہ ایک شخص کو دو مرتبہ قتل نہیں کیا جا سکتا۔ مقتول کے بھائی نے کہا کہ اگر میں اسے قتل نہ کروں تو میرے بھائی کا خون رائیگاں جائے گا۔ فرمایا کہ تم اس صورت میں اسے قتل کر سکتے ہو کہ جب وہ پہلے وار کے بدلے تم پر تلوار کا وار کرے اگر تم زندہ بچ نکلے تو اسے قتل کر دینا۔ کہا کہ میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا اور اس کے قتل سے دست بردار ہو گیا۔

قاتل کو قصاصاً تلوار سے قتل کیا جائے گا۔ خواہ اس نے قتل کا ارتکاب چھت سے گرا کر یا زہر دے کر یا کسی اور طریقہ سے کیا ہو۔

حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لا یقاد من احدا اذا قتل الا بالسیف و ان قتل بغیر ذلک۔ (مستدرک الوسائل)

جب کوئی شخص قتل کا مرتکب ہو تو اس سے قصاص تلوار کے ذریعے لیا جائے گا خواہ اس نے کسی اور طریقہ سے قتل کیا ہو۔

قصاص کا تعلق جس طرح انسانی قتل سے ہوتا ہے اسی طرح اعضاء بدن میں کسی عضو کو کاٹ دینے یا مجروح کرنے پر بھی قصاص ہو گا اور جس طرح قتل میں دیت کا جواز ہے اسی طرح اس میں بھی مقررہ دیت لی جا سکتی ہے۔

چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ماکان من جراحات فی الجسدفان فیھا القصاص او یقبل المجروح دیت الجراحہ فیعطاھا۔ (وسائل الشیعہ)

جسم کے کسی حصہ کو مجروح کرنے کی صورت میں قصاص ہے یا یہ کہ مجروح دیت قبول کر لے اس صورت میں اسے دیت دے دی جائے گی۔

قصاص میں اس امر کا لحاظ ضروری ہے کہ قصاص جرم کی حد سے بڑھنے نہ پائے بلکہ نوعیت و مقدار کے اعتبار سے اس کے مثل ہو۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی کی آنکھ پھوڑ دے تو اس کی بھی ایک آنکھ پھوڑ دی جائے

گی' خواہ مجرم کی دونوں آنکھیں موجود ہوں یا ایک آنکھ جاتی رہی ہو۔ چنانچہ حضرتؑ نے ایک یک چشم کے بارے میں فرمایا

اذا فقاء عین صحیح یفقا عینہ الصحیحہ۔ (مستدرک الوسائل) جب وہ کسی صحیح و سالم کی آنکھ پھوڑ دے تو اس کی بھی صحیح آنکھ پھوڑ دی جائے گی۔

اگر کوئی شخص کسی کی آنکھ پر اس طرح ضرب لگائے کہ ڈھیلا اپنی جگہ پر رہے اور بینائی جاتی رہے تو قصاص میں صرف آنکھ کی بینائی کو زائل کیا جائے گا۔ چنانچہ ایک شخص نے دوسرے شخص کی آنکھ پر ضرب لگائی جس سے آنکھ کا ڈھیلا تو ویسے کا ویسا رہا مگر بینائی جاتی رہی۔ اس شخص نے مضروب کو دیت دینا چاہی مگر اس نے دیت کی بجائے قصاص کا مطالبہ کیا جب آپس میں فیصلہ نہ ہو سکا تو یہ معاملہ حضرت عمر کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے حضرت علی علیہ السلام سے رجوع کیا۔ آپؑ نے مضروب کو دیت پر آمادہ کرنا چاہا یہاں تک کہ دگنی دیت دینا چاہی مگر وہ نہ مانا اور قصاص پر اصرار کرتا رہا۔ جب دیت پر مصالحت نہ ہو سکی تو حضرت نے روئی تر کر کے ضرب لگانے والے کی پلکوں اور آنکھوں کے گرد رکھی اور ایک آئینہ گرم کر کے اس کی آنکھ کے سامنے کیا اور اسے سورج کی طرف دیکھنے کے لئے کہا۔ جب اس نے ٹکٹکی جما کر سورج کی طرف دیکھا تو سورج کی حرارت سے آنکھ کی چربی پگھل گئی بینائی جاتی رہی اور آنکھ اپنی ہیئت پر باقی رہی۔

اگر سزا مقررہ مقدار سے تجاوز کر جائے تو سزا دینے والا اس زیادتی کا ضامن ہو گا۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام نے قنبر کو ایک شخص پر حد جاری کرنے کا حکم دیا۔ قنبر نے تین تازیانے غلطی سے زیادہ لگا دیئے۔

فاقادہ علی قنبر ثلثہ اسواط۔ (وسائل شیعہ) حضرت نے قنبر سے ان تین تازیانوں کا قصاص لیا۔

اگر کسی کو متنبہ کر دیا جائے اور وہ اپنا بچاؤ کرنے کے بجائے کسی چیز کی زد میں آ جائے تو اسے قصاص لینے کا حق نہ ہو گا۔ چنانچہ ایک مرتبہ چند بچے کھیل رہے تھے کہ کھیل کے دوران ایک بچے نے لکڑی پھینکی جو ایک دوسرے لڑکے کو لگی اور اس کے اگلے دانت ٹوٹ گئے۔ حضرتؑ کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا تو لکڑی پھینکنے والے نے گواہ پیش کئے کہ اس نے لکڑی پھینکنے سے پہلے خبردار کر دیا تھا۔ حضرتؑ نے اسے قصاص سے بری قرار دے دیا اور فرمایا۔

قد اعذر من حذر۔ (وسائل الشیعہ) جس نے خبردار کر دیا' وہ معذور ہے۔

اگر کوئی شخص کسی کو ناگوار بات کہے اور وہ بھی جواب میں ویسی ہی بات کہے تو اسے قصاص سے تعبیر نہیں کیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

لیس فی کلام قصاص۔ (وسائل الشیعہ)　　　　باتوں میں قصاص نہیں ہے۔

البتہ ناگوار بات کہنے اور جواب دینے والے کو تادیب کی جائے گی۔ چنانچہ ایک شخص نے کسی کو پاگل کا بیٹا کہا۔ اس نے بھی جواباً یہی الفاظ کہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام سے اس کی شکایت کی گئی تو آپؑ نے پہلے کو دوسرے سے اور دوسرے کو پہلے سے بیس تازیانے لگوائے حالانکہ سخت الفاظ کا بدلہ سخت الفاظ میں چکایا جا چکا تھا۔

باب الدیہ

قتل یا اعضاء بدن کو نقصان پہنچانے کے نتیجہ میں جو مال بطور معاوضہ دیا جاتا ہے' دیت کہلاتا ہے۔ اگر قتل کا وقوع عمداً" ہو تو قصاص سے دست بردار ہو کر دیت لینے کا جواز ہے اور اگر قتل غلطی سے ہو اس طرح کہ کسی کو ایسی چیز سے مارا جائے جس سے عام طور پر موت واقع نہیں ہوتی مگر اتفاقیہ موت ہو جائے یا تیر وغیرہ سے کسی جانور کو نشانہ بنایا جائے اور وہ کسی آدمی کے لگ جائے تو ان دونوں صورتوں میں صرف دیت لینے کا حق ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے۔

من قتل مومنا خطاء فتحریر رقبہ مومنہ و دیتہ مسلمہ الی اھلہ الا ان یصدقوا۔

جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو ایک مومن غلام آزاد کرے اور مقتول کے قرابت داروں کو دیت ادا کرے گا مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں۔

دیت چھ چیزوں میں سے کوئی ایک چیز مقررہ مقدار میں دی جاتی ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

الدیہ الف دینار والدینار عشرہ درھم وعلی اھل الذھب الف دینار وعلی اھل الورق عشرہ الاف درھم وعشرہ الاف لاھل الا مصار ولا ھل البواری الدیہ مائہ من الا بل و لا ھل اسواد مائتا بقرہ او الف شاہ۔ (الفقیہ)

دیت کی مقدار ایک ہزار دینار[لہ] ہے اور ایک دینار دس درھم کے مساوی ہے جو سونا رکھتے ہوں وہ ہزار دینار دیں اور جو چاندی رکھتے ہوں وہ دس ہزار درہم دیں۔ شہری باشندوں کے لئے دس ہزار درہم ہیں' بادیہ نشینوں کے لئے سو اونٹ اور دیہاتوں یا قصبوں کے رہنے والوں کے لئے دو سو گائیں یا ہزار بکریاں۔

محدث کبیر شیخ حر عاملی نے تحریر کیا ہے کہ۔

رواہ فی المقنع مرسلا الی قولہ مائتی حلہ۔ (وسائل الشیعہ)

صدوق رحمتہ اللہ علیہ نے مقنع میں اس حدیث کو دو سو حلوں تک روایت کیا ہے۔

لہ دینار سونے کا سکہ ہے جو ایک مثقال کے برابر ہوتا ہے اور مثقال کا وزن ۱۸ چنوں کے مساوی ہے اور درہم چاندی کا سکہ ہے جو ۶ر۱۲ چنوں کے ہم وزن ہے۔

اگر جان بوجھ کر قتل کیا گیاہو تو ایک سال کے اندر دیت ادا کی جائے گی اور اگر غلطی یا اشتباہ سے قتل واقع ہوا ہو تو تین سال کے اندر دیت دی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

تستادی دیتہ الخطاء فی ثلث سنین و تستادی دیتہ الحمد فی سنہ۔ (الفقیہ)

جو قتل غلطی سے ہو اس کی دیت تین سال کی مدت میں ادا کی جائے گی اور جو قتل قصداً" ہو اس کی دیت ایک سال میں ادا کی جائے گی۔

اگر قصداً" قتل کیا ہو یا قصد قتل کے بغیر زد و کوب سے موت واقع ہو گئی ہو تو قاتل خود دیت ادا کرے گا اور اگر محض غلطی سے ایسا ہوا ہو تو قاتل کے اقرباء پر یہ دیت عائد ہو گی۔چنانچہ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

لیس علی العاقلہ دیتہ العمد انما علیھم دیتہ الخطاء۔ (متدرک الوسائل)

قاتل کے اقرباء پر قتل عمد کی دیت نہیں ہے اگر غلطی سے قتل واقع ہوا ہو تو البتہ ان پر دیت کی ذمہ داری ہو گی۔

حضرت عمر نے ایک حاملہ عورت کے بارے میں ایک ناگوار بات سنی تو اسے طلب کرنے کے لئے آدمی بھیجا اور اسے اس قدر ڈرایا دھمکایا گیا کہ وہ ہراساں ہو گئی اور اس خوف و ہراس کی وجہ سے اسے درد شروع ہو گیا۔ اس نے قریب ہی ایک گھر میں بچہ جنا جو زندہ پیدا ہونے کے بعد مر گیا۔ حضرت عمر نے صحابہ سے اس کے بارے میں پوچھا۔ سب نے باتفاق رائے کہا کہ آپ پر کوئی مظلمہ عائد نہیں ہوتا۔ حضرت علی علیہ السلام سے دریافت کیا تو آپؑ نے فرمایا کہ اگر ان لوگوں نے تمہاری رو رعایت کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے تو تمہیں فریب دیا ہے اور اگر واقعاً" ان کی یہ رائے ہے تو انہوں نے غلط رائے قائم کی ہے۔

الدیتہ علی عاقلتک۔ (وسائل الشیعہ)

اس کی دیت تمہارے اقرباء پر عائد ہوتی ہے۔

حضرت عمر کو خود ہی یہ فیصلہ کر لینا چاہئے تھا کہ جب یہ حادثہ خوف و ہراس کی وجہ سے رونما ہوا ہے تو ہراساں کرنے والا اس کی ذمہ داری سے بری قرار نہیں پا سکتا اور وہ تو معمولی قسم کے واقعات میں بھی' دیت دے دیا کرتے تھے۔ چنانچہ امام شعرانی نے کشف الغمہ میں تحریر کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر حجام سے بلیں کٹوا رہے تھے کہ کسی بات پر بگڑ کر اسے اتنا ڈانٹا کہ اس کی ریح صادر ہو گئی۔ حضرت عمر نے کہا کہ اس حد تک ڈرانے کا تو ہمارا ارادہ نہ تھا لہٰذا ہم اس کی دیت دیں گے۔چنانچہ اسے ایک بکری اور چالیس درہم دئے۔

اگر کوئی شخص قاضی کے غلط فیصلہ کے نتیجہ میں مارا جائے یا اسے جسمانی ضرر و نقصان پہنچے تو اس کی دیت بیت المال سے دی جائے گی۔ چنانچہ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

قضی امیرالمؤمنین ما خطأت به القضاة فی دم او قطع فعلی بیت مال المسلمین۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام نے فیصلہ فرمایا کہ قاضیوں کی غلطی کے نتیجہ میں جو خون بہے یا عضو بدن کٹے اس کی دیت بیت المال سے ادا کی جائے گی۔

اگر کوئی شخص بھیڑ بھاڑ میں مارا جائے اور کچلنے والوں کا پتہ نہ چل سکے تو اس کی دیت بیت المال سے دی جائے گی۔ چنانچہ ایک شخص نماز جمعہ کے ہجوم میں کچلا گیا۔ حضرتؑ نے اس کے بارے میں فرمایا۔

ان دیتہ من بیت مال المسلمین۔ (وسائل الشیعہ)

اس کی دیت بیت المال سے ادا کی جائے گی۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے جنگ جمل سے پلٹتے ہوئے ایک عورت اور ایک نومولود بچے کی میتیں دیکھیں۔ آپؑ نے ان کے بارے میں پوچھا تو بتایا گیا کہ یہ عورت حاملہ تھی اس نے جب جنگ کی ہولناکی اور لوگوں کی بھگدڑ دیکھی تو اس پر اتنا ہول طاری ہوا کہ وضع حمل ہو گیا اور دونوں نے دم توڑ دیا۔ پوچھا کہ ان دونوں میں سے پہلے کون مرا تھا۔ بتایا گیا کہ پہلے تو بچہ مرا تھا۔ حضرتؑ نے ان دونوں کی دیت بیت المال پر عائد کی اور اس عورت کے شوہر کو بچے کی دیت میں سے دو حصے دیئے اور ایک حصہ مرنے والی ماں کا قرار دے کر اس کی تقسیم اس طرح کی کہ نصف شوہر کو دیا اور باقی نصف اس عورت کے قرابت داروں کے حوالے کیا اور اس عورت کی دیت میں سے نصف کا وارث شوہر کو قرار دیا کیوں کہ اس عورت کا کوئی اور بچہ نہ تھا اور نصف اس عورت کے دوسرے اقربا کو دیا۔

اس سلسلہ میں امیرالمومنین علیہ السلام کے چند فیصلے درج کئے جاتے ہیں جن سے دیت و ضمان کے بارے میں خواہ اس کی ذمہ داری ایک فرد پر عائد ہوتی ہو یا چند افراد پر، رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

یمن میں چند آدمیوں نے شیر کا شکار کرنے کے لئے بلندی پر ایک گڑھا کھودا۔ رات کو شیر ادھر سے گزرتا ہوا اس میں گر پڑا۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا تو صبح ہوتے ہی گڑھے کے گرد بھیڑ لگ گئی۔ ان تماشائیوں میں سے ایک کا پاؤں پھسلا تو اس نے سنبھلنے کے لئے پاس کھڑے ہوئے ایک آدمی کو پکڑا اس نے جھٹ سے تیسرے کو اور تیسرے نے چوتھے کو پکڑ لیا اور وہ چاروں گڑھے کے اندر جا گرے اور شیر نے ان سب کو چیر پھاڑ دیا۔ ان کے ورثاء میں دیت کے بارے میں جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ جب کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے تو امیرالمومنین علیہ السلام کی طرف رجوع کیا۔ آپؑ نے فرمایا کہ پہلا آدمی دیت کا حق دار نہیں ہو گا اور دوسرا پہلے آدمی سے ایک تہائی دیت کے لینے کا اور تیسرا دوسرے آدمی سے دو تہائی دیت کے لینے کا اور چوتھا تیسرے آدمی سے پوری دیت کے لینے کا حق دار ہو گا۔

یہ فیصلہ اس بناء پر فرمایا کہ پہلا خود سے گرا تھا اور وہ خود ہی اپنی ہلاکت کا باعث بنا۔ لہٰذا اسے دیت کا حق دار قرار نہیں دیا جا سکتا اور دوسرے کی ہلاکت کا سبب یہ تھا کہ پہلے آدمی نے اسے پکڑا اور تیسرا اور چوتھا آدمی اس کے اوپر گرا لہٰذا اس کی دیت ان تینوں سے متعلق ہو گی مگر چونکہ تیسرے اور چوتھے آدمی کے گرنے کا باعث وہ خود تھا

اس لئے دو تہائی دیت ساقط ہو جائے گی اور ایک تہائی پہلے آدمی کے ذمہ باقی رہے گی اور تیسرے آدمی کی دیت دو تہائی اس لئے ہو گی کہ وہی اس کی ہلاکت کا تمام تر ذمہ دار ہے۔

چھ آدمی دریائے فرات میں نہانے کے لئے اترے ان میں سے ایک لہروں کی لپیٹ میں آکر غرق ہو گیا۔ حضرتؑ کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا تو پانچ میں سے تین نے دو کے خلاف گواہی دی کہ انہوں نے اسے غرق کیا ہے اور ان دو نے ان تینوں کے خلاف گواہی دی کہ انہوں نے مل کر اسے غرق کیا ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ دیت کو ان پانچوں آدمیوں پر تقسیم کر دیا جائے۔ اس طرح کہ دو حصے وہ تین آدمی دیں جن کے خلاف دو کی شہادت ہے اور تین حصے وہ دو آدمی دیں جن کے خلاف تین کی شہادت ہے۔

چار آدمیوں نے شراب پی اور نشہ کی حالت میں ایک دوسرے پر چھریوں سے حملہ کر دیا اور سب کے سب شدید زخمی ہو گئے۔ حضرتؑ نے حکم دیا کہ انہیں زیر حراست رکھا جائے جب ہوش میں آئیں تو انہیں پیش کیا جائے۔ اس عرصہ میں دو زخمی زخموں کی تاب نہ لا کر مر گئے۔ جب ان دونوں مقتولوں کے وارثوں کو علم ہوا تو انہوں نے حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر زندہ رہنے والوں کے خلاف مرافعہ کیا۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ تمہارے آدمی ان زندہ بچ رہنے والوں کے ہاتھوں مرے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ہاتھ سے زخمی ہو کر مرے ہوں۔ کہا کہ پھر آپؑ اپنے علم کی روشنی میں فیصلہ فرمائیں۔ فرمایا کہ چاروں آدمیوں کے قبیلہ والے مل کر ان دونوں مقتولوں کی دیت دیں گے اور دونوں مقتولوں کو جو زخم پہنچے ہیں ان کی دیت مقتولوں کی دیت سے وضع کر لی جائے۔

حضرتؑ نے یہ فیصلہ اس بناء پر فرمایا کہ قتل تو بہرصورت واقع ہوا تھا مگر نہ قتل عمد کا کوئی ثبوت تھا اور نہ قاتل شخص متعین تھا۔

ایک لڑکی نے ایک دوسری لڑکی کو ہنسی کھیل میں اپنے کندھوں پر اٹھایا۔ اتنے میں ایک اور لڑکی آئی اور اس نے ازراہ شوخی اٹھانے والی لڑکی کے چٹکی لی اور وہ اس زور سے اچھلی کہ سوار ہونے والی لڑکی گری اور گردن ٹوٹنے سے ہلاک ہو گئی۔ حضرتؑ کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا تو آپؑ نے ایک تہائی دیت چٹکی بھرنے والی لڑکی پر عائد کی اور ایک تہائی دیت ساقط کر دی کیوں کہ مرنے والی لڑکی خود بھی اس کھیل میں شریک تھی۔

ایک پیاسے آدمی نے کچھ لوگوں سے پانی مانگا مگر انہوں نے پانی ہوتے ہوئے پانی دینے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ وہ پیاس سے بے حال ہو کر مر گیا۔ حضرتؑ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپؑ نے ان لوگوں کو اس کی موت کا ذمہ دار قرار دے کر ان پر دیت عائد کی۔

ایک عورت نے اپنا بچہ ایک دایہ کے سپرد کیا۔ اس دایہ نے اسے ایک اور کھلائی کے حوالے کر دیا جو اسے

لے کر کہیں غائب ہو گئی اور یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس نے بچے کا کیا کیا ہے۔ حضرت نے حکم دیا کہ پہلی دایہ ضامن ہے کیوں کہ اسی نے بچے کو ماں کی گود سے لیا تھا۔ لہٰذا وہ اس کی دیت ادا کرے۔

ایک غلام نے ایک آزاد کو غلطی سے قتل کر دیا۔ جب وہ قتل کا مرتکب ہوا تو اس کے آقا نے اسے آزاد کر دیا۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے اس کی آزادی کو صحیح قرار دیا اور قتل کی دیت غلام پر عائد کی کیوں کہ اب وہ آزاد ہو چکا تھا۔

ایک شخص کسی کے گھر میں داخل ہوا اور اسے صاحب خانہ کے کتے نے کاٹ لیا۔ حضرتؑ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ اگر وہ صاحب خانہ کی اجازت کے بغیر داخل ہوا تو صاحب خانہ ذمہ دار نہیں ہے اور اگر اس کی اجازت سے داخل ہوا تو صاحب خانہ ضامن ہے۔

ایک شخص نے حضرت عمر سے شکایت کی کہ فلاں شخص کے بیل نے اس کے اونٹ کا پیٹ چاک کر دیا ہے۔ حضرت عمر نے کہا کہ اس پر نہ دیت ہے اور نہ قصاص۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے یہ فیصلہ سنا تو فرمایا کہ اگر اس شخص نے بیل کو اونٹ کی گزر گاہ میں باندھ رکھا تھا تو وہ اس کا ضامن ہو گا ورنہ نہیں۔ چنانچہ محل وقوع کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ بیل کہیں باہر سے لایا تھا اور اسے اونٹ کے راستے میں باندھ دیا تھا۔ حضرت عمر نے آپؑ کی رائے پر عمل کرتے ہوئے بیل کے مالک سے اسے اونٹ کی قیمت دلوا دی۔

ایک شخص پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص کو لے کر آیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس شخص کے بیل نے میرے گدھے کو ہلاک کر ڈالا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں پہلے حضرت ابوبکر اور پھر حضرت عمر کے پاس بھیجا۔ ان دونوں کا جواب یہ تھا کہ جانور پر دیت ہے نہ قصاص۔ پھر انہیں حضرت علی علیہ السلام کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر بیل نے گدھے کے استھان پر پہنچ کر اسے ہلاک کیا ہے تو بیل کا مالک ضامن ہو گا اور اگر گدھا بیل کی جگہ پر چلا آیا تو بیل کا مالک ضامن نہیں ہو گا۔ وہ دونوں یہ فیصلہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ آپؐ نے یہ فیصلہ سن کر فرمایا

الحمد لله الذی جعل من اهل بیتی من یحکم بحکم الانبیاء(وسائل الشیعہ)

تمام حمد و ثنا اس اللہ کے لئے ہے جس نے میرے اہل بیت میں وہ افراد رکھے جو انبیاء کی مانند فیصلے کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خچر جو ادھر چرتا رہتا تھا اور اسے کوئی روکتا ٹوکتا نہ تھا۔ سرکنڈوں کے ایک انبار میں گھس گیا۔ بنی مدلج کے ایک آدمی نے تیر چلا کر اسے ہلاک کر دیا۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے اسے طلب کر کے فرمایا۔

واللہ لا تفارقنی حتی تلدیھا۔ (وسائل الشیعہ) — خدا کی قسم تم اس جگہ سے جا نہیں سکتے جب تک اس کی قیمت ادا نہ کر دو۔

چنانچہ اس نے چھ سو درہم ادا کیے۔

ایک شخص کا گھوڑا تھان سے بھاگ نکلا اور دوڑتے ہوئے ایک آدمی کو لات ماری اور اسے ختم کر دیا۔ اس آدمی کے وارث گھوڑے کے مالک کو پکڑ کر حضرتؑ کے پاس لائے اور دیت کا مطالبہ کیا۔ گھوڑے کے مالک نے کہا کہ یہ خود ہی تھان سے بھاگ نکلا تھا اور چند گواہ بھی پیش کیے۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ اس صورت میں' گھوڑے کے مالک پر دیت عائد نہیں ہوتی۔

ایک شخص کے دو اونٹ آوارہ ہو کر صحرا کی طرف نکل گئے ایک شخص نے انہیں پکڑ لیا اور دونوں کو ایک رسی سے باندھ دیا ان میں سے ایک گلا گھٹنے کی وجہ سے مر گیا۔ حضرتؑ نے فیصلہ فرمایا کہ یہ شخص ضامن نہیں ہے کیونکہ۔

انما اراد الاصلاح۔ (وسائل الشیعہ) — اس نے تو بھلائی کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

اعضاء بدن میں سے کسی عضو کو قطع یا مجروح یا بیکار کر دینے سے بعض صورتوں میں دیت قتل کی دیت کے مساوی ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں کم۔ جو جرم کی سنگینی و سبکی کے اعتبار سے مختلف ہوتی رہتی ہے۔ اس نقصان و ضرر رسانی پر عائد ہونے والی چند دیتیں تحریر کی جاتی ہیں۔

اگر کوئی شخص کسی کی دونوں آنکھیں پھوڑ کر نابینا کر دے تو اسے پوری دیت دینا ہو گی اور اگر ایک آنکھ پھوڑے تو آدھی دیت۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فی العینین الدیتہ وفی کل واحد منھما نصف الدیتہ۔ (وسائل الشیعہ) — دونوں آنکھوں میں پوری دیت ہے اور ایک آنکھ میں آدھی دیت۔

اگر کسی کی ایک آنکھ پہلے ہی سے پھوٹی ہوئی ہے تو اس کی صحیح آنکھ کے پھوڑنے پر پوری دیت دی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اذا انتفت اشفاد العین کلھا فلم تنبت ففیھا الدیتہ کاملہ وفی کل واحد منھا ربع الدیتہ۔ (مستدرک الوسائل) — اگر آنکھوں کی تمام پلکیں کاٹ دی جائیں اور وہ دوبارہ نہ اگیں تو پوری دیت دی جائے گی اور ہر پلک کی دیت ایک چوتھائی ہو گی۔

اگر کسی کی آنکھ کے دونوں پپوٹے کاٹ دیئے جائیں تو آدھی دیت اور ایک پپوٹا کاٹا جائے تو چوتھائی دیت دینا

ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فی جفون العینین فی کل واحد منها ربع الدیة۔ (مستدرک الوسائل)

آنکھ کے دونوں پپوٹوں میں سے ہر پپوٹے کی دیت ایک چوتھائی ہے۔

اگر ابروؤں کو اس طرح گزند پہنچایا جائے کہ تمام بال جھڑ جائیں تو دونوں ابروؤں کی دیت نصف اور ایک ابرو کی دیت ایک چوتھائی ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ان اصیب الحاجب فذهب شعره کله فدیته نصف دیته العین مائتا و خمسون دینارا۔ (وسائل الشیعہ)

اگر کسی گزند کی وجہ سے ابرو کے تمام بال جھڑ جائیں تو آنکھ کی دیت کا نصف یعنی دو سو پچاس دینار دیئے جائیں گے۔

اگر کسی کے دونوں کان کاٹ دیئے جائیں تو پوری دیت اور ایک کان کاٹ دیا جائے تو نصف دیت دینا ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے:

فی الاذنین اذاقطعت احدا هما فدیتها خمس مائه دینارا۔ (وسائل الشیعہ)

جب ایک کان کاٹ دیا جائے تو اس کی دیت پانچ سو دینار ہو گی۔

اگر کان کی لو کاٹ دی جائے تو ایک تہائی دیت دینا ہو گی۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ان علیا قضی فی شحمه الاذن ثلث دیه الاذن۔ (وسائل الشیعہ)

حضرت علی علیہ السلام نے کان کی لو کاٹنے پر کان کی دیت کا ایک تہائی دینے کا فیصلہ کیا۔

اگر کسی کو دونوں کانوں سے بہرا کر دے تو پوری دیت دینا ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

اذا ضرب الرجل فذهب سمعه کله ففیه الدیه کاملة۔ (مستدرک الوسائل)

جب کسی کو اس طرح چوٹ لگائے کہ قوت سماعت بالکل جاتی رہے تو پوری دیت دینا ہو گی

اگر کسی کی ناک کاٹ دی جائے تو پوری دیت دی جائے گی چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

قضی امیرالمؤمنین فی دیه الا نف اذا استوصل مائته من الابل۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام نے فیصلہ فرمایا کہ جب ناک پوری کاٹ دی جائے تو دیت میں سو اونٹ دیئے جائیں۔

اگر ناک کا پردہ کاٹ دیا جائے تو نصف دیت دینا ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فان قطع روثہ الا نف فد یتھا خمسہ مائتہ دینار۔ (وسائل الشیعہ)

اگر ناک کا پردہ کاٹ دیا جائے تو پانچ سو دینار دیت ہو گی۔

اگر کسی کے دونوں ہونٹ کاٹ دیئے جائیں تو پوری دیت اور ایک ہونٹ کاٹا جائے تو آدھی دیت ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فی الشفتین الدیتہ وفی کل واحد نصف الدیتہ۔ (مستدرک الوسائل)

دونوں ہونٹوں کی دیت پوری ہو گی اور ایک ہونٹ کی دیت آدھی۔

اگر کسی کی زبان جڑ سے کاٹ دی جائے تو پوری دیت اور اگر اس کا کچھ حصہ کاٹ دیا جائے تو اسی کے تناسب سے دیت دی جائے گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فی اللسان الدیتہ و اذا بقی منہ فبحساب مانقص منہ۔ (مستدرک الوسائل)

زبان کی دیت پوری ہو گی اور اگر اس میں سے کچھ باقی رہے تو پھر کمی کے تناسب سے دیت ہو گی۔

اگر کسی ضرب کے نتیجہ میں زبان بعض حروف کا تلفظ نہ کر سکے تو کل دیت کو مخارج حروف پر تقسیم کر کے دیت دی جائے گی۔چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

من ضرب اوقطع من لسانہ فلم یصب بعض الکلام فانہ ینظر الی مالا یصیبہ من الحروف فیعطی الدیتہ بحساب ذ لک من حروف المعجم۔(مستدرک الوسائل)

اگر کوئی شخص کسی کی زبان پر چوٹ لگائے یا کاٹ دے اور وہ کچھ الفاظ کا تلفظ نہ کر سکے تو یہ دیکھا جائے گا کہ وہ حروف تہجی میں سے کتنے حرف ادا نہیں کر سکتا اور انہی حرفوں کے حساب سے دیت دی جائے گی۔

ایک شخص نے ایک بچے کے سر پر ضرب لگائی جس سے اس کی زبان میں کھچاؤ پیدا ہو گیا اور بعض حروف کی ادائیگی نہ کر سکا۔ اسے حضرتؑ کے سامنے پیش کیا گیا آپؑ نے اسے حروف تہجی ادا کرنے کے لئے کہا وہ چند حروف ادا نہ کر سکا۔ آپؑ نے فرمایا کہ دیت کو حروف تہجی پر تقسیم کیا جائے اور جتنے حروف یہ ادا کر سکا ہے اتنی مقدار سالم دیت سے وضع کر کے اسے دی جائے۔ اگر کسی گونگے کی زبان کاٹ دی جائے تو ایک تہائی دیت ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے کہ۔

فی لسان الا خرس ثلث الدیہ۔ (مستدرک الوسائل)

گونگے کی زبان قطع کرنے کی دیت ایک تہائی ہے۔

اگر کسی کے تمام دانت توڑ دیئے جائیں تو سالم دیت دینا ہو گی۔ اس طرح کہ سامنے کے چھ اوپر والے اور

چھ نیچے والے دانتوں میں سے ہر ایک کی دیت پچاس دینار اور پیچھے والے سولہ دانتوں میں سے ہر ایک کی دیت پچیس دینار ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

کل سن من المقادیم اذا کرحتی یذھب خمسون دینار ایکون ذ لک ستمائه دینار و دیته کل سن من المواخر اذا کرحتی یذھب علی النصف من دیته المقادیم خمسه و عشرون دینارا۔ (وسائل الشیعہ)

جب سامنے کے دانتوں میں سے کوئی دانت اس طرح توڑا جائے کہ جڑ سے اکھڑ جائے تو دانت کی دیت پچاس دینار ہو گی اور ان کی مجموعی دیت چھ سو دینار بنے گی اور پچھلی طرف کے دانتوں کو توڑنے کی صورت میں ہر دانت کی دیت سامنے والے دانتوں کی دیت سے نصف یعنی پچیس دینار ہو گی۔

اگر کوئی شخص کسی کی داڑھی کے بال اس طرح مونڈے یا اکھیڑے کہ دوبارہ نہ اگیں تو پوری دیت دینا ہو گی۔ اور اگر اگ آئیں تو ایک تہائی دیت۔ چنانچہ سکونی سے روایت ہے کہ۔

ان علیا علیه السلام قضی فی اللحیه اذا حلقت فلما تنبت بالدیه کامله فاذا نبتت فثلث الدیه۔ (الفقیہ)

جب کسی کی داڑھی کے بال اس طرح مونڈ دیئے جائیں کہ دوبارہ نہ اگیں تو حضرت علی علیہ السلام نے پوری دیت کا فیصلہ فرمایا۔

اگر کسی کا شانہ توڑ دیا جائے تو سو دینار دیت ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

دیته المنکب اذا کر خمس دیته الید مائه دینار۔ (مستدرک الوسائل)

شانہ کی دیت سو دینار ہے جو ہاتھ کی دیت کا پانچواں حصہ ہے۔

اگر کسی کے دونوں ہاتھ گٹ سے کاٹ دیئے جائیں تو پوری دیت اور ایک ہاتھ کاٹا جائے تو آدھی دیت دینا ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فی الیدین الدیه وفی کل واحد منھما نصف الدیه۔ (مستدرک الوسائل)

دونوں ہاتھوں کی پوری دیت ہے اور ایک ہاتھ کی آدھی دیت۔

اگر کسی کی دسوں انگلیاں کاٹ دی جائیں تو پوری دیت دینا ہو گی۔ اور ایک انگلی کاٹی جائے تو دیت کا دسواں حصہ دیا جائے گا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فی الاصبع عشر من الابل۔ (مستدرک الوسائل)

ایک انگلی کی دیت دس اونٹ ہے۔

اگر انگلی کی ایک پور کاٹی جائے تو انگلی کی دیت کا تیسرا حصہ دیا جائے گا اور انگوٹھے کی پور کاٹی جائے تو انگلی

کی دیت سے آدھی دیت دی جائے گی۔ چنانچہ سکونی سے روایت ہے کہ۔

ان امیرالمؤمنین یقضی فی کل مفصل من الاصابع بثلث عقلی تلک الا صابع الا الا بھام فانہ کان یقضی فی مفصلھا بنصف عقلی تلک الابھام لان لھا مفصلین۔ (الفقیہ)

امیرالمومنین علیہ السلام کا یہ فیصلہ تھا کہ انگلی کی ہر پور کی دیت انگلی کی دیت کی ایک تہائی ہو گی لیکن انگوٹھے کی پور کی دیت انگوٹھے کی دیت کا نصف ہو گی کیونکہ اس میں دو ہی پوریں ہوتی ہیں۔

اگر کسی کی کمر اس طرح توڑ دی جائے کہ وہ بیٹھ نہ سکے تو پوری دیت دینا ہو گی۔ چنانچہ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں۔

قضی امیرالمؤمنین فی رجل کر صلبہ فلا یستطیع ان یجلس ان فیہ الدیتہ۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام نے اس شخص کے بارے میں جس کی کمر توڑ دی گئی تھی اور وہ بیٹھ نہ سکتا تھا پوری دیت کا فیصلہ فرمایا۔

اگر عورت کے دونوں پستان قطع کر دیئے جائیں تو پوری دیت اور ایک پستان قطع کیا جائے تو نصف دیت ہو گی۔ چنانچہ امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

قضی امیرالمؤمنین فی رجل قطع ثدی امراتہ قال اذن اغرمہ لھا نصف الدیتہ۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام نے اس شخص کے بارے میں جس نے اپنی عورت کا ایک پستان کاٹ ڈالا تھا فرمایا کہ میں اس مرد سے عورت کو آدھی دیت دلواؤں گا۔

اگر کسی کو اس طرح ضرب لگائی جائے کہ پیشاب رکنے نہ پائے تو اسے پوری دیت دی جائے گی۔

ان علیا قضی فی رجل ضرب حتی سلس ببولہ بالدیتہ کاسلہ۔ (وسائل الشیعہ)

حضرت علی علیہ السلام نے اس شخص کے بارے میں جس کا چوٹ لگنے کی وجہ سے پیشاب نہ رکتا تھا پوری دیت کا فیصلہ فرمایا۔

اگر کسی کے دونوں خصیئے کاٹ دیئے جائیں تو اسے پوری دیت دی جائے گی اور اگر ایک خصیہ کاٹا گیا ہو تو آدھی دیت۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فی البیضتین الدیتہ وفی کل واحد منھا نصف الدیتہ۔ (مستدرک الوسائل)

دونوں خصیوں کی سالم دیت ہے اور ایک کی آدھی دیت۔

اگر کسی کے دونوں پیر ٹخنوں سے کاٹ دیئے جائیں تو پوری دیت ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

والرجلین جمیعا الف دینار۔ (مستدرک الوسائل)

دونوں پیروں کی دیت ہزار دینار ہے۔

اگر پاؤں کی دسوں انگلیاں کاٹ دی جائیں تو پوری دیت دینا ہو گی اور ہر انگلی کی دیت، دیت کا دسواں حصہ ہو گی۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

فی کل اصبع اصابع الرجلین مائتہ وفی کل انمتہ بحسابھا۔(مستدرک الوسائل)

پیروں کی انگلیوں میں سے ہر انگلی کی دیت سو دینار ہے اور ہر پور کی دیت اسی تناسب سے ہو گی۔

اگر کوئی شخص کسی کے منہ پر تھپڑ مارے تو ڈیڑھ دینار سے چھ دینار تک تاوان دینا ہو گا۔ صدوق رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔

انہ قضی فی اللطمتہ بالوجہ تسود ان ارشھا ستتہ دنانیر فان اخضرت فار شھا ثلثتہ دنانیر فان احمرت فارشھا دینار و نصف۔ (مستدرک الوسائل)

حضرت علی علیہ السلام نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر طمانچے سے چہرہ سیاہ ہو جائے تو چھ دینار اور سرخ ہو جائے تو ڈیڑھ دینار نیلا ہو جائے تو تین دینار تاوان دیا جائے گا۔

اگر کوئی شخص کسی کے سر یا چہرے پر ضرب لگائے اور خون نکل آئے تو دیت ایک فیصد حصہ دے گا۔

ان علیا علیہ السلام قضی فی الدامیہ بعیرا۔ (مستدرک الوسائل)

حضرت علی علیہ السلام نے خون نکالنے والی چوٹ پر ایک اونٹ دیت کا فیصلہ کیا۔

اگر کھال کے ساتھ تھوڑا سا گوشت بھی چیر دے تو دیت کا دو فیصد دیا جائے گا۔

قضی فی الباصعتہ بعشرین دینارا۔ (مستدرک الوسائل)

حضرت علی علیہ السلام نے اس ضرب میں جو تھوڑا سا گوشت بھی چیر دے بیس دینار دیت کا فیصلہ کیا۔

اگر زیادہ مقدار میں گوشت چیر دے تو دیت کا تین فیصد دیا جائے گا۔

قضی فی الملاحمہ بثلثین دینارا۔ (مستدرک الوسائل)

حضرت علی علیہ السلام نے اس ضرب میں جو گوشت کے اندر تک اتر جائے تیس دینار دیت کا فیصلہ کیا۔

اگر چوٹ کا اثر ہڈی کے نازک پردے تک پہنچ جائے تو چار فیصد دیت دی جائے گی۔

ان علیا قضی فی السحاق اربعتہ ابعر او قیمتها من الذهب والورق (مستدرک الوسائل)

حضرت علی علیہ السلام نے اس ضرب میں جو ہڈی کے پردے تک پہنچ جائے چار اونٹ یا ان کی قیمت کے مساوی سونا اور چاندی کی دیت کا فیصلہ کیا۔

اگر ہڈی نظر آنے لگے تو پانچ فیصد دیت دی جائے گی۔

ان علیا علیہ السلام قضی فی الموضحتہ بخمس من الابل اوقیمتها من الذهب والورق۔ (مستدرک الوسائل)

حضرت علی علیہ السلام نے اس ضرب میں جس سے ہڈی دکھائی دینے لگے پانچ اونٹ یا ان کی قیمت کے برابر سونا اور چاندی کی دیت کا فیصلہ کیا۔

اگر ہڈی ٹوٹ جائے تو دیت کا دس فیصد دیا جائے گا چنانچہ سکونی سے روایت ہے کہ

قضی امیرالمومنین فی الهاشمتہ بعشر من الابل۔ (الفقیہ)

امیرالمومنین نے اس ضرب میں جس سے ہڈی ٹوٹ جائے دس اونٹوں کی دیت کا فیصلہ کیا۔

اگر ہڈی کے ذرے الگ ہو جائیں تو پندرہ فیصد دیت دی جائے گی۔

قضی فی المنقلتہ خمستہ عشر من الابل۔ (مستدرک الوسائل)

حضرت علی علیہ السلام نے ہڈی کے ذروں کے الگ ہونے کی صورت میں پندرہ اونٹوں کی دیت کا فیصلہ کیا۔

اگر ضرب جوف دماغ یا بھیجے کے پردہ تک پہنچے تو ایک تہائی دیت دی جائے گی۔

ان علیا علیہ السلام قضی فی الجائفتہ وفی المامومتہ ثلث الدیتہ۔ (مستدرک الوسائل)

حضرت علی علیہ السلام نے جوف دماغ اور ہڈی کے پردے تک پہنچنے والی ضرب میں ایک تہائی دیت کا فیصلہ کیا۔

اگر کوئی شخص ایسا کام کرے جس سے کسی زن مسلمہ کا حمل ساقط ہو جائے تو جسمانی ساخت کے منازل کے اعتبار سے اس کی دیت بیس دینار سے ایک ہزار دینار تک ہو گی۔ چنانچہ ایک شخص نے ایک حاملہ عورت کو اس طرح

زد و کوب کیا کہ اس کا حمل جو بندھے ہوئے خون کی صورت میں تھا ساقط ہو گیا۔ امیرالمومنینؑ سے اس کی دیت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس کی دیت چالیس دینار ہو گی اور اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

ولقد خلقنا الانسان من سلالتہ من طین ثم جعلنا نطفتہ فی قرار مکین ثم جعلنا النطفتہ علقہ فجعلنا العلقہ مضغتہ فجعلنا المضغہ عظاما فکسونا العظام لحما ثم انشانا خلقا آخرت فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا پھر ہم نے ایک ٹھہراؤ کی جگہ میں اسے نطفہ کی صورت میں رکھا پھر اس نطفہ کو بندھا ہوا خون بنایا پھر بندھے ہوئے خون کو گوشت کا لوتھڑا بنایا پھر لوتھڑے میں ہڈیوں کا ڈھانچا تیار کیا پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا پھر (اس میں روح پھونک کر) اسے دوسری شکل و صورت دے دی تو بابرکت ہے وہ خدا جو ہر بنانے والے سے بہتر بنانے والا ہے۔

پھر فرمایا کہ نطفہ کی دیت بیس دینار۔ بندھے ہوئے خون کی چالیس دینار لوتھڑے کی ساٹھ دینار اور ہڈیوں کی تخلیق کے بعد اسی (80) دینار اور صورت کی تکمیل کے بعد سو دینار اور روح پڑنے کے بعد ہزار دینار ہو گی۔ اگر کسی یہودی نصرانی یا مجوسی عورت کا بچہ ساقط کر دیا جائے تو اس کی دیت اس کی ماں کی دیت کا دسواں حصہ ہو گی چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

ان امیرالمومنین قضی فی جنین الیھودیہ والنصرانیہ والمجوسیہ عشر دیتہ امہ۔ (وسائل الشیعہ)

امیرالمومنین علیہ السلام نے یہودیہ نصرانیہ اور مجوسیہ عورت کے بچے کے ساقط کرنے کی دیت اس کی ماں کی دیت کا دسواں حصہ قرار دی۔

مسائل مشکلہ

امیرالمومنین علیہ السلام مشکل سے مشکل مسائل اور پیچیدہ سے پیچیدہ منزاعات کے حل کرنے میں حیرت انگیز دستگاہ رکھتے تھے اور جن مسائل کا حل تلاش کرنے میں اہل نظر کی فکری قوتیں اور ذہنی کاوشیں بیکار ہو جاتی تھیں۔ آپؑ کا ذہن رسا انہیں فوراً حل کر دیتا تھا۔ اگرچہ علماء و فقہاء نے مسائل مشکلہ کے عنوان سے بہت سی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھایا ہے۔ مگر اس منزل کے پہلے راہ پیما آپؑ ہیں اور آپؑ ہی کے افکار و نظریات کی روشنی نے اس منزل کی طرف رہنمائی کی ہے۔ ذیل میں اس سلسلہ کے چند قضایا و مسائل درج کئے جاتے ہیں۔

ایک شخص نے حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا کہ وہ شخص کون ہو سکتا ہے جس نے صبح کے وقت ایک عورت سے عقد کیا شام کو اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا اور اس کے بعد وہ شخص مرگیا اور بیوی اور یہ نومولود بچہ اس کے وارث قرار پائے۔ حضرت ابوبکر کوئی جواب نہ دے سکے۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے سنا تو فرمایا کہ وہ عورت اپنے آقا کی حاملہ کنیز تھی آقا نے اسے آزاد کر دیا اور پھر اس سے نکاح کر لیا۔ صبح کو عقد ہوا اور شام کو ولادت ہوئی اور اس کے مرنے کے بعد یہی دونوں اس کے وارث ہوں گے۔

عقبہ ابن ابی عقبہ وفات پا گیا۔ حضرتؑ چند لوگوں کے ہمراہ اس کے جنازہ میں شریک ہوئے۔ تشیع جنازہ کے دوران آپؑ نے ایک شخص سے فرمایا کہ عقبہ مرگیا ہے لہٰذا تمہاری بیوی تم پر حرام ہو گئی ہے۔ حضرت عمر وہاں موجود تھے انہوں نے کہا کہ یہ عجیب بات ہے کہ ایک شخص مرجاتا ہے اور دوسرے شخص کی بیوی اس پر حرام ہو جاتی ہے حضرتؑ نے فرمایا کہ یہ عقبہ کا غلام ہے اور اس کے نکاح میں ایک آزاد عورت ہے جو عقبہ کے ورثاء میں شامل ہے اور اس غلام میں بھی اس کا حصہ ہے اور عورت اپنے غلام پر حرام ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ بھی اپنے شوہر پر حرام ہو جائے گی۔

ایک عورت نے حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ کیا آپؑ اسے جائز قرار دیتے ہیں کہ ایک جوان شوہر دار عورت اپنے باپ سے اجازت لے کر دوسرا شوہر کر لے۔ لوگ اس سوال پر متعجب ہوئے مگر امیرالمومنین علیہ السلام فوراً سمجھ گئے کہ شوہر کے ہوتے ہوئے دوسرے شوہر کی خواہش کے معنی اس کے سوا کیا ہو سکتے ہیں کہ اس کا شوہر عورت کے قابل نہیں ہے۔ آپؑ نے اس کے شوہر کو طلب کیا اور فرمایا کہ تم اسے طلاق دے دو اس نے بغیر کسی حیل و حجت کے طلاق دے دی اور آپ نے عدہ کا انتظار کئے بغیر اس کا عقد ایک دوسرے شخص سے کر دیا کیونکہ ایسی صورت میں عدہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت عمرؓ کو بھی پیش آیا اور وہ یہ کہ ایک عورت نے ان سے کہا کہ۔

ان زوجی یقوم اللیل و یصوم النھار وانا اکرہ ان اشکوہ الیک وھو یعمل بطاعۃ اللہ۔ (استیعاب)

میرا شوہر رات کو نمازیں پڑھتا ہے اور دن کو روزہ رکھتا ہے مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میں آپ سے اس کا گلہ کروں جبکہ وہ اللہ کا اطاعت گزار ہے۔

حضرت عمرؓ نے کہا کہ پھر تو وہ بہت اچھا آدمی ہوا' خدا اسے جزائے خیر دے کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں اسے منع کردوں کہ وہ دن کو روزہ نہ رکھے اور رات کو نماز نہ پڑھے۔ کعب ابن سور وہاں بیٹھا تھا اس نے کہا کہ اس عورت کا مقصد یہ ہے کہ اس کا شوہر ہمہ وقت عبادت میں لگا رہتا ہے اور بیوی کے حقوق ادا کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ حضرت عمر نے کہا کہ تم خوب سمجھے اب تم ہی اس کا فیصلہ کرو۔ اس نے کہا کہ مرد کو چار عورتیں کرنے کی اجازت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ چار راتوں میں سے ایک رات اس کے حصہ میں آتی ہے۔ لہٰذا وہ چار راتوں میں سے تین راتیں عبادت میں صرف کرے اور ایک رات اس کے لئے مخصوص کردے۔ حضرت عمر کو کعب کا یہ فیصلہ پسند آیا اور اسے بصرہ کا قاضی مقرر کر دیا۔ جہاں وہ جنگ جمل میں اونٹ کی مہار تھامنے پر کسی کا تیر لگنے سے ہلاک ہو گیا۔

ایک شخص نے اپنی کنیز جس سے اس کا ایک لڑکا بھی تھا اپنے ایک غلام سے بیاہ دی۔ اس شخص کا انتقال ہوا تو وہ لڑکا اس کا وارث قرار پایا اور وہ کنیز اپنے لڑکے کی طرف منتقل ہونے کی بنا پر آزاد قرار دے دی گئی۔ کیونکہ ماں اپنے بیٹے کی غلامی میں نہیں آسکتی پھر وہ لڑکا مر گیا اور وہ عورت اس کے ترکہ کی وارث قرار پائی۔ اس ترکہ میں وہ غلام بھی شامل تھا جس سے اس کا عقد ہوا تھا۔ اب وہ عورت یہ کہتی تھی کہ یہ میرا غلام ہے اور غلام یہ کہتا تھا کہ یہ میری بیوی ہے۔ جب کوئی تصفیہ نہ کر سکے تو حضرت عثمانؓ کے سامنے پیش ہوئے مگر وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ امیرالمومنین علیہ السلام اس پر مطلع ہوئے تو آپؑ نے اس عورت سے کہا کہ وہ تیرا غلام ہے چاہے تو اسے آزاد کر یا اپنی غلامی میں رکھ یا بیچ ڈال اگر وہ تیری طرف منتقل ہونے کے بعد زناشوئی کے تعلقات قائم کرتا تو سزا کا مستحق ہوتا۔

ایک عورت حضرتؑ کے پاس آئی اور کہا کہ میں عقبہ ابن عامر جہنی کی بیوی ہوں جو مال کثیر چھوڑ کر مر گیا ہے مگر عقبہ کے چچا زاد بھائیوں نے اس کے ترکہ پر قبضہ کر لیا ہے حالانکہ میں حاملہ ہوں اور پیدا ہونے والا بچہ ہی اس کا صحیح وارث ہے اور اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں عقبہ کے دو غلاموں سالم اور میمون کو پیش کیا جنہیں عقبہ کے بعد اس کے چچا زاد بھائیوں نے آزاد کر دیا تھا۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ اگر اس کے ہاں بچہ پیدا ہو تو نہ اسے کچھ ملے گا اور نہ اس کے بچے کو اور اگر اس کے ہاں بچہ پیدا نہ ہو تو اسے ترکہ میں سے چوتھا حصہ دیا جائے گا۔ اس کی توجیہ یہ بیان فرمائی کہ بچہ پیدا ہونے کی صورت میں اس کی زوجیت اور بچے کی فرزندی کی گواہی دینے والے اس کے دعویٰ کی بنا پر غلامی پر باقی ہوں گے کیونکہ عقبہ کے چچا زاد بھائی نہ وارث ہیں اور نہ انہیں آزاد کرنے کا حق پہنچتا ہے اور غلام کی گواہی اس موقع پر کافی نہیں ہے اور بچہ نہ ہونے کی صورت میں چچازاد بھائی وارث ہوں گے اور وارثوں ہی

نے ان دونوں کو آزاد کیا ہے لہٰذا آزادی کی بنا پر ان کی گواہی زوجیت کے بارے میں قابل قبول ہو گی۔

ایک نوجوان حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یاامیرالمومنین علیہ السلام میرا باپ چند آدمیوں کے ہمراہ سفر پر گیا۔ وہ تو سب کے سب واپس آ گئے مگر میرا باپ پلٹ کر نہیں آیا میں نے ان سے پوچھا تو یہ جواب دیا کہ وہ سفر کے دوران مرگیا ہے اور اس کے مال کے بارے میں پوچھا تو جواب دیا کہ اس کے پاس کچھ نہیں تھا حالانکہ میرے علم میں ہے کہ وہ مال کثیر لے کر نکلا تھا مجھے شبہہ ہے کہ انہوں نے اسے قتل کر دیا ہے اور اس کا مال آپس میں تقسیم کر لیا ہے۔ میں قاضی شریح کی عدالت میں پیش ہو چکا ہوں مگر اس نے میرا دعویٰ مسترد کر دیا ہے اب میں آپؑ کے پاس فریاد لے کر آیا ہوں۔ حضرتؑ اسے اور ان آدمیوں کو لے کر شریح کے پاس آئے اور فرمایا کہ اے شریح تم نے کس بنیاد پر اس نوجوان کے دعویٰ کو مسترد کیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے اس نوجوان سے گواہ طلب کئے مگر یہ کوئی گواہ پیش نہ کر سکا لہٰذا میں نے ان لوگوں سے حلف لے کر اس کا دعویٰ مسترد کر دیا۔ فرمایا کہ اے شریح کیا اس طرح کے دعوؤں کا یوں فیصلہ کیا جاتا ہے۔ پھر حضرتؑ نے اس کا فیصلہ اس طرح کیا کہ ان لوگوں کو الگ الگ بٹھایا اور ہر ایک پر ایک ایک آدمی نگران مقرر کر دیا اور ان میں سے ایک کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ تم کس دن نکلے تھے، مہینہ اور سال کون سا تھا، مرنے والے کا مرض کیا تھا، کتنے دن بیمار رہا، غسل و کفن کس نے دیا، نماز کس نے پڑھائی اور قبر میں کون اترا۔ اس نے جو جوابات دیئے عبیداللہ ابن ابی رافع انہیں حضرتؑ کے حکم سے قلمبند کرتے رہے۔ جب تمام متعلقہ امور پوچھ چکے تو آپ نے بلند آواز سے اللہ اکبر کہا اور گرد و پیش بیٹھے ہوئے لوگوں نے بھی صدائے تکبیر بلند کی پھر دوسرے آدمی کو بلایا اس نے اس خیال سے کہ پہلے آدمی نے اعتراف جرم کر لیا ہے کہا کہ یا امیرالمومنین علیہ السلام میں ان لوگوں کے ساتھ شریک جرم ہونا نہ چاہتا تھا مگر مجھے کہہ سن کر شریک کر لیا گیا اور ہم سب نے مل کر اسے قتل کیا اور اس کا مال آپس میں بانٹ لیا۔ اس کے بعد دوسروں کو ایک ایک کر کے بلایا انہوں نے انکار کی گنجائش نہ پا کر اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ جب وہ اقرار کر چکے تو آپ نے انہیں مقتول کے خون کا مجرم اور اس کے مال کا ذمہ دار قرار دیا۔

ایک شخص نے اپنے غلام کو حضرتؑ کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ یہ میرا غلام ہے اور اس نے مجھ سے اجازت حاصل کئے بغیر عقد کر لیا ہے فرمایا کہ تم اسے اس عورت سے الگ کر دو اس نے غلام سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم اس عورت کو طلاق دے دو۔ حضرتؑ نے یہ سنا تو فرمایا کہ تم نے طلاق کا حکم دے کر اپنی رضا مندی کا اظہار اور نکاح کے جواز کا اقرار کیا ہے لہٰذا اب اسے اختیار ہے چاہے طلاق دے یا نہ دے۔

حضرتؑ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے یہ قسم کھائی تھی کہ اگر وہ رمضان کے مہینہ میں اپنی بیوی سے ہم بستری نہ کرے تو اس کی بیوی کو تین طلاقیں ہو جائیں گی حضرتؑ نے فرمایا کہ وہ اسے لے کر سفر پر روانہ ہو جائے اور پھر دن کے وقت ہم بستری کر لے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے یہ ان لوگوں کے لئے چھٹکارے کی ایک صورت تجویز کی ہے جو قسم کے ذریعہ طلاق کو صحیح سمجھتے ہیں۔

ایک شخص نے حاضر خدمت ہو کر کہا کہ میرے سامنے چند خرمے رکھے ہوئے تھے میری بیوی نے ایک خرما اٹھا کر منہ میں رکھ لیا میں نے قسم کھائی کہ وہ نہ اسے پھینکے اور نہ اسے نگلے فرمایا وہ آدھا کھا لے اور آدھا پھینک دے تم قسم سے بری الذمہ ہو جاؤ گے۔

متفرق سوالات اور ان کے جوابات

امیرالمومنین علیہ السلام سے یہود و نصاریٰ کے علماء و احبار مختلف قسم کے سوالات کرتے تھے۔ کبھی علمی آزمائش مقصود ہوتی تھی اور کبھی علمی استفادہ۔ آپؑ ان کے ہر سوال پر کان دھرتے اور اس کی نوعیت کچھ بھی ہوتی بغیر کسی ذہنی دباؤ کے ایسا جواب دیتے کہ وہ مطمئن ہو کر خاموشی اختیار کر لیتے یا حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے۔ ذیل میں آپؑ کے چند جوابات درج کئے جاتے ہیں۔ ایک یہودی نے آپؑ سے سوال کیا کہ۔

اخبرنی عمالیس اللہ و عمالیس عنداللہ و عمالا یعلمہ اللہ۔ (توحید صدوق)

مجھے بتایئے کہ وہ کیا چیز ہے جو اللہ کے لئے نہیں ہے اور وہ کیا چیز ہے جو اللہ کے ہاں نہیں ہے اور وہ کیا چیز ہے جس کا اسے علم نہیں ہے۔

فرمایا کہ وہ چیز جسے اللہ نہیں جانتا وہ تمہارا یہ قول ہے کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور اللہ نہیں جانتا کہ اس کا کوئی بیٹا ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے **قل اتنبئون اللہ بما لا یعلم** (اے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تم ان سے کہو کہ کیا تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہیں جانتا) اور وہ چیز جو اللہ کے لئے نہیں ہے وہ شریک ہے اور جو چیز اس کے ہاں نہیں ہے وہ ظلم ہے۔ اس یہودی نے یہ جواب سنا تو کلمہ پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔

ایک نصرانی نے حضرتؑ سے کہا کہ **اخبرنی عن وجہ الرب** "مجھے اللہ کے چہرے کے بارے میں بتایئے" حضرت نے کچھ لکڑیاں منگوا کر آگ روشن کی جب شعلے بھڑک اٹھے تو فرمایا **این وجہ ھذاہ النار** "اس آگ کا چہرہ کس طرف ہے" اس نے کہا کہ آگ کا رخ چاروں طرف یکساں ہوتا ہے فرمایا کہ یہ آگ جو ہماری روشن کی ہوئی ہے اس کا رخ متعین نہیں کیا جا سکتا تو اللہ جو کسی چیز سے مشابہت نہیں رکھتا اس کا رخ کیسے متعین کیا جا سکتا ہے۔ پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

وللہ المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ۔

پورب اور پچھم اللہ ہی کے لئے ہیں لہٰذا جدھر رخ کر لو گے وہیں اللہ کا سامنا ہے۔

ایک شخص نے پوچھا کہ وہ کون سی عبادت ہے کہ اگر بجا لائی جائے تو عقوبت اور ترک کی جائے تو عقوبت فرمایا کہ وہ نماز ہے جو نشہ کی حالت میں پڑھی جائے کیونکہ نشہ میں نہ نماز درست ہے اور نہ تکلیف ساقط۔

سلطان روم کے ایک قاصد نے پوچھا کہ اس آدمی کے بارے میں آپؑ کیا کہتے ہیں جو نہ جنت کا خواہشمند ہے نہ دوزخ سے ہراساں نہ اللہ سے ڈرتا ہے اور نہ سجدہ و رکوع کرتا ہے خون اور غیر ذبیحہ جانور کا گوشت کھاتا ہے بن دیکھے گواہی دیتا ہے فتنہ کو دوست رکھتا ہے اور حق سے کراہت کرتا ہے فرمایا کہ جو نہ جنت کا طالب ہے نہ دوزخ

سے ہراساں اور نہ اللہ سے خائف وہ اللہ کا دوست ہے اس لئے کہ وہ جنت کی خواہش اور دوزخ کے خوف سے بالاتر رہ کر اللہ کی اطاعت کرتا ہے اور اللہ سے ڈرتا ہے تو اس کے عدل کی بنا پر اور ظلم کی بنا پر نہیں ڈرتا۔ اس لئے کہ اسے یقین ہے کہ اللہ ظالم نہیں ہے اور رکوع و سجود نہیں کرتا تو نماز جنازہ میں اس لئے کہ اس میں نہ رکوع ہے اور نہ سجود' ٹڈی اور مچھلی کا گوشت کھاتا ہے اور ان دونوں کو ذبح نہیں کیا جاتا اور کلیجی کھائی جاتی ہے اور وہ خون ہی خون ہوتی ہے اور اولاد کو دوست رکھتا ہے اور قرآن مجید میں اولاد کو فتنہ سے تعبیر کیا گیا ہے **انما اموالکم و اولادکم فتنہ** "تمہارا مال اور اولاد فتنہ ہے" جنت و دوزخ کی گواہی دیتا ہے حالانکہ اس نے نہ جنت کو دیکھا ہے اور نہ دوزخ کو اور موت ناگوار معلوم ہوتی ہے اور وہ سراسر حق ہے۔

یہودیوں کی ایک جماعت نے چند سوالات کے ضمن میں پوچھا کہ وہ کون تھا جس نے اپنی قوم کو ڈرایا اور وہ نہ انسانوں میں سے تھا اور نہ جنوں میں سے فرمایا وہ چیونٹی تھی جس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر کو دیکھ کر کہا۔

یا ایھا النمل ادخلو اسماکنکم لا یحطمنکم سلیمان وجنودہ وھم لا یشعرون۔

اے چیونٹیو اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور ان کا لشکر تمہیں کچل ڈالے اور انہیں خبر بھی نہ ہونے پائے۔

پوچھا وہ کون سی جگہ تھی جس پر ایک ہی مرتبہ سورج چمکا اور پھر اس پر سورج کی شعاعیں نہیں پڑیں فرمایا وہ رود نیل کی نچلی سطح ہے جس پر سے بنی اسرائیل گزرے اور فرعون اور اس کا لشکر موجوں کی لپیٹ میں آیا۔ پوچھا کہ مخلوقات میں وہ کون کون جانور ہیں جو ماں کے شکم سے پیدا نہیں ہوئے فرمایا وہ حضرت آدم' جناب حوا' حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اژدھا' حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی اور حضرت ابراہیم علیہ اسلام کے ہاتھ سے ذبح ہونے والا مینڈھا اور وہ پرندہ جس کا ڈھانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنایا اور وہ اللہ کے حکم سے پرواز کرنے لگا۔

ایک شخص نے خطبہ کے دوران پوچھا کہ وہ کون سا جاندار ہے جو دوسرے جاندار کے شکم سے نکلا مگر ان دونوں میں کوئی قرابت نہ تھی فرمایا وہ یونس ابن متی علیہ السلام تھے جو مچھلی کے پیٹ سے نکلے۔

پوچھا گیا کہ وہ کون سا درخت تھا جسے پانی سے سیراب نہیں کیا گیا فرمایا کہ وہ درخت جو حضرت یونس علیہ السلام پر سایہ ڈالنے کے لئے اگا۔ قرآن مجید میں ہے۔

وانبتنا علیہ شجرہ من یقطین۔

ہم نے انکے سر پر (سایہ کے لئے) کدو کا درخت لگایا۔

پوچھا گیا کہ وہ کون ذی روح ہے جو جماد سے پیدا ہوا۔ فرمایا وہ ناقہ صالح علیہ السلام ہے۔

ایک شخص نے پوچھا کہ وہ کون ہے جو زندگی میں پانی سے سیراب ہوتا رہا اور مرنے کے بعد کھاتا ہے فرمایا وہ عصائے موسیٰ علیہ السلام تھا جب تک وہ درخت کا جزو رہا پانی سے سیراب ہوتا رہا اور جب شاخ سے الگ ہو کر مردہ ہو گیا تو جادو گروں کی رسیوں اور چھڑیوں کو نگل گیا۔

ایک یہودی عالم راس الجالوت نے آپ سے پوچھا کہ تمام چیزوں کی اصل و بنیاد کیا ہے۔ فرمایا پانی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

وجعلنا من ماء کل شئی حی۔ ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا ہے۔

پوچھا کہ وہ دو گھٹنے بڑھنے والی چیزیں کون سی ہیں جن کا گھٹاؤ بڑھاؤ نظر میں آتا ہے فرمایا کہ وہ شب و روز ہیں جو گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ پوچھا کہ وہ کون سا پانی تھا جو نہ زمین سے پھوٹا اور نہ آسمان سے برسا فرمایا وہ پسینہ تھا جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے گھوڑوں کو دوڑا کر حاصل کیا تھا اور ملکہ سبا بلقیس کے پاس بھیجا تھا پوچھا وہ کون سی چیز ہے جو بے جان ہونے کے باوجود سانس لیتی ہے فرمایا وہ صبح ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے **والصبح اذا تنفس** "صبح کی قسم جب وہ سانس لے (روشن ہو جائے)" پوچھا وہ کون سی قبر ہے جو صاحب قبر کے ساتھ گھومتی پھرتی رہی فرمایا وہ مچھلی ہے جس کے شکم میں حضرت یونس علیہ السلام رہے۔

آپؑ سے پوچھا گیا کہ وہ کون ہے جس پر بہتان باندھا گیا لیکن وہ نہ انسان ہے اور نہ جن فرمایا کہ وہ بھیڑیا ہے جس پر حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جھوٹ باندھتے ہوئے کہا کہ **فاکلہ الذئب** (اسے بھیڑیا کھا گیا)۔

پوچھا گیا کہ وہ کون ہے جس کا شمار نہ انسانوں میں ہوتا ہے اور نہ جنوں میں اور اس پر وحی نازل ہوئی فرمایا وہ شہد کی مکھی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے **واوحی ربک الی النحل**۔ (تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی)

پوچھا گیا کہ وہ مبعوث ہونے والا کون ہے جو نہ جن و انس میں سے ہے اور نہ ملائکہ و شیاطین میں سے۔ فرمایا وہ کوا ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے **فبعث اللہ غرابا** "خدا نے ایک کوے کو بھیجا"

پوچھا گیا کہ وہ رسول کون ہے جو نہ انسانوں اور جنوں میں سے ہے اور نہ فرشتوں اور شیطانوں میں سے فرمایا وہ ہد ہد ہے جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا **اذھب بکتابی ھذا فالقہ الیھم** "ہمارا یہ خط لے کر جا اور ان لوگوں کے آگے ڈال دے"

کعب احبار نے پوچھا کہ وہ کون ہے جس کا کوئی باپ نہیں اور وہ کون ہے جس کا کوئی قوم و قبیلہ نہیں اور وہ کون ہے جس کا کوئی قبلہ نہیں فرمایا جس کا کوئی باپ نہیں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور جس کا کوئی قبیلہ نہیں وہ

حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور جس کا کوئی قبلہ نہیں وہ خانہ کعبہ ہے۔

ایک شخص نے پوچھا کہ بہترین چیز جو اللہ نے خلق کی ہے کیا ہے۔ فرمایا کلام پھر پوچھا کہ بدترین چیز کیا ہے فرمایا کلام مقصد یہ ہے کہ اچھی بات سے اچھی کوئی چیز نہیں اور بری بات سے بری کوئی چیز نہیں۔

ایک شخص نے پوچھا کہ وہ دو بھائی کون تھے جو ایک دن پیدا ہوئے اور ایک دن مرے۔ ان میں سے ایک کی عمر پچاس برس تھی اور دوسرے کی عمر ڈیڑھ سو برس تھی فرمایا وہ دو بھائی عزیر اور عزرہ تھے اللہ نے عزیر کو سو سال مردہ رکھا اور پھر اسے جلایا جیسا کہ قرآن مجید میں ہے **فاماته الله مائته عام ثم بعثه** (خدا نے اسے موت دی اور سو برس تک مردہ رکھا پھر اسے زندہ اٹھایا)

پوچھا گیا کہ وہ باپ اور بیٹا کون سے ہیں کہ باپ کی عمر کم اور بیٹے کی عمر زیادہ ہے فرمایا وہ عزیر اور ان کے فرزند ہیں۔ چنانچہ جب اللہ نے عزیر کو سو سال مردہ رکھنے کے بعد زندہ کیا تو اس وقت ان کی عمر چالیس سال تھی اور ان کے بیٹے کی عمر ایک سو بیس سال ہو چکی تھی۔

ایک شخص نے پوچھا کہ سنت، بدعت، جماعت اور فرقہ کے معانی کیا ہیں فرمایا

السنته ماسن رسول الله صلے الله علیه و آله والبدعته ما احدث بعده والجماعته اهل الحق وان کانوا قلیلا والفرقه اهل الباطل وان کانوا کثیرا۔ (معانی الاخبار)

سنت وہ ہے جس کا اجراء رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ نے (اپنے قول و عمل سے) کیا اور بدعت یہ ہے کہ اپنی طرف سے کوئی چیز ایجاد کر لی جائے اور جماعت سے مراد اہل حق کی جماعت ہے اگرچہ وہ کم ہو اور فرقہ سے مراد اہل باطل کا گروہ ہے اگرچہ وہ کثرت میں ہو۔

ابو سعید خدری نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی یہ حدیث بیان کی۔

لایبقی علی وجه الارض بعد مائته الامات۔(مروج الذهب ج ۱ ص ۴۱۲)

ایک صدی کے بعد روئے زمین پر ایک بھی زندہ باقی نہیں رہے گا۔

لوگ اس حدیث کو سن کر پریشان ہو گئے۔ حضرتؑ سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا کہ ابو سعید نے صحیح بیان کیا ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ سو برس کے بعد زمین آدمیوں سے خالی ہو جائے گی بلکہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دیکھا ہے ایک صدی کے بعد ان میں سے ایک بھی باقی نہیں رہے گا۔

ایک دہریہ نے حضرتؒ سے کہا کہ مسلمانوں کا یہ نظریہ ہے کہ کافر آگ میں جلتا ہے۔ یہ میرے پاس کافر کی ہڈی ہے مگر اس میں ذرا بھی تو تپش نہیں ہے آپ نے چقماق طلب کیا اور رگڑ کر اس میں سے آگ نکالی پھر وہ پتھر اسے دیا اور کہا کہ اسے چھو کر دیکھو یہ بظاہر ٹھنڈا ہے مگر اس کے اندر آگ بھری ہوئی ہے۔

خطابی و اقناعی جوابات

امیرالمومنین علیہ السلام کے بعض جوابات کی نوعیت خطابی و اقناعی ہوتی تھی۔ ایسے جوابات کا موقع و محل وہاں ہوتا ہے جہاں تحقیقی و تفصیلی جواب سائل کی ذہنی سطح سے بلند تر ہو اور اسے ایک لطیف و شگفتہ جواب دے کر اس کی ذہنی تسکین کا سامان کرنا مقصود ہو۔ چنانچہ اس قسم کے جوابات دلاویز و خوش آئند ہونے کی وجہ سے فوراً ذہن میں اتر جاتے ہیں اور سائل کو بڑی حد تک مطمئن کر دیتے ہیں۔ حضرتؑ کے اس قسم کے چند جوابات درج کئے جاتے ہیں جو اقناعی ہونے کے باوجود حقیقت و واقعیت سے الگ بھی نہیں ہیں۔

آپؑ سے پوچھا گیا کہ اگر کسی شخص کو گھر میں بند کر دیا جائے اور وسائل معاش روک دئے جائیں تو اس کی روزی کدھر سے آئے گی۔ فرمایا جدھر سے اس کی موت آئے گی۔ مطلب یہ ہے کہ روزی رسان ظاہری اسباب و ذرائع کا محتاج نہیں ہے جو ذات پتھر اور ریشم کی تاروں میں لپٹے ہوئے کیڑے کی روزی کا سامان کرتی ہے وہ انسان کی رزق رسانی کا بھی سامان کر سکتی ہے اگرچہ بظاہر رزق کے دروازے مسدود ہوں۔

پوچھا گیا کہ خداوند عالم اس ان گنت مخلوق کا حساب کیونکر لے گا۔ فرمایا جس طرح مخلوق کے ان گنت ہونے کے باوجود اسے روزی دیتا ہے۔ پھر پوچھا گیا کہ وہ حساب کیونکو لے گا جبکہ انسان اسے دیکھے گا نہیں۔ فرمایا جس طرح انہیں روزی دیتا ہے اور وہ اسے دیکھتے نہیں۔

پوچھا گیا کہ پانی کا ذائقہ کیا ہے فرمایا **طعم الحیاہ** "جو زندگی کا ذائقہ ہے"

پوچھا گیا کہ مشرق و مغرب کے درمیان کتنا فاصلہ ہے فرمایا جتنا سورج ایک دن میں طے کرتا ہے۔

پوچھا گیا کہ زمین و آسمان کا درمیانی فاصلہ کتنا ہے فرمایا اتنا کہ آنکھ اسے طے کر سکے اور مظلوم کی دعا وہاں تک پہنچ سکے۔ اس سوال کا جواب اس سے بہتر نہیں ہو سکتا اس لئے کہ زمین و آسمان کا فاصلہ اس وسیع کائنات کے حدود تک پھیلا ہوا ہے جس کی حد بندی تو ہو نہیں سکتی البتہ ایک مظلوم کی دعائے مستجاب اس کی وسعتوں پر چھا سکتی ہے۔ کیونکہ دعا کو شرف قبولیت بخشنے والا اس کائنات پر محیط ہے۔ حضرتؑ کے اس ارشاد میں کہ "آنکھ اسے طے کر لے" آسمان کے حد نظر ہونے کا بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔

پوچھا گیا کہ جھوٹ اور سچ میں کتنا فاصلہ ہے فرمایا چار انگلیوں کا (یعنی کان اور آنکھ کا درمیانی فاصلہ) مطلب یہ ہے کہ ہر سنی سنائی بات پر اس وقت تک اعتماد صحیح نہیں ہے جب تک قابل اعتماد ذرائع سے اس کا علم و یقین نہ ہو جائے۔

کعب ابن اشرف نے کہا کہ قرآن مجید میں ہے **وجنته عرضها السموات والارض** "جنت کی وسعت آسمان و

زمین کے برابر ہے" تو پھر دوزخ کہاں پر ہے فرمایا۔

اذا جاء اللیل این یکون النهار و اذا جاء النهار این یکون اللیل۔ جب رات آتی ہے تو دن کہاں ہوتا ہے اور جب دن آتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے۔

کہا اللہ کے علم میں فرمایا کہ پھر جنت بھی اللہ کے علم میں ہے۔

حاضر جوابی

حاضر جوابی انسان کی فطری ذہانت کی آئینہ دار ہے اور برجستہ و برعمل جواب سوچ بچار کے بعد دئے جانے والے جواب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے اگرچہ اس میں مخاطب کی بات کی ایک طرح سے تردید ہوتی ہے مگر جواب کی شگفتگی و برجستگی ناگواری کا احساس نہیں ہونے دیتی اور مخاطب بھی خندہ زیر لب کے ساتھ داد تحسین دیئے بغیر نہیں رہتا۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے **نعم الناصر الجواب الحاضر** "برجستہ جواب بہترین مددگار ہے"

امیرالمومنین علیہ السلام کے گوناگوں خصوصیات میں ایک حاضر جوابی بھی ہے۔ آپؑ خوش طبعی کے موقع پر خوش طبعی کے انداز میں اور طنز کے موقع پر طنزیہ انداز میں ایسا نپا تلا جواب دیتے جو اپنی دلآویزی سے بہار آفریں فضا پیدا کر دیتا یا سننے والوں کی زبانوں پر خاموشی کا پہرہ بٹھا دیتا۔ ذیل میں حضرتؑ کے چند جوابات درج کئے جاتے ہیں جن سے آپؑ کے ذہنی استحضاء اور طبعی شگفتگی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ایک یہودی عالم نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مسلمانوں کے طرز عمل پر اعتراض کرتے ہوئے حضرتؑ سے کہا کہ **مادفنتم نبیکم حتی اختلفتم فیه** (تم لوگ اپنے نبی کو دفن بھی نہ کر چکے تھے کہ ان کے بارے میں اختلاف شروع کر دیا) حضرت نے فرمایا **انما اختلفنا عنه لا فیه** (ہم نے ان کے بارے میں اختلاف نہیں کیا بلکہ ان کی نیابت کے سلسلہ میں اختلاف ہوا) پھر فرمایا کہ تمہاری حالت یہ تھی کہ جب تمہیں مصر سے نکالا گیا اور ابھی تمہارے پیر دریا کی تری سے سوکھنے نہ پائے تھے کہ تم بے راہ ہو گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ۔

اجعل لنا الها کمالهم الهته فقال انکم قوم تجهلون۔ ہمارے لئے بھی ایک ایسا خدا بنا دیجئے جیسے ان لوگوں کے خدا ہیں اس پر موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ بیشک تم ایک جاہل قوم ہو۔

اس یہودی کا مقصد تو یہ تھا کہ مسلمان یہودیوں پر تو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے شریعت میں تغیرو

تبدل کر کے اختلافات کی بنیاد رکھی مگر مسلمان کب اختلاف سے بچ سکے ان میں تو نبی کے دفن ہونے سے پہلے ہی اختلاف و نزاع کی صورت پیدا ہو گئی۔ حضرتؑ نے اسے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ اولا" تو یہ اختلاف نبی کی نبوت و صداقت کے بارے میں نہ تھا بلکہ ان کی نیابت کے سلسلہ میں پیدا ہوا اور تم نے تو اپنے نبی کی زندگی ہی میں بے راہروی اختیار کر لی اور توحید سے منحرف ہو کر موسیٰ علیہ السلام سے یہ فرمائش کرنے لگ گئے کہ جیسے اور لوگوں کے پاس پرستش کے لئے بت ہیں ہمارے لئے بھی ویسا بت بنا دیجئے۔ جس پر تمہارے ہی نبی نے تمہیں شریعت سے بے خبراور دین کی روح سے نا آشنا کہا۔

ایک مرتبہ حضرت عثمانؓ نے آپؑ سے کہا کہ ابوبکرؓ و عمرؓ دونوں آپؑ سے بہتر تھے۔ فرمایا بہتر کیونکر ہو سکتے ہیں جبکہ **عبدت الله قبلهما و عبدته بعدهما** "میں نے ان دونوں سے پہلے اللہ کی عبادت کی اور ان کے بعد بھی مصروف عبادت ہوں" مقصد یہ ہے کہ معیار فضیلت ایمان و عمل ہے۔ میں ایمان میں سابق ہوں اور عمل کے لحاظ سے میرا زمانہ طویل ہے۔

ایک شخص نے آپ سے کہا کہ **ما اقصر سیفک** "آپ کی تلوار کتنی چھوٹی ہے" حضرت نے اسے یہ جواب دے کر خاموش کر دیا کہ **اطوله بخطوه** "میں قدم آگے بڑھا کر اسے طویل کر لیا کرتا ہوں"

ایک شخص نے جو بظاہر دوست اور بباطن آپؑ سے عناد رکھتا تھا آپؑ کی بڑھ چڑھ کر مدح اور توصیف کی تو فرمایا **انادون ماتقول وفوق مافی نفسک** "جو تمہاری زبان پر ہے میں اس سے کم ہوں اور جو کچھ تمہارے دل میں ہے اس سے زیادہ ہوں"

ایک مرتبہ آپؑ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے درمیان چل رہے تھے ان دونوں کا قد حضرتؑ کے قد سے نکلتا ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ نے آپؑ کے قد پر طنز کرتے ہوئے کہا **یا علی انت فینا بمنزله النون فی لنا** "اے علی علیہ السلام آپ ہم دونوں کے درمیان اس طرح ہیں جیسے لنا میں نون" حضرت نے فورا" جواب دیا **لو لا انا بینکما لکنتمالا** "اگر میں تم دونوں کے درمیان نہ ہوتا تو تم لا ہوتے" مطلب یہ ہے کہ جس طرح لنا میں سے نون نکال لیا جائے تو لا باقی رہ جاتا ہے اسی طرح میں الگ ہو جاؤں تو تم لاشے ہو کر رہ جاؤ گے۔

ایک مرتبہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی علیہ السلام اور چند صحابہ کھجوریں کھا رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھجوریں کھاتے اور گٹھلیاں حضرت علی علیہ السلام کے سامنے رکھ دیتے۔ آپ کی دیکھا دیکھی صحابہ نے بھی گٹھلیاں آپ کے آگے ڈھیر کرنا شروع کر دیں۔ جب فارغ ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے زیادہ کھجوریں کس نے کھائی ہیں۔ صحابہ نے کہا **من اکثر نواته فهوا کول** "جس کے آگے گٹھلیاں زیادہ ہیں اسی نے زیادہ کھجوریں کھائی ہیں" حضرت علی علیہ السلام نے کہا **یا لا من اکله مع النواه فهوا**

کول "ایسا نہیں بلکہ جس نے گٹھلیوں سمیت کھجوریں کھائیں وہ زیادہ کھانے والا ہے"

اخبار غیبیہ

انبیاء و آئمہ کا علم دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک عادی و اکتسابی اور دوسرا موہبی والہامی۔ علم عادی وہ ہے تعلم جو عام ذرائع و اسباب کے تابع ہوتا ہے جیسے مشاہدہ یا عادل افراد کی گواہی سے کسی واقعہ کا علم اور علم موہبی وہ ہے جو وحی و الہام اور القائے ربانی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اس علم میں تعلیم و اکتساب کا قطعاً" دخل نہیں ہے بلکہ یہ موہبہ الٰہی اور عطیہ خداوندی ہے۔ علم اکتسابی جنبۂ بشریت سے تعلق رکھتا ہے اور علم موہبی مقام نبوت و عصمت سے وابستہ ہے۔ اسی علم کے ذریعہ انبیاء و آئمہ امور غیبیہ پر مطلع ہوتے اور پیش آئند واقعات کی خبر دیتے ہیں۔ اگرچہ قرآن مجید میں علم غیب کو ذات الٰہی سے مختص کیا گیا۔ ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔

قل لا یعلم من فی السموات والارض الغیب الا اللہ۔

کہہ دو کہ اللہ کے علاوہ زمین و آسمان میں بسنے والوں میں سے کوئی بھی غیب نہیں جانتا۔

مگر دوسرے مقام پر پسندیدہ و برگزیدہ رسولوں کا استثناء بھی موجود ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے۔

عالم الغیب فلا یظھر علی غیبہ احدا الا من ارتضی من رسول۔

وہی غیب کا جاننے والا ہے اور اپنے غیب کی باتوں کو کسی پر ظاہر نہیں کرتا مگر جس پیغمبر کو وہ پسند کرے۔

اس سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ علم غیب ذات باری سے بایں معنی مختص ہے کہ اس کا علم مستقلاً" اور بالذات ہے اور پسندیدہ رسولوں کو ذاتی طور پر امور غیبیہ کا علم نہیں ہوتا بلکہ خداوند عالم کے بتانے اور وحی و الہام کے ذریعہ آگاہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ جب اللہ اپنے رسولوں کو پردہ غیب میں چھپے ہوئے امور سے آگاہ کرتا ہے تو اس میں بھی کوئی استبعاد نہ ہونا چاہیئے کہ آئمہ و خاصان خدا بھی پیغمبر کی تعلیم اور القاو الہام کے ذریعہ غیب کی باتوں سے باخبر ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام نے زمانہ آئندہ میں رونما ہونے والے حوادث و واقعات کے سلسلہ میں جو پیشین گوئیاں فرمائی ہیں وہ اس امر کا روشن ثبوت ہیں کہ آپ کے علم و ادراک کا ذریعہ صرف ظاہری حواس نہ تھے بلکہ وارث علم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے کے اعتبار سے ان امور پر بھی اطلاع رکھتے تھے جو دائرہ محسوسات سے باہر اور پردہ غیب میں نہاں تھے اور اسی علم سے مستقبل میں واقع ہونے والے امور کا انکشاف کرتے تھے۔ البتہ عام معاملات زندگی میں متعارف طریقوں سے حاصل ہونے والے علم پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ اب امیرالمومنین علیہ السلام کی ان گنت پیشین گوئیوں میں سے چند پیشین گوئیاں درج کی جاتی ہیں۔ جس سے یہ امر واضح ہو جائے گا کہ آپؑ مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات پر مشاہدات و محسوسات کی طرح نظر رکھتے تھے۔

عبداللہ ابن رزین غافقی نے بیان کیا کہ۔

سمعت علیا یقول یا اھل العراق مستقتل منکم سبعتہ نضر بعد زاء مثلھم کمثل اصحاب الاخدود فقتل حجر و اصحابہ (البدایہ و النہایہ ج ۸ ص ۵۵)

میں نے حضرت علی علیہ السلام کو فرماتے سنا کہ اے اہل عراق تم میں سے سات آدمی عنقریب مرج عذراء میں قتل کئے جائیں گے ان کی مثال اصحاب اخدود کی ہو گی۔ چنانچہ حجر اور ان کے اصحاب قتل کئے گئے۔

حجر ابن عدی کندی جو حجر الخیر اور حجر الادبر کے نام سے بھی یاد کئے جاتے ہیں اپنے بھائی ہانی ابن عدی کے ہمراہ مدینہ آئے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں باریاب ہو کر اسلام لائے۔ آپ کا شمار افاضل صحابہ میں ہوتا ہے۔ زہد و تقویٰ میں نمایاں امتیاز رکھتے اور امیرالمومنین علیہ السلام کے خواص اصحاب میں محسوب ہوتے تھے۔ جمل و صفین کی جنگوں میں حضرتؑ کے ہمرکاب رہے اور ہر معرکہ میں پوری سرگرمی سے حصہ لیا۔ امیرالمومنین علیہ السلام اور ان کی اولاد کی محبت رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی اور اسی محبت و وابستگی کی بنا پر اموی کارندوں کے مظالم کا نشانہ بنے اور آخر بے جرم و خطا قتل کر دئے گئے۔

اموی عمال کا وتیرہ تھا کہ وہ علانیہ حضرت علی علیہ السلام اور ان کی اولاد پر سب و شتم کرتے تھے اور یہی ہدایات انہیں مرکز کی طرف سے دی جاتی تھیں۔ چنانچہ معاویہ نے جب مغیرہ ابن شعبہ کو کوفہ کا حاکم بنا کر بھیجنا چاہا تو اسے بلا کر کہا کہ۔

ولست تارک ایصاء ک بخصلہ لا تترک شتم علی و ذمہ والترحم علی عثمان والاستغفار لہ والعیب لا صحاب علی والا قصاء لھم والا طراء بشیعہ عثمان والا دناء لھم۔ (تاریخ کامل ج ۳ ص ۲۳۴)

میں ایک بات تمہیں کہے بغیر نہیں رہ سکتا وہ یہ کہ تم علی علیہ السلام پر سب و شتم اور ان کی مذمت اور عثمان کے لئے دعائے رحمت و مغفرت کو اپنا معمول بنانا اور اس کے ساتھ علی علیہ السلام کے دوستوں کی خوردہ گیری اور انہیں دور رکھنے اور عثمان کے ہمنواؤں کی مدح سرائی اور انہیں قریب تر کرنے کو کسی صورت میں ترک نہ کرنا۔

مغیرہ نے کوفہ پہنچ کر ہر خطبہ میں علی علیہ السلام و آل علی علیہ السلام پر لعن طعن شروع کر دی۔ حجر اپنی عقیدت و ارادت کی بنا پر اسے گوارا نہ کر سکتے تھے۔ وہ اس دشنام طرازی کے خلاف احتجاج کرتے اور بھرے اجتماع میں مغیرہ کو ٹوک دیتے۔ مغیرہ، حجر ابن عدی سے "مصلحتہ" کوئی خاص تعرض تو نہ کرتا مگر اپنی روش سے دستبردار بھی نہ ہوتا۔ کچھ دربار رس لوگوں نے اسے مشورہ دیا کہ حکومت کی یہ نرم روی حکومت کے وقار کو مجروح کئے دے رہی

ہے لہٰذا ان کے خلاف تادیبی کاروائی کی جائے۔ مغیرہ نے کہا کہ میرے بعد جو شخص یہاں کا والی ہو کر آئے گا اگر اس سے بھی ان کا یہی طرز عمل رہا تو وہ انہیں قتل کئے بغیر نہیں رہے گا۔ مجھے ضرورت نہیں کہ میں ان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کروں۔ معاویہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اسے امارت کوفہ سے الگ کر دیا اور اس کی جگہ زیاد ابن سمیہ کا تقرر کر دیا۔

زیاد کا تقرر طوفان کا ایک پیش خیمہ تھا اس نے کوفہ میں وارد ہوتے ہی شیعیان علی علیہ السلام کو ڈرانا دھمکانا اور علی علیہ السلام و اولاد علی علیہ السلام کو سب و شتم کا ہدف بنانا شروع کر دیا۔ حجر اسے بھی ملامت کرنے سے نہ چوکتے اور غلط بات پر بے دھڑک ٹوک دیتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ زیاد نے خطبہ جمعہ کو اتنا طول دیا کہ نماز کا وقت تنگ ہو گیا۔ حجر نے اسے نماز کی طرف متوجہ کیا مگر اس نے خطبہ جاری رکھا۔ حجر نے دیکھا کہ نماز کا وقت گزرا جا رہا ہے تو وہ نماز کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے ساتھ اور لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ زیاد نے اس صورت حال سے معاویہ کو آگاہ کیا اور حجر کے بارے میں ان کی رائے طلب کی۔ معاویہ نے جواب دیا کہ انہیں پابند سلاسل کر کے دمشق روانہ کردو ۔ زیاد تو چاہتا ہی تھا کہ ان سے پیچھا چھوٹے۔ فوراً چند آدمی ان کی طلبی کے لئے بھیجے۔ جب یہ آدمی حجر کے ہاں پہنچے اور انہیں زیاد کے پاس چلنے کے لئے کہا تو حجر کے ساتھیوں نے کہا کہ ہم زیاد کے حکم کی کوئی حیثیت و وقعت نہیں سمجھتے۔ حجر کسی صورت میں اس کے ہاں نہیں جائیں گے۔ جب یہ لوگ ناکام پلٹے تو زیاد نے دوبارہ سپاہیوں کو بھیجا جنہوں نے حجر کے ساتھیوں پر لاٹھیاں برسا کر کئی ایک کو زخمی کر دیا۔ حجر نے جب گرفتار کرنے والوں کی کثرت و قوت دیکھی تو گھر کا رخ کیا جہاں ان کے اور ساتھی بھی جمع ہو گئے۔ زیاد کے آدمی یہاں بھی پہنچ گئے۔ حجر کے ساتھیوں نے کچھ دیر ان کا مقابلہ کیا مگر زیادہ دیر تک یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔ آخر بچ بچا کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ صرف قیس ابن یزید حکومت کی گرفت میں آگئے۔ حجر نے اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر کہ تم اس جمعیت کا مقابلہ نہیں کر سکتے رخصت کر دیا اور خود محلہ بنی حرب کی طرف چلے گئے اور سلیم ابن یزید کے گھر میں پناہ لے لی۔ زیاد کے سپاہیوں کو خبر ہوئی تو انہوں نے ادھر کا رخ کیا۔ سلیم نے انہیں بڑھتے دیکھا تو تلوار سونت کر مقابلہ کے لئے آمادہ ہو گئے۔ حجر نے انہیں روکا اور کہا کہ خدا تمہیں اس حمایت و پاسداری کی جزا دے تم یہ کرو کہ اگر یہاں سے نکل جانے کا کوئی مخفی راستہ ہو تو مجھے بتا دو تاکہ میں ادھر سے نکل جاؤں اور میری وجہ سے تم پر کوئی افتاد نہ پڑے۔ چنانچہ حجر ایک مخفی راستے سے نکلے اور قبیلہ بنی نخع کے ہاں پہنچ کر عبداللہ ابن حارث نخعی کے گھر میں داخل ہوئے اور وہیں ٹھہر گئے۔ مگر زیاد کے سپاہی سن گن پا کر یہاں بھی پہنچ گئے۔ حجر کو خطرہ منڈلاتا نظر آیا تو وہ رات کے اندھیرے میں قبیلہ بنی ازد کے ہاں پہنچ کر ربیعہ ابن ناجد ازدی کے گھر میں چلے آئے اور سپاہی انہیں ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

زیاد جب بے دست و پا ہو گیا تو اس نے محمد ابن اشعث کو بلا کر حکم دیا کہ جس طرح ہو سکے حجر کو تلاش کرو

اگر تم نے تین دن کے اندر اسے میرے سامنے پیش نہ کیا تو تم اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ حجر کو یہ معلوم ہوا تو انہوں نے محمد ابن اشعث کو پیغام بھجوایا کہ میں خود تمہارے پاس آنے کو تیار ہوں تاکہ تم مجھے زیاد کے سامنے پیش کر سکو مگر اتنا کرو کہ زیاد سے یہ عہد و پیمان لے لو کہ وہ مجھے امان دے اور معاویہ کے ہاں بھجوا دے پھر وہ جانیں اور ان کا کام۔ محمد ابن اشعث کو کچھ ڈھارس ہوئی اور وہ چند آدمیوں کو لے کر زیاد کے پاس آیا اور اس سے امان دینے اور معاویہ کے پاس بھجوانے پر رضا مند کر لیا۔ جب حجر کو اس امان دہی کی اطلاع دی گئی تو وہ زیاد کے پاس چلے آئے۔ زیاد نے انہیں کڑے تیوروں سے دیکھا اور کہا کہ میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ تمہاری شاہرگ کاٹ دوں۔ مگر مجھے اپنے عہد کا پاس ہے۔ اس کے بعد انہیں چند دن کے لئے قید خانہ میں رکھا اور پھر ان کے خلاف گواہیوں کا ایک پلندہ جمع کر کے شہاب ابن کثیر اور وائل ابن حجر کی زیر نگرانی انہیں دمشق روانہ کر دیا۔ ان گواہوں میں بیشتر وہ لوگ تھے جو حجر سے دشمنی و عناد رکھتے تھے اور کچھ لوگ وہ تھے جن کے نام خود سے درج کر دیئے گئے تھے۔ چنانچہ ان گواہوں میں شریح ابن ہانی حارثی کا بھی نام تھا۔ انہیں پتا چلا تو انہوں نے ایک خط معاویہ کے نام لکھا اور وائل ابن حجر کے ہاتھ معاویہ تک پہنچا دیا۔ خط یہ تھا۔

اما بعد فانہ بلغنی ان زیاد اکتب الیک بشھادتی علی حجر ابن عدی وان شھادتی علی حجر انہ ممن یقیم الصلوٰۃ ویوتی الزکوٰۃ و یدیم الحج والعمرہ یامر بالمعروف وینھی عن المنکر حرام الدم والمال فان شئت فاقتلہ وان شئت فدعہ۔ (تاریخ طبری ج ۴ ص ۲۰۴)

مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ زیاد نے حجر ابن عدی کے خلاف میری گواہی بھی تحریر کی ہے حجر کے بارے میں میری گواہی یہ ہے کہ وہ نماز گزار زکوٰۃ کے پابند اور برابر حج و عمرہ بجا لاتے رہتے ہیں وہ اچھی باتوں کا حکم دیتے اور بری باتوں سے روکتے ہیں ان کا خون بہانا اور مال چھیننا حرام ہے اب آگے آپ کی مرضی چاہے اسے قتل کریں چاہے چھوڑ دیں۔

جب حجر اور ان کے ساتھی دمشق سے چھ میل کے فاصلہ پر مرج عذراء میں پہنچے تو منزل کرنے کے لئے ٹھہر گئے۔ معاویہ کو ان کے گرفتار کر کے لائے جانے کی اطلاع ہو چکی تھی انہوں نے ہدبہ ابن فیاض قضاعی، حصین ابن عبداللہ کلابی اور ابو شریف البدی کو وہاں بھیجا جنہوں نے حجر اور ان کے ساتھیوں سے کہا کہ امیر معاویہ کے پاس ایسی ناقابل تردید شہادتیں پہنچی ہیں جن سے حکومت کے خلاف تمہاری بغاوت و سرکشی ثابت ہوتی ہے اور تمہارے قتل کے جواز میں کوئی شبہ نہیں رہتا لیکن۔

انا قدناء نا ان نعرض عليكم البرائہ من علی واللعن لہ فان فعلتم ترکنا کم وان ابیتم قتلنا کم۔ (تاریخ طبری ج ۴ ص ۲۰۵)

ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم تم سے علی علیہ السلام سے بیزاری اور ان پر لعنت کا مطالبہ کریں اگر تم ایسا کرو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں اور انکار کرو تو تمہیں قتل کر دیں۔

حجر اور ان کے ساتھیوں نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنی جانوں کے بچاؤ کے لئے امیرالمومنین علیہ السلام کے بارے میں کوئی ناسزا لفظ کہیں یا ان سے اظہار بیزاری کریں۔ اب انہوں نے موت کو سر پر منڈلاتے دیکھ کر مصلے بچھا دیئے اور تمام رات نمازوں میں گزار دی۔ جب صبح ہوئی تو معاویہ کے آدمیوں نے تلواریں نیاموں سے کھینچ لیں۔ حجر نے کہا کہ مجھے وضو اور دو رکعت نماز پڑھنے کی مہلت دی جائے جب مہلت ملی تو انہوں نے وضو کیا اور دو رکعت نماز پڑھی اور کہا کہ خدا کی قسم میں نے اپنی زندگی میں اتنی مختصر نماز کبھی نہیں پڑھی۔ میں چاہتا تھا کہ حسب معمول نماز کو طول دوں مگر اس خیال سے ایسا نہیں کیا کہ تم یہ نہ سمجھو کہ میں موت سے ڈر گیا ہوں میری وصیت یہ ہے کہ مجھے ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سمیت خاک و خون میں غلطاں دفن کیا جائے تاکہ میں کل اللہ کے روبرو اسی حالت میں معاویہ سے اپنے خون کا محاسبہ کروں۔ ہدبہ ابن فیاض قضاعی نے آپ کی گردن پر تلوار ماری کچھ دیر لاشہ تڑپا اور روح طیب جسد عنصری سے پرواز کر گئی۔ آپ کے ساتھیوں میں سے شریک ابن شداد حضرمی، صیفی ابن قیس شیبانی، قبیصہ ابن ضبیہ عبسی، محزر ابن شہاب منقری اور کرام ابن حیان غزی بھی شہید کئے گئے اور عبدالرحمن ابن حسان غزی کو قس ناطف میں زندہ گاڑ دیا گیا اور اس طرح امیرالمومنین علیہ السلام نے جو پیشین گوئی فرمائی تھی ۵۱ ھ میں معاویہ کے دور حکومت میں پوری ہوئی۔ حجر اور ان کے اصحاب کے بے گناہ قتل نے بہت سی آنکھوں کو اشکبار کیا اور خود معاویہ کو بھی اس قتل کی سنگینی اور پاداش عمل کا احساس تھا۔ چنانچہ جب اس کا وقت آخر آیا تو اس کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوئے۔

حجر تمہارے قتل سے میرا یوم حساب طویل ہو گا۔

ابو سالم میسم ابن یحیی تمار کے بارے میں فرمایا۔

انک توخذ بعدی و تصلب و تطعن بحربتہ فاذا کان الیوم الثالث ابتدر منخراک و فمک دما فتخضب لحیتکہ فانتظر ذلک الخضاب و تصلب علی باب

تم میرے بعد گرفتار ہو گے سولی پر لٹکائے جاؤ گے اور ایک بھالے سے تمہیں چھیدا جائے گا جب تیسرا دن ہو گا تو تمہارے دونوں نتھنوں اور منہ سے خون جاری

دار عمر و ابن حریث (اعلام الوری)

ہو جائے گا جس سے تمہاری ڈاڑھی رنگین ہو جائے گی لہٰذا اس خضاب کے منتظر رہو۔ تمہیں عمرو ابن حریث کے گھر کے دروازے پر سولی دی جائے گی۔

میثم کوفہ کے ایک تجارت پیشہ خاندان کے فرد تھے اور کھجوروں کے کاروبار کی وجہ سے تمار (خرما فروش) کہلاتے تھے آپ امیرالمومنین علیہ السلام کے ان تلامذہ و اصحاب میں شمار ہوتے ہیں جو اسرار امامت کے امین، تنزیل و تاویل قرآن کے عالم اور معارف دینی کے خزینہ دار تھے۔ ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے۔

کان میثم قد اطلعہ علی علیہ السلام علی علم کثیر و اسرار خفیہ من اسراء الوصیتہ۔ (شرح ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۲۱)

علی علیہ السلام نے میثم کو علوم کثیرہ اور وصیت کے مخفی اسرار پر مطلع کیا تھا۔

جب میثم نے امیرالمومنین علیہ السلام سے اپنے بارے میں شہادت کی خبر سنی تو کہا یا امیرالمومنین علیہ السلام مجھے کس جرم کی پاداش میں سولی پر لٹکایا جائے گا۔ فرمایا کہ تم سے مطالبہ کیا جائے گا کہ اگر جاں بخشی چاہتے ہو تو مجھ سے اظہار بیزاری کرو۔ کہا کہ میں ہر مصیبت سہہ لوں گا اور ہر ظلم و اذیت برداشت کر لوں گا مگر آپ سے اظہار بیزاری نہیں کروں گا۔

اگر سنگ جفا ریزد و گر تیر بلا بارد
دل از کویت نخواہم کند تاجاں در بدن دارم

جب ابن زیاد کے دور میں شیعیان علی علیہ السلام کا استیصال کیا جانے لگا تو جناب میثم کی تلاش شروع ہوئی اور ان کے میر محلّہ کو حکم دیا گیا کہ وہ انہیں گرفتار کر کے لائے۔ میر محلّہ کو معلوم ہوا کہ میثم حج کے لئے مکہ جا چکے ہیں اس نے ابن زیاد سے کہا کہ ان کی واپسی تک مجھے مہلت دی جائے جب وہ آئیں گے تو انہیں پیش کر دیا جائے گا۔ جب میثم حج سے فارغ ہو کر واپس آئے تو انہیں ابن زیاد کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے پوچھا کیا تم میثم ہو کہا ہاں میثم ہوں کہا کہ تم ابوتراب علیہ السلام سے اظہار بیزاری کرو۔ کہا کون ابو تراب کہا علی علیہ السلام۔ کہا کہ اگر میں ان سے اپنی نفرت و بیزاری کا اعلان نہ کروں تو پھر کیا ہو گا۔ کہا کہ تمہیں قتل کیا جائے گا۔ کہا کہ میرے مولا و آقا مجھے خبر دے گئے تھے کہ تمہیں عمرو ابن حریث کے گھر کے سامنے سولی دی جائے گی۔ میں اس ساعت کا منتظر ہوں۔ چنانچہ انہیں کچھ دن قید میں رکھ کر عمرو ابن حریث کے مکان کے سامنے سولی پر لٹکا دیا گیا۔ انہوں نے سولی پر سے کہنا شروع کیا کہ اے لوگو تم میں سے جو پیش آئند حوادث کے بارے میں امیرالمومنین علیہ السلام کی احادیث سننا چاہے وہ آئے۔ ابن زیاد کو معلوم ہوا تو اس نے حکم دیا کہ ان کے منہ پر لگام چڑھا دی جائے۔ چنانچہ لگام چڑھا دی گئی اور وہ

بولنے سے مجبور ہو گئے۔ جب سولی پر لٹکے تین دن گزر گئے تو ان کے منہ اور نتھنوں سے خون جاری ہو گیا۔ ڈاڑھی اور چہرہ خون سے رنگین ہو گیا اور اسی دن غروب آفتاب سے پہلے ان کی روح ملاء اعلیٰ کی طرف پرواز کر گئی۔ یہ واقعہ سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کے وارد عراق ہونے سے دس دن پہلے کا ہے۔

رشید ہجری سے فرمایا۔

کیف صبرک اذا ارسل الیک دعی بن امیہ فقطع یدیک و رجلیک ولسانک۔ (امالی شیخ)

اس وقت تمہارے صبر کی کیا حالت ہو گی جب بنی امیہ سے ملحق کیا ہوا ایک شخص تمہیں بلوا بھیجے گا اور تمہارے ہاتھ، پیر اور زبان کاٹے گا۔

رشید نے سنا تو کہا کہ اس کا ثمرہ تو پھر جنت ہی ہے فرمایا۔ ہاں۔

انت معی فی الدنیا والاخرۃ۔ (رجال کشی)

تم دنیا میں بھی میرے ساتھ رہے اور آخرت میں بھی میرے ساتھ ہو گے۔

آخر اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا وقت آیا اور ابن زیاد نے انہیں بلا کر کہا کہ تم علی علیہ السلام سے اپنی بیزاری کا اعلان کرو۔ انہوں نے کہا کہ میرے آقا مجھے یہ خبر دے گئے تھے کہ مجھ سے اظہار بیزاری کے لئے کہا جائے گا اور میرے انکار پر میرے ہاتھ پیر اور زبان کاٹ دی جائے گی۔ ابن زیاد نے کہا کہ میں ان کی بات کو سچا ثابت نہیں ہونے دوں گا۔ تمہارے ہاتھ پیر تو کاٹے جائیں گے مگر زبان نہیں کاٹی جائے گی۔ چنانچہ ان کے ہاتھ اور پیر کاٹ دئے گئے۔ جب انہیں اٹھا کر گھر میں لایا گیا تو ان کی بیٹی قنواء بنت رشید نے پوچھا کہ بابا آپ درد تو شدت سے محسوس کرتے ہوں گے۔ کہا کہ بس اتنا کہ جیسے کوئی ہجوم میں گھر کر رہ گیا ہو۔ پھر کہا کہ کاغذ قلم لاؤ میں تمہیں پیش آئند حوادث لکھوا دوں۔ ابن زیاد کو اس کی خبر دی گئی تو اس نے حکم دیا کہ ان کی زبان بھی کاٹ دی جائے۔ چنانچہ زبان بھی کاٹ دی گئی اور وہ اسی رات شہادت کی منزل پر فائز ہو کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ابوالعالیہ کہتے ہیں کہ مزرع ابن عبداللہ نے بیان کیا کہ انہوں نے حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو یہ کہتے ہوئے سنا۔

لیو خذن رجل فیقتلن ولیصلبن بین شرفتین من شرف ھذا المسجد۔ (بحارالانوار)

ایک شخص گرفتار ہو گا اور اس مسجد کے کنگروں میں سے دو کنگروں کے درمیان اسے سولی پر آویزاں کیا جائے گا۔

ابوالعالیہ کہتے ہیں کہ میں نے ان سے کہا کہ اب تو آپ غیب کی خبریں دینے لگے۔ کہا کہ میں نے اسے

امیرالمومنین علیہ السلام ایسے عظیم راز کو سے سنا ہے۔ ابوالعالیہ کہتے ہیں کہ ابھی ایک ہفتہ نہ گزرا تھا کہ مزرع گرفتار کر لئے گئے اور قتل کے بعد مسجد کے دو کنگروں کے درمیان سولی پر آویزاں کئے گئے۔

جویریہ ابن مسہر عبدی کے بارے میں فرمایا۔

لیقتلنک العتل الزنیم ولیقطعن یدک ورجلک ثم انہ لیصلبنک۔ (تنقیح المقال)

تمہیں ایک تند خو اور بد ذات قتل کرے گا اس طرح کہ پہلے تمہارے ہاتھ پیر کاٹے گا پھر تمہیں سولی پر لٹکائے گا۔

جویریہ امیرالمومنین علیہ السلام کے ثقہ و معتمد صحابی تھے۔ حضرت انہیں دیکھتے تو محبت و شفقت کا اظہار فرماتے اور سفر میں ہمرکاب رکھتے تھے۔ جب معاویہ کے دور اقتدار میں دوستداران آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مظالم توڑے جانے لگے اور شیعان علی علیہ السلام میں سے کسی کو شہربدر اور کسی کو قتل کیا جانے لگا تو زیاد ابن سمیہ نے جویریہ کے ہاتھ پیر کاٹے اور پھر ایک درخت کے تنے پر انہیں لٹکا دیا۔

عمرو ابن الحمق الخزاعی سے فرمایا۔

راسک اول راس یشھر فی الاسلام من بلد الی بلد۔ (تنقیح المقال)

اسلام میں تمہارا سر پہلا سر ہو گا جو ایک شہر سے دوسرے شہر میں پھرایا جائے گا۔

عمرو ابن حمق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بلند مرتبت صحابی اور حافظ احادیث و آثار تھے ان کا شمار امیرالمومنین علیہ السلام کے مخلص اور جانباز دوستوں میں ہوتا ہے۔ جنگ جمل و صفین اور نہروان میں حضرتؑ کے ہمرکاب رہ کر داد شجاعت دی۔ حضرتؑ فرمایا کرتے تھے۔

لیت ان فی شیعتی مائتہ مثلک۔ (تنقیح المقال)

کاش میرے شیعوں میں تم ایسے ۱۰۰ ہوتے۔

عمرو کوفہ میں سکونت پذیر تھے۔ جب زیاد ابن سمیہ نے حجر ابن عدی اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری کا حکم دیا تو آپ حجر کی طرف سے دفاع کرتے رہے اور اس پکڑ دھکڑ میں بکر ابن عبید کی لاٹھی سے زخمی ہو گئے۔ ابو سفیان ابن عویمر اور عجلان ابن ربیعہ انہیں عبداللہ ابن مالک کے گھر میں اٹھا لائے۔ آپ چند دن وہاں رہے پھر موصل چلے گئے۔ جہاں گرفتار کر کے حاکم موصل عبدالرحمن ثقفی کے سامنے پیش کئے گئے۔ اس نے انہیں پہچان لیا اور معاویہ سے ان کے بارے میں رائے طلب کی۔ معاویہ نے لکھا کہ عمرو عثمان کے قاتلوں میں سے ہے۔ لہٰذا اس پر اتنے وار کئے جائیں جتنے اس نے عثمان پر کئے تھے۔ چنانچہ ان پر نو وار کئے گئے حالانکہ وہ پہلے یا دوسرے وار میں دم توڑ چکے تھے۔ اس کے بعد حاکم موصل نے ان کا سر قطع کیا اور زیاد کے پاس بھجوا دیا۔ زیاد نے وہ سر معاویہ کے پاس بھیج دیا

اور اس طرح ان کا سر موصل سے کوفہ اور کوفہ سے دمشق تک پھرایا گیا۔ ابن قتیبہ نے تحریر کیا ہے۔

اول راس حمل من بلد الی بلد راس عمرو ابن الحمق الخزاعی۔ (المعارف ص ۲۴۱)

پہلا سر جو ایک شہر سے دوسرے شہر میں پھرایا گیا وہ عمرو ابن حمق خزاعی کا سر تھا۔

قنبر مضری کہتے ہیں کہ۔

لقد اخبرنی امیرالمومنین ان نیتی تکون ذبحا ظلما بغیر حق۔ (ارشاد شیخ مفید)

مجھے امیرالمومنین علیہ السلام نے خبر دی تھی کہ میری موت اس طرح ہو گی کہ میں تیغ جفا سے ناحق ذبح کیا جاؤں گا۔

قنبر قبیلہ مضر سے تعلق رکھتے تھے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کے جان نثار و وفادار غلام تھے ہمہ وقت حاضر خدمت رہتے اور آپؑ سے والہانہ محبت رکھتے تھے اور حضرتؑ بھی انہیں اولاد کی طرح سمجھتے اور اولاد کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ اس وابستگی کے جرم میں گرفتار کر کے حجاج شقی کے سامنے پیش کئے گئے۔ اس نے دیکھا تو کہا کہ تم علی علیہ السلام کے غلام قنبر ہو کہا کہ ہاں میں علی علیہ السلام کا غلام ہوں اور وہ میرے ولی نعمت تھے۔ کہا کہ تم ان کے دین سے علیحدگی اختیار کر لو۔ کہا کوئی ایسا دین بتاؤ جو ان کے دین سے بہتر ہو۔ کہا کہ میں بہرحال تمہیں قتل کروں گا۔ کہا کہ میں شہادت کے درجے پر فائز ہو کر سعادت ابدی حاصل کروں گا اور تم شقی و بدبخت قرار پاؤ گے کہا کہ یہ بتاؤ کہ تم کس طرح قتل ہونا پسند کرو گے۔ کہا کہ جس طرح تم چاہو مجھے قتل کرو اور یاد رکھو کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ چنانچہ ان کا گلا کاٹ کر ذبح کر دیا گیا۔

جب امیرالمومنین علیہ السلام صفین کی طرف جاتے ہوئے سر زمین کربلا سے گزرے تو حادثہ فاجعہ کربلا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

ھهنا مناخ رکابھم و ھهنا موضع رحالھم و ھهنا مھراق د مائھم فتیہ من آل محمد یقتلون بھذہ عرصہ تبکی علیھم السماء والارض۔ (صواعق محرقہ ص ۱۹۳)

اس سرزمین پر آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جوانوں کو قتل کیا جائے گا جن پر آسمان بھی روئے گا اور زمین بھی یہ جگہ ان کی سواریوں کی ہے اور یہ ان کے سازو سامان کی اور یہ مقام وہ ہے جہاں ان کا خون بہے گا۔

حادثہ کربلا اپنی نوعیت کے اعتبار سے تاریخ عالم کا منفرد واقعہ ہے جو ۶۱ ھ کے ماہ محرم کے پہلے عشرہ میں رونما ہوا۔ اور ہر سال ان دنوں میں اس معرکہ حق و باطل کی یاد تازہ کی جاتی ہے جو فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حسین علیہ السلام نے اپنی اور اپنے اعزہ و رفقاء کی قربانی سے سر کیا۔ ایک طرف بیعت پر اصرار تھا اور دوسری طرف

بیعت سے انکار۔ حسین علیہ السلام اور ان کے ہمراہیوں نے دشمن کی کثرت و قوت کو نظرانداز کر کے دل بادل فوجوں کے مقابلہ میں بیعت سے انکار کر دیا اور آخر دم تک اس انکار پر قائم رہے اور دنیا سے اپنی خود داری' استقامت اور اصول پرستی کا لوہا منوا لیا۔

امیرالمومنین علیہ السلام کی پیشین گوئی میں جن جوانان آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کا تذکرہ ہے تاریخ ان کی تعداد اٹھارہ بتاتی ہے۔ ان میں چھ امیرالمومنین علیہ السلام کے فرزند تھے سید الشہداء امام حسین علیہ السلام' ابو الفضل العباس' عبداللہ' جعفر' عثمان اور محمد الاصغر اور امام حسن علیہ السلام کے تین فرزند تھے قاسم' عبداللہ اور ابوبکر اور امام حسین علیہ السلام کے دو بیٹے تھے علی اکبر اور علی اصغر اور عقیل کے دو بیٹے تھے عبدالرحمن اور جعفر اور عبداللہ ابن جعفر کے دو فرزند تھے محمد اور عون اور مسلم ابن عقیل کے دو بیٹے تھے عبداللہ اور محمد اور ابو سعید ابن عقیل کے ایک فرزند تھے محمد ان کے علاوہ گنے چنے چند اصحاب تھے جنہوں نے خون آشام تلواروں کے سامنے گردنیں خم کر دیں مگر طاغوتی طاقت کے آگے سر تسلیم خم کرنا گوارا نہ کیا۔

اصبغ ابن نباتہ کہتے ہیں کہ سعد ابن ابی وقاص سے فرمایا۔

ان فی بیتک لسخلا یقتل الحسین ابنی۔

تمہارے گھر میں ایک بچہ ہے جو میرے فرزند حسین علیہ السلام کو قتل کرے گا۔

یہ بچہ عمر ابن سعد تھا جو ابن زیاد کے حکم سے چار ہزار کے لشکر کے ساتھ کربلا آیا اور امام حسین علیہ السلام اور ان کے رفقاء کے قتل سے اپنے جذبہ خون آشامی کی تسکین کی۔

سوید ابن غفلہ کہتے ہیں کہ ایک شخص حضرتؑ کے پاس آیا اور کہا کہ خالد ابن عرفطہ مر گیا ہے آپؑ اس کے لئے دعا فرمائیں۔ حضرتؑ نے فرمایا۔

انہ لم یمت ولا یموت حتی یقود جیش ضلالۃ صاحب لوائہ حبیب ابن جماز۔(ارشاد)

وہ نہیں مرا اور اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک وہ ایک ضلالت و گمراہی کے لشکر کی قیادت نہیں کرتا اس کے لشکر کا جھنڈا اٹھانے والا حبیب ابن جماز ہو گا۔

مجمع میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور کہا کہ یا امیرالمومنین علیہ السلام میں آپؑ کا دوست اور فرمانبردار ہوں۔ پوچھا تم کون ہو۔ کہا میں حبیب ابن جماز ہوں۔ فرمایا میں تمہیں متنبہ کئے دیتا ہوں کہ تم وہ جھنڈا نہ اٹھانا مگر تم اٹھاؤ گے اور باب الفیل کی طرف سے مسجد میں داخل ہو گے۔ چنانچہ جب ابن زیاد نے عمر ابن سعد کی قیادت میں کربلا کی جانب لشکر روانہ کیا تو خالد ابن عرفطہ مقدمتہ الجیش کا سردار اور حبیب ابن جماز حامل لواء تھا۔

اسمٰعیل ابن زیاد کہتے ہیں کہ ایک دن امیرالمومنین علیہ السلام نے براء ابن عازب سے فرمایا۔

یا براء یقتل ابنی الحسین وانت حی لا تنصرہ۔ (ارشاد)

اے براء میرا فرزند حسین علیہ السلام قتل کیا جائے گا اور تم زندہ ہو گے اور ان کی مدد نہیں کرو گے۔

چنانچہ براء ابن عازب بڑی حسرت و ندامت کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ امیرالمومنین علیہ السلام نے سچ فرمایا تھا حسین علیہ السلام شہید کر دئے گئے اور میں ان کی مدد کو نہ پہنچ سکا۔

امام علی بن موسیٰ الرضاؑ کے بارے میں فرمایا۔

سیقتل رجل من ولدی بارض خراسان بالسم ظلما اسمہ اسمی واسم ابیہ موسی ابن عمران۔ (امالی صدوق)

میری اولاد میں سے ایک فرد سرزمین خراسان میں زہر سے ظلماً مارا جائے گا اس کا نام میرے نام پر اور اس کے باپ کا نام موسیٰ ابن عمران کے نام پر ہو گا۔

علوی حکومت کے قیام کی آڑ میں اموی حکومت کا تخت الٹا گیا تو علویوں کے بجائے عباسیوں نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس کا طبعی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ علویوں کو یہ اقتدار کھٹکتا اور وہ حکومت سے متصادم ہوتے۔ چنانچہ عباسیوں کے خلاف بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب مامون رشید بر سر اقتدار آیا تو علویوں کی سرگرمیوں میں کمی واقع نہ ہوئی۔ اس نے علویوں کے جوش و خروش کو دبانے کے لئے امام علی الرضا علیہ السلام کو اپنے دارالخلافہ مرو میں آنے کی دعوت دی اور انہیں لانے کے لئے اپنے ماموں رجاء ابن ضحاک کو مدینہ بھیجا۔ امام مدینہ چھوڑنا نہ چاہتے تھے مگر جب مجبور کر دیئے گئے تو نیشا پور سے ہوتے ہوئے مرو میں تشریف فرما ہوئے۔ مامون نے بڑی سرگرمی سے استقبال کیا اور آپ کو ولیعہد سلطنت قرار دینے کا اظہار کیا۔ آپؑ نے اس سے بچنے کی پوری کوشش کی اور انکار پر انکار کرتے رہے۔ آخر اس کے انتہائی اصرار سے مجبور ہو کر چند شرائط کے ساتھ اسے منظور فرما لیا۔ آپ کے اعلان ولیعہدی سے علوی تو مطمئن ہو گئے مگر بنی عباس کو خلافت اپنے خاندان سے باہر جاتی نظر آئی تو انہوں نے بغداد میں ہنگامہ کھڑا کر دیا اور مامون کو معزول قرار دے کر ابراہیم ابن مہدی عباسی کی بیعت کر لی۔ اب مامون کے لئے دو طرفہ مصیبت تھی اگر اس اعلان ولیعہدی کو منسوخ کرتا ہے تو علویوں کی بغاوت کے ابھرنے کا اندیشہ ہے اور اگر برقرار رکھتا ہے تو عباسیوں کی شورش پر قابو پانا اس کے اختیار سے باہر ہے۔ اس نے یہ تدبیر سوچی کہ کسی طرح امام رضا علیہ السلام کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے اور اسے طبعی موت قرار دے کر علویوں کو خاموش رکھا جائے اور عباسیوں کو ہمنوا بنا لیا۔ جائے چنانچہ وہ بغداد جاتے ہوئے طوس کے قصبہ سنا آباد میں اترا اور امام علیہ السلام کو پیغام بھیجا کہ میں ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ آپؑ آئیں یا مجھے آنے کی اجازت دیں۔ امام علیہ السلام خود اس کے ہاں جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ جب اس کے ہاں پہنچے تو اس نے انگور جن میں زہر کی آمیزش تھی آپؑ کے سامنے پیش کئے۔ آپ نے کھانے سے

انکار کیا مگر اس نے اصرار کیا تو آپؑ نے چند دانے کھائے جن کے کھاتے ہی زہر کا احساس ہوا۔ آپؑ نے ہاتھ کھینچ لیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ مامون نے پوچھا کہ آپؑ کہاں جارہے ہیں فرمایا جہاں تم بھیجنا چاہتے تھے۔ جب اپنی قیام گاہ پر آئے تو حالت دگرگوں ہو گئی اور تین دن موت و حیات کی کشمکش میں رہنے کے بعد ۱۷ صفر ۲۰۲ھ کو پچپن برس کی عمر میں انتقال فرما گئے اور قریہ سنا آباد میں جواب مشہد الرضا علیہ السلام کے نام سے موسوم ہے دفن کئے گئے۔ دعبل خزاعی نے آپ کے مرثیہ میں کہا ہے۔

یا ارض طوس سقاک اللہ رحمتہ ماذا ضمنت من الخیرات یا طوس

اے سرزمین طوس خدا تجھے اپنی رحمت کے چھینٹوں سے سیراب کرے تو اپنے دامن میں نیکیوں کا خزانہ سمیٹے ہوئے ہے۔

طابت بقاعک فی الدنیا و طاب بھا شخص ثوی بسنا باد مرموس

دنیا جہاں میں تیری سرزمین کا کونا کونا پاک و صاف ہے اور وہ ہستی بھی طیب و طاہر ہے جو سنا آباد میں منزل گزیں اور مدفون ہے۔

معاویہ ابن ابی سفیان کے بارے میں فرمایا۔

الا وانہ سیامرکم کم بسبی والبراہ منی۔ (نہج البلاغہ)

وہ تمہیں حکم دے گا کہ مجھے گالیاں دو اور مجھ سے بیزاری کا اظہار کرو۔

چنانچہ معاویہ نے اپنے عمال سلطنت کو مامور کیا کہ وہ جمعہ و عیدین اور دوسرے اجتماعات میں حضرتؑ پر علانیہ سب و شتم کریں حالانکہ امام حسن علیہ السلام نے شرائط صلح میں ایک شرط یہ بھی رکھی تھی کہ کم از کم آپؑ کے روبرو حضرتؑ پر لعن طعن نہ کی جائے مگر اس کا پاس نہیں کیا گیا چنانچہ ابن اثیر تحریر کرتے ہیں کہ شرائط صلح میں ایک شرط یہ تھی کہ۔

ان لا یشتم علیا فلم یجبہ الی الکف عن شتم علی فطلب ان لا یشتم وھو یسمع فاجابہ الی ذالک ثم لم یف لہ بہ ایضا۔ (تاریخ کامل ج ۳ ص ۲۰۳)

وہ حضرتؑ کو گالی گلوچ نہ دے مگر وہ علی علیہ السلام پر سب و شتم سے دستبرداری پر آمادہ نہ ہوا پھر امام حسن علیہ السلام نے یہ خواہش کی کہ ان کے سامنے گالیاں نہ دی جائیں۔ معاویہ نے اس کا وعدہ کیا مگر اسے پورا نہ کیا۔

مروان ابن حکم کے بارے میں فرمایا۔

اما ان لہ امرہ کلعقتہ الکلب انفہ و ھوابو الا کبش الاربعتہ وستلقی الامتہ منہ ومن ولدہ یوماخمر (نہج البلاغہ)

دیکھو یہ بھی اتنی مدت کہ کتا اپنی ناک چاٹنے سے فارغ ہو حکومت کرے گا اور اس کے چار بیٹے بھی حکمران ہوں گے اور امت اس کے اور اس کے بیٹوں کے ہاتھوں سختیوں کے دن دیکھے گی۔

چنانچہ معاویہ ابن یزید کے مرنے کے بعد اہل شام نے جابیہ دمشق میں اس کی بیعت کی اور نو مہینے برسر اقتدار رہنے کے بعد مرگیا اور اس کے بیٹوں میں سے عبدالملک خلیفہ ہوا اور عبدالعزیز مصر' کا بشر کوفہ و بصرہ کا اور محمد جزیرہ کا والی قرار پایا اور اسی نے ابراہیم ابن مالک اشتر اور مصعب ابن زبیر کو دیر جاثلیق میں قتل کیا۔

عبداللہ ابن زبیر کے بارے میں فرمایا۔

خب ضب یروم امراو لا یدرکہ ینصب حبالتہ الذ ین لا صطیا و الدنیا وھو بعدمصلوب قریش۔ (بحار الانوار)

فریب کار اور جاہ طلب حکومت کے لئے تگ و دو کرے گا مگر اسے حاصل نہ کر سکے گا دنیا کا شکار کرنے کے لئے دین کا جال بچھائے گا اور آخر قریش کے ہاتھوں سولی پر لٹکایا جائے گا۔

عبداللہ ابن زبیر یزید کی بیعت سے انکار کرنے کے بعد مکہ میں آکر مقیم ہو گیا اور اقتدار کے لئے راہ ہموار کرنا شروع کر دی۔ جب یزید مر گیا تو اس نے کچھ لوگوں کے تعاون سے حجاز میں اپنی حکومت کا پرچم بلند کر دیا اور حجاز کے علاوہ یمن عراق اور خراسان کے باشندوں نے بھی اس کی بیعت کر لی لیکن بنی امیہ اور بنی ہاشم اس کی بیعت کے لئے آمادہ نہ ہوئے جس پر اس نے بنی امیہ کے سرکردہ افراد کہ جن میں مروان اور عبدالملک بھی شامل تھے مدینہ سے باہر نکال دیا اور محمد ابن حنیفہ' عبداللہ ابن عباس اور بنی ہاشم کے چوبیس نمایاں افراد کو قید خانہ میں بند کر دیا اور انہیں یہ دھمکی دی کہ اگر بیعت نہیں کریں گے تو انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ عبداللہ ابن زبیر بنی ہاشم کو اپنا حریف تصور کرتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ ان سے بیعت لئے بغیر اقتدار کی بنیادیں مستحکم نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ اس نے بیعت لینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور سارے جتن کر ڈالے۔ مگر بیعت کے حصول میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر سختی و تشدد پر اتر آیا اور ان پر مظالم توڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ابن واضح یعقوبی نے تحریر کیا ہے۔

تحامل عبداللہ ابن الزبیر علی بنی ہاشم تحاملا شدید او اظھر لھم العداوہ والبغضاء حتی بلاغ ذلک منہ ان ترک الصلواہ علی محمد فی خطبتہ۔ (تاریخ یعقوبی ج ۳ ص ۸)

عبداللہ ابن زبیر نے بنی ہاشم پر سخت مظالم توڑے اور علانیہ ان سے دشمنی کا مظاہرہ کیا اس کی دشمنی کی حد یہ تھی کہ اس نے خطبہ میں محمد صلی اللہ علیہ و آلہ پر درود ترک کر دیا۔

جب بنی ہاشم کو قید خانہ میں سختیاں جھیلتے کچھ عرصہ گزر گیا تو مختار ابن عبید نے ان کی مدد کے لئے چار ہزار سواروں کا ایک لشکر بھیجا جس نے قید خانہ کا دروازہ توڑ کر انہیں باہر نکالا۔ بنی ہاشم نے قید سے آزاد ہو کر ابن زبیر کے ارادوں کو ناکام بنانے کا تہیہ کر لیا ادھر مروان نے مدینہ سے نکل کر شام کا رخ کیا اور شام کے حدود میں پہنچ کر اپنی بیعت لینا شروع کر دی اور ابن زبیر کو ایک لمحہ کے لئے بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ مروان مر گیا تو اس کے بیٹے عبدالملک نے چالیس ہزار شامیوں کو حجاج ابن یوسف کی سرکردگی میں روانہ کیا۔ جنہوں نے مکہ کو محاصرہ میں لے لیا اور آمد و رفت کے تمام راستے بند کر دئے۔ ابن زبیر نے اپنے لشکر کی صف بندی کی اور مقابلہ کے لے میدان میں اتر آیا۔ جب اس کے ساتھیوں نے دشمن کی کثرت و قوت دیکھی تو کچھ میدان سے منہ موڑ کر گھروں میں چھپ کر بیٹھ گئے اور کچھ لوگوں نے حجاج کے دامن میں پناہ لے لی۔ ابن زبیر نے اپنے باقی ماندہ لشکر کی ہمت بندھائی اورا سے جنگ میں جھونک دیا۔ دونوں فریق میں خونریز جنگ ہوئی۔ میدان لاشوں سے پٹ گیا ابن زبیر قتل کر دیا گیا اورا س کی بچی کھچی فوج تتر بتر ہو گئی۔ عبدالملک کے آدمیوں نے اس کی لاش کو مقام تنعیم میں سولی پر لٹکا دیا جو کئی دنوں تک لٹکی رہی۔ ایک دن عبداللہ ابن عمر ادھر سے گزرے تو انہوں نے لاش سے مخاطب ہو کر کہا۔

یرحمک اللہ یا ابا خبیب لولا ثلث کن فیک لقلت انت انت الحادک فی الحرم وسساد عتک الی الفتنۃ و بخل بکفک۔ (تاریخ یعقوبی ج ۳ ص ۱۴)

اے ابا خبیب اللہ تم پر رحم کرے اگر تم میں تین باتیں نہ ہوتیں تو میں یہ کہتا کہ تم تم ہی ہو ایک یہ کہ تم نے حرم میں الحاد و بے دینی کا ارتکاب کیا دوسرے فتنہ کی طرف تیزی سے بڑھے اور تیسرے کنجوسی کرتے رہے۔

ایک شخص نے آپؑ پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ آپؑ نے مال کی تقسیم میں عدل و مساوات کا اصول پیش نظر نہیں رکھا۔ فرمایا کہ اگر تم جھوٹ کہتے ہو تو اللہ اس وقت تک تمہیں موت نہ دے جب تک بنی ثقیف کا ایک شخص تمہیں اپنی گرفت میں نہ لے لے۔ لوگوں نے پوچھا کہ وہ کون ہے فرمایا۔

رجل لا یدع للہ حرمتہ الا انتھکھا۔ (احتجاج طبرسی)

وہ ایسا آدمی ہے جو ہر اس چیز کی بے حرمتی کا مرتکب ہو گا جو اللہ کے نزدیک عزت و حرمت رکھتی ہے۔

یہ حجاج ابن یوسف ثقفی تھا جس نے کوہ ابو قبیس پر منجنیق نصب کر کے خانہ کعبہ پر سنگباری کی اور شعائر اللہ کی توہین کا مرتکب ہوا اور مدینہ منورہ میں جابر ابن عبداللہ، انس ابن مالک، سہل ابن سعد اور دوسرے صحابہ کی تذلیل کے لئے ان کے ہاتھوں اور گردنوں کو گرم سیسہ سے داغا جس طرح ذمیوں کو داغا جاتا تھا اور اتنی خونریزیاں کیں کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جلال الدین سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

قد قتل من الصحابتہ و اکابر التابعین مالا یحصی فضلا عن غیر ھم۔ (تاریخ الخلفاء ص ۱۵۴)

اس نے اتنے صحابہ اور بزرگ تابعین قتل کئے کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا ہے چہ جائیکہ دوسرے مقتولین کا شمار ہو سکے۔

نضر ابن شمیل کہتے ہیں کہ۔

بسمعت ھشاما یقول احصبوا امن قتل الحجاج صبرا فوجدوھم ماہ وعشرین الفا۔ (عقد الفرید ج ۳ ص ۲۶۰)

میں نے ابن ھشام کو کہتے سنا کہ حجاج کے ان مقتولین کی تعداد جنہیں اس نے جکڑ (باندھ) کر قتل کیا ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔

حضرتؑ نے اپنے ایک خطبہ میں جسے علامہ مجلسی قدس سرہ نے بحار الانوار ج ۹۱ ص ۵۸۷ میں درج کیا ہے۔ حکومت عباسیہ کے قیام کی پیشین گوئی کی ہے اور خلفاء عباسین کے بعض نمایاں صفات و عادات کا تذکرہ فرمایا ہے چنانچہ ابوالعباس سفاح اور منصور دوانیقی کے بارے میں فرمایا۔

اولھم ارائفھم وثانیھم افتکھم۔

ان میں کا پہلا مہربان ہو گا اور دوسرا قاتل و سفاک۔

ابو العباس ۱۳۲ ھ میں بر سر اقتدار آیا اور چار سال آٹھ مہینے حکومت کرنے کے بعد ۱۳۶ ھ میں مر گیا اس کا یہ مختصر دور بنی امیہ کے استیصال اور مختلف بغاوتوں کے فرو کرنے میں گزرا۔ اس عرصہ میں بنی ہاشم سے کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ مصلحتہً ان سے حسن سلوک بھی کرتا رہا اور منصور نے اپنے اقتدار کے استحکام کے لئے بے دریغ خون بہایا اور جس کے متعلق بھی یہ شبہہ ہوا کہ وہ اس کے اقتدار کے لئے خطرہ ثابت ہو سکتا ہے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ خصوصاً حسنی سادات پر مظالم کے پہاڑ توڑے۔ کسی کو پابہ زنجیر، قید و بند میں رکھا اور کسی کو قتل کر کے اس کے سر کی تشہیر کی۔ چنانچہ عبداللہ المحض کے بیٹوں محمد اور ابراہیم کو گرفتار کرنے کے لئے لشکر بھیجا اور انہیں قتل کروانے کے بعد محمد کا سر مختلف شہروں میں پھرایا اور ابراہیم کا سر ان کے والد بزرگوار کے پاس جو قید خانہ میں زندگی گزار رہے تھے بھجوایا۔ جلال الدین سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

فقلتھا وجماعتہ کثیرہ من ل البیت فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ (تاریخ الخلفاء ص ۱۴۸)

منصور نے محمد و ابراہیم اور اہل بیتؑ کے کثیر افراد کو قتل کیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہارون رشید کے متعلق فرمایا۔

وخاسسھم کبثھم۔

ان میں کا پانچواں اونچے درجہ کا سردار ہو گا۔

ہارون رشید صاحب سطوت و جبروت تھا۔ اس نے جنگوں میں سرگرم عمل اور رومیوں سے بر سر پیکار رہنے

کے باوجود علوم و فنون کی ترقی میں حصہ لیا اور یونانی و سنسکرت زبان کی کتابوں کے عربی میں تراجم کرائے۔ رفاہ عامہ کے سلسلہ میں شفا خانے قائم کئے مگر ان خوبیوں کے باوجود امام موسی کاظم علیہ السلام کو زندان میں زہر سے شہید کر کے اپنے نامہ عمل کو سیاہ کیا۔

مامون رشید کے متعلق فرمایا۔

وسابعھم اعلمھم۔ ان میں کا ساتواں ان سب سے بڑھ کر عالم ہو گا۔

چنانچہ مامون فلسفہ تاریخ وقائع ایام فقہ اور فنون عربیہ میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ علمی مباحث میں دلچسپی لیتا اکابر علماء سے مختلف موضوعات پر مناظرے کرتا اور انہیں لاجواب کر دیتا۔ بلا شبہہ خلفاء میں اس سے بڑھ کر کوئی ذی علم نہ تھا۔ سیوطی نے لکھا ہے۔

ولم یل الخلافۃ من بنی العباس اعلم منہ۔ (تاریخ الخلفاء ص ۲۱۳) خلفاء بنی عباس میں اس سے بڑھ کر کوئی صاحب علم نہ تھا۔

مگر اس علم و فضل کے باوجود اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے امام رضا علیہ السلام کے خون سے اپنے دامن کو داغدار کیا۔

متوکل عباسی کے بارے میں فرمایا۔

عاشرھم الفرھم یقتلہ اخصھم بہ۔ ان میں کا دسواں بڑا کافر ہو گا اور اس کے قریبی لوگ ہی اسے قتل کریں گے۔

متوکل آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انتہائی بغض و عناد رکھتا تھا اور اسی دشمنی کی بنا پر اسے کافر کہا ہے۔ اسے نہ صرف اولاد علی علیہ السلام سے بغض تھا بلکہ جو انہیں دوست رکھتا تھا اسے زندہ نہ چھوڑتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اس نے یعقوب ابن السکیت سے جو علوم عربیہ کے امام اور اس کے بیٹوں کے معلم تھے۔ پوچھا کہ میرے بیٹے معتز اور موید تمہیں زیادہ عزیز ہیں یا فرزندان علی علیہ السلام حسن علیہ السلام و حسین علیہ السلام۔ انہوں نے کہا کہ حسن علیہ السلام و حسین علیہ السلام تو ایک طرف رہے میں علی علیہ السلام کے غلام قنبر کو بھی ان دونوں سے بہتر سمجھتا ہوں۔ یہ سننا تھا کہ متوکل کے تن بدن میں آگ لگ گئی اس نے ابن سکیت کی زبان گدی سے کھینچوا دی اور وہ تڑپ تڑپ کر جاں بحق ہو گئے۔ غرض اس نے دوستداران آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تذلیل اور سادات بنی فاطمہ علیہ السلام کی ایذا رسانی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ قبر سید الشہداء علیہ السلام کو منہدم اور اس پر ہل چلانے کا حکم دیا اور آپؑ کے مرقد کی زیارت سے مانع ہوا۔ علامہ سیوطی نے تحریر کیا ہے۔

امر بھدم قبر الحسین و ھدم ماحولہ من الدور وان یعمل مزارع وضع الناس من زیارتہ و خرب وبقی صحراء وکان المتوکل معروفا بالنصب۔ (تاریخ الخلفاء ص ۲۴۱)

اس نے حکم دیا کہ حسین (علیہ السلام) کی قبر اور جتنے گھر اس کے گرد و پیش ہیں سب گرا دئے جائیں اور ان پر کھیتی باڑی کی جائے اور لوگوں کو زیارت سے منع کیا یہاں تک کہ وہ جگہ منہدم ہو کر چٹیل میدان ہو گئی۔ متوکل آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دشمنی میں شہرت رکھتا تھا۔

متوکل کے اس اقدام سے عامہ مسلمین کے جذبات بھڑک اٹھے۔ ہر طرف سے اس پر لعن طعن کی بوچھاڑ ہونے لگی اور مسجدوں اور دیواروں پر اس کے خلاف دشنام آمیز تحریریں لکھی جانے لگیں اور شعراء نے اس کی مذمت میں اشعار کہے چنانچہ ایک شاعر نے کہا ہے۔

تاللہ ان کانت امیۃ قداتت　　　قتل ابن بنت نبیھا مظلوما

خدا کی قسم اگر بنی امیہ اپنے نبی کے دختر زادے پر ظلم ڈھاتے ہوئے ان کے قتل کے مرتکب ہوئے۔

فلقد اتاہ بنو ابیہ بمثلہ　　　ھذا العمری قبرہ مھدوما

تو بنی عباس نے جو ان کے ہم جد تھے ویسا ہی ان پر ظلم کیا مجھے اپنی زندگی کی قسم یہ حسین علیہ السلام ہی کی قبر ہے جو ان کے ہاتھوں منہدم ہوئی ہے۔

متوکل کی غلط اور متشددانہ روش سے اس کی اولاد بھی تنگ آچکی تھی۔ چنانچہ اس کے بیٹے منتصر نے اس کے قتل کا تہیہ کیا۔ اس کی وجہ بظاہر یہ تھی کہ اس نے پہلے منتصر کو اپنا ولیعہد نامزد کیا مگر کچھ دنوں کے بعد اس کی رائے بدل گئی اور منتصر کے بجائے معتز کو اپنا ولیعہد مقرر کرنا چاہا اور منتصر سے کہا کہ وہ ولیعہدی سے دستبردار ہو جائے مگر وہ نہ مانا اور ان دونوں میں سخت کشیدگی پیدا ہو گئی آخر منتصر نے متوکل کے چند ترک غلاموں کو اس کے قتل پر آمادہ کیا۔ وہ تو چاہتے ہی تھے کہ اس کا کام تمام ہو۔ چنانچہ انہوں نے ہتھیار سنبھالے اور رات کے وقت جبکہ وہ مجلس طرب آراستہ کئے ہوئے تھا اچانک اس پر ٹوٹ پڑے اور تلواروں سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ اس کے بعد منتصر مسند خلافت پر بیٹھا اور چھ ماہ کی حکومت کے بعد وفات پائی۔[1]

---

[1] واقعات شاہد ہیں کہ جنہوں نے تخت و تاج کے لئے اپنے باپ کو راستے سے ہٹایا انہیں بھی زیادہ عرصہ تک حکومت کرنا نصیب نہیں ہوا اور موت نے جلد ہی انہیں تخت و تاج سے محروم کر دیا۔

معتمد کے بارے میں فرمایا۔

وخامس عشرهم کثیر العناء قلیل الغناء۔

ان میں کے پندرہویں کو الجھنوں سے واسطہ زیادہ ہو گا اور مالی استطاعت کم ہو گی۔

معتمد ابن متوکل مہتدی کے قتل کے بعد مسند فرمانروائی پر بیٹھا۔ اس نے اپنے بھائی موفق کو وزارت دفاع اور مختلف صوبوں کی امارت کا عہدہ سپرد کیا۔ معتمد کو اسے اپنے دور خلافت میں گوناگوں مشکلات سے دو چار ہونا پڑا۔ چنانچہ حبشی غلاموں نے علی ابن محمد کی سرکردگی میں بصرہ اور اس کے اطراف میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ جن سے موفق نے متعدد جنگیں لڑیں۔ حجاز و عراق میں ایسا سخت قحط پڑا کہ لوگ دانے دانے کو ترس گئے اور نہر عیسیٰ کے بند کے ٹوٹ جانے سے بغداد میں اتنا شدید سیلاب آیا کہ محلّہ کرخ کے سات ہزار مکان منہدم ہو گئے۔ معتمد اگرچہ تیئیس برس تک بساط خلافت پر متمکن رہا مگر وہ ایک طرح سے موفق کے ہاتھ میں کھلونا بنا رہا اور وہی سلطنت کے تمام امور سرانجام دیتا تھا۔ ابن اثیر نے تحریر کیا ہے۔

وکان فی خلافته محکوما علیه قد تحکم علیه اخوه ابو احمد الموفق وضیق علیه حتی انه احتاج الی ثلثمائته دینار فلم یجدها۔ (تاریخ کامل ج ٦ ص ٧٣)

معتمد اپنے دور خلافت میں حاکم کے بجائے محکوم تھا اس کا بھائی ابو احمد موفق اس پر مسلط تھا اور اسے تنگدستی کی حالت میں رکھتا تھا یہاں تک کہ اگر اسے تین سو دینار کی ضرورت پڑتی تو وہ بھی اسے میسر نہ ہوتے۔

معتضد ابن موفق کے بارے میں فرمایا۔

سادس عشرهم اقضاهم للذمم واوصلهم للرحم۔

ان میں کا سولہواں سب سے بڑھ کر ادائے حقوق اور صلہ رحمی کرنے والا ہے۔

عباسی خلفاء نے ہر دور میں سادات علویہ کو اپنا حریف سمجھتے ہوئے مظالم کا نشانہ بنایا اور انہیں قتل و غارت کیا جاتا رہا البتہ معتضد نے قرابت و صلہ رحمی کا کچھ پاس و لحاظ کرتے ہوئے ان پر تشدد گوارا نہیں کیا اور نہ ان کے ساتھ حسن سلوک کئے جانے سے مانع ہوا۔ چنانچہ ابن جریر طبری نے تحریر کیا ہے کہ والی طبرستان محمد ابن زید علوی نے مخفی طور پر بتیس ہزار دینار محمد ابن ورد عطار کے پاس بھیجے تاکہ وہ بغداد، کوفہ، مکہ اور مدینہ کے سادات پر انہیں تقسیم کریں۔ رئیس شرطہ بدر کو معلوم ہوا تو اس نے محمد ابن ورد کو طلب کیا اور اس رقم کے بارے میں باز پرس کی۔ اس نے کہا کہ مجھے والی طبرستان ہر سال اتنی رقم بھیجتا ہے اور جہاں جہاں وہ کہتا ہے میں تقسیم کر دیتا ہوں۔ بدر نے معتضد سے اس کا ذکر کیا اور اس کی رائے دریافت کی۔ معتضد نے کہا کہ تمہیں وہ خواب یاد ہو گا جو میں نے تم سے

بیان کیا تھا۔ کہا کہ مجھے یاد نہیں ہے کہا کہ میں نے خواب دیکھا کہ لاؤ لشکر کے ساتھ نہروان کے اطراف میں راہ پیما ہوں اس دوران میں میری نظر ایک ٹیلے پر پڑی جس پر ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو اس نے شاہی جلوس اور اس کے شکوہ و جلال کو نظرانداز کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ آگے بڑھ کر میرے سامنے آؤ میں آگے بڑھا تو کہا کہ مجھے پہچانتے ہو کہ میں کون ہوں میں نے کہا کہ آپ کو کبھی دیکھا نہیں کہا کہ میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہوں پھر ایک بیلچے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ اسے اٹھاؤ اور زمین پر مارو میں نے چند ضربیں لگانے کے بعد ہاتھ روک لیا فرمایا۔

انہ سیلی من ولدک ھذا الا مربعد د الضربات فاوصھم بولدی خیرا۔ (تاریخ طبری ج ۸ ص ۸۰)

تم نے جتنی ضربیں لگائی ہیں تمہاری اولاد میں اتنے ہی مسند حکومت کے وارث ہوں گے لہٰذا انہیں یہ وصیت کرنا کہ وہ میری اولاد سے حسن سلوک کریں۔

یہ خواب بیان کرنے کے بعد کہا کہ تم محمد ابن ورد سے کہہ دو کہ وہ محمد ابن زید کو لکھے کہ چوری چھپے مال بھیجنے کی ضرورت نہیں وہ علانیہ مال بھیجے اور جہاں چاہتا ہے بے جھجک تقسیم کرے۔

علامہ طبری نے یہ بھی لکھا ہے کہ ۲۸۴ ھ میں معتضد نے اس ارادہ کا اظہار کیا کہ ہر نماز جمعہ کے بعد منبروں پر کھڑے ہو کر معاویہ ابن ابی سفیان پر لعنت کی جائے اور ایک نوشتہ[1] جو امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے فضائل و مناقب اور معاویہ کے نقائص و معایب پر مشتمل تھا پڑھ کر لوگوں کو سنایا جائے۔ جب اس کے وزیر عبداللہ ابن سلیمان کو معلوم ہوا تو وہ حضرت علی علیہ السلام سے انحراف کی بنا پر قاضی یوسف ابن یعقوب کے پاس آیا اور اسے معتضد کے ارادہ سے مطلع کیا اور کہا کہ کوئی ایسی تدبیر کیجئے کہ وہ اپنے ارادہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ چنانچہ قاضی یوسف معتضد کے پاس آیا اور کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کا ارادہ ہے کہ نماز جمعہ کے بعد معاویہ پر برملا لعنت کی جائے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس سے عوام کے جذبات آپ کے خلاف بھڑک اٹھیں گے اور ایسا فتنہ اٹھ کھڑا ہو گا کہ اس کا دبانا آپ کے بس سے باہر ہو جائے گا۔ کہا کہ مجھ میں اتنا دم خم ہے کہ میں اسے دبا سکوں اور کوئی ہنگامہ کھڑا نہ ہونے دوں کہا کہ پھر ان علویوں کے بارے میں کیا کیجئے گا جو خروج پر تلے بیٹھے ہیں جب عوام آل محمدؐ کے مآثر و فضائل سے آگاہ ہوں گے تو وہ ان کی طرف مائل ہو جائیں گے جس سے انہیں تقویت پہنچے گی اور وہ اپنے موقف کے حق بجانب ہونے میں اسے بطور حجت و برہان پیش کریں گے۔ اس پر معتضد خاموش ہو گیا اور اپنا

---

[1] یہ نوشتہ تاریخ طبری جلد ۸ صفحہ ۱۸۳ تا ۱۸۹ میں درج ہے اور اس کے نیچے معتضد کے وزیر ابوالقاسم عبداللہ ابن سلیمان کا نام کاتب کی حیثیت سے مرقوم ہے۔

ارادہ بدل دیا۔

مقتدر کے بارے میں فرمایا۔

کانی اری ثامن عشرھم تفحص رجلاہ فی دمہ بعد ان یاخذہ جندہ بکظمہ من ولدہ ثلث رجال سیرتھم سیرۃ الضلال۔

میں ان میں کے اٹھارویں کو گویا دیکھ رہا ہوں کہ وہ اپنے خون میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے جبکہ اس کا لشکر اس کا گلا دبوچ چکا ہو گا اس کے بیٹوں میں سے تین وہ ہیں جن کا طور طریقہ گمراہوں کا ہو گا۔

مقتدر ابن معتضد تیرہ برس کی عمر میں مسند خلافت پر بیٹھا اور پچیس سال برسر اقتدار رہنے کے بعد قتل کر دیا گیا۔ صورت یہ پیش آئی کہ مونس المظفر جو امیر الامراء کے منصب پر فائز تھا اسے عبداللہ ابن حمدان اور نازوک حاجب نے یہ بتایا کہ مقتدر اسے معزول کر کے اپنے ماموں زاد بھائی ہارون ابن غریب کا اس کی جگہ تقرر کرنا چاہتا ہے مونس نے یہ سنا تو امراء اور فوجی دستوں کے ساتھ قصر شاہی پر دھاوا بول دیا مقتدر کو گھر سے باہر نکال کر اپنے گھر میں زیر حراست رکھا اور محمد ابن معتضد کو القاہر باللہ کا لقب دے کر مسند خلافت پر بٹھا دیا۔ جب بیعت کی تکمیل ہو گئی تو لشکریوں نے اپنے سالانہ وظائف اور حق بیعت کا مطالبہ کیا لیکن بروقت یہ مطالبہ پورا نہ کیا جا سکتا تھا۔ انہیں انتظار کرنے کے لئے کہا گیا اس پر وہ بگڑ گئے اور ہلڑ ہنگامہ کرتے ہوئے مونس کے مکان پر آئے اور اس کے ہاں سے مقتدر کو باہر لائے اور قصر میں لا کر اسے دوبارہ مسند اقتدار پر بٹھا دیا۔ مقتدر نے فوج کو سالانہ وظائف کے ساتھ عطایا و انعامات دئے۔ ابھی اس واقعہ کو دو ہی سال کا عرصہ گزرا ہو گا کہ مونس و مقتدر میں پھر کسی بات پر کشیدگی پیدا ہو گئی۔ مونس موصل چلا آیا اور ترکوں اور بربریوں پر مشتمل ایک فوج تیار کی اور بغداد کا رخ کیا۔ مقتدر کو معلوم ہوا تو اس نے بھی فوجیں میدان میں اتار دیں اور خود ایک بلندی پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں میں جنگ چھڑ گئی۔ مقتدر کی فوج کے جرنیلوں نے اسے میدان میں لا کھڑا کرنا چاہا تاکہ فوج کی ہمت بڑھے مگر مقتدر پر اتنا خوف و ہراس طاری تھا کہ وہ نیچے اترنے پر آمادہ نہ ہوا۔ آخر زور دینے پر اترا مگر اس وقت جب مونس نے عباسی فوجوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا اس کی فوج کا ایک سردار اس کے پاس آیا اور کہا کہ آپ واپس جایئے۔ مقتدر واپس جانا چاہتا تھا کہ مونس کی فوج نے اس پر حملہ کر دیا ایک بربری نے اس پر بھالا مارا اور وہ زمین پر گر پڑا۔ اس کا سرتن سے علیحدہ کرنے کے بعد نیزہ پر بلند کیا گیا اور جسم پر سے لباس اتار کر عریاں کر دیا گیا جسے ایک شخص نے گھانس پھونس سے ڈھانپا۔ اس کے بارہ بیٹوں میں سے راضی، متقی اور مطیع مختلف ادوار میں خلیفہ ہوئے جن کے عادات و خصائل اپنے پیشرووں کی عادات سے مختلف نہ تھے۔

مستعصم کے بارے میں فرمایا۔

لکانی اراہ علی جسد ازوری قتیلا۔ گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ بغداد کے پل پر مقتول پڑا ہے۔

مستعصم خلفاء بغداد میں کا آخری تاجدار تھا جس پر عباسی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ سلطنت عباسیہ پر یہ زوال دفعتہ" طاری نہیں ہوا بلکہ ان حالات کا طبعی نتیجہ تھا جو صدیوں پہلے سے رونما ہو رہے تھے۔ چنانچہ حنبلیوں اور اشعریوں کے آئے دن کے بکھیڑے اور شیعہ سینوں کے جھگڑے حکومت کی بنیادوں کو گھن کی طرح اندر ہی اندر چاٹ رہے تھے اور حکمرانوں کی تن آسانیاں اور ارکان دولت کی باہم آویزیاں تباہی و بربادی کی راہ ہموار کرتی جا رہی تھیں اور آخر دور میں تو سیاسی و عسکری قوت دم توڑ چکی تھی اور خلفاء بے بس اور دیلمی اور سلجوقی امراء کے دست نگر ہو کر رہ گئے تھے اور ہر قدم پر ان کے اشارہ چشم وابرو کے منتظر رہتے تھے۔ مگر ان حالات میں بھی اسلامی ممالک آزادی و خود مختاری کے باوجود برائے نام سہی مرکز خلفمت سے وابستہ تصور ہوتے تھے اور یہی وابستگی اسے باقی و برقرار رکھے ہوئے تھی۔ لیکن ایک شکستہ و بوسیدہ عمارت کو اڑانوں کے سہارے کب تک رکھا جا سکتا تھا ایک نہ ایک دن اسے دھڑام سے گرنا ہی تھا۔ چنانچہ تاتاریوں کے ہاتھوں سقوط بغداد کا حادثہ پیش آیا۔ اس المیہ کی ذمہ داری خواہ کسی کے سر ڈالنے کی کوشش کی جائے مگر خود خلیفہ وقت کو اس سے بری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس نے سلطنت کے نظم و نسق سے آنکھیں بند رکھیں اور اپنی ناعاقبت اندیشی سے دشمن کو تاخت و تاراج کا موقع فراہم کیا۔ حملہ تاتار کا قوی ترین محرک یہ تھا کہ چنگیز خان کے پوتے منکو خان کے دور اقتدار میں باطنیوں نے جو بحیرہ خزر کے جنوب میں پہاڑی علاقوں میں سکونت پذیر تھے امن عامہ کو خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ منکو خان نے اپنے بھائی ہلاکو خان کو ایران کی حکومت کا پروانہ دے کر ان کی سرکوبی پر مامور کیا۔ ہلاکو خان نے اطراف و جوانب کے سربراہوں اور مستعصم سے مدد کی درخواست کی مگر مستعصم نے اس کی درخواست کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور کوئی مدد نہ دی۔ جب ہلاکو خان نے باطنیوں پر قابو پا لیا اور ان کے قلعے فتح کر لئے تو مستعصم کو ایک خط میں لکھا کہ تم نے میرے ساتھ تعاون کرنے سے گریز کیا اب اس کی تلافی کی یہی صورت ہے کہ تم ہماری بالا دستی تسلیم کر کے اطاعت قبول کرو مگر مستعصم کے سر میں ہوائے غرور بھری ہوئی تھی اس نے اس کا سخت الفاظ میں جواب دیا اور پیغامبر کو بھی ذلیل کیا گیا اس نے یہ نہ سوچا کہ اس کے پاس نہ باقاعدہ فوج ہے نہ آزمودہ کار سپاہ اور جو ہے وہ ناکارہ و آرام طلب جس میں نہ ہلاکو خان کی دل بادل فوجوں سے مقابلہ کرنے کی جرأت ہے اور نہ میدان میں جم کر لڑنے کی ہمت۔ لہٰذا نرم رویہ اختیار کرنا قرین مصلحت ہو گا غرض اس تحکمانہ طرز عمل سے ہلاکو خان کے تیور بدلے' تاتاری خون نے جوش مارا اور وہ دو لاکھ تاتاریوں کے ساتھ بغداد پر حملہ کے ارادہ سے نکل کھڑا ہوا۔ مستعصم کی پاشان و پریشان فوج کے بس کا روگ نہ تھا کہ وہ اس سیلاب بلا کے آگے بند باندھ سکے۔ کچھ دیر تک مدافعانہ جنگ لڑی اور آخر تاتاریوں کے پرزور حملے سے پسپا ہو کر شہر میں واپس ہو گئی۔ تاتاریوں نے پیش قدمی کر کے بغداد کا محاصرہ کر لیا جب مستعصم نے دیکھا کہ اس کی قوت دفاع دم توڑ چکی ہے تو وہ

اعزہ و امراء کو لے کر ہلاکو خان کے پاس چلا آیا۔ ہلاکو نے اسے اپنی گرفت میں لے کر اپنی فوجوں کو قتل عام کا حکم دے دیا تاتاریوں نے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور ایک ایک گھر اور شاہی خرمن کو لوٹ لیا اور چالیس دن تک ان کی تلواریں اہل بغداد کے سروں پر چلتی رہیں اور صرف وہی لوگ بچے جو کسی طرح ان کی نظروں سے اوجھل رہ سکے۔ مستعصم کو ایک چٹائی میں لپیٹ کر اس طرح روندا گیا کہ اس نے دم توڑ دیا اور اس کے عزیز و اقارب بھی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ یہ واقعہ محرم ۶۵۶ ھ میں پیش آیا اور سوا پانچ صدیوں تک قائم رہنے والی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

محمد ابن عبداللہ المحض کے بارے میں فرمایا۔

انہ یقتل عند احجار الزیت۔ وہ احجار زیت کے نزدیک قتل کئے جائیں گے۔

سانحۂ کربلا کے بعد اموی حکومت کے خلاف نفرت کا جذبہ پوری شدت سے ابھر آیا تھا جس نے ایک عام بے چینی اور غیر اطمینانی کیفیت پیدا کر دی اور حکومت کی تبدیلی ناگزیر سمجھی جانے لگی۔ چنانچہ بنی امیہ کے دور آخر میں عباسیوں اور علویوں نے اموی اقتدار کا تختہ الٹ کر حکومت پر قابض ہونے کا تہیہ کر لیا اور آل رسولؐ کے حق کی فوقیت کا اعلان کر کے انقلابی تحریک کو آگے بڑھایا اور ماہ ذی الحجہ ۱۳۱ ھ میں ایک مجلس مشاورت قائم کر کے یہ طے کیا کہ اموی اقتدار کے خاتمہ پر محمد ابن عبداللہ المحض کو جو حسن مثنی کے پوتے اور زہد و ورع کی بنا پر نفس زکیہ کے نام سے یاد کئے جاتے تھے مسند خلافت پر بٹھا دیا جائے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس معاہدہ کی تکمیل کر لی گئی۔ ان بیعت کرنے والوں میں منصور دوانیقی بھی شامل تھا۔ جب ۲۶ ذی الحجہ ۱۳۲ ھ کو مروان ثانی کے قتل کر دیئے جانے پر اموی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو عباسیوں نے معاہدہ کو بالائے طاق رکھ کر خلافت کے نام پر زمام اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لی اور محمد ابن عبداللہ کے بجائے ابوالعباس سفاح کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ سفاح نے محمد ابن عبداللہ اور ان کے ہمنواؤں سے کوئی تعرض نہ کیا اور اپنی پوری توجہ بنی امیہ کے استیصال پر مرکوز کر دی۔ جب اسکے بعد منصور مسند خلافت پر متمکن ہوا تو اسے محمد ابن عبداللہ کی طرف سے یہ اندیشہ ہوا کہ وہ معاہدہ کی خلاف ورزی کے پیش نظر حکومت کے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوں اور محمد ابن عبداللہ کو بھی یہ خطرہ نظر آرہا تھا کہ منصور انہیں اپنے راستے سے ہٹانے کی پوری کوشش کرے گا۔ چنانچہ وہ اور ان کے بھائی ابراہیم پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔ اس روپوشی سے منصور کے اس شبہہ کو اور تقویت پہنچی کہ وہ اپنی خلافت کے لئے کوشاں ہیں۔ اس نے زیاد ابن عبیداللہ کو ان کی گرفتاری پر متعین کیا۔ زیاد نے انہیں امان کے وعدہ پر طلب کیا جب وہ آئے تو انہیں چھوڑ دیا اور خود قید خانہ میں چلا گیا پھر ان کی گرفتاری پر محمد ابن خالد کو مقرر کیا۔ اس نے گھروں تک کی تلاشی لی مگر انہیں گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر رباح ابن عثمان کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا گیا اور اسے تاکید کی کہ جس طرح بن پڑے محمد اور ابراہیم کو تلاش کیا جائے۔ جب وہ بھی ناکام ہوا تو منصور نے حکم دیا کہ تمام حسنی سادات کو گرفتار کر لیا جائے۔ چنانچہ

انہیں زنجیروں میں جکڑ کر مدینہ سے کوفہ لایا گیا اور تنگ و تاریک قید خانوں میں ڈال دیا گیا اور عبداللہ المحض کو بھی پابند سلاسل کر کے زندان کے تہ خانہ میں رکھا گیا اور ان پر اتنے مظالم کئے گئے جو کسی طرح اموی مظالم سے کم نہ تھے۔ کسی شاعر نے صحیح کہا ہے۔

واللہ مافعلت امیتہ فیھم　　　　معشار ما فعلت بنو العباس

خدا کی قسم بنی عباس نے ان پر جو مظالم کئے ان کے مقابلہ میں بنی امیہ کے مظالم دسواں حصہ ہوں گے۔

جب محمد کو ان حالات کا علم ہوا تو وہ ان مظالم کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ماہ رجب ۱۴۵ھ میں ایک مختصر سی جمیعت کے ساتھ مدینہ آئے اور اہل مدینہ کو اپنے ساتھ ملا کر حکومت کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا۔ منصور کو اطلاع دی گئی تو اس نے اپنے بھتیجے عیسٰی کی قیادت میں چار ہزار سوار اور دو سو پیادے بھیجے اور اس کے عقب میں محمد ابن قحطبہ کو ایک عظیم لشکر کے ساتھ اس کی مدد کے لئے روانہ کیا دونوں فریق میں خونریز جنگ ہوئی محمد، حمید ابن قحطبہ کے ہاتھ سے مارے گئے اور ان کے ساتھی بھی سب ایک ایک کر کے قتل کئے گئے۔ ابن قحطبہ نے محمد کا سر کاٹ کر منصور کے پاس بھجوایا۔ جس نے مختلف شہروں میں اس کی تشہیر کی۔ یہ واقعہ امیرالمومنین علیہ السلام کی پیشین گوئی کے مطابق مدینہ کے نزدیک احجار زیت میں پیش آیا۔

ابراہیم ابن عبداللہ المحض کے بارے میں فرمایا۔

بباخمری یقتل بعد ان یشھر یاتیہ سھم غرب یکون فیہ منیت فیابوس المراھی شلت یدہ و وھن معسرہ

وہ باخمری میں پہلے تو دشمن پر غالب آجائیں گے پھر قتل کر دئے جائیں گے اس طرح کہ کسی نامعلوم شخص کا تیر انہیں لگے گا۔ جو جان لیوا ثابت ہو گا برا ہو اس تیر پھینکنے والے کا کاش اس کے ہاتھ شل اور بازو ناکارہ ہو جاتے۔

منصور، محمد ابن عبداللہ کے بھائی ابراہیم کی تلاش میں بھی تھا۔ مگر وہ ایک جگہ قیام نہ کرتے تھے اس لئے ان کا پتا نہ چلتا تھا آخر میں وہ بصرہ میں وارد ہوئے اور شہر کے عمائد و اکابران کے ہمنوا ہو گئے۔ انہوں نے حاکم بصرہ سفیان ابن معاویہ کو بے دست و پا کر کے بصرہ پر تسلط حاصل کر لیا اور بیت المال کی جمع جتھا فوج پر تقسیم کر دی۔ اس اثناء میں محمد ابن عبداللہ کے مارے جانے کی اطلاع آگئی۔ آپ نے فارس و اہواز کے لوگوں پر مشتمل ایک لشکر ترتیب دیا اور یکم شوال ۱۴۵ھ کو بصرہ میں قیام کر دیا۔ منصور نے یہ خبر سنی تو بہت سٹپٹایا۔ اس نے فورا" شام، افریقہ اور خراسان میں پھیلی ہوئی فوجوں کو جمع کر کے ان کے مقابلہ میں صف بندی کا حکم دیا۔ ابراہیم ابھی محاذ جنگ کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ اہل کوفہ کی ایک جماعت ان کے پاس آئی اور کہا کہ کوفہ میں ایک لاکھ شمشیرزن آپ

کے پرچم کے نیچے لڑنے کے لئے تیار ہیں۔ آپ یہاں سے کوفہ تشریف لے چلیئے۔ ابراہیم نے اہل کوفہ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے کوفہ کی طرف حرکت کی جب کوفہ اور واسط کے درمیان مقام باخمری میں پہنچے تو منصور کا لشکر بھی وہاں پہنچ گیا۔ ابراہیم کی سپاہ نے دشمن کے لشکر کو دیکھ کر تلواریں میانوں سے کھینچ لیں اور بڑی بے جگری سے حملہ کر دیا۔ فوج مخالف اس حملہ کی تاب نہ لا سکی اس کے قدم اکھڑ گئے اور پسپا ہو کر کوفہ کے حدود تک پہنچ گئی صرف سو آدمی میدان میں رہ گئے۔ ان کے قدم بھی اکھڑا چاہتے تھے کہ ایک سنسناتا ہوا تیر آیا جو ابراہیم کے حلق میں لگا۔ آپ نے سنبھلنا چاہا مگر سنبھل نہ سکے زمین پر گرے اور دم توڑ دیا۔ ان کے ہمراہی منتشر ہو گئے فوج مخالف کے سردار عیسیٰ ابن موسیٰ نے ان کا سر کاٹ کر منصور کے پاس بھجوا دیا۔ یہ واقعہ ماہ ذی الحجہ ۱۴۵ھ میں پیش آیا۔

علی ابن محمد اور اس کی حبشی فوج کے بارے میں فرمایا۔

کانی بہ قد سار بالجیش الذی لا یکون لہ غبار ولا لجب ولا قعقعۃ لجم ولا حمحمۃ خیل یثیرون الارض باقدامھم کانھا اقدام النعام۔ (نہج البلاغہ)

میں اس شخص کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ ایک ایسے لشکر کو لے کر بڑھ رہا ہے جس میں نہ گرد و غبار ہے نہ شور و غوغا نہ لگاموں کی کھڑکھڑاہٹ اور نہ گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز وہ لوگ زمین کو اپنے پیروں سے جو شتر مرغ کے پیروں کے مانند ہیں روند رہے ہوں گے۔

علی ابن محمد قبیلہ عبد قیس کا ایک فرد اور خوارج کے فرقہ ازارقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ امراء سلطنت کی مجلسوں میں آتا جاتا اور ان کے عطیوں پر گزر بسر کرتا تھا۔ سر میں سیادت و پیشوائی کا سودا تو رکھتا ہی تھا اپنے متبعین کی ایک جماعت تشکیل دینے کے لئے ۲۴۹ھ کو بغداد سے بحرین میں آیا اور کچھ لوگوں کو اپنا معتقد بنا لیا بحرین میں پانچ سال گزارنے کے بعد اپنے چند عقید تمندوں کے ساتھ بصرہ آیا۔ حاکم بصرہ محمد ابن رجاء نے اس کے طور طریقے دیکھے تو اس کی گرفتاری کا حکم دیا۔ یہ بھاگ کر بصرہ سے بغداد آگیا اور جب محمد ابن رجاء کی حکومت ختم ہو گئی تو بصرہ واپس آگیا اور یہاں پہنچ کر اعلان کیا کہ جو غلام میرے پاس چلا آئے گا وہ آزاد قرار پائے گا۔ غلام اپنے آقاؤں کے ظلم و ستم سے تنگ آئے ہوئے تو تھے ہی اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے ہزاروں کی تعداد میں اس کے گرد جمع ہو گئے۔ جب اس نے حبشی غلاموں کی اچھی خاصی جمیعت بہم پہنچا لی تو ملک میں شورش برپا کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور عراق کے مختلف شہروں میں لوٹ مار شروع کر دی اور تھوڑے ہی عرصہ میں واسط' رامہرمز ایسے متعدد شہروں پر قابض ہو گیا۔ مرکزی حکومت کی طرف سے اس کی سرکوبی کے لئے لشکر بھیجے جاتے مگر اس کے جیالے سپاہی ان کے قدم ٹکنے نہ دیتے اور انہیں جنگ سے دستبردار ہو کر پسپا ہونے پر مجبور کر دیتے۔ ۲۵۲ھ میں ایلہ پر چڑھائی کی اور وہاں کے باشندوں کو تہ تیغ کر کے شہر میں آگ لگا دی اور اہواز تک کا علاقہ اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ۲۵۷ھ میں اس کے ایک

سردار لشکر علی ابن ابان مہلبی نے بصرہ پر متعدد حملے کئے۔ ہر حملہ میں ہزاروں آدمیوں کو قتل کیا اور محلوں کے محلے جلا دیئے۔ جب بصرہ کے کشت و خون کی مرکز میں معتمد کو اطلاع ہوئی تو اس نے مولد کی سرکردگی میں ایک لشکر بھیجا جو دس دن تک لڑتا رہا۔ آخر حبشیوں نے اس کی فوج پر شبخون مارا اور اسے میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد نو برس تک جنگوں کا سلسلہ جاری رہا مگر حبشی سپاہ کو شکست نہ دی جا سکی۔ ۲۶۶ ھ میں معتمد نے ابوالعباس معتضد کو اس مہم پر متعین کیا۔ ابوالعباس دس ہزار کے لشکر کے ساتھ روانہ ہوا اور دشمن کا سامنا کرتے ہی اس پر ٹوٹ پڑا۔ کچھ دیر مقابلہ کیا اور پھر پیچھے کو ہٹا۔ حبشی اس کی پسپائی کو دیکھ کر خوش ہوئے اور جوش میں آکر آگے بڑھے اتنے میں ایک فوجی دستہ نے جو ابو حمزہ نصیر کی قیادت میں کشتیوں کے ذریعہ پہنچا تھا عقب سے حملہ کر دیا اس کے ساتھ ابوالعباس نے بھی پلٹ کر حملہ کیا جب حبشی دو طرفہ گھر گئے تو ان میں بھگدڑ مچ گئی اور جدھر جس کا منہ آیا ادھر بھاگ کھڑا ہوا۔ چند دنوں کے بعد انہوں نے مجتمع ہو کر پھر حملوں کا آغاز کر دیا۔ ۲۶۷ ھ میں ابوالعباس کا باپ موفق بھی ایک کثیر لشکر کے ساتھ پہنچ گیا اور ابوالعباس کے ساتھ مل کر میدان کارزار گرم کیا۔ آخر ۲۷۰ ھ میں علی ابن محمد کے مارے جانے سے جنگوں کا سلسلہ رکا۔ ان جنگوں میں مقتولین کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں کیا جا سکا۔ سیوطی نے لکھا ہے کہ پندرہ لاکھ مسلمان تہ تیغ ہوئے اور بصرہ میں صرف ایک دن کے اندر تین لاکھ افراد مارے گئے۔ ہزاروں خاندانوں کی عزت و ناموس پامال ہوئی اور واسط' کوفہ اور اس کے اطراف کی بیس ہزار عورتوں اور بچوں کو حبشیوں کے پنجے سے چھڑایا گیا۔

ایران سے نکلنے والے تیل کے چشموں کے بارے میں فرمایا۔

ویحا للطا لقان فان لله تعالی بھاکنوزا لیست من ذھب ولا فضتہ۔ (بحار الانوار)

طالقان میں اللہ کے ایسے خزانے ہیں جو نہ سونے کے ہیں اور نہ چاندی کے۔

داعیان طبرستان کے بارے میں فرمایا۔

دعاہ حتی تقوم باذن اللہ فتدعوا الی دین اللہ۔

چند داعی اللہ کے حکم سے کھڑے ہوں گے جو اللہ کے دین کی طرف دعوت دیں گے۔

بنی عباس نے جب علوی سادات کو اپنے مظالم کا نشانہ بنایا تو ان میں کا ایک خاندان طبرستان کے پہاڑی علاقہ میں آکر آباد ہو گیا۔ ابتداء میں یہ لوگ مذہبی رہنماؤں کی حیثیت سے متعارف ہوئے اور مختلف مقامات پر مبلغ و داعی بھیج کر تبلیغی فرائض انجام دیتے رہے۔ جب دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں ایک معتدبہ جمیعت ان کے ساتھ ہو گئی تو سیاست میں دخیل ہو گئے اور ۲۵۰ ھ میں داعی کبیر حسن ابن زید کو حکمران منتخب کر کے طبرستان میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ حسن فقیہ' ادیب' شاعر اور شاعر نواز تھا چنانچہ شعراء اس کے دربار میں قصائد پڑھتے اور انعام و اکرام حاصل

کرتے۔ ایک مرتبہ ایک شاعر کو قصیدہ مدحیہ پر دس ہزار درہم دئے جو اس دور میں بہت بڑا انعام تھا۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک شاعر نے قصیدہ پڑھا جس کا ایک مصرع یہ تھا **اللہ فرد و ابن زید فرد** (اللہ یکتا ہے اور ابن زید بھی یکتا ہے) اس پر اس نے بگڑ کر کہا کہ اے دروغ گو تیرے منہ میں خاک تو نے یہ کیوں نہ کہا **اللہ فرد و ابن زید عبد** (اللہ یکتا ہے اور ابن زید ایک بندہ ہے) حسن نے انیس سال آٹھ مہینے چھ دن حکومت کرنے کے بعد ۲۷۰ھ میں وفات پائی۔

حسن کی وفات کے بعد اس کا بھائی محمد ابن زید قائم بالحق کے لقب سے برسر اقتدار آیا۔۶ یہ بھی اپنے بھائی کی طرح علوم دینیہ و عربیہ کا ماہر تھا۔ اس کا تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے کربلا میں صرف کثیر سے روضۂ سید الشہداء اور شہر پناہ تعمیر کرائی۔ ابن اثیر نے تاریخ کامل میں لکھا ہے کہ دو آدمی آپس کا جھگڑا نمٹانے کے لئے اس کے سامنے پیش ہوئے۔ اس نے ان کے نام پوچھے تو ایک نے معاویہ بتایا اور دوسرے نے علی۔ اس نے یہ نام سنے تو کہا کہ بس فیصلہ ہو گیا علی کے مقابلہ میں معاویہ حق بجانب نہیں ہو سکتا۔ معاویہ نے کہا کہ آپ ناموں پر فیصلہ نہ کیجئے ان ناموں میں ایک مصلحت پوشیدہ ہے کہا وہ کیا کہا کہ میرا باپ مخلص شیعہ تھا اس نے نواصب سے بچانے کے لئے میرا نام معاویہ رکھا اور میرے اس حریف کا باپ ناصبی تھا اس نے شیعوں اور علویوں کے ڈر سے اس کا نام علی رکھ دیا۔ محمد اس کی حاضر جوابی پر مسکرایا اور اسے اپنے مصاحبین میں شامل کر لیا۔

محمد کی حکومت اگرچہ طبرستان' جرمان' سے' اصفہان اور کاشان تک پھیلی ہوئی تھی مگر اس نے عمرو ابن لیث کی خراسان سے برطرفی کی خبر سنی تو اپنی مملکت کو وسعت دینے کے لئے خراسان پر حملہ کے ارادہ سے نکل کھڑا ہوا۔ جب جرجان کے قریب پہنچا تو اسمٰعیل ابن احمد سامانی نے جو خراسان پر قبضہ کر چکا تھا اسے پیغام بھجوایا کہ وہ واپس چلا جائے۔ مگر اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہ رکے آخر دونوں میں جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں محمد شدید زخمی ہو گیا اور انہی زخموں کی وجہ سے ۲۸۷ھ میں انتقال کیا اور سامانیوں نے طبرستان پر قبضہ کر لیا۔

۳۰۴ھ میں علوی خاندان کا ایک فرد حسن ابن علی اطروش جو ناصر الحق کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے طبرستان پر حملہ آور ہوا اور سامانیوں کو وہاں سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ ناصر الحق نے علوی حکومت تو دوبارہ قائم کر دی مگر خود اس جنگ میں مارا گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۹۷ برس تھی۔

ناصر الحق کی وفات کے بعد اس کے داماد حسن ابن قاسم کو طبرستان کی حکومت سپرد کی گئی مگر ناصر الحق کے بیٹوں ابو الحسین احمد حاکم جرجان اور ابو القاسم والئ گیلان نے اسے حکومت سے بے دخل کر دیا۔ ابو الحسین احمد نے ۳۱۱ھ میں وفات پائی تو اس کا بیٹا ابو علی محمد طبرستان کے صدر مقام آمل میں مسند اقتدار پر پہنچا مگر ماکان ابن کالی دیلمی نے آمل پر حملہ کر کے ابو علی محمد کو گرفتار کر کے جرجان بھیج دیا جہاں اس نے اپنی حکومت قائم کر لی جب ابو علی محمد گھوڑے سے گر کر جاں بحق ہو گیا تو اس کے بھائی ابو جعفر حسن نے حکومت سنبھال لی۔ مگر حسن ابن قاسم نے ماکان

ابن کالی کے تعاون سے آمل پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا اور ابو جعفر حسن جرجان کی طرف چلا گیا۔ اس دوران میں اسفار ابن شیرویہ جو ابو جعفر حسن کی طرف سے ساریہ کا حاکم تھا حسن ابن قاسم پر حملہ آور ہوا۔ حسن ابن قاسم جو نوے برس کی عمر کا تھا لڑتا ہوا مارا گیا۔ ابو جعفر حسن کے بعد اس کا بھائی الثائر کا لقب اختیار کر کے حکمران ہوا۔ جب الثائر کا ۳۵۵ھ میں انتقال ہوا تو اس کا بھائی حسن الناصر حکمران قرار پایا اور اس پر علوی حکومت کا اختتام ہو گیا۔

سلطنت فاطمیہ کے بانی عبداللہ المہدی کے بارے میں فرمایا۔

ثم یظهر صاحب القیرو ان الغض البض ذوالنسب المحض المنتجب من سلالته ذی البداء المسجی بالرداء۔

پھر قیروان کا فرمانروا ظاہر ہو گا جس کا جسم تر و تازہ اور نرم و نازک ہو گا صحیح نسب کا حامل اور اس کی اولاد میں سے ہو گا جس کے لئے بدا واقع ہو گا اور جسے چادر میں لپیٹ کر رکھا جائے گا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنی زندگی میں جناب اسمٰعیل کی امامت کا اظہار کیا تھا مگر جب وہ آپؑ کی زندگی ہی میں وفات پا گئے تو ان کی امامت کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا اس لئے امام علیہ السلام نے رفع اشتباہ کے لئے ان کی میت کو ایک چادر میں لپیٹ کر رکھ دیا تھا اور اعیان و اکابر شیعہ کو ان کی میت دکھا دی تھی تاکہ انہیں موت کا یقین ہو جائے اور امامت کے سلسلہ میں بدا کے واقع ہونے کا کوئی شبہہ نہ رہے مگر ایک گروہ نے اسمٰعیل کی وفات کے باوجود انہیں امام تسلیم کر لیا اور پھر ان کی اولاد میں سلسلہ امامت کے اجراء کے قائل ہو گئے۔ چنانچہ اسمٰعیل کے بعد جعفر المصدق پھر محمد المکتوم پھر محمد الحبیب اور پھر عبداللہ کو امام مانا جانے لگا۔ اس سلسلہ امامت کے قائل اسمعیلیہ کہلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسمٰعیل امام ہفتم تھے پھر تین امام مخفی ہوئے اور ان مخفی آئمہ کے بعد آئمہ ظاہر کا سلسلہ شروع ہوا اور عبداللہ ابن محمد الحبیب پہلا امام قرار پایا۔ بعض مورخین نے عبداللہ کی سیادت سے انکار کیا ہے مگر اکثر مورخین نے جن میں ابن خلکان اور ابن خلدون بھی شامل ہیں اسے صحیح النسب فاطمی سید تسلیم کیا ہے۔

فرقہ اسمعیلیہ کے مبلغ و داعی مختلف علاقوں میں اپنے نظریات کی تبلیغ کے لئے متعین کئے جاتے تھے۔ چنانچہ ابو عبداللہ حسن ابن محمد کو شمالی افریقہ کا داعی مقرر کیا گیا۔ وہ پہلے حج کے دنوں میں مکہ آیا تاکہ افریقی لوگوں سے جو حج کے لئے آیا کرتے تھے راہ و رسم پیدا کرے اور ان کے ساتھ افریقہ کی راہ لے۔ چنانچہ اس نے اہل کتامہ سے جو شمالی افریقہ میں واقع ہے روابط بڑھائے اور حج سے فارغ ہو کر ان کے قافلہ کے ہمراہ کتامہ پہنچ گیا اور کچھ عرصہ اس علاقہ میں قیام کرنے سے اہل کتامہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور پھر ان کے تعاون سے لشکر کشی کی اور مختلف شہروں کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب اس نے شمالی افریقہ کے معتدبہ حصہ پر قبضہ کر لیا تو اپنے بھائی ابوالعباس کو حمص کے علاقہ میں سلمیہ بھیجا تاکہ عبداللہ کو عزت و احترام کے ساتھ یہاں لائے اور زمام حکومت اس کے ہاتھوں میں دے دی جائے۔ جب ابوالعباس سلمیہ پہنچا تو عبداللہ اس کے ہمراہ نکل کھڑا ہوا۔ مکتفی باللہ کو اس کی نقل و حرکت کی خبر دی

گئی تو اس نے اس کی گرفتاری کا فرمان جاری کر دیا۔ عبیداللہ نے اس کی پرواہ نہ کی اور اپنے بیٹے ابوالقاسم نزار کے ہمراہ غیر معروف راستوں پر ہو لیا اور مصر ہوتا ہوا طرابلس پہنچ گیا اور وہاں سے ابوالعباس کو ابو عبداللہ کو اطلاع دینے کے لئے کتامہ روانہ کر دیا۔ ابوالعباس کتامہ جاتے ہوئے جب قیرقان پہنچا تو وہاں کے حاکم زیادۃ اللہ نے اسے گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا اور طرابلس کے عامل کو لکھا کہ وہ عبیداللہ کو گرفتار کر لے۔ عبیداللہ گرفتاری کی خبر سن کر سلجماسہ کی طرف چل دیا مگر یہاں بھی مرکزی حکومت کی طرف سے اس کی گرفتاری کا حکم پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ ادھر ابو عبداللہ نے لشکر کشی کا سلسلہ برابر جاری رکھا اور ۲۹۶ھ میں قیروان کو فتح کر کے اپنے بھائی ابوالعباس کو زندان سے نکالا اور سلجماسہ کو محاصرہ میں لے کر عبیداللہ اور اس کے بیٹے نزار کو قید سے رہا کیا اور انہیں رہائی دلانے کے بعد ربیع الثانی ۲۹۷ھ کو قیروان واپس پلٹ آیا اور اقتدار عبیداللہ کے سپرد کر کے اس کی فرمانروائی کا اعلان کیا۔ عبیداللہ نے شمالی افریقہ میں سلطنت عبیدیہ کی بنیاد رکھی اور چوبیس سال ایک ماہ اور بیس دن حکومت کرنے کے بعد ۳۲۲ھ میں فوت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابوالقاسم نزار مسند حکومت پر بیٹھا اور جب اس کے تیسرے جانشین المعزلدین اللہ نے ۳۵۹ھ میں مصر پر قبضہ کیا تو مصر کو دارالحکومت قرار دے لیا۔ سلطنت عبیدیہ ۲۷۴ برس تک قائم رہی۔

سلاطین دیالمہ کے بارے میں فرمایا۔

یخرج من دیلمان بنو الصیاد ثم یستقوی امرھم حتی یملکوا الزوراء ویخلموا الخلفاء۔

دیلم سے ایک شکاری کی اولاد میدان میں نکلے گی جس کا اقتدار اتنا مضبوط ہو گا کہ وہ بغداد پر چھا جائے گی اور خلفاء کو برطرف کرے گی۔

زمانہ سابق میں بحرخزر کا جنوبی علاقہ دیلم کہلاتا تھا اور وہاں کے باشندے بھی دیلم اور دیالمہ کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ یہاں ایک شخص بویہ نامی مقیم تھا جس کی کنیت ابو شجاع تھی۔ اگرچہ وہ شاہان فارس کی اولاد میں سے تھا مگر غربت و ناداری کی بنا پر بحیرہ کیسپین میں مچھلیاں پکڑ کر گزر بسر کرتا تھا۔ اس کے تین لڑکے تھے علی، حسن اور احمد جو اپنے حسن تدبر اور سعی پیہم سے فارس کے تمام صوبوں پر قابض ہو گئے اور عمادالدولہ، رکن الدولہ اور معزالدولہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ان کا دائرہ اختیار و اقتدار اتنا وسیع تھا کہ بغداد کا مرکز خلافت بھی ان کے زیر اثر ہو گیا۔ دربار خلافت میں خلیفہ کے پہلو بہ پہلو بیٹھتے اور سکوں پر خلیفہ کے نام کے ساتھ ان کا نام بھی لکھا جاتا بلکہ خلیفہ کی موقوفی و بحالی ان کے اختیار میں تھی اور جسے چاہتے مسند خلافت پر بٹھا دیتے اور جسے چاہتے اتار دیتے۔ چنانچہ جب معزالدولہ کو یہ معلوم ہوا کہ مستکفی باللہ ترکوں کی مدد سے اسے قتل یا بغداد سے باہر نکال دینا چاہتا ہے تو اس کے فرستادہ چند دیلمی مستکفی کے دربار میں آئے اور اس کی طرف بڑھے۔ وہ یہ سمجھا کہ درباری دستور کے مطابق دست بوسی کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے ہاتھ آگے کر دیا انہوں نے اس کے ہاتھ مین ہاتھ ڈال کر اسے

نیچے اتار لیا اور گھسیٹتے ہوئے معزالدولہ کے پاس لے آئے۔ اس نے اسے قید کر دیا اور المطیع للہ کو مسند خلافت پر بٹھا دیا۔ اسی طرح رکن الدولہ کے پوتے ابونصر بہاء الدولہ ابن عضد الدولہ کے حکم سے الطائع للہ کو بھرے دربار میں تخت خلافت سے نیچے اتار لیا گیا وہ چیختا چلاتا رہا مگر اس کی حمایت میں نہ کسی کو زبان کھولنے کی جرأت ہوئی اور نہ تلوار کو حرکت دینے کی ہمت۔ بہاء الدولہ نے اسے معزول کرنے کے بعد چند آدمیوں کو متقی کے بیٹے قادر باللہ کے پاس بھیجا جو طائع کے خوف سے بطیحہ میں مقیم تھا تاکہ طائع کی جگہ پر اسے مسند خلافت پر بٹھایا جائے۔

ابن اثیر جزری نے تحریر کیا ہے کہ ہبتہ اللہ ابن عیسیٰ نے بیان کیا کہ جب قادر باللہ بطیحہ میں مقیم تھا تو میں ہفتہ میں دو مرتبہ اس کے ہاں آتا تھا۔ وہ میرا احترام کرتا اور خندہ پیشانی سے پیش آتا۔ ایک مرتبہ میں اس کے ہاں گیا تو وہ اس خندہ روئی سے پیش نہ آیا جو اس کا معمول تھا۔ میں نے کہا کہ آج آپ کی پذیرائی کا انداز کچھ بدلا ہوا ہے اگر مجھ سے کوئی لغزش ہوئی ہو یا کوئی ناگوار بات کہی ہو تو معذرت چاہتا ہوں۔ کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ میں نے رات ایک خواب دیکھا ہے جس کا میرے دل و دماغ پر اثر ہے اور میں کچھ کھو سا گیا ہوں۔ میں نے کہا کہ وہ خواب تو بیان کیجئے۔ کہا کہ میں نے دیکھا کہ ایک وسیع و عریض دریا ہے جس کا پاٹ دجلہ سے کئی گنا بڑا ہے۔ میں اس دریا کے کنارے کنارے چلنے لگا آگے بڑھ کر ایک بلند و بالا پل نظر آیا مجھے حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے دریا پر اتنا اونچا اور مضبوط پل کس نے بنایا ہے ابھی میں حیران و ششدر کھڑا تھا کہ ایک شخص کو دیکھا جو بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کیا تم اس دریا کو عبور کرنا چاہتے ہو میں نے کہا ہاں اس نے وہیں سے ہاتھ بڑھایا اور مجھے پکڑ کر دریا کے اس پار اتار دیا میں نے اس کی یہ غیر معمولی قوت و طاقت دیکھی تو مجھ پر ہیبت طاری ہو گئی میں نے پوچھا کہ آپ کون ہیں کہا۔

علی ابن ابی طالب و ھذا الا مر صائر الیک و یطول عمرک فیہ فاحسن الی ولدی و شیعتی۔ (تاریخ کامل ج ۷ ص ۱۴۸)

میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہوں یہ حکومت تمہاری طرف پلٹے گی لہٰذا میری اولاد اور میرے شیعوں سے نیک برتاؤ کرنا۔

ہبتہ اللہ کہتا ہے کہ ادھر اس نے خواب ختم کیا ادھر باہر سے شور سنائی دیا جھانک کر دیکھا تو دروازہ پر لوگوں کا ہجوم تھا اور تہنیت و تبریک کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں وجہ پوچھی تو بتایا گیا کہ بہاء الدولہ کے آدمی آئے ہیں جو قادر باللہ کو بغداد لے جانا چاہتے ہیں تاکہ تخت و تاج خلافت اس کے سپرد کیا جائے۔ قادر باللہ نے یہ سنا تو دم بخود ہو کر رہ گیا اور اسی وقت بہاء الدولہ کے آدمیوں کے ساتھ بغداد روانہ ہو گیا۔ جب بغداد پہنچا تو بہاء اللہ ارکان دولت اور روسائے شہر نے اس کا پرجوش استقبال کیا اور اپنے جلو میں لے کر قصر خلافت میں اتارا۔ قادر باللہ نے اکتالیس برس تین ماہ کا طویل عرصہ حکومت کی۔

تاتاریوں اور ان کی خونریزیوں کے بارے میں فرمایا۔

كانی اراهم قوما كان وجوههم المجان للطرقته يلبسون السرق والد يباج و يعتبقون العنان ويكون هناك استحرار قتل حتى يمشى المجروح على المقتول ويكون المغلت اقل من الماسور۔

میں ایسے لوگوں کو دیکھ رہا ہوں جن کے چہرے ان ڈھالوں کی طرح ہیں کہ جن پر چمڑے کی تہیں منڈھی ہوئی ہوں وہ ابریشم و دیبا کے کپڑے پہنتے ہیں اور اصیل گھوڑوں کو عزیز رکھتے ہیں اور وہاں کشت و خون کی گرم بازاری ہو گی اور بچ کر بھاگ نکلنے والے اسیر ہونے والوں سے کم ہوں گے۔

قبیلہ تاتار منگولیا کے صحرائے گوبی میں متمدن دنیا سے الگ تھلگ وحشیانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ ان لوگوں کے سینے چوڑے' چہرے چپٹے اور خدو خال ترکوں سے ملتے جلتے تھے۔ ایک نسل سے ہونے کے باوجود مختلف شاخوں اور ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ہر شاخ کا ایک سردار ہوتا تھا جو اپنے قبیلہ کی سود و بہبود کا نگران سمجھا جاتا تھا۔ ۲۰ ذی قعدہ ۵۴۹ ھ میں شمالی علاقہ کے سردار کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام تموچین (فولادی ٹکڑا) رکھا گیا۔ ابھی یہ بچہ تیرہ برس ہی کا تھا کہ اس کا باپ زہر سے ہلاک کر دیا گیا۔ یہ بچہ جس نے بعد میں قاآن اعظم چنگیز خان کے نام سے شہرت پائی اپنے باپ کی جگہ پر سردار قرار پایا۔ اگرچہ اس کی مخالفت میں آوازیں اٹھیں مگر اس نے خود اعتمادی کا سہارا لے کر مخالف آوازوں کو خاموش کر دیا اور اپنے حسن تدبر اور زور بازو سے آس پاس کے علاقوں کو فتح کر لیا اور اپنی طاقت اتنی بڑھا لی کہ ایک تاتاری سردار نے اپنی لڑکی اسے بیاہ دی اور آپس میں معاہدہ صلح کر لیا۔ جب وہ مر گیا تو چنگیز خان نے اس کے علاقہ پر بھی قبضہ کر لیا اور پراگندہ و منتشر ریاستوں کو ختم کر کے ایک مستحکم و وسیع مملکت تشکیل دے لی۔ اسی چنگیز خان کی قیادت میں تاتاریوں نے اسلامی مملکتوں پر تاخت کی اور آبادیوں کو بے نشان' شہروں کو ویران اور لاکھوں آدمیوں کو تہ تیغ کر کے اپنی فرمانروائی کا پرچم بلند کیا۔ اس مار دھاڑ اور قتل و غارت کا آغاز اس طرح ہوا کہ اس کے ہمسایہ ملک خوارزم کے چند تاجر تاتاریوں کے علاقہ میں آئے جن کے پاس عمدہ ریشمین کپڑے تھے۔ چنگیز خان عمدہ کپڑوں کی تلاش میں رہتا تھا اس نے حسب پسند کپڑے خریدے اور مزید خریداری کے لئے اپنے ہاں کے آدمی ان تاجروں کے ہمراہ خوارزم بھیجے تاکہ وہ کپڑا اور دوسری چیزیں خرید کر لائیں۔ جب یہ لوگ واپسی پر خوارزم کے سرحدی گاؤں اترار میں پہنچے تو والی اترار نے خوارزم شاہ کے حکم سے ان کا مال ضبط کر لیا اور ان آدمیوں کو جو کئی سو تھے قتل کر دیا۔ حالانکہ دونوں مملکتوں میں تاجروں کے آزادانہ آنے جانے کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ چنگیز خان کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے خوارزم شاہ کو ایک ایلچی کے ذریعہ پیغام بھیجا کہ وہ والیٔ اترار کو قصاص کے لئے اس کے حوالے کرے مگر اس نے ناعاقبت اندیشی سے نہ صرف والیٔ اترار کو اس کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا بلکہ ایلچی کو قتل کر کے اعلان جنگ کر دیا اور ایک لشکر جرار تاتاریوں کی سرحد پر اتار دیا۔ چنگیز خاں کا بیٹا جوجی خاں لشکر لے کر نکلا اور خوارزم کے لشکر کو پسپا کر دیا۔ خوارزمیوں کی پسپائی سے تاتاریوں کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ ایران

کے مختلف شہروں پر حملہ آور ہونے کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور چنگیز کے بیٹوں چغتائی خاں اور اکتائی خاں نے اترار کے قلعہ کو محاصرہ میں لے کر والی اترار کو زندہ گرفتار کر لیا اور اس کی آنکھوں اور کانوں میں پگھلی ہوئی چاندی انڈیل کر اسے ہلاک کر دیا اور خود چنگیز خاں ایک عظیم لشکر کے ساتھ بخارا کی طرف روانہ ہوا اور وہاں کی آبادی کو قتل کر کے شہر میں آگ لگا دی اور بچے کھچے لوگوں کو غلام بنا لیا۔ بخارا کو تباہ کرنے کے بعد سمرقند کا رخ کیا یہاں کے لوگوں نے مقابلہ کے لئے ہاتھ پیر مارے مگر چنگیزی فوجوں کے آگے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ یہاں بھی تاتاریوں نے قتل عام کیا اور باقی ماندہ زن و مرد کو کنیز و غلام بنا کر ساتھ لے لیا۔ پھر خوارزم پر حملہ آور ہوئے۔ شاہ خوارزم دارالحکومت چھوڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ سر چھپاتا پھرتا تھا۔ اہل شہر نے دیکھا کہ تاتاریوں کا لشکر مختصر ہے انہیں آسانی سے پسپا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ مقابلہ کے لئے باہر نکل آئے۔ ان کے باہر نکلتے ہی تاتاریوں نے جو ادھر ادھر کمین گاہوں میں چھپے ہوئے تھے۔ یکبارگی حملہ کر دیا۔ ایک لاکھ آدمیوں کو قتل کر کے شہر کو لوٹ لیا اور دریا کا بند توڑ کر اسے تہ آب کر دیا۔ خوارزم کو تباہ کرنے کے بعد خراسان کا رخ کیا اور بے دریغ انسانی خون بہایا۔ خراسان کے بعد بدخشاں کو برباد کیا یہاں سے بلخ کی طرف بڑھے اور پوری آبادی کو تہ تیغ کر دیا پھر بامیان اور طالقان پر فوج کشی کی اور پوری طرح خون آشامی کا مظاہرہ کیا۔ پھر نساء کا رخ کیا اور زن و مرد کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اسی طرح سبزوار، نیشاپور، مرو برات اور دوسرے شہروں کو لوٹا۔ شاہ خوارزم کا بیٹا جلال الدین غزنین کی طرف جا چکا تھا۔ چنگیز خاں نے اس کا تعاقب کیا مگر وہ غزنین چھوڑ چکا تھا۔ اس نے تعاقب جاری رکھا اور دریائے سندھ کے کنارے پر اسے گھیر لیا۔ جلال الدین نے گھوڑا دریا میں ڈالدیا اور موجوں سے ٹکراتا ہوا دوسری سمت نکل گیا۔ چنگیز خاں نے اس کے بال بچوں کو قتل کر دیا اور غزنہ اور غور پر قبضہ کر لیا۔ غرض تاتاریوں نے وسط ایشیا سے روس تک تہلکہ مچا دیا۔ شہروں کو کھنڈر آبادیوں کو ویران اور میدانوں کے میدان لاشوں سے پاٹ دئے۔

تعمیر بغداد کے بارے میں فرمایا۔

تبنی لهم مدینته یقال لها الزوراء بین دجلت و دجیل۔	بنی عباس کے لئے دریائے دجلہ اور نہر دجیل کے درمیان ایک شہر کی بنیاد رکھی جائے گی جسے زوراء کہا جائے گا۔

زوراء بغداد کا دوسرا نام ہے۔ اس کی بنیاد عباسیین کے دوسرے حکمران منصور دوانیقی نے ۱۴۴ھ میں رکھی۔ اس نے ماہر انجینئروں سے اس کا نقشہ بنوایا۔ مختلف جگہوں سے معمار و کاریگر جمع کئے اور ہر روز ایک لاکھ معماروں اور مزدوروں نے کام کر کے اس کو تکمیل تک پہنچایا۔ وسط شہر میں قصر شاہی اور امراء سلطنت کے محلات تعمیر کئے گئے اور باب خراسان، باب البصرہ، باب الکوفہ اور باب الشام سے اس کی حد بندی کی گئی۔

اصبغ ابن نباتہ نے بیان کیا کہ صفین کی طرف جاتے ہوئے امیرالمومنین علیہ السلام ایک اونچے ٹیلے پر کھڑے

ہوئے اور اس ٹیلے اور بابل کے درمیان سرکنڈوں کے ایک جنگل کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "شہر ہے اور کیسا شہر ہے" میں نے عرض کیا کہ یا امیرالمومنین علیہ السلام کیا یہاں کبھی کوئی شہر آباد تھا جس کے کھنڈر دیکھ کر آپؑ یہ فرما رہے ہیں فرمایا۔

لاولکن ستکون مدینہ یقال لھا الحلتہ السیفیتہ۔ نہیں بلکہ یہاں ایک شہر آباد ہو گا جسے حلہ السیفیہ کہا جائے گا۔

چنانچہ سیف الدولہ صدقہ ابن منصور نے سلطان ملک شاہ کی اولاد کی باہم آویزیوں سے کنارہ کش رہنے کے لئے ۴۹۵ ھ میں اس سرزمین پر قیام کیا اور اپنے اہل و عیال اور لشکر کے لئے متعدد مکانات تعمیر کرائے۔ جس کے بعد لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی اور سیف الدولہ کی زندگی ہی میں ایک شہر سا آباد ہو گیا جو حلہ سیفیہ کے نام سے موسوم ہوا۔

امیرالمومنین علیہ السلام اپنے چند اصحاب کے ہمراہ بیرون کوفہ تشریف فرما ہوئے اور ایک جانب اشارہ کر کے فرمایا۔

لا تنھب الایام حتی یحضر ھھنا نھر یجری فیہ الماء۔ کچھ عرصہ کے بعد یہاں نہر کھو دی جائے گی جس میں پانی رواں ہو گا۔

کچھ لوگوں نے کہا کہ کیا ایسا بھی ہو گا فرمایا کہ ہاں چنانچہ اب کوفہ کے پہلو میں نہر رواں ہے اور نہر آصفی کے نام سے موسوم ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے بصرہ جاتے ہوئے ذیقار میں منزل کی تو فرمایا کوفہ سے پورے ایک ہزار آدمی آئیں گے نہ ایک زیادہ ہو گا اور نہ ایک کم۔ وہ مرنے اور جان دینے کا معاہدہ کریں گے اور اس معاہدہ پر ثابت قدم رہیں گے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ مجھے یہ خدشہ ہوا کہ کہیں اس تعداد میں کمی یا بیشی نہ ہو جائے ورنہ ساتھ والے شک و شبہہ میں پڑ جائیں گے۔ چنانچہ میں نے آنے والوں کو شمار کرنا شروع کیا جب آنے والوں کی تعداد نو سو ننانوے تک پہنچی تو ان کا سلسلہ رک گیا میں نے دل میں کہا کہ حضرتؑ نے یہ کہا ہی کیوں تھا کہ نہ ایک کم ہو گا اور نہ ایک زیادہ۔ ابھی میں اسی پریشان خیالی میں تھا کہ ایک شخص کو آتے دیکھا جو اون کا کرتہ پہنے اور تلوار' زرہ اور ایک مشکیزہ لئے ہوئے تھا اس نے حضرت کے قریب پہنچ کر کہا کہ ہاتھ بڑھایئے تاکہ میں آپ کی بیعت کروں فرمایا کس بات پر بیعت کرو گے کہا جہاد اور پیان امامت پر۔ پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے کہا اویس قرنی۔ حضرتؑ نے یہ نام سنا تو بلند آواز سے تکبیر کہی اور فرمایا کہ میرے حبیب اور اللہ کے رسولؐ مجھے یہ خبر دے گئے تھے کہ میں ایک ایسے شخص سے ملاقات کروں گا جو اللہ کے گروہ میں شامل اور شہادت و شفاعت کے درجہ پر فائز ہو گا۔

دور آخر کے علائم و آثار کے سلسلہ میں فرمایا۔

یاتی علی الناس زمان یرتفع فیہ الفاحشتہ وتصنع و ینتھک فیہ الحارم و یعلن فیہ الزنا و یستجل فیہ اموال الیتمی ویوکل الربوا ویطفف فی المکاییل والموازین و یستحل الخمر بالنبذ و ارشھوہ بالھد یتہ والخیانتہ بالامانتہ و ینشبہ الرجال بالنساء والنساء بالرجال ویستخف بحدود الصلواہ ویحج فیہ لغیر اللہ۔ (بحارالانوار)

لوگوں پر ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا جس میں بدکاری وسعت معاش کے لئے بطور پیشہ اختیار کی جائے گی اللہ کے حدود توڑے جائیں گے زنا کھلے بندوں ہو گا یتیموں کا مال حلال سمجھا جائے گا سود کھایا جائے گا ناپ تول میں کمی کی جائے گی شراب کو آب انگور رشوت کو ہدیہ اور خیانت کو امانت کی صورت میں حلال قرارر دیا جائے گا مرد عورتوں کی اور عورتیں مردوں کی شباہت اختیار کریں گی نماز کے حدود و شرائط کو سبک سمجھا جائے گا اور حج اللہ کے علاوہ اور مقاصد کے لئے کیا جائے گا۔

تاریخ عالم شاہد ہے کہ جس قوم نے تقویٰ و پرہیز گاری کی شاہراہ اختیار کی' راستبازی کو اپنا شعار بنایا اور حدود الہیہ کا احترام ملحوظ رکھا وہ پھلی پھولی اور برگ و بار لائی اور جس نے معصیت و سرکشی اختیار کی وہ اس کے نتائج سوء سے بچ نہ سکی۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے اسلام کے دور انحطاط کے علائم میں انہی بداعمالیوں کو سرفہرست جگہ دی ہے۔ ان علائم کی جھلک عصر حاضر میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ راگ رنگ' رقص و سرود اور اس قسم کے محرمات کو تہذیب و ثقافت کا نام دیا جاتا ہے۔ زناء و غنا' کاروبار کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔ حیلے حوالوں اور غلط تاویلوں کا سہارا لے کر سند جواز مہیا کی جاتی ہے۔ رشوت ہدیہ سمجھ کر وصول کی جاتی ہے اور شراب' آب انگور' آب جو اور دوسرے ناموں سے بے جھجک استعمال کی جاتی ہے اور اس تبدیلی اسم کو وجہ جواز قرار دے لیا جاتا ہے۔ اسی طرح سود کو ایک طرح کا لین دین کہہ کر جائز سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ سود اور تجارت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ کاروبار میں نفع و نقصان دونوں کی گنجائش ہوتی ہے اور سود میں نقصان کا پہلو نہیں ہوتا بلکہ نفع ہی نفع ہوتا ہے جو دوسروں کی مجبوری و بے بسی سے فائدہ اٹھا کر سمیٹا جاتا ہے۔ موجودہ معاشرہ میں ناپ تول میں کمی اور امانت میں خیانت ایسی برائیاں بھی کم نہیں ہیں اور یہ بھی ہر رہ گزر پر مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ مرد حرکات و سکنات رفتار و گفتار اور وضع و لباس میں عورتوں کی نقالی کرتے اور عورتیں مردوں کی چال ڈھال کا چربہ اتارتی نظر آتی ہیں اور بعض اوقات تو یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ جسے ہم دیکھ رہے ہیں وہ مرد بصورت زن ہے یا زن بصورت مرد ہے۔ رہے اسلامی فرائض تو انہیں چنداں اہمیت نہیں دی جاتی۔ اگر ان کی اہمیت کا احساس ہوتا تو ان حدود پر بھی توجہ مرکوز ہوتی جو ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ چنانچہ نماز پڑھی جاتی ہے تو نہ وضو کی صحت و عدم صحت پر نظر کی

جاتی ہے' نہ جگہ کی اباحت اور جسم و لباس کی طہارت کا خیال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان شرائط کو پورا نہ کیا جائے تو نماز کا پڑھنا اور نہ پڑھنا دونوں برابر ہو جاتے ہیں اور حج میں سیر' سیاحت' شہرت اور تجارت ایسے مقاصد بھی شامل کر لئے جاتے ہیں۔ حالانکہ حج وہ ہے جو خالصتہً اللہ کے لئے ہو اور اس میں کوئی دنیوی مقصد کارفرما نہ ہو۔

بددعا کے فوری اثرات

انبیاء آئمہ اور خاصان خدا کی دعائیں وہ کسی کے حق میں ہوں یا خلاف' بارگاہ الہٰی میں مستجاب ہوتی ہیں اور خداوند عالم ان کے مرتبہ و مقام اور تقرب کے پیش نظران کی کسی دعا کو مسترد نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ جس کے حق میں دعا کرتے ہیں وہ اس دعا کا سزا وار ہوتا ہے اور بددعا کرتے ہیں تو اس کے لئے جس کا رویہ معاندانہ و جارحانہ ہوتا ہے اور وہ سچ کو سچ سمجھتے ہوئے اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس ضد اور کفر کا پھریہی علاج رہ جاتا ہے کہ اسے بددعا کا ہدف بنایا جائے۔ اوروں کی تنبیہہ و سرزنش کے لئے قدرت کی گرفت کو پکارا جائے۔ امیرالمومنین علیہ السلام بھی انہی اولیاء اللہ اور خاصان خدا میں سے تھے جن کی کوئی دعا شرف قبولیت حاصل کئے بغیر نہ رہتی تھی اور دعا کے الفاظ منہ سے نکلتے ہی قبولیت سے ہمکنار ہو جاتے تھے۔ ابن مسعود کہتے ہیں۔

لاتتعیضو الدعوہ علی فانما لا ترد۔ (مناقب) علی علیہ السلام کی بد دعا نہ لینا اس لئے کہ ان کی دعا رد نہیں ہوتی۔

استجابت دعا کے سلسلہ میں چند واقعات درج کئے جاتے ہیں۔

علی ابن زاذان کہتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے ایک حدیث بیان فرمائی تو ایک دریدہ دہن نے اس کی تکذیب کی۔ آپؑ نے فرمایا کہ میں تمہارے لئے بددعا کروں گا اگر میں جھوٹا ہوں گا تو بددعا کا کوئی اثر نہ ہو گا اور اگر میں سچا ہوں گا تو بددعا اثر کئے بغیر نہیں رہے گی۔ اس نے کہا کہ اگر آپؑ سچ کہتے ہیں تو بددعا کیجئے آپؑ نے بددعا کی اور اس کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔

جمیع ابن عمیر بیان کرتے ہیں کہ عیزار نامی ایک شخص' معاویہ کو عراق کے حالات سے آگاہ کیا کرتا تھا۔ حضرتؑ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپؑ نے اسے بلا کر کہا کہ میں نے تمہارے بارے میں سنا ہے کہ تم شامیوں کے جاسوس ہو۔ کیا تم قسم کھا کر مجھے مطمئن کر سکتے ہو کہ تم نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ اس نے قسم کھا کر کہا کہ آپؑ کو میرے بارے میں غلط اطلاع دی گئی ہے۔ آپؑ نے فرمایا۔

ان کنت کاذبا فاعمی اللہ بصرک۔ اگر تم جھوٹے ہو تو اللہ تمہیں نابینا کرے۔

اس واقعہ کو ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ بصارت سے محروم ہو گیا۔

ایک مرتبہ امیرالمومنین علیہ السلام نے بھرے مجمع میں فرمایا کہ تم میں کون ہے جس نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد سنا ہے۔

من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ و دعا من عاداہ۔ جس کا میں مولا ہوں اس کے علی علیہ السلام بھی مولا ہیں اے اللہ جو علی علیہ السلام کو دوست رکھے تو بھی اسے دوست رکھ اور جو انہیں دشمن رکھے تو بھی اسے دشمن رکھ۔

کچھ لوگوں نے اس حدیث کی صحت کی گواہی دی مگر انس ابن مالک چپ رہے۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ اے انس تم بھی تو غدیر کے موقع پر موجود تھے۔ کیا تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے یہ الفاظ نہیں سنے کہا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں میرا حافظہ کام نہیں کرتا۔ حضرتؑ نے یہ سنا تو فرمایا۔

ان کنت کاذ با فضربک اللہ ببیضاء لا معتہ لا تواریھا انعمامتہ۔ (المعارف) اگر تم جھوٹ کہتے ہو تو خدا تمہیں ایسے برص میں مبتلا کرے جسے عمامہ بھی نہ چھپا سکے۔

چنانچہ وہ برص میں مبتلا ہو گئے جس کے بعد وہ اپنا چہرہ ہمیشہ ڈھانپے رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ حسن بصری ایک جدون کے کنارے وضو کر رہا تھا کہ ادھر سے امیرالمومنین علیہ السلام کا گزر ہوا آپؑ نے اسے وضو کرتے دیکھا تو فرمایا اعضاء وضو کو اس طرح دھوؤ کہ کوئی جزو خشک نہ رہ جائے اس نے کہا کہ کبھی تو آپؑ نے ان لوگوں کو تہ تیغ کر دیا جو پوری طرح وضو کرتے تھے فرمایا کیا تم ان کے قتل پر رنجیدہ و غمگین ہو کہا ہاں فرمایا۔

فاطال اللہ حزنک۔ (بحارالانوار) تو اللہ تمہیں ہمیشہ غمگین رکھے۔

ایوب بجستانی کہتے ہیں کہ میں نے جب بھی اسے دیکھا اسے افسردہ و غمگین پایا۔ گویا اپنے کسی عزیز کو دفن کر کے پلٹا ہے۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہا۔

عمل فی دعوہ الرجل الصالح۔ (بحارالانوار) یہ ایک مرد صالح کی بددعا کا نتیجہ ہے۔

جب بسر ابن ابی ارطاۃ نے عبید اللہ ابن عباس کے دو کمسن بچوں کو ان کی ماں ام الحکم جویریہ کے سامنے ذبح

کر دیا تو حضرتؑ نے بددعا کرتے ہوئے فرمایا۔

اللھم اسلبه دینه و عقله خدایا بسر سے دین اور عقل سلب کر لے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا اس کا دین بھی جاتا رہا اور عقل بھی جاتی رہی اور آخر عمر میں اس کی دیوانگی کی یہ کیفیت تھی کہ لوگوں نے لکڑی کی ایک تلوار اسے دے دی جسے وہ مشک پر جس میں ہوا بھری ہوئی تھی دن بھر چلاتا اور یوں اپنے جذبہ خون آشامی کو تسکین دیتا یہاں تک کہ موت نے اسے جکڑ لیا۔

حضرتؑ کوفہ میں بنی مراد کے ایک زیر تعمیر مکان کی طرف سے گزر رہے تھے کہ اس مکان پر سے اینٹ کا ایک ٹکڑا گرا جس نے آپؑ کے سر کو زخمی کر دیا آپؑ نے فرمایا۔

مالیوسی من مراد تو احد اللھم لاترفعھا۔ مجھے بنی مراد سے ایک نہیں بہت سے دنوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اے خدا اسے بلند نہ ہونے دینا۔

لوگوں کا بیان ہے کہ خدا کی قسم ہم جب بھی اس مکان کی طرف سے گزرے تو دوسروں کے مکانوں کے پہلو میں یوں دکھائی دیتا تھا جیسے سینگ والے بکروں کے درمیان ایک بے سینگ کی بکری ہو۔

علم کلام

علم کلام وہ علم ہے جس میں اسلامی عقائد کی صحت کا عقلی دلائل سے اثبات اور زنادقہ' ملاحدہ اور فرق باطلہ کے نظریات کا ابطال کیا جاتا ہے۔ اسلامی عقائد کی بنیاد عقل پر استوار ہے اور کوئی عقیدہ ایسا نہیں ہے جس کی تائید عقل سے نہ ہوتی ہو۔ اس لئے اسلام نے کورانہ تقلید کے بجائے دلیل و برہان کی روشنی میں جانچ پرکھ کر رائے قائم کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ عقل کی رہنمائی سے صحیح نظریات تک پہنچا جا سکے۔ انہی نظریات و عقائد کا فکری و عقلی جائزہ لینے اور دلیل و برہان سے کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے علم کلام کی تدوین کی گئی اور علماء و متکلمین نے عقائد کے سلسلہ میں تفصیلی مباحث ترتیب دئے اور مخالفین کے شبہات کا دلائل سے رد کیا۔ مگر متقدمین میں ایک گروہ کو اپنے خود ساختہ نظریات' معیار عقلی پر پورے اترتے نظر نہ آئے تو اس نے فکر و نظر اور عقلی استدلال کو خطرناک سمجھتے ہوئے اس علم کی بھرپور مخالفت کی۔ چنانچہ امام شافعی' امام مالک احمد ابن حنبل' سفیان ثوری اور محدثین نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور حکماء و متکلمین کو ملحد و زندیق کے ناموں سے یاد کیا اور علمی سوال و جواب کو بدعت قرار دیتے ہوئے قابل تعزیر جرم ٹھہرایا۔ حضرت عمر بھی عقائد کو عقل کے معیار پر پرکھنے کے خلاف تھے اور علمی و عقلی مسئلہ پوچھنے پر سزا سے بھی درگزر نہ کرتے تھے۔ چنانچہ امام غزالی نے تحریر کیا ہے۔

وھوالذی سد باب الکلام و لجدل و ضرب ضبیعا بلد رہ لما اورد علیہ سوالا فی تعارض آیتین من کتاب اللہ وحجزہ وامر الناس بھجرہ۔ (احیاء العلوم ج ا ص ۲۱)

حضرت عمرؓ نے علم کلام وجدل کا دروازہ بند کیا اور ضبیع تمیمی نے جب دو آیتوں کے باہمی اختلاف کے بارے میں ان سے سوال کیا تو انہوں نے اسے درہ سے مارااور اس سے قطع تعلق کر لیا اور دوسروں کو بھی اس سے قطع مراسم کا حکم دیا۔

اس مخالفت اور انتہائی مخالفت کے باوجود یہ علم برگ و بار لایا اور اس کی استدلالی قوت کے سامنے ارباب ظاہر کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور آج اسلامی مکاتب فکر میں سے کوئی بھی اس کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کرتا عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے معتزلہ نے عقلی استدلال کا دروازہ کھولا اور مذہب و عقل میں تطبیق پیدا کر کے علم کلام کی بنیاد رکھی مگر حقیقت یہ ہے کہ اس علم کا سرچشمہ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی تھی۔ چنانچہ آپؐ نے مختلف ادیان و مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کی صداقت و برتری کا اثبات دلائل و براہین سے فرمایا اور وہ دلائل عقلی معیار اور منطقی طرز استدلال پر پورے اترتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آئمہ اہل بیت نے اسی سرچشمہ نبوت سے سیراب ہو کر اس علم کی آبیاری کی خصوصاً" امیرالمومنین علیہ السلام نے اس کے نشر و ارتقاء میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اسلامی نظریات و عقائد کو عقل کی روشنی میں پیش کیا۔ چنانچہ توحید، عینیت، صفات، رسالت، معاد، قضا و قدر اور جبرو اختیار کے سلسلہ میں آپ کے خطبات اور یہود و نصاریٰ اور زنادقہ کے مقابلہ میں آپ کے احتجاجات اس کا روشن ثبوت ہیں۔ علماء متکلمین نے آپؑ ہی کے کلمات سے طریق استدلال کے رموز سیکھے اور آپؑ ہی کے افادات کی بنیادوں پر علم کلام کی عمارت کھڑی کی۔ امام رازی تحریر کرتے ہیں۔

قد جاء فی خطب امیرالمومنین علی ابن ابی طالب من اسرار التوحید والعدل والنبوہ والقضاء والقدر واحوال المعاد مالم یات فی کلام سائرالصحابہ و ایضاً فجمیع فرق المتکلمین ینتھی اخر نسبتھم فی ھذا العلم الیہ۔ (اربعین ص ۴۶۷)

امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے خطبات میں توحید، عدل، نبوت اور قضاء و قدر کے اسرار اور معاد کے حالات اتنے بیان ہوئے ہیں کہ تمام صحابہ کے مجموعی کلام میں بھی نظر نہیں آتے۔ اس علم میں متکلمین کے تمام گروہوں کا آخری نقطہ انتساب آپ ہی پر منتہی ہوتا ہے۔

مصری مؤرخ عقاد اس علم میں حضرت کی اقدمیت کا اعتراف کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

عند اخذ الحکماء الذین شرعوا علم الکلام قبل ان یتطرق الیهم علم فارس او علم یونان۔ (العبقریات الاسلامیہ ص ۸۵۶)

وہ حکماء جنہوں نے علم کلام کا آغاز کیا انہوں نے یہ علم حضرتؑ ہی سے حاصل کیا قبل اس کے کہ فارس یا یونان کا علم ان تک پہنچے۔

لہٰذا اس میں شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس علم کے بانی امیرالمومنین علیہ السلام تھے آپؑ ہی نے اس کی داغ بیل رکھی اور آپؑ ہی نے اسے نقطہ عروج پر پہنچایا۔ علامہ محسن الامین نے تحریر کیا ہے۔

امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام مقتدی الشیعہ و امامهم و اول من سن مایسمی علم الکلام والاحتجاج فی الاسلام۔ (اعیان الشیعہ ج ۱ ص ۲۲۴)

امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام جو شیعوں کے مقتداؤ امام ہیں اور وہ پہلے فرد ہیں جنہوں نے اس علم کی داغ بیل ڈالی جو علم کلام و احتجاج کے نام سے موسوم ہے۔

علم مناظرہ و احتجاج

علم مناظرہ وہ علم ہے جس میں اثبات مدعا اور طریق استدلال یا ابطال دعوی اور رد استدلال کے اصول و آداب سے بحث کی جاتی ہے۔ مناظرہ اگر حدود مناظرہ میں رہ کر کیا جائے تو اس پر نتیجہ خیز اثرات مرتب ہو سکتے ہیں اور باہمی سوال و جواب اور جواب الجواب سے صحیح اور غلط نظریہ کا امتیاز ہو جاتا ہے اور مناظرہ کا مقصد بھی یہی امتیاز حق و باطل ہے۔ لہٰذا ہر فریق کے لئے ضروری ہے کہ آداب مناظرہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے حقیقت طلبی کے جذبہ کے ساتھ گفتگو کرے' فریق مخالف کی بات ضبط و سکون اور فراخ حوصلگی سے سنے' سخت اور درشت لہجے میں جواب دینے کے بجائے متانت و سنجیدگی کے انداز میں جواب دے' خارج از موضوع کوئی بات نہ چھیڑے' اوچھے ہتھیاروں پر اترنے اور ذاتیات پر حملہ آور ہونے سے اجتناب برتے اور دوسرے فریق کو معقول دلائل سے قائل کرنے اور اسی کے مسلمات سے مطمئن کرنے کی کوشش کرے۔ اگر دلائل اور فریق ثانی کے مسلمات کو نظرانداز کر کے سخن پروری و کج بحثی سے کام لے گا اور وقتی ہار جیت ہی کو پیش نظر رکھے گا تو وہ مناظرہ نہ ہو گا مکابرہ ہو گا جس کا مقصد صرف مد مقابل کو الجھاوؤں میں ڈال کر نیچا دکھانا اور اپنی ہمہ دانی و چرب زبانی کا سکہ بٹھانا ہوتا ہے جو کسی طرح ممدوح و قابل ستائش نہیں ہے اور نہ ہی کوئی غیر جانبدار و معاملہ فہم انسان اس سے متاثر ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید میں آداب مناظرہ کی رہنمائی کے سلسلہ میں ارشاد ہے۔

ادع الی سبیل ربک بالحکمتہ و الموعظتہ الحسنتہ وجادلھم بالتی ھی احسن۔

تم لوگوں کو حکمت و پسندیدہ موعظت کے ذریعہ اپنے پروردگار کی راہ کی طرف بلاؤ اور بحث و مباحثہ کرو تو عمدہ اور شائستہ طریقہ سے۔

دنیائے اسلام میں سب سے پہلے امیرالمومنین علیہ السلام نے مخالفین و مبتدعین سے بحث و مباحث کی طرح ڈالی۔ ان کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا اور اسلام کی صداقت کے نقوش ان کے ذہن نشین کئے۔ چنانچہ امام غزالی تحریر کرتے ہیں۔

واول من سن دعوہ المبتدعہ بالمجادلہ الی الحق علی ابن ابی طالب۔ (احیاء العلوم ج ا ص ۸۵)

جس نے سب سے پہلے فرق ضالہ کو بحث و مباحثہ کے ذریعہ حق کی دعوت دی وہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام تھے۔

علامہ مجلسی نے تحریر کیا ہے۔

وان اول من سن دعوہ المبتدعہ بالمجادلہ الی الحق علی وقد ناظرہ الملاحدۃ فی مناقضات القرآن و اجاب مشکلات مسائل الجاثلیق حتی اسلم۔ (بحارالانوار ج ٦ ص ۴٦۳)

جس نے سب سے پہلے بحث و جدل کے ذریعہ مذاہب باطلہ کو حق کی دعوت دی وہ حضرت علی علیہ السلام تھے چنانچہ ملحدوں نے قرآنی اختلافات کے بارے میں ان سے مناظرے کئے اور جاثلیق کے مشکل سوالات کے جوابات دئے جس کے نتیجہ میں وہ اسلام لے آیا۔

امیرالمومنین علیہ السلام جب بھی کسی سے مناظرانہ رنگ میں گفتگو کرتے تو اسے دلائل کے زور سے خاموش کر دیتے اور جواب الجواب کی نوبت نہ آنے دیتے۔ چنانچہ خوارج کے مختلف نمائندوں اور یہود و نصاریٰ کے عالموں سے جو مختلف مواقع پر مباحثے کئے یا معترضین کو جواب دئے وہ ان کے لئے قفل دہن ثابت ہوئے۔ علامہ مجلسی نے کتاب ابو بکر ابن مردویہ کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ۔

ماحاج علی احدالا حجہ۔ (بحارالانوار ج ۹ ص۔ ۴٦۳)

حضرت علی علیہ السلام نے کسی سے استدلالی گفتگو نہیں کی مگر یہ کہ اسے لاجواب کر دیا۔

ذیل میں حضرت کی چند احتجاجی گفتگوئیں تحریر کی جاتی ہیں۔

ایک مسیحی سے الوہیت مسیح کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا۔

لولا تمرد عیسیٰ عن عبادہ اللہ لصرت علی دینہ۔ (عیون الاخبار)

اگر عیسیٰ علیہ السلام اللہ کی عبادت سے گریز نہ کرتے تو میں ان کا دین اختیار کر لیتا۔

اس مسیحی نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف عبادت سے گریز کی نسبت صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ وہ ہمہ وقت عبادت میں منہمک رہتے تھے۔ فرمایا اگر تمہارے عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود خدا تھے تو وہ عبادت کس کی کرتے تھے جبکہ عبادت کرنا بندے کے شایان شان ہے نہ خدا کے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نہروان سے واپس پلٹ کر کوفہ تشریف لائے تو کچھ لوگوں نے کہا کہ آپؑ نے جس طرح طلحہ، زبیر اور معاویہ سے جنگ کی اسی طرح ابوبکر و عمر سے جنگ کیوں نہ کی۔ فرمایا۔

لصراز لی مظلوما مستاثر اعلی حقی۔ (احتجاج طبری ص ۱۰۱)

میں ہمیشہ مظلوم رہا اور میرے حق پر دوسروں کو ترجیح دی جاتی رہی۔

اس پر اشعث ابن قیس نے کہا تو پھر اس کا واحد حل یہ تھا کہ آپؑ تلوار اٹھاتے اور اپنے حق کا مطالبہ کرتے۔ فرمایا اے اشعث اگر تم نے یہ بات کہی ہے تو اس کا جواب بھی سن لو۔ میں اس خاموشی کے سلسلہ میں چھ نبیوں کے طریق کار پر عمل پیرا رہا ان میں ایک حضرت نوح علیہ السلام ہیں جن کے بارے میں ارشاد قرآنی ہے۔

فدعا ربہ انی مغلوب فانتصر۔

نوح نے اپنے پروردگار سے دعا مانگی کہ میں ان لوگوں کے مقابلہ میں کمزور ہوں لہذا تو ہی ان سے بدلہ لے۔

دوسرے حضرت لوط علیہ السلام ہیں جنہوں نے کہا۔

لوان لی بکم قوۃ او اوی الی رکن شدید۔

کاش تمہارے مقابلہ کی مجھ میں طاقت ہوتی یا میں کسی مضبوط قلعہ میں سر چھپا سکتا۔

تیسرے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جنہوں نے کہا۔

واعتزلکم وما تدعون من دون اللہ۔

میں تم سے اور ان بتوں سے جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو الگ ہو جاؤں گا۔

چوتھے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں جنہوں نے کہا۔

فضررت منکم لما خفتکم۔ میں جب تم لوگوں سے ڈرا تو بھاگ کھڑا ہوا۔

پانچویں حضرت ہارون علیہ السلام ہیں جنہوں نے کہا۔

یابن ام ان القوم استضعفونی و کادوا یقتلو ننی۔ اسے میرے ماں جائے قوم نے مجھے کمزور و ناتواں پایا اور بعید نہ تھا کہ وہ مجھے قتل کر دیتے۔

چھٹے خیرالبشر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ ہیں جنہوں نے قریش سے خطرہ محسوس کیا تو آمادہ ہجرت ہوئے اور مکہ سے نکل کر غار ثور میں پناہ لی اور مجھے اپنے بستر پر سونے کا حکم دے گئے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ان انبیاء کرام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو کوئی ڈر خوف نہ تھا تو یہ صریحاً غلط اور قرآنی آیات کے خلاف ہے۔ لہٰذا جب ظاہری اسباب اور تاب مقاومت نہ ہونے کی صورت میں انبیاء تک مقابلہ سے اجتناب کرتے رہے تو یارو مددگار نہ ہونے کی صورت میں وصی پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بھی معذور سمجھنا چاہیئے۔

حضرت ابوبکر مہاجرین و انصار کے حلقہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ امیرالمومنین علیہ السلام تشریف لائے اور ابوبکر سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم نے دختر رسول فاطمہ سلام اللہ علیہا کو فدک دینے سے کیوں انکار کیا ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنی زندگی میں انہیں ہبہ فرما چکے تھے ابوبکر نے کہا کہ فدک عامۂ مسلمین کا مال ہے اگر فاطمہ سلام اللہ علیہا گواہ پیش کریں تو ان کا حق تسلیم کر لیا جائے گا۔ ورنہ یہ مسلمانوں ہی کا مال قرار پائے گا اور حکومت وقت کی تحویل میں رہے گا فرمایا کہ اگر کوئی چیز مسلمانوں کے قبضہ میں ہو اور میں یہ دعویٰ کروں کہ یہ میری ملکیت خاصہ ہے تو تم گواہوں کا مطالبہ کس سے کرو گے کہا آپؑ سے فرمایا کہ پھر تم فاطمہ علیہا السلام سے کس بنا پر گواہوں کا مطالبہ کر سکتے ہو جبکہ فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانہ حیات سے ان کے قبضہ میں چلا آرہا ہے۔ پھر یہ بتاؤ کہ اگر چند افراد فاطمہ علیہا السلام کے بارے میں کسی ایسے امر کے ارتکاب کی گواہی دیں جس پر حد شرعی عائد ہوتی ہو تو تم کیا قدم اٹھاؤ گے کہا کہ میں حد شرعی جاری کروں گا فرمایا کہ اگر تم نے ایسا ارادہ کیا تو دائرہ اسلام سے خارج ہو جاؤ گے کہا کس طرح فرمایا کیا تم نے قرآن مجید میں یہ آیت پڑھی ہے۔

انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھر کم تطھیرا۔ اے اہل بیت علیہ السلام اللہ کا یہ ارادہ ہے کہ تم سے ہر پلیدی کو دور رکھے اور تمہیں ایسا پاک و پاکیزہ کر دے جیسا پاک و پاکیزہ کرنے کا حق ہے۔

کہا ہاں پڑھی ہے فرمایا کیا فاطمہ علیہا السلام بھی اہل بیت علیہ السلام میں شامل ہیں کہا ہاں شامل ہیں فرمایا کہ

پھران پر حد جاری کرنے کے معنی یہ ہوں گی کہ اللہ نے ان کی طہارت و پاکیزگی کی جو گواہی دی ہے تم نے اسے رد کر دیا اور اللہ کے مقابلہ میں چند جہلا کی گواہی قبول کرلی۔ یاد رکھو کہ تم نے فدک کے بارے میں اللہ کی گواہی کو بھی قابل اعتماد نہیں سمجھا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے اس ارشاد کو بھی نظرانداز کر دیا کہ۔

البینتہ علی المدعی والیمین علی المدعی علیہ۔ بینہ و گواہی مدعی کے ذمہ ہے اور مدعا علیہ پر قسم عائد ہوتی ہے۔

علم الادب

زبان و بیان کی تمام خوبیوں کے ساتھ خیالات و افکار کی ترجمانی کا نام ادب ہے۔ ادب صرف معنی آفرینی و فکر پیمائی ہی سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے اسلوب بیان کی شگفتگی، طرز ادا کی دلاویزی اور لفظوں کے دروبست کی حسن آفرینی بھی ضروری ہے۔ اگرچہ الفاظ سے مقصود معنی ہی ہوتے ہیں مگر معانی براہ راست دوسروں کے ذہن میں منتقل نہیں کئے جا سکتے۔ ان کے لئے الفاظ کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے کیونکہ معانی و مطالب کے ابلاغ کا یہی ایک ذریعہ ہیں ان کے بغیر نہ معانی کی منتقلی عمل میں آسکتی ہے اور نہ افہام و تفہیم کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر الفاظ بھونڈے، ترتیب کنجلک اور اسلوب الجھا ہوا ہو گا تو معنی دھندلے اور اثر کمزور پڑ جائے گا۔ اس کے برعکس اگر الفاظ شستہ، لسانی قواعد کے مطابق اور موقع و محل کے اعتبار سے مناسب ہوں گے تو معنی واضح اور کلام پر اثر ہو گا اور ادب کا مقصد ہی یہ ہے کہ اپنی بات کو دلنشین لفظوں کے قالب میں ڈھال کر دوسروں کے ذہن میں اتارا جائے اور الفاظ کے حسن و اثر آخر ہی سے ایک سحر آگہی فضا پیدا کر کے احساس و شعور کو متاثر کیا جائے۔

یہ علم اپنی افادیت کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس سے فکر و نظر اور علم و فن کی زندگی و بقا وابستہ ہے چنانچہ گزشتہ اقوام و ملل کے تہذیبی اور اخلاقی اور سیاسی معاشرتی حالات کا اندازہ ان کے علمی و ادبی ذخائر ہی سے ہوتا ہے اور ہر قوم کا ادب اس کی اخلاقی معاشرتی اور سیاسی زندگی کی تصویر اور اس کے عادات اور تہذیب کا آئینہ ہوتا ہے۔ ادب سے جہاں مختلف قوموں کی تمدنی و معاشرتی تہذیبوں کا پتا چلتا ہے وہاں لفظ کو معنی سے ہم آہنگ کرنے کے لئے احساسات کو عملی جامہ پہنانے اور انہیں پر اثر بنانے کا ملکہ بھی حاصل ہوتا ہے اور اس طرح زبان، نکھر، سنور کر ارتقائی منازل طے کرتی اور فروغ پاتی ہے۔ یوں تو ہر زبان میں ادب کے بہتر سے بہتر نمونے موجود ہیں مگر عربی زبان اپنی لطافت شیرینی اور متوازن الفاظ کے اعتبار سے ادبی تخلیق کے لئے نہایت موزوں واقع ہوئی ہے اسی لئے ہر دور میں اس کا دامن نظم و نثر کے ادب پاروں سے مالا مال رہا ہے اور کوئی زبان ادبی لطافتوں اور بلاغت آفرینیوں میں اس کے مقابلہ پر نہ آسکی۔

عربی ادب کے ارتقاء اور اسے اوج و عروج کے بام بلند تک پہنچانے میں امیرالمومنین علیہ السلام کے خطبات و نگارشات کا حصہ سب سے زیادہ رہا ہے۔ آپؑ نے زبان کو نئے اسلوب و آہنگ دیئے۔ اظہار بیان کا نیا سلیقہ بخشا' فصاحت و بلاغت کی راہیں کھولیں' زبان کے اصول و قواعد تعلیم کئے اور ادب کے ہر شعبہ میں ایسے درخشاں نقوش چھوڑ گئے جنہیں راہروان وادی ادب نے علمی دستاویز و ادبی سند قرار دے کر مشعل راہ بنایا۔

ادب کے ذیل میں صرف و نحو' لغت' عروض و قوافی' قرأت و کتابت نظم و نثر اور معانی بیان اور بدیع سے بحث کی جاتی ہے۔ ان میں سے ہر شعبہ مستقل علم کا درجہ رکھتا ہے لہٰذا ہر شعبہ کو الگ الگ عنوان کے تحت درج کیا جاتا ہے۔

علم صرف و نحو

عربی زبان میں لفظ کی ہیئت و حرکت کی تبدیلی سے معنی میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ جس علم کے ذریعہ لفظ کی ہیئت کا علم حاصل ہوتا ہے اسے علم صرف اور جس علم کے ذریعہ حرکات (زیر' زبر' پیش) کا علم حاصل ہوتا ہے اسے علم نحو کہا جاتا ہے۔ انہی حرکات کے ذریعہ مختلف معانی میں امتیاز اور معنی مقصود کی تعیین ہوتی ہے۔ اگر حرکت اعراب میں غلطی واقع ہو گی تو معنی کچھ کے کچھ ہو جائیں گے مثلاً ما احسن زیداً کو اگر ما احسن زیدٌ پڑھا جائے تو معنی بدل جائیں گے اس لئے کہ پہلے جملہ کے معنی یہ ہیں کہ زید کتنا اچھا ہے اور دوسرے جملہ کے معنی یہ ہیں کہ زید نے کوئی اچھائی نہیں کی۔ عرب اہل زبان تھے انہیں اعرابی صحت کے لئے قواعد و ضوابط کا سہارا لینے کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ خود ان کی بول چال سے ضوابط کا استخراج کیا جاتا تھا مگر موالی و معربین اعرابی غلطیوں کا شکار ہو جاتے تھے' جو اہل زبان کی قوت سماعت پر گراں گزرتی تھیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سامنے اعرابی غلطی کی تو آپؐ نے فرمایا۔

ارشدوا اخاکم فقد ضل۔ (المزہر ج ۲ ص ۳۹۶) اپنے بھائی کی غلطی کی اصلاح کرو یہ بھٹک گیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد جب فتوحات کا دور آیا تو عربوں اور عجمیوں کے آپس کے میل جول بڑھے۔ اس میل ملت اور باہمی بات چیت کے نتیجہ میں زبان کا متاثر ہونا بھی طبعی امر تھا۔ چنانچہ بول چال میں اعرابی غلطیاں ہونے لگیں۔ امیرالمومنین علیہ السلام کو اس کا احساس ہوا کہ اگر زبان کی حفاظت کا ساماں نہ کیا گیا تو عجمی اثرات سے اس صورت بگڑ کی جائے گی۔ لہٰذا اس کے گرداگرد قواعد کی ایک محکم باڑ باندھ دینا چاہیے تاکہ اس کی صحت برقرار رہے۔ چنانچہ آپؑ نے لسانی قواعد کے اصول وضع کئے اور ابوالاسود دئلی کو ان کی ترتیب و تدوین پر مامور کیا۔

ابوالاسود بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ امیرالمومنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپؑ سر جھکائے خاموش بیٹھے ہیں گویا کچھ سوچ رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ یا امیرالمومنین علیہ السلام آپ کس فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں فرمایا کہ عجمیوں کے آنے جانے اور ان کے اختلاط سے ایسے کلمات سننے میں آتے ہیں جو اعرابی اعتبار سے غلط اور استعمالات عرب کے خلاف ہوتے ہیں۔ اگر تصحیح زبان کی طرف توجہ نہ کی گئی تو لفظ و معنی کی سمتیں بدل جائیں گی اور کوئی بات صحیح طور پر سمجھی نہ جا سکے گی۔ اس لئے میں نے سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ عربی زبان کے قواعد منضبط کر دوں تاکہ صحیح و غلط میں امتیاز ہو سکے اور کلام میں غلطی واقع ہونے نہ پائے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ ایسا کر جائیں گے تو عربی زبان ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جائے گی ورنہ غلط استعمالات کے نشر و شیوع سے زبان کے خط و خال مسخ ہو جائیں گے اور رفتہ رفتہ قرآن و حدیث کی زبان سے دوری ہو جائے گی۔ ابوالاسود کہتے ہیں کہ تین دن کے بعد میں پھر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؑ نے کاغذ کا ایک پرزہ میری طرف بڑھایا جس پر تحریر تھا۔

الکلام کلہ اسم و فعل و حرف الاسم ما انباء عن المسمی و الفعل ما انباء عن حرکتہ المسمی والحرف ما انباء عن معنی لیس باسم ولا فعل۔

کلام کی تین قسمیں ہیں اسم، فعل اور حرف، اسم وہ ہے جو کسی مسمیٰ کا پتا دے اور فعل وہ ہے جو مسمیٰ کے عمل و حرکت کا پتا دے اور حرف وہ ہے جس میں نہ اسم کے معنی ہوں اور نہ فعل کے۔

پھر آپؑ نے فرمایا۔

واعلم یا ابا الاسود ان الاشیاء ثلثہ ظاہر و مضمر و شئی لیس بظاہر ولا مضمر۔ (معجم الادباء ج ۱۳ ص ۴۹)

اے ابوالاسود تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اشیاء کی تین قسمیں ہیں ظاہر، مضمر اور وہ جو نہ ظاہر نہ مضمر (جیسے اسم اشارہ)۔

اس کے بعد آپؑ نے معرفہ و نکرہ، وجوہ اعراب، رفع نصب جر اور چند دوسرے اصول بیان فرمائے اور فرمایا **انح ھذا النحوہ** "تم یہ طریقہ اختیار کرو" حضرت کے اس قول سے ان قواعد کا نام نحو قرار پا گیا۔ ابوالاسود کہتے ہیں کہ میں نے حضرت کی ہدایت جانب کے مطابق کچھ قواعد مرتب کر کے اصلاح کے لئے آپؑ کی خدمت میں پیش کئے اور جب حروف ناصبہ **انّ، انہ لیت لعل اور کان** گنوائے تو آپؑ نے فرمایا کہ **لکن** کو تو چھوڑ گئے میں نے کہا کہ میرا خیال تھا کہ لکن حروف ناصبہ میں سے نہیں ہے فرمایا ایسا نہیں ہے یہ بھی ان میں داخل ہے چنانچہ میں نے اسے بھی بڑھا دیا۔

ابوالاسود نے اس سلسلہ میں جو کچھ سیکھا امیرالمومنین علیہ السلام ہی سے سیکھا۔ علامہ سیوطی تحریر کرتے ہیں۔

كان ابوالاسود اخذ ذلک عن امیرالمومنین علی رضی اللہ عنہ۔ (المزہر ج ۲ ص ۳۹۷)

ابولاسود نے علم نحو امیرالمومنین علی رضی اللہ عنہ سے حاصل کیا۔

ابوالاسود سے ان کے فرزند عطاء ابن ابی الاسود۔ یحیٰ ابن یعمر میمون الاقرن اور عنبسہ ابن عبدان نے یہ فن سیکھا اور دوسروں کو سکھایا اس کے بعد خلیل ابن احمد فراہیدی متوفی ۱۷۵ھ اور ان کے شاگرد اخفش مجاشعی متوفی ۲۱۵ھ نے اس کے قواعد منضبط کے اور اس کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ بیشک ان لوگوں کی محنت و عرق ریزی سے یہ علم پایۂ تکمیل تک پہنچا مگر ایک علم کو تشریحات و توضیحات سے تکمیل تک پہنچانا اور ہے اور اس کی ایجاد اور بنیاد رکھنا اور ہے۔ علامہ عقاد تحریر کرتے ہیں۔

حصته الامام من علم النحو عظيمه لان الابتدء بها اصعب من تحصيل المجلد ات الفخام التى دونها النحاه بعد تقلم العلم و تكثرالناظرين فيه۔ (عبقریتہ الامام ص ۱۸۶)

علم نحو میں حضرت علی علیہ السلام کا بہت بڑا حصہ ہے اس لئے کہ اس کی ایجاد و تاسیس اس سے کہیں زیادہ مشکل تھی کہ نحو کی ضخیم کتابیں تصنیف کر دی جائیں جبکہ نحویوں کی تدوین سے پہلے یہ علم ایجاد ہو چکا تھا اور اس پر بحث و نظر کرنے والوں کی بھی کثرت تھی۔

یہ واضح رہے کہ علم صرف، علم نحو ہی کا ایک شعبہ ہے اور دونوں کا موضوع کلمہ و کلام ہے فرق یہ ہے کہ اگر صحت و اعتدال کے لحاظ سے بحث کی جائے تو علم صرف ہے اور ترکیب و اعراب کے اعتبار سے بحث کی جائے تو علم نحو ہے۔ اس لئے یہ دونوں علم علوم عربیہ کے ذیل میں یکجا بیان کئے جاتے رہے ہیں۔ ابوعثمان مازنی متوفی ۲۴۹ھ نے اسے نحو سے الگ کیا اور پھر مستقلاً علم صرف پر کتابیں تحریر کی جانے لگیں۔ بہرحال علم صرف کی تاسیس علم نحو کے ساتھ ساتھ ہوئی۔ لہٰذا جو علم نحو کا موجد ہو گا وہی علم صرف کا موجد قرار پائے گا اور علم نحو کے ایجاد کا سہرا بلا شبہہ حضرتؑ کے سر ہے جس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ کچھ لوگوں نے عبدالرحمن ابن ہرمز اعرج اور کچھ لوگوں نے نصرابن عاصم کو نحو کا موجد قرار دینے کی کوشش کی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان دونوں نے نحو کے ابتدائی اصول ابوالاسود سے سیکھے اور ابوالاسود اس فن میں امیرالمومنین علیہ السلام کے شاگرد تھے۔

علم اللغت

علم اللغت کے معنی زبان دانی کے ہیں۔ زبان دانی کے لئے اصلی اور دخیل مترادف اور متباین، مشترک اور متشابہہ الفاظ اور ان کی ہیئت و ساخت کا جاننا ضروری ہے تاکہ تلفظ، محل استعمال اور حقیقی و مجازی معنی کی تشخیص میں غلطی نہ ہونے پائے۔ ہر زبان میں حسب ضرورت الفاظ کا سرمایہ پایا جاتا ہے۔ ابتداء میں ضروریات محدود ہوتی ہیں

اس لئے الفاظ کا ذخیرہ میں محدود ہوتا ہے اور جوں جوں ضروریات بڑھتی جاتی ہیں الفاظ کا دائرہ بھی پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح کہ یا تو نئی اشیاء اور جدید معانی کے لئے نئے الفاظ وضع کئے جاتے ہیں یا دوسری زبان کی لفظوں کو اپنے لب و لہجہ کے سانچے میں ڈھال کر اپنی زبان کے حدود میں داخل کر لیا جاتا ہے۔ عربی زبان بھی تعمیر و ساخت اور شکست و ریخت کے انہی مرحلوں سے گزر کر اور ریگزار عرب کے وسیع دامنوں میں پل کر پروان چڑھی اور متمدن زبانوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ عربی زبان ارتقاء کی راہ پر اس وقت گامزن ہوئی۔ جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے مکہ میں طرح اقامت ڈالی اور قحطان کی ایک شاخ بنی جرہم میں رشتہ ازدواج قائم کیا۔ اس طرح دو خاندانوں کے اختلاط اور عربی و عبرانی کی آمیزش سے زبان میں توسیع ہوئی اور الفاظ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔ اس وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس میں چھیالیس ہزار چار سو متروک الفاظ کے علاوہ چھ کروڑ پانچ لاکھ بیس ہزار الفاظ مستعمل ہیں۔ حالانکہ کسی معیاری زبان کا سرمایہ الفاظ ساڑھے چار لاکھ سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ عربی زبان میں ایک ایک شے کے لئے اس کی مختلف حالتوں اور کیفیتوں کے پیش نظر متعدد الفاظ وضع کئے جاتے رہے ہیں مثلاً" شیر کے لئے پانچ سو' سانپ کے لئے دو سو اور کتے کے لئے ستر الفاظ مستعمل ہیں۔ ایک مرتبہ عرب کا مشہور شاعر ابوالعلاء معری' علم الہدیٰ سید مرتضیٰ کے ہاں حاضر ہوا۔ جب دروازہ پر تو پہنچا تو کسی چیز سے ٹھوکر کھائی ایک شخص کی زبان سے نکلا **من هذا الكلب** یہ کتا کون ہے ابوالعلاء نے کہا کہ کتا وہ ہے جو کتے کے ستر اسماء سے ناواقف ہو۔ سید مرتضیٰ نے یہ سنا تو اسے بلایا اور جب اس سے بات چیت کی تو معلوم ہوا کہ وہ زبان عرب پر عبور تام رکھتا ہے۔ غرض دنیا کی کوئی ترقی یافتہ زبان عربی زبان کی وسعت کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور نہ کوئی ایسی لغت تدوین کی جا سکی ہے جو تمام الفاظ' امثال اور محاورات عرب پر حاوی ہو اگرچہ خلیل ابن احمد فراہیدی متوفی ۱۷۵ ھ نے کتاب العین' ابوبکر ابن درید متوفی ۳۲۱ ھ نے جمہرہ' ابوالحسن احمد ابن فارس متوفی ۳۹۰ ھ نے مجمل' ابونصر اسمٰعیل جوہری متوفی ۳۹۸ ھ نے صحاح' ابو غالب تمام ابن غالب قرطبی متوفی ۴۳۶ ھ نے تلقیح العین' ابن سیدہ اندلسی متوفی ۴۵۸ ھ نے المحکم' ابن منظور افریقی متوفی ۷۱۱ ھ نے لسان العرب' مجدالدین فیروز آبادی متوفی ۸۱۷ ھ نے قاموس اور دوسرے لغویین نے بے شمار کتابیں لغت میں ترتیب دیں اور جب تک تدوین و تالیف کا سلسلہ جاری ہے مگر کسی کتاب کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ تمام الفاظ عرب کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔

امیرالمومنین علیہ السلام زبان عرب پر پوری دسترس رکھتے تھے۔ چنانچہ آپؑ کے خطب' خطوط و فرامین اور کلمات حکمیہ میں لفظوں کا اتنا وافر سرمایہ ہے کہ اس دور کے ادباء و فصحاء کا مجموعی کلام بھی اتنے الفاظ پر محیط نہیں ہے۔ آپؑ تحریر و تقریر میں الفاظ پر الفاظ لاتے۔ الفاظ کی مرصع تصویر کھینچتے' حرف و صوت میں حقائق و معارف سموتے' کلام میں تفنن و بوقلمونی پیدا کرتے اور کسی موقع پر ثقیل اور نامانوس الفاظ کا سہارا نہ لیتے بلکہ ہر لفظ نکھری سنوری اور فصاحت کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہوتی۔ استاد محی الدین محشی' نہج البلاغہ تحریر کرتے ہیں۔ **املكهم لغته يدير ها كيف يشاء** "وہ لغت عرب پر سب سے زیادہ اقتدار رکھتے تھے اور جس صورت سے چاہتے اسے گردش دیتے

تھے" آپؑ جس لفظ کا جس طرح تلفظ کرتے وہ اس کی صحت کی سند قرار پا جاتا۔ چنانچہ نضر ابن شمیل بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ مامون رشید عباسی کے ہاں گیا۔ مامون نے بر سبیل تذکرہ یہ حدیث بیان کی۔

حدثنا هشيم عن الشعبي عن ابن عباس قال رسول الله اذا تزوج الرجل اعراۃ لدينها وجمالها كان فيها سداد من عوز۔ (المزہر)

ہم سے ہشیم نے اس نے شعبی سے اور شعبی نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی عورت سے اس کے دین اور جمال کی وجہ سے عقد کرے وہ اسے تنگدستی و احتیاج سے بچا لے جائے گی۔

مامون نے لفظ سداد د بفتح سین پڑھی۔ نضر نے کہا کہ ہمیں یہ حدیث امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے سلسلہ روایت سے پہنچی ہے اور آپ نے سداد بکسر سین فرمایا تھا اور اس مقام پر سداد ہی صحیح ہے مامون نے کہا کہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ میں نے غلط پڑھا ہے کہا کہ یہ آپ کی غلطی نہیں ہے بلکہ ہشیم کی غلطی ہے اور آپ نے تو جیسا سنا ویسا بیان کیا مامون نے کہا کہ سَداد اور سِداد میں کیا فرق ہے کہا کہ سَداد کے معنی صحت و درستی کے ہیں اور سِداد کے معنی کسی نقصان کی تلافی یا کسی شے کے تدارک کے ہیں۔ کہا کہ کلام عرب میں اس کا کوئی شاہد ہے کہا ہاں اور عبداللہ ابن عمرو عرجی کا یہ شعر پڑھا۔

اضاعونی وای فتی اضاعوا۔
لیوم کریھتہ وسداد شغر۔

انہوں نے مجھے اپنے ہاتھوں سے کھو دیا جنگ کے دن اور سرحدوں کی حفاظت کے موقع پر انہیں احساس ہو گا کہ انہوں نے کیسے جوان کو کھویا ہے"

عربی زبان بھی دوسری زبانوں کی طرح جذب و قبول کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ چنانچہ اس میں فارسی، رومی، نبطی، حبشی، قبطی، عبرانی اور سریانی زبانوں کے الفاظ بھی سموئے ہوئے ہیں جیسے سندس، قسطاس زنجبیل وغیرہ یہ اور اس قسم کے دوسرے الفاظ مزاج و ساخت کے اعتبار سے عربی لفظوں میں گھل مل گئے ہیں۔ حضرتؑ نے بھی توسیع زبان کے لئے غیر عربی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپؑ نے قاضی شریح سے پوچھا کہ اگر ایک عورت کو طلاق دی گئی ہو اور وہ یہ دعویٰ کرے کہ اسے ایک مہینہ میں تین مرتبہ خون آتا ہے تو تم اس کے عدہ کے بارے میں کیا فیصلہ کرو گے۔ شریح نے کہا کہ اگر اس کے گھر والے اس کی تصدیق کریں تو اس کے قول کو صحیح سمجھا جائے گا حضرت نے فرمایا قالون یہ رومی زبان کی لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ تم نے صحیح کہا (لسان العرب)

ایک مرتبہ کچھ لوگوں کو دامن لٹکائے چلتے دیکھا تو فرمایا۔

كانهم اليهود خرجوامن فهو رهم۔ (شرح ابن ابی الحدید ج ۴ ص ۳۶۱) گویا یہ یہودی ہیں جو اپنی درسگاہوں سے باہر نکل رہے ہیں۔

فهور فهر کی جمع ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے کہ یہ نبطی یا عبرانی زبان کی لفظ ہے۔ اس کی اصل **بهر** ہے جس کے معنی یہودیوں کی درسگاہ یا اس مقام کے ہیں جہاں وہ عید کے لئے جمع ہوتے تھے۔ محیط میں ہے کہ **فهر** فوریم کا معرب ہے اور فوریم یہودیوں کی ایک عید کا نام ہے جو ماہ آذر کی ۱۳ یا ۱۵ تاریخ کو ہوتی ہے۔

عرب جب عجمی الفاظ کو معرب کرتے تھے تو ان لفظوں کو جہاں اپنے لب و لہجہ کے سانچے میں ڈھالتے وہاں ان سے اور صیغے بھی بنایا کرتے تھے چنانچہ عرب کا ایک شاعر کہتا ہے۔

وقد اقلتنا المصايا الضمر مثل القسی عاجها المقمجر

تمہیں ان لاغر اندام اونٹوں نے اٹھالیا جو ان کمانوں کے مانند تھے جنہیں کمانی گر نے ٹیڑھا کیا ہو۔

شاعر نے پہلے کمانگر کو قمنجر کی صورت میں بدلہ اور پھر اسے شعری قاعدہ کے مطابق اسے فاعل کی صورت دے دی۔ حضرت نے بھی اسی نہج پر الفاظ ڈھالے۔ چنانچہ ایک مرتبہ نو روز کے موقع پر آپ کے سامنے حلوا پیش کیا گیا آپؑ نے پوچھا کہ آج کیا بات ہے کہا گیا کہ آج نوروز ہے۔ آپؑ نے خوش طبعی کے طور پر فرمایا۔

نورز والنا کل یوم۔ (المزہر) تو پھر ہمارے لئے ایسا نوروز ہر روز منایا کرو۔

نوروز فارسی زبان کی لفظ ہے اس کا عربی میں تلفظ نوروز اور نیرُوز ہوتا ہے۔ حضرتؑ نے اسی لفظ نوروز سے نوروزو امر کا صیغہ مشتق کیا ہے۔

بعض الفاظ قریب المعنی ہوتے ہیں مگر مترادف و ہم معنی نہیں ہوتے اس معنوی تفریق کی وجہ سے ان کا محل استعمال بھی مختلف ہوتا ہے۔ حضرتؑ نے اس تفریق معنوی کی طرف بھی رہنمائی فرمائی ہے۔ چنانچہ آپؑ سے دریافت کیا گیا کہ اکراہ و اجبار میں کیا فرق ہے فرمایا۔

الاکراه من السلطان والاجبار من الزوجه والابن۔ (قصا یا تی) اکراہ وہ ہے جو بادشاہ کی طرف سے ہو اور اجبار وہ ہے جو زوجہ اور فرزند کی طرف سے ہو۔

مطلب یہ ہے کہ جو بات حکماً منوائی جائے وہ اکراہ ہے اور جس میں حکم کار فرما نہ ہو وہ اجبار ہے۔

آپؑ سے دریافت کیا گیا کہ خوف اور غم میں کیا فرق ہے فرمایا۔

الخوف قبل و قوعہ والغم ما یلحق الانسان من وقوعہ (الف کلمہ)

کسی امر ناگوار کے واقع ہونے سے پہلے جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہ خوف ہے اور جو کیفیت واقع ہونے کے بعد طاری ہوتی ہے وہ غم ہے۔

اجر اور عوض میں فرق یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو ابتلاء و آزمائش ہو جیسے دکھ' درد بیماری وغیرہ اس کے بدلہ میں جو کچھ اللہ کی طرف سے ملے وہ عوض ہے اور انسان کے اعمال کے نتیجہ میں جو حاصل ہو وہ اجر ہے۔ چنانچہ حضرت نے اس فرق کو ایک مریض کی عیادت کرتے ہوئے واضح کیا۔

ان مرض لا اجرفیہ ولکنہ یحط السیئات ویحتهاحت الاوراق و انما الاجر فی القول باللسان والعمل بالایدی والاقدام۔ (نہج البلاغہ)

مرض میں اجر نہیں ہے البتہ وہ گناہوں کو مٹاتا ہے اور انہیں اس طرح جھاڑ دیتا ہے جس طرح درخت سے پتے جھڑتے ہیں ہاں اجر اس میں ہوتا ہے کہ کچھ زبان سے کہا جائے اور کچھ ہاتھ پیروں سے کیا جائے

معانی الفاظ کے سلسلہ میں حضرتؑ کا قول حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ آیہ قرآنی **واذا الموؤدۃ سئلت۔** (جس وقت زندہ درگور لڑکی سے پوچھا جائے گا) میں لفظ موؤدۃ کے متعلق صحابہ میں اختلاف رائے ہوا تو آپؑ نے فرمایا۔

انها لاتکون موؤدۃ حتی یاتی علیها التارات السبع۔ (درۃ الغواص)

زندہ درگور لڑکی پر لفظ موؤدۃ اس وقت صادق آتی ہے جب وہ سات مرحلوں سے گزر چکی ہو۔

حضرت نے آیہ قرآنی **لقد خلقنا الانسان من سلالته** میں خلقت انسانی کے جو مراتب بیان کئے ہیں ان کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب لڑکی ولادت کے بعد روئے' جئیے اور پھر اسے زندہ دفن کر دیا جائے وہ موؤدہ ہے۔

حضرت ابوبکرؓ سے لفظ کلالہ کے معنی دریافت کئے گئے انہوں نے کہا۔

هو من مات ولم یدع ولد اولاد الدا هذا قولی فیها برائی فان کان هوا با فمن اللہ۔ (کشف الغمہ ج ۲ ص ۵۹)

وہ جس کے نہ بیٹا ہو اور نہ باپ یہ میری اپنی رائے ہے اگر صحیح ہو تو اللہ کی جانب سے ہے۔

امیرالمومنین کے سامنے اس کا ذکر ہوا تو فرمایا کہ یہ رائے سے کام لینے کا محل نہیں ہے۔ قرآن مجید میں کلالہ کا اطلاق سگے بھائی بہن اور پدری بھائی' بہن یعنی باپ' ایک اور مائیں مختلف ہوں اور مادری بھائی بہن یعنی ماں

ایک اور باپ مختلف ہوں سب پر ہوا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

یستفتونک قل اللہ یفتیکم فی الکلالۃ ان امرو هلک لیس لہ ولد ولہ اخت فلها نصف ماترک و هویرثها ان لم یکن لها ولد۔

لوگ تم سے کلالہ کے بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دو کہ اللہ تمہیں کلالہ کے بارے میں یہ حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی شخص مرجائے اور اس کے کوئی اولاد نہ ہو اور صرف ایک بہن ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہو گا اور اگر بہن مر جائے اور اس کے کوئی اولاد نہ ہو تو بھائی سارے مال کا وارث ہو گا۔

اس آیت میں کلالہ سے حقیقی اور پدری بھائی بہن مراد ہیں۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے۔

وان کان رجل یورث کلالۃ او امراۃ ولہ اخ او اخت فلکل واحد منهما السدس فان کانوا اکثر من ذلک فهم شرکاء فی الثلث۔

اگر کوئی مرد یا عورت مادری بھائی یا بہن کو اپنا وارث چھوڑ جائے تو ان میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہو گا اور اگر ایک سے زیادہ ہوں وہ ایک تہائی میں برابر کے شریک ہوں گے۔

اس آیت میں کلالہ سے مراد مادری بھائی بہن ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ سے آیہ قرآنی **فاکھتہ و ابا** کے معنی دریافت کئے گئے کہا کہ **فاکھتہ** کے معنی تو میں جانتا ہوں مگر **ابا** کے معنی مجھے معلوم نہیں حضرتؑ نے سنا تو فرمایا **الاب هوا نکلاء والمرعی** (اس کے معنی گھاس اور چراگاہ کے ہیں)

ابن قتیبہ دینوری نے ادب الکاتب میں تحریر کیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ آیہ قرآنی **وفار التنور** (تنور جوش مارنے لگا) میں تنور کے معنی سطح زمین کے ہیں۔ فیروز آبادی نے بھی قاموس میں یہ معنی تحریر کئے ہیں۔ حضرتؑ سے مروی ہے کہ جبرئیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ۔

مر اصحابک بالعج والثج (معانی الاخبار)

اپنے اصحاب کو عج اور ثج کا حکم دیجئے۔

پھر حضرتؑ نے فرمایا کہ عج کے معنی صدائے تلبیہ بلند کرنے کے ہیں اور ثج کے معنی جانور کے ذبح کرنے کے ہیں۔ حضرتؑ سے حنان اور منان کے معنی پوچھے گئے فرمایا کہ حنان وہ ہے جو روگردانی کرنے والے پر بھی نظر کرم رکھے اور منان وہ ہے جو بن مانگے دے۔

ایک عورت نے اپنے شوہر کو سفلہ کہا۔ شوہر نے کہا کہ اگر میں سفلہ ہوں تو میری طرف سے تجھے طلاق ہے۔ یہ معاملہ حضرتؑ کے سامنے پیش ہوا۔ آپؑ نے فرمایا۔

ان کنت لاتبالی ماقلت وما قیل لک فانت سفلہ والا فلاشئی علیک۔ (تہذیب الاحکام)

اگر تجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ تو نے کیا کہا اور تیرے بارے میں کیا کہا جاتا ہے تو سفلہ ہے اگر ایسا نہیں ہے تو یہ بات بے نتیجہ ہے۔

آپؑ سے پوچھا گیا کہ نوُمتہ کے معنی کیا ہیں فرمایا۔

الذی لایدری الناس مافی نفسہ۔ (معانی الاخبار)

وہ جس کے دل کی بات لوگ نہ جان سکیں۔

آپؑ سے پوچھا گیا کہ "قسی" کس کپڑے کو کہتے ہیں فرمایا اس مصری یا شامی کپڑے کو جس کی لکیروں سے چار خانے بنتے ہوں۔

ضرب الامثال

ضرب المثل اس مختصر سے مختصر فقرہ کو کہتے ہیں جو اپنی لفظی لطافت اور معنوی افادیت کی بنا پر بے تکلف زبانوں پر آگیا ہو اگر مثل کا استعمال برمحل ہو تو اس سے کلام کا حسن اور اثر آفرینی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ مثل میں کسی تجربہ و مشاہدہ کا نچوڑ یا کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ لہٰذا جس واقعہ کے سلسلہ میں اسے بیان کیا گیا ہو گا اس سے ملتے جلتے ہوئے واقعہ کی تصویر نظروں کے سامنے آجائے گی اور اس کی روشنی میں موجودہ واقعہ کے اچھے یا برے نتائج پر حکم لگایا جا سکے گا۔ ابراہیم نظام کا قول ہے کہ مثل میں چار خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو کسی کلام میں یکجا نہیں ہوتیں۔ لفظی اختصار، معنئ مقصود سے ہم آہنگی، حسین تشبیہ اور لطیف استعارہ۔ انہی خوبیوں کی بنا پر مثلیں زبانوں پر چڑھتی اور فروغ عام پاتی ہیں۔

امیرالمومنین علیہ السلام کے خطبات و تحریرات میں کثرت سے مثلیں استعمال ہوئی ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ھیھات بعد اللتیا والتی۔

افسوس اب یہ بات جبکہ میں چھوٹی بڑی مصیبت جھیل چکا ہوں۔

اللھیتا التی کی تصغیر ہے اس مثل کی ابتداء یوں ہوئی کہ ایک شخص نے ایک پستہ قد عورت سے عقد کیا جو

آئے دن اس کے لئے کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی کر دیتی اس نے تنگ آکر اسے طلاق دے دی اور ایک ایسی عورت سے نکاح کر لیا جو دراز قامت تھی مگر یہ اس کے لئے پہلی سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوئی اس نے اسے بھی طلاق دے دی اور کہا بعد اللتیا والتی لا اتزوج ابدا (میں اس چھوٹی اور بڑی کے بعد کبھی شادی نہیں کروں گا) اس کے بعد اس سے چھوٹی اور بڑی مصیبت مراد لی جانے لگی۔

لو کان یطاع لقصیر امر۔ کاش کہ قصیر کی بات مان لی جاتی۔

یہ مثل اس موقع پر استعمال کی جاتی ہے جہاں کسی مشورہ دینے والے کا مشورہ رد کر دیا جائے اور بعد میں پچھتایا جائے۔ یہ جملہ سب سے پہلے جذیمہ ابن ابرش کے غلام قصیر نے کہا اور پھر مثل کے طور پر استعمال ہونے لگا۔

عند الصباح یحمد القوم السری۔ صبح کے وقت ہی لوگ رات کی راہ پیمائی کی تعریف کرتے ہیں۔

یہ مثل اس موقع پر کہی جاتی ہے جب زحمت و مشقت کے نتیجہ میں راحت و آرام میسر آئے۔ یہ جملہ سب سے پہلے خالد ابن ولید نے کہا اور پھر بطور مثل استعمال ہونے لگا۔

کم من اکلۃ منعت اکلات۔ بسا اوقات ایک دفعہ کا کھانا بہت دفعہ کے کھانوں سے مانع ہو جاتا ہے۔

یہ جملہ ضرورت سے زیادہ شکم پری کے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انسان کو ضرورت سے زیادہ نہ کھانا چاہیئے کیونکہ کھانے کی حرص مختلف بیماریوں کا پیش خیمہ ہے جس کے نتیجہ میں انسان کو بہت سے کھانوں سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ یہ جملہ سب سے پہلے عامر ابن ظرب عدوانی نے کہا اور پھر مثل کے طور پر استعمال ہونے لگا۔

ابوالفضل میدانی نے مجمع الامثال میں لکھا ہے کہ ایک موقع پر امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے تمثیلاً" بیان فرمایا کہ ایک جنگل میں ایک شیر اور تین بیل سفید' سیاہ اور سرخ مل کر رہتے تھے۔ شیر انہیں کھا جانا چاہتا تھا مگر ان کے ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے اسے حملہ کا موقع نہ ملتا تھا۔ ایک دن اس نے کالے اور سرخ بیل سے کہا کہ مجھے اس سفید بیل کی طرف سے اندیشہ ہے کیونکہ سفید ہونے کی وجہ سے وہ دور سے دکھائی دے جاتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ شکاری اسے دیکھ کر یہاں پہنچ جائے اور ہم سب اس کی وجہ سے مارے جائیں اگر تم مجھے اجازت دو تو میں اسے کھا جاؤں تاکہ ہمارے لئے کوئی خطرہ نہ رہے۔ دونوں بیلوں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور شیر اسے چیر پھاڑ کر کھا گیا۔ پھر ایک دن اس نے سرخ بیل سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا رنگ تو میرے رنگ سے ملتا جلتا ہے مگر یہ کالا بیل ہمیں ایک نہ ایک دن لے ڈوبے گا۔ اگر تم کہو تو میں اسے بھی کھا جاؤں تاکہ ہم یہاں بے خوف و خطر رہ

سکیں۔ اس نے کہا کہ بہتر ہے اسے بھی کھا جاؤ۔ جب اسے کھا چکا تو سرخ بیل سے کہا کہ اب میں تمہیں بھی کھاؤں گا اس نے کہا کہ اب میں اکیلا اور بے بس ہوں تم جب چاہو مجھے کھا سکتے ہو مگر مجھے اتنی مہلت دو کہ میں اپنا پیغام دوسروں تک پہنچا سکوں۔ شیر نے اسے مہلت دی اور اس نے بلند آواز سے کہا۔

الا انی اکملت یوم اکل التور الابیض۔ میں تو اسی دن لقمہ بن گیا تھا جس دن سفید بیل کھایا گیا تھا۔

اس مثل سے مراد یہ ہے کہ جو شخص دوسرے کی ہلاکت پر رضا مند ہو جاتا ہے اسے بھی ہلاکت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

میدان جنگ میں حضرتؑ سے کہا گیا کہ آپ زرہ خود پہنے بغیر دشمن سے بھڑ جاتے ہیں فرمایا۔

احرز ام اجلہ۔ موت کا لمحہ انسان کو حفاظت میں لئے ہوئے ہے۔

اس جملہ کے بارے میں میدانی نے لکھا ہے کہ۔

هذا اصدق مثل ضربته العرب۔ (مجمع الامثال) یہ عربی مثلوں میں سب سے سچی ضرب المثل ہے۔

ایک مرتبہ عید کے موقع پر متعدد کھانے آپ کے سامنے جمع ہو گئے آپ نے ان کھانوں کو ملا کر ایک کر لیا اور فرمایا۔

اجعلها باجا۔ میں انہیں یک رنگ کئے لیتا ہوں۔

علامہ مجلسی نے لکھا ہے کہ **صارت کلمته مثلا ا**(حضرت کا یہ کلمہ ضرب المثل بن گیا ہے)

ساعدا سماہدا۔ آخر اس تبدیلی کا کیا سبب ہے۔

علامہ سید رضی نے تحریر کیا ہے کہ یہ جملہ جو بطور مثل استعمال ہوتا ہے اور سب سے پہلے آپ ہی سے سنا گیا ہے۔

جعلت فداکـ۔ میں تم پر قربان جاؤں۔

شیخ علاء الدین نے تحریر کیا ہے کہ۔

اد لی من قال جعلت فد اک علی رضی اللہ عنہ۔ جس نے سب سے پہلے جعلت فد اک کہا وہ حضرت علی علیہ السلام تھے۔
(محاضرہ الاوائل)

حضرتؑ کے چند کلمات اور درج کئے جاتے ہیں جو اپنے اختصار اور جامعیت کی وجہ سے ضرب المثل بن چکے ہیں۔

لارای لمن لا یطاع	اس کی رائے ہی کیا جس کی بات نہ مانی جائے۔
القلب مصحف البصر	دل آنکھ کا صحیفہ ہے۔
الهم نصف الهرم	غم آدھا بڑھاپا ہے۔
خیر البلاد ما حملک	بہترین شہر وہ ہے جو تمہارا بوجھ اٹھائے۔
الحرمان خیر من الامتنان	احسان مند ہونے سے محروم ہونا بہتر ہے۔
من صارع الحق صرعہ	جو حق سے ٹکرائے گا حق اسے پچھاڑ دے گا۔
الامانی تعمی اعین البصائر	امیدیں چشم بصیرت کو کور کر دیتی ہیں۔
کل متقصر علیہ کاف	جس پر قناعت کر لی جائے وہ کافی ہے۔
رسولک ترجمان عقلک	تمہارا قاصد تمہاری عقل کا ترجمان ہے۔
بطن المرء عدوہ	انسان کا شکم اس کا دشمن ہے۔
ثبات الملک بالعدل	ملک کا ثبات و قیام عدل سے وابستہ ہے۔
جلیس المرء مثلہ	آدمی کا ہم نشیں ویسا ہوتا ہے جیسا وہ خود ہوتا ہے۔
رسول الموت الولادۃ	پیدائش موت کی پیغامبر ہے۔
عاقبتہ الظلم و خیمہ	ظلم کا انجام سخت ہے۔
صمت الجاهل سترہ	جاہل کی خاموشی اس کی پردہ پوش ہے۔
اشرف الغنی ترک المنیٰ	امیدوں سے دستبرداری بہترین ثروت ہے۔

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے   دل بے آرزو دیا تو نے

من لم یثق لم یوثق بہ
جو دوسروں پر اعتماد نہیں کرتا اس پر بھی اعتماد نہیں کیا جاتا۔

ضعف العقل امان من الغم۔
عقل کی کمزوری غم سے امان دلاتی ہے۔

چنداں کہ عقل بیش غم روزگار بیش

اول رای العاقل آخر رای الجاھل۔
عاقل کی رائے جو شروع میں ہوتی ہے وہی جاہل کی رائے آخر میں ہوتی ہے۔

آنچہ دانا کند کند ناداں
لیک بعد از خرابیٔ بسیار

علم عروض

علم عروض وہ علم ہے جس میں اوزان شعر سے بحث کی جاتی ہے۔ اس علم کے ذریعہ شعر کے وزن کو پرکھا اور کلام موزوں و غیر موزوں میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ افراد جو طبع موزوں رکھتے ہیں انہیں علم عروض کی احتیاج نہیں ہے اور ان کا ذوق طبعی خود ہی موزوں و غیر موزوں کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ مگر وہ لوگ جو طبع موزوں نہیں رکھتے اور صف شعراء میں شامل ہونے کے لئے الفاظ کو نظم کے قالب میں ڈھالنا چاہتے ہیں وہ عروض کا سہارا لینے کے لئے مجبور ہوتے ہیں اور لفظوں کو جوڑ کر مقررہ اوزان میں سے کسی ایک وزن پر شعر ڈھال لیتے ہیں۔ شعری وزن اس طرح جانچا جاتا ہے کہ بحر کے ہر رکن کے مقابلہ میں الفاظ کی ترتیب اس طرح قائم کی جاتی ہے کہ متحرک حروف کے مقابلہ میں متحرک حروف اور ساکن حروف کے مقابلہ میں ساکن حروف آئیں۔ اس طرح الفاظ کی نشست سے آواز میں توازن و ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور شعر وزن کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ وزن تناسب ہی کی ایک قسم ہے یہ تناسب متحرک و ساکن حرفوں کے امتزاج و تالیف سے اسی طرح پیدا ہوتا ہے جس طرح آوازوں کے اتار چڑھاؤ اور بھاری اور ہلکے سروں کے تال میل سے نغمہ پیدا ہوتا ہے۔ متحرک حرفوں کے تسلسل کو چڑھاؤ اور ساکن حرفوں کے ٹھہراؤ کو اتار سمجھئے۔ اسی ہم رنگی کی بنا پر شاعری اور موسیقی کا انتہائی نزدیکی تعلق ہے۔ دونوں وزن اور تناسب پر اپنی بنیاد قائم کرتے ہیں اور دونوں پرجوش و طرب اور حزن و افسردگی کے یکساں اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

یہ توازن و تناسب، نغمہ و شعر کے علاوہ مختلف آوازوں، ہواؤں کے ہلکوروں، آبشاروں کے گرنے، طوفانی موجوں کے اٹھنے، بادلوں کے گرجنے، بلندیوں پر سے پتھروں کے لڑھکنے اور پرندوں کے چہچہانے میں بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ قمری کی آواز گکو کو گکو کو گکو کو گکو کو بحر طویل فعولن مفا عیلن فعولن مفا عیلن کے وزن پر ہے۔ انہی موزوں و

متناسب آوازوں سے موسیقی اور عروض کا فن وجود میں آیا۔ چنانچہ فیثا غورث کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے ایک مرتبہ دریا کے کنارے لوہے پر ہتھوڑے کے چلنے کی پیہم آوازیں سنیں تو ان آوازوں کے اتار چڑھاؤ میں اسے تناسب و نغمگی کا احساس ہوا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر آوازوں میں ایک ہی آہنگ ہو تو وہ کیف و اثر سے خالی ہوتی ہیں اور اگر صوتی اعتبار سے بھاری اور ہلکی ہوں تو ان میں تناسب کے ذریعہ کیف اور اثر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی ذہانت سے کام لے کر ریشم کے ڈوروں کو باندھ کر سارنگی کی طرح کا ایک آلہ بنایا اور آوازوں کے زیرو بم اور تاروں کے اتار چڑھاؤ سے صوتی آہنگ پیدا کر کے اسے ایک فنی حیثیت دے دی۔ اسی طرح خلیل ابن احمد فراہیدی جو فن موسیقی میں کامل دستگاہ رکھتا تھا ایک مرتبہ ٹھٹھیروں کے بازار سے گزرا تو کھٹ کھٹ کی منظم و مرتب آوازوں میں اس نے موزونیت کا احساس کیا اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جس طرح الفاظ میں وزن ہوتا ہے جسے ف ع ل کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے اسی طرح آوازوں کے اتار چڑھاؤ سے بھی وزن پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ان موزوں و متناسب آوازوں سے اس کا ذہن اوزان شعر کی تشکیل کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے دقت نظر اور ذہنی کاوش سے کام لے کر علم عروض ایجاد کیا اور پانچ دائرے بنا کر پندرہ بحروں کے اوزان مرتب کئے۔ پھر اخفش نے سولھویں بحر کا اضافہ کیا جو بحر متدارک کے نام سے موسوم ہے۔ اس علم کے بنیادی ماخذ کے بارے میں احمد ابن حمدان رازی کا قول یہ ہے کہ۔

العروض اخذ اصلہ الخلیل ابن احمد من رجل من اصحاب علی ابن الحسین ابن علی ابن ابی طالب۔ (تاسیس الشیعہ ص ۵۹)

خلیل ابن احمد نے عروض کے بنیادی قواعد علی ابن الحسین ابن علی ابن ابی طالب علیہم السلام کے اصحاب میں سے ایک شخص سے سیکھے۔

اس قول سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلیل ابن احمد ان آوازوں سے راہنمائی حاصل کرنے سے پہلے اس کے بنیادی قواعد کی طرف متوجہ ہو چکا تھا اور امام علی ابن الحسین علیہما السلام کے اصحاب میں سے کسی ایک شخص سے اس فن کے ابتدائی اصول سیکھے تھے۔ بعید نہیں ہے کہ اس شخص نے امام علی ابن الحسین علیہما السلام سے سیکھے ہوں یا بالواسطہ امیرالمومنین علیہ السلام سے استفادہ کیا ہو۔ اس لئے کہ حضرت علی علیہ السلام نے سب سے پہلے ناقوس کی آواز کے اتار چڑھاؤ کو بحر متدارک مثمن مقطوع کے سانچے میں ڈھالا اگر کھٹ کھٹ کی آوازوں سے علم عروض نے جنم لیا ہے تو پھر اس کے موجد امیرالمومنین علیہ السلام قرار پائیں گے۔ کیونکہ انہوں نے سب سے پہلے ناقوس کی آواز میں نہ صرف وزن و ہم آہنگی محسوس کی بلکہ اسے لفظی جامہ بھی پہنایا۔ چنانچہ حارث ابن اعور بیان کرتے ہیں کہ میں حیرہ میں امیرالمومنین علیہ السلام کے ہمرکاب چل رہا تھا کہ ایک دیر سے ناقوس کے بجنے کی آواز آئی۔ آپ نے برجستہ اس کے وزن و آہنگ پر یہ منظوم کلمات فرمائے اور نوائے دیر صدائے حرم بن کر گونجنے لگی۔

جو چاہیں ہم تو ہو ناقوس میں بھی بانگ اذاں   خدا خدا کی بتوں سے ابھی صدا آئے

لا الہ الا اللہ
ذات الہ ہے واحد و یکتا
اس کا کوئی شریک نہ ہمتا

سبحان اللہ حقا حقا
عیبوں سے وہ پاک ہے حقا
بات ہے حق کی بول ہے سچا

ان المولی ضمیر یبقی
بے پروا اور سب کا آقا
قائم و دائم رہنے والا

حقا حقا صدقا صدقا
ہر دم گونجے حق کا نعرہ
حق کا بول رہے گا بالا

یحلم عنا رفقا رفقا
اس کی ذات ہے حلم سراپا
اس کا شیوہ رفق و دارا

لو لا حلمہ کنا شقی
حلم سے گر وہ کام نہ لیتا
بخت نہ اپنا یاور ہوتا

ان المولی یسائلنا
بے شک ہم سے پوچھے گا مولا
تم نے کیا دنیا میں کیا کیا

ویرا فقنا ویحا سبنا
جانچ ہماری گو وہ کرے گا
سختی نہ ہو گی اس میں اصلا

یا مولانا لا تہلکنا
اے مولا اے سب کے آقا
ہر آفت سے ہم کو بچانا

وتدار کنا واستخد منا
دکھ کا ہمارے کرنا چارہ
تابع فرماں ہم کو بنانا

حلمک عنا قد جراء نا
حلم سے تیرے کھا کر دھوکا
کتنے نڈر ہم ہو گئے مولا

یا مولانا عفوک عنا
تو تو بڑا غفار ہے مولا
عفو خطا کر بار الہا

ان الدنیا قد غرتنا
دنیا ہے بس دھوکا ہی دھوکا
اپنے جال میں ہم کو پھانسا

واشتغلتناو استہوتنا
غافل اس نے ہم کو بنایا
راہ ہوس پر اس نے لگایا

واستلہتنا واستغوتنا
اپنی راہ پہ ہم کو ڈالا
حق کی راہ سے دور ہٹایا

قو ضیعنا د ارا تبقی
گھر عقبی کا ہم نے اجاڑا
جس میں سدا ہے جا کے رہنا

واستوصنا دا را تفنی
گھر دنیا کا ہم نے بسایا
جو ہے فانی اور لا تبقی

تفنی الد نیا قرنا قرنا
ہر دم رو بفنا ہے دنیا
ختم ہے اک دن کھیل یہ سارا

کلا موتی کلا موتی
موت سے کس کو ہے چھٹکارا
ایک نہ اک دن سب کو مرنا

کلا فیھا موتی موتی   کس کو سدا ہے یاں پر رہنا   رفتہ رفتہ سب کو مرنا

کلا موتی کلا د فنا   سب کو ہے ہر حال میں مرنا   اجڑے گھر میں جا کے بسنا

نقلا نقلا د فنا د فنا   یاں سے اک دن کوچ ہے کرنا   زیر لحد ہے تنہا رہنا

یا بن الد نیا مھلا مھلا   دنیا والے رک جا تھم جا   سونچ سمجھ کر آگے بڑھنا

زن ماباتی وزنا وزنا   رتی رتی تولہ تولہ   کام ہو سارا تولا ناپا

لسنا ند ری ما فرطنا   عیش میں سارا وقت گنوایا   غفلت میں انجام نہ سونچا

الا فیھا یوما متنا   جس دن موت نے آن دبوچا   اس دن آنکھ سے اٹھا پردہ

لو لا جھلی ما ان کانت   بے خبری کا کہرا چھایا   کچھ نہ سوجھے کیا ہے دنیا

عندی الد نیا الا سبحنا   چشم بصیرت کھول کے دیکھا   صورت زنداں اس کو پایا

یابن الد نیا جمعا جمعا   دنیا والے کر لے اکٹھا   بھر لے اپنا خالی پیالہ

یابن الد نیا مھلا مھلا   دنیا والے یابن الدنیا   کچھ تو کر احساس زیاں کا

یابن الد نیا دقا دقا   دنیا والے بندہ دنیا   اس کا در کھٹکاتے رہنا

یابن الد نیا وزنا وزنا   دنیا والے کام ہو تیرا   وزن میں پورا ٹھیک اترتا

خیرا خیرا سئیا سئیا   نیکی کا بدلہ نیک کمایا   شر کا بدلہ شر ہے پایا

سئیا سئیا حسنا حسنا   بد انجام ہے بد کاموں کا   نیک عمل کا نیک نتیجہ

یاذا من ذا اکم ذا ھذا   کیا ہے دنیا کتنی دنیا   آنکھیں کھول کے دیکھ ذرا سا

لسنا نرجو ننجو نخشی   بخشش کا اب کیا ہے سہارا   خوف و رجا سے کام نہ رکھا

عجل قبل الفوت الوزنا   موت سے پہلے جلدی کرنا   ہاتھ سے اپنے وزن عمل کا

مامن یوم یمضی عنا   جو دن گزرا ایسا گزرا   جیسے ڈھلتا گھٹتا سایہ

الا اوھن عنا رکنا	موت کے آگے بس ہے کس کا	ہر دن کوئی نہ کوئی ہے مرتا	
ان المالک انذ رنا	مالک نے ہر چند ڈرایا	خوف نہ اس کا ہم نے کھایا	
انما نحشی عزلی • بھما	مر کر اک دن جینا ہو گا	بدلیں گے یہ جسم نہ اعضاء	

اسی طرح ایک مرتبہ ایک طنبورہ نواز کو طنبورہ بجاتے اور اس پر جھومتے دیکھاتو آپ نے آگے بڑھ کر طنبورہ توڑ دیا اور اس سے یہ عہد لیا کہ آئندہ وہ یہ کام نہیں کرے گا۔ پھر فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ اس طنبورہ سے کیا آواز نکلتی ہے کہا یہ تو میں نہیں جانتا۔ فرمایا کہ اس میں سے یہ صدا آتی ہے۔

ستند م ستند م ایا صاحبی ستد خل جھنم ایا ضاربی

اے میرے ساتھی تم جلد شرمندگی و ندامت اٹھاؤ گے اور اے میرے بجانے والے تم عنقریب جنہم واصل ہو گے۔

فن شعر

شعر اس کلام کا نام ہے جس میں جذبات کی عکاسی اور احساسات کی ترجمانی موثر ودلکش پیرایہ میں کی گئی ہو۔ اگرچہ ابتداء میں شعر کے لئے وزن ضروری نہ سمجھا جاتا تھا مگر شعرائے عرب نے کلام کی خوبی و دلآویزی کے لئے وزن کا التزام کیا اور اب ہر زبان میں وزن و آہنگ کی پابندی لازمی قرار دے لی گئی ہے۔ اگر وزن کے ساتھ تشبیہ و استعارہ اور تخیل و محرکات کی لطافتیں بھی ہوں تو اس سے شعر کی دلفریبی و اثر انگیزی اور بڑھ جاتی ہے اور سننے والے کلام کے حسن سے متاثر و مسحور ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ یوں تو دنیا کے ہر خطہ میں ذوق شعری پایا جاتا ہے اور شعر و سخن کی محفلیں جمتی ہیں مگر سرزمین عرب ہمیشہ شاعری کا گہوارہ رہی ہے اور ہر دور میں ایک سے ایک بہتر شاعر پیدا کیا ہے جن کا احاطہ و شمار نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ عربوں کا فطری جوش اور زبان کی موزونیت ہے۔ چنانچہ جتنے متوازن اور معنی سے ہم آہنگ الفاظ اس زبان میں ہیں وہ کسی اور زبان میں نہیں ہیں۔ عربی شاعری صرف قلبی واردات کی ترجمانی تک محدود نہ تھی بلکہ دشمن کو للکارنے، غیرت قومی کو جھنجھوڑنے، انتقامی جذبات کو ابھارنے اور نسلی افتخار و برتری کے اظہار کے لئے شعر ہی سے کام لیا جاتا تھا۔ یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ دور جاہلیت کی شاعری اخلاقیات سے یکسر تہی دامن تھی جبکہ اس میں سخاوت، شجاعت اور خود داری کے درس بھی ملتے ہیں۔ لیکن ایسے مضامین کی بھی کمی نہ تھی جو برائی کو پر کشش بنا کر بے راہروی کی تحریک کرتے تھے۔ اسلام، جس کا مقصد اخلاقیات کی تربیت و تکمیل تھی وہ یہ گوارا نہ کر سکتا تھا کہ اس قسم کی مخرب اخلاق شاعری کو فروغ حاصل ہو۔ چنانچہ قرآن مجید ایسے تخریب کار

شعراء کی مذمت میں کہتا ہے۔

الشعراء يتبعهم الغاوون الم ترانهم فی کل وادیهیمون وانهم یقولون مالا یفعلون۔

شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں ہیں۔

یہ انہی شعراء کے بارے میں ہے جو نفسانی جذبات کو ابھارتے، شر و فساد کو ہوا دیتے اور لوگوں کی عزت و ناموس کو ہدف بناتے تھے اور جہاں تک نفس شاعری کا تعلق ہے تو اسلام نے اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی نہ شعر کہنے سے منع کیا اور نہ شعر سننے سے روکا۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روبرو اشعار پڑھے جاتے تھے اور آپ نہ صرف سنتے بلکہ بعض مواقع پر صد و تحسین سے حوصلہ افزائی بھی فرماتے۔ بہرحال ظہور اسلام کے بعد بھی شعر و شاعری کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ البتہ اسلام نے جہاں عربوں کے اخلاق و عادات پر اثر ڈالا وہاں ان کے ذہنی رجحانات میں بھی تبدیلی پیدا کی اور عصبیت و نسلی تفاخر کو جو ان کی شاعری کا محور تھا سرے سے ختم کر دیا جس کے نتیجہ میں تشبیب و تفاخر کی جگہ اخلاقیات و مدح پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لے لی۔ چنانچہ حضرت ابو طالب علیہ السلام جو اس دور کے عظیم شاعر تھے ان کا کلام اخلاقی تعلیمات اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح و توصیف ہی پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ میں حسان ابن ثابت، کعب ابن مالک انصاری، عبداللہ ابن رواحہ، نابغہ جعدی، کعب ابن زہیر وغیرہ کفار کی زبان بندی کے لئے ان کے ہجویہ اشعار کے جواب میں ہجویہ اشعار کہتے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح و توصیف میں بھی قصائد نظم کرتے تھے۔ عرب میں حدی اور رجز کا پہلے بھی رواج تھا اور اسلام کے بعد بھی باقی رہا اور اب بھی عرب کے صحراؤں میں حدی کی صدائیں بلند ہوتی سنائی دیتی ہیں۔ البتہ رجز کی آوازیں شمشیر و سناں کی جنگوں کے ساتھ ختم ہو گئی ہیں۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے علم و ادب کے گھرانے میں آنکھیں کھولیں اور طبع موزوں و ذوق علم کے ساتھ اپنے پدر بزرگوار حضرت ابو طالب علیہ السلام سے شاعری و زبان آوری ورثہ میں پائی اور اشعار کا ایک وافر ذخیرہ چھوڑا۔ یہ اشعار زہد و بے ثباتی دنیا پند و موعظت، عبرت و حکمت، بلند نفسی و علوہمتی ایسے مطالب عالیہ پر مشتمل ہیں اور اخلاقی ادب کا بہترین سرمایہ ہیں۔ ان اشعار کا جوہر شکوہ الفاظ، حسن بندش، آمد و برجستگی اور سلاست و روانی ہے اور ندرت تشبیہ و حسن تعلیل ایسے محاسن شعری بھی نمایاں ہیں۔ چند متفرق اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

سلام علی اهل القبور الدوارس
کانهم لم یجلسوا فی المجالس

کہنہ قبروں میں بسنے والوں پر سلام ہو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کبھی مجلس آرائی کی ہی نہ تھی۔

ولم یشربوا من بارد الماء شربة
ولم یاکلوا مابین رطب و یابس

اور نہ ٹھنڈا پانی پیا تھا اور نہ دنیا کی مختلف چیزوں سے لذت اندوز ہوئے تھے۔

الا خبرونی این قبر ذلیلکم　　و قبر العزیز الباذخ المتنافس

مجھے یہ بتاؤ کہ تم میں سے ادنیٰ کی قبر کون سی ہے اور معزز و باوقار اور اعلیٰ کی قبر کون سی ہے۔

وفی قبض کف الطفل عند ولوده　　دلیل علی الحرص المرکب فی الحی

پیدائش کے وقت بچے کی مٹھیوں کا بند ہونا یہ بتاتا ہے کہ حرص زندہ انسان کے اندر سمو دی گئی ہے۔

وفی بسطها عند الممات مواعظ　　الا فانظرونی قد خرجت بلا شئے

اور موت کے وقت ان کا کھلا ہونا ایک درس عبرت ہے کہ دیکھ لو کہ میں دنیا سے خالی ہاتھ جا رہا ہوں۔

اصبر علی حسد العدو　　فان صبرک قاتله

دشمن کے حاسدانہ رویہ پر صبر کرو تمہارا صبر خود ہی اسے ہلاک کر دے گا۔

فالنار تاکل بعضها　　ان لم تجد ما تاکله

اگر آگ کو بھسم کرنے کے لئے کچھ نہ ملے تو پھر آگ آگ ہی کو نگل جایا کرتی ہے۔

ومن یصحب الدنیا یکن مثل قابض　　علی الماء خانته فروج الاصابع

جو شخص دنیا میں رہے سہے وہ اس شخص کے مانند ہے جو اوک میں پانی بھرے اور انگلیوں کی درزوں سے سارے کا سارا بہہ جائے۔

حلاوة دنیاک مسمومته　　فما تاکل الشهد الا بسم

تمہاری دنیا کی شیرینی زہر آلودہ ہے تم شہد بھی کھاتے ہو تو اس میں زہر کی آمیزش ہوتی ہے۔

فکن موسرا شئعت ام معسرا　　فما تقطع الدهر الا بهم

چاہے تم فارغ البال ہو چاہے تنگدست زندگی غم و حزن کے سایہ ہی میں کٹے گی۔

اذا تم امر بدا نقصه　　توقع زوالا اذا قیل تم

ہر عروج کا نتیجہ تنزل ہے لہٰذا کمال کے بعد زوال کی توقع رکھو۔

اذا النائبات بلغن المدی　　　　و کادت لھن تذوب المھج

جب مصیبتیں حد آخر تک پہنچ جائیں اور دل سوز غم سے پگھلنے لگیں۔

وحل البلاء وقل الغرا　　　　فعند التناھی یکون الفرج

اور بلائیں گھیرلیں اور صبر ساتھ چھوڑ دے تو انتہائے مصیبت کے بعد خوشی و خوش حالی آتی ہے۔

ایک گروہ نے آپ کی شعری مہارت کی نفی کی ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ جب کفار قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے ہجویہ اشعار کہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کہا گیا کہ آپ حضرت علی علیہ السلام سے فرمائیں کہ وہ ان کے ہجویہ اشعار کا جواب دیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ **لیس ہناکہ** "وہ اس کام کے نہیں ہیں" اس ارشاد کا مقصد تو یہ تھا کہ ہجویہ اشعار کہنا ان کے مرتبہ کے شایاں نہیں ہے مگر اس کا مطلب یہ سمجھ لیا گیا کہ وہ جواب دینے سے عاجز اور شعر کہنے سے قاصر تھے۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو صحابہ جواب کے لئے آپؑ کا نام ہی کیوں تجویز کرتے۔ اس نام کے تجویز کرنے سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپؑ شعر کہنے اور شعر کے حسن و قبح کو پرکھنے میں عمومی شہرت رکھتے تھے اور کچھ لوگوں نے آپؑ کی شعر گوئی کے سلسلہ میں یہ لکھ دیا ہے کہ آپؑ نے اپنی زندگی میں صرف دو شعر کہے چنانچہ مجدالدین فیروز آبادی حضرتؑ کے دو شعر نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

قال المازنی لم یصح انہ تکلم بشئی من الشعر غیر ھذین البیتین و صوبہ الز مخشری۔ (قاموس "ودق")

ابو عثمان مازنی نے کہا ہے کہ یہ ثابت نہیں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے ان دو شعروں کے علاوہ بھی اشعار کہے ہوں اور زمخشری نے بھی اسی قول کو صحیح مانا ہے۔

یاقوت حموی نے معجم الادباء میں اسی رائے کی تائید کی ہے مگر اس دعوی کی تصدیق اسی صورت میں کی جا سکتی ہے جب تاریخ و ادب کی قدیم کتابوں میں سے ان تمام اشعار کو حذف کر دیا جائے جن کی صحت نسبت کے بارے میں کوئی شک و شبہہ نہیں کیا گیا اور اس کثرت سے نقل ہوئے ہیں کہ ان سے مستقل مجموعے مرتب کئے جا چکے ہیں اور مختلف ہاتھوں سے ان کی ترتیب و جمع آوری ہوئی ہے چنانچہ۔

ابو احمد عبدالعزیز ابن یحییٰ جلودی متوفی حدود ۳۳۰ ھ نے آپؑ کے اشعار کو جمع کیا۔ چنانچہ نجاشی نے ان کے مؤلفات میں کتاب شعر علی کا ذکر کیا ہے۔

محمد ابن عمران مرزبانی متوفی ۳۸۴ ھ نے آپؑ کے مختلف مواقع کے اشعار یکجا کئے۔

علی ابن احمد فنجکروی متوفی ۵۱۳ ھ نے آپؑ کے منظوم کلام کا ایک مجموعہ مدون کیا۔

ابو البرکات ہبتہ اللہ ابن علی متوفی ۵۴۲ ھ نے ایک مجموعہ آپؑ کے اشعار پر مشتمل مرتب کیا۔

محمد ابن الحسین ا لکیدری متوفی حدود ۵۷۶ ھ نے دو مجموعے آپؑ کے کلام پر مشتمل ترتیب دیئے' ایک کا نام انوارا لعقول اور دوسرے کا نام الحدیقتہ الانیقہ ہے۔

سید محسن امین عاملی صاحب اعیان الشیعہ متوفی ۱۳۷۱ ھ نے حروف تہجی کی ترتیب پر آپؑ کے اشعار کی تدوین کی۔

ان مجموعوں کے علاوہ متعدد اعلام نے اپنی کتابوں میں آپؑ کے مختلف اشعار درج کئے ہیں۔ چنانچہ محمد ابن سلامہ مغربی نے کتاب دستور معالم الحکم میں سبط ابن جوزی نے تذکرہ میں نصرابن مزاحم نے کتاب الصفین میں ابن صباغ مالکی نے فصول المہمہ میں برد نے کامل میں اور دوسرے مؤلفین نے اپنے مؤلفات میں آپؑ کے مختلف موقع کے اشعار نقل کئے ہیں۔ ان مجموعوں اور ان میں اشعار کی کثرت کو دیکھتے ہوئے یہ رائے قطا" صحت سے عاری اور واقعیت سے دور ہے کہ آپؑ نے اپنی زندگی میں صرف دو شعر کہے۔ سعید ابن مسیب کہتے ہیں۔

کان ابوبکرؓ شاعر او عمر شاعر او علی الشعر الثلثہ۔
(عقدالفرید ج ۳ ص ۳۹۶)

حضرت ابو بکر اور حضرت عمر دونوں شاعر تھے اور حضرت علی علیہ السلام ان سے بڑھ کر شاعر تھے۔

شعبی کا یہ قول متعدد کتابوں میں درج ہے۔

کان ابوبکر یقول الشعر وکان عمر یقول الشعر وکان عثمان یقول الشعر وکان علی الشعر الثلثہ۔
(تاریخ الخلفاء ص ۱۲۸)

حضرت ابو بکر حضرت عمر اور حضرت عثمان شعر کہا کرتے تھے مگر حضرت علی علیہ السلام کی شاعری کا پایہ ان تینوں سے بلند تر تھا۔

اس دور میں شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو جس نے اپنی زندگی میں ایک آدھ شعر نہ کہا ہو مگر ایسے لوگوں کو کبھی شعراء میں شمار نہیں کیا گیا۔ اگر امیرالمومنین علیہ السلام نے اپنی زندگی میں صرف دو شعر کہے ہوتے تو انہیں شاعر بھی نہیں کہنا چاہیئے تھا چہ جائیکہ الشعر (بہت بڑا شاعر) کہا جائے۔ حضرت علی علیہ السلام کا خلفاء ثلثہ سے تقابل اور ان کے مقابلہ میں انہیں اشعر کہنا غیر موزوں سی بات ہے اس لئے کہ اولا" تو ان خلفاء کا کلام کہیں دیکھنے سننے میں نہیں آتا اور کچھ تھوڑا بہت ہو تو ہو مگر اتنا بہرحال نہیں ہے کہ انہیں صف شعراء میں شمار کیا جا سکے بلکہ تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ ان میں سے بعض کو شعر کا مفہوم سمجھنے کے لئے دوسروں کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ زبرقان ابن بدر نے حضرت عمر سے شکایت کی کہ حطیہ نے اس کی ہجو میں یہ شعر کہا ہے۔

دع المکارم لا تنهض لبغیتها
واقعد فانک انت الطاعھم الکاسی۔

بزرگیوں کو چھوڑ اور ان کے پیچھے نہ بھاگ اپنی جگہ پر بیٹھا رہ تجھے تو کھانے اور پہننے سے مطلب ہے۔

حضرت عمر نے کہا کہ اس میں تو ہجو کی کوئی بات نہیں ہے کیا تم کھاتے اور پہنتے نہیں ہو۔ زبرقان نے کہا کہ اس سے بڑھ کر ہجو کیا ہو سکتی ہے کہ اس نے میری زندگی کا مقصد ہی کھانا پینا اور پہننا قرار دے لیا ہے۔ حضرت عمر اس پر مطمئن نہ ہوئے اور حسان ابن ثابت کو بلایا اور پوچھا کہ کیا اس میں ہجو کا کوئی پہلو ہے انہوں نے کہا۔

ماجاہ ولکن سلح علیہ (عقد الصزید ج ۳ ص ۴۱۶)
ہجو ہی نہیں کی بلکہ اس پر غلاظت پھینک دی ہے

احمد حسن الزیات اس واقعہ کے ذیل میں تحریر کرتے ہیں۔

لم یفطن الی موضع الھجاء فیہ لدقتہ حتی ولہ علیہ حسان (تاریخ الادب العربی)
حضرت عمر شعر کی باریکی کی بنا پر ہجو کے پہلو کو نہ سمجھ سکے یہاں تک کہ حسان نے انہیں بتایا۔

قبیلہ بنی عجلان نے حضرت عمر سے شکایت کی کہ نجاشی نے ان کی ہجو کی ہے۔ حضرت عمر نے کہا کہ میں بھی سنوں کہ وہ ہجو کیا ہے انہوں نے یہ شعر پڑھا۔

اذا اللہ عادی اھل یوم و دقہ
فعادی بنی عجلان رھط ابن مقبل

اگر اللہ کمینے اور ذلیل لوگوں کو دشمن رکھتا ہے تو قبیلۂ ابن مقبل کی شاخ بنی عجلان کو بھی دشمن رکھے۔

حضرت عمر نے کہا کہ یہ تو ہجو نہیں ہے بلکہ بددعا ہے اگر وہ مظلوم ہے تو اس کی دعا قبول ہو گی ورنہ رد کر دی جائے گی انہوں نے کہا کہ اس کے بعد یہ شعر بھی کہا ہے۔

قبیلتہ لا یخضرون بذمتہ
ولا یظلمون الناس حبتہ خردل

یہ قبیلہ کسی سے عہد شکنی کا مرتکب نہیں ہوتا اور نہ کسی پر رائی برابر ظلم کرتا ہے (یعنی وہ کمزور و بزدل ہیں)۔

حضرت عمر نے یہ شعر سن کر کہا۔

لیت آل الخطاب مثل ھولاء۔ (عقد الفرید)
کاش خطاب کی آل اولاد بھی ایسی ہوتی

انہوں نے کہا کہ اس کے بعد یہ شعر کہا ہے۔

ولا یردون الماء الا عشیہ
اذا صلر الور ادعن کل سنھل

یہ لوگ رات کے وقت چشمہ پر آتے ہیں جب دوسرے لوگ اپنے اونٹوں کو سیراب کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے کہا کہ بھیڑ بھاڑ سے بچنا اچھی بات ہے یہ تو کوئی ہجو نہیں ہے حالانکہ شاعر کا مقصد یہ تھا کہ وہ ذلیل و کمزور ہیں اور انہیں اونٹوں کو پانی پلانے کی اجازت اس وقت ملتی ہے جب تمام لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا کر واپس چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ شعر بھی تو کہا ہے۔

وما سمی العجلان الالقولھم　　　خذ القعب ایھا العبد و اعجل

بنی عجلان کا نام عجلان اس لئے پڑا کہ لوگ اسے یہ کہتے تھے کہ اسے غلام پیالہ اٹھا اور جلدی سے دودھ دوہ لے۔

حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس میں کیا برائی ہے قوم کا سردار قوم کا خدمت گزار ہوتا ہے۔ غرض ان ہجویہ اشعار سے ہجو کے پہلو کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔

امیرالمومنین علیہ السلام الفاظ کی گہرائیوں میں جھانک کر شعر کے حسن و قبح کو پرکھنے کا ملکۂ تام رکھتے تھے اور کلام عرب پر احاطہ کرنے کے بعد شعر کی قدر و قیمت اور شعراء کے مرتبہ و مقام کو بخوبی پہچانتے تھے۔ چنانچہ اسی شعری شعور اور وسیع النظری کی بنا پر آپؑ سے دریافت کیا گیا کہ عرب میں سب سے بڑا شاعر کون ہے فرمایا۔

ان القوم لم یجروا فی حلبتہ تعرف الغایہ عند قصبتھا فان کان ولا بد فا لملک الضلیل۔ (نہج البلاغہ)

شعراء کی دوڑ ایک روش پر نہ تھی کہ گوے سبقت لے جانے سے ان کی آخری حد کو پہچانا جائے اگر ترجیح دینا ہی ہے تو پھر گمراہ فرمانروا (امراء القیس) ہے۔

حضرت نے پہلے تو کسی ایک کی تعیین کرنے سے پہلو تہی کی اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ شعراء کے کلام میں موازنہ کر کے اشعر کی تعیین اس صورت میں ہو سکتی ہے جب ان کے اشعار کی نوعیت ایک ہو اور جب اصناف شعر میں سے ہر صنف کا ایک مخصوص لب و لہجہ ہے اور ایک مخصوص مزاج ہے تو ان میں تقابل کیسا مثلاً" جو الفاظ اظہار شجاعت کے لئے موزوں ہوتے ہیں وہ تغزل کے لئے موزوں و مناسب نہیں ہوتے اور جو تغزل کے لئے مناسب ہوتے ہیں وہ شجاعت و بسالت کے لئے مناسب نہیں سمجھے جاتے۔ اس لئے کہ لفظ و معنی کا رشتہ اس کا مقتضی ہے کہ حماست کے الفاظ میں سختی و خشونت اور تغزل کے الفاظ میں نرمی و نزاکت ہو۔ لہٰذا جب کلام کی سمتیں بدلی ہوئی ہوں گی تو ان میں موازنہ بے محل قرار پائے گا۔ اس ایک گونہ معذرت کے بعد امراء القیس ابن حجر کندی کو ترجیح دی ہے اور اس ترجیح کی وجہ ایک موقع پر یہ بیان فرمائی ہے۔

رأيته احسنهم نادرہ اسبتهم بادرہ وانه لم يقل لرغبته ولا الرحبه۔ (المزہر ج ۲ ص ۴۷۸)

میں نے اسے مضمون آفرینی میں سب سے بہتر اور بیساختگی و برجستہ گوئی میں سب سے آگے پایا ہے اس نے نہ رغبت کی بنا پر شعر کہے اور نہ خوف و ہراس کے پیش نظر۔

حضرت نے رغبتہ و رہبتہ کی لفظوں سے عرب کے شاعر اعشٰی اور نابغہ کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ اعشٰی کو کسی شے کی طلب و خواہش ہوتی تو اس کی طبیعت میں روانی آتی اور نابغہ کو خوف دامنگیر ہوتا تو اس کے جذبۂ شاعری میں ارتعاش پیدا ہوتا۔

امیرالمومنین علیہ السلام کے اس اجمالی تبصرہ سے نقد و نظر کے بنیادی ضوابط کی طرف رہنمائی ہوتی ہے پہلا ضابطہ یہ ہے کہ کلام کی نوعیت یکساں ہو جب موازنہ برمحل ہو گا اور اگر کلام کا موضوع و آہنگ بدلا ہوا ہو تو تقابل صحیح نہ ہو گا چنانچہ مثنوی کا موازنہ رباعی سے اور مرثیہ کا موازنہ غزل سے برمحل نہ سمجھا جائے گا دوسرا ضابطہ یہ ہے کہ شعر میں جدت، جودت اور ندرت ہونا چاہئے اگر صرف لفظوں کا تانا بانا بنا گیا ہو تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو گی۔ چنانچہ اسی ندرت پسندی و جدت بازی کی وجہ سے امراء القیس کو دوسرے شعراء پر ترجیح دی ہے۔ تیسرا ضابطہ جو امراء القیس کی شاعرانہ خصوصیات سے متخرج ہے یہ ہے کہ معنی کے ساتھ لفظوں کی ترکیب و ترتیب اور دروبست میں حسن سلیقہ کارفرما ہو۔ چنانچہ شعر کی خوبی کا انحصار صرف مضمون آفرینی پر نہیں ہے بلکہ اس میں اسلوب و طرز بیان کو بھی دخل ہے۔ اس لئے کہ معنی کتنے ہی بلند اور لطیف کیوں نہ ہوں۔ اگر انہیں موزوں و مناسب لفظوں میں پیش نہ کیا جائے تو معنی کا حسن کجلا کر رہ جائے گا اور اگر معنی میں کوئی خاص ندرت نہ ہو مگر انہیں عمدہ الفاظ میں بیان کیا جائے تو پامال مضمون میں بھی رعنائی و تازگی پیدا ہو جائے گی۔ چنانچہ امراء القیس جس میں رندی و سرمستی کا عنصر نمایاں تھا ایک عام اور مبتذل بلکہ اخلاقی سطح سے گرے ہوئے مضمون کو کہیں استعارہ و تشبیہ اور کہیں حسن ترکیب کا سہارا لے کر خوش آہنگ بنا دیتا ہے اور اس کی اسی خصوصیت خاصہ کی بنا پر حضرتؑ نے اسے بزم شعرا کا صدر نشیں قرار دیا ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام یگانہ روزگار، ادیب و نقاد تو تھے ہی اس کے ساتھ شاعر نواز اور ادیب پرور بھی تھے اور ادبی شہ پاروں کو پرکھتے اور ان کی قدر افزائی فرماتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک اعرابی آپؑ کے پاس آیا اور کہا کہ میں ایک حاجت لے کر آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اگر آپؑ میری حاجت روائی فرمائیں گے تو میں اللہ کی حمد و ستائش کروں گا اور آپ کا شکرگزار ہوں گا۔ آپ نے فرمایا کہ تم اپنی حاجت زمین پر تحریر کرو اس نے لکھا انی فقیرہ "میں غریب و نادار ہوں" آپ نے قنبر سے فرمایا کہ فلاں حلہ اسے دے دو اس نے حلہ لے لیا اور برجستہ یہ اشعار پڑھے۔

کسو تنی حلہ تبلی محاسنھا　　فسوف اکسوک من حسن الثنا حللا

آپ نے مجھے وہ حلہ پہنایا ہے جس کا رنگ روپ مٹ جائے گا اور میں اس کے عوض آپ کی بہترین مدح و ثنا کے حلے پہناؤں گا۔

ان الثناء ولیحیی ذکر صاحبہ　　کالغیث یحیی نداہ السھل ولجبلا

مدح و ثناء ممدوح کے ذکر کو زندہ جاوید بنا دیتی ہے جس طرح برسنے والے ابر کی پھوار پہاڑوں اور میدانوں کی رگ رگ میں زندگی کی رو دوڑا دیتی ہے۔

لاتزھد الدھر فی عرف بدأت بہ　　فکل عبد سیجزی بالذی فعلا

جو حسن سلوک اور نیکی آپ نے کی ہے اس کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھئے کیونکہ ہر بندے کو اس کے کئے کا بدلہ ملے گا۔

حضرت اس کی برجستہ گوئی سے خوش ہوئے اور قنبر سے فرمایا کہ اسے پچاس دینار بھی دے دو پھر اس اعرابی سے مخاطب ہو کر کہا۔

اما الحلتہ سلمسئلتک واما الدنا نیر فلا د بک۔　　تمہارے سوال پر تمہیں حلہ دیا گیا ہے اور تمہارے ادب کے پیش نظر یہ دینار دیئے جا رہے ہیں۔

(عمدہ ابن وشیق ج ۱ ص ۲۹)

فن نثر

امیرالمومنین علیہ السلام کی نثری تخلیقات علم و ادب کا عظیم سرمایہ ہیں جن میں سائنسی انکشافات، علمی اکتشافات اور فلسفہ و حکمت کے نکات سمٹے ہوئے ہیں۔ حضرت کو زبان، بیان پر اتنا اقتدار حاصل تھا کہ طویل سے طویل تحریروں میں روانی، تسلسل، صفائی اور سبک روی میں فرق نہیں آتا اور مختصر سے مختصر جملوں میں معانی و مطالب کی وسعت کے باوجود ادائے مطلب میں خلل واقع نہیں ہوتا اور لفظوں کے درو، بست جملوں کی ساخت اور بندش کی تازگی نے نثر کو اس انتہا تک پہنچا دیا جس کے بعد اعجاز کی حد شروع ہو جاتی ہے اور انسانی زور فصاحت دم توڑتا نظر آتا ہے۔ جچی تلی لفظیں موقع و محل کے اعتبار سے کہیں ہلکی پھلکی اور کہیں گونجتی گرجتی معنی سے ہم آہنگ اور شگفتگی سے ہمکنار، کیف و رنگ میں ڈوبے ہوئے جملے، زنجیر کی کڑیوں کی طرح مرتبط فقرے اور قرآن و حدیث کے اسلوب میں ڈھلی ہوئی تحریریں آپ کی انشاء پردازی کا خاص جوہر ہیں۔ الہیات کے دقیق مسائل کو ادبی اسلوب بیان کے امتزاج سے اتنا دلکش اور جاذب نظر بنا دیا ہے کہ نظریں کلام کی لفظی و معنوی خوبیوں پر جم کر رہ جاتی ہیں اور فلسفہ،

ادب پارہ کے روپ میں نظر آنے لگتا ہے اور اخلاق مواعظ کو اس شیریں انداز میں پیش کیا ہے کہ موعظت کی تلخی کا احساس نہیں ہونے پاتا اور بات دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے اور جہاں موت کی ہولناکی، نزع کی بے چینی، قبر کی تنہائی، تیمارداروں کی مایوسی اور دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا ہے وہاں موت پوری ہولناکیوں کے ساتھ آنکھوں کے سامنے کھڑی نظر آتی ہے اور جہاں اپنے کلک گہربار سے طاؤس کی خوش رنگی و خوش خرامی، اجالوں میں چیونٹی کی نقل و حرکت اور گھپ اندھیروں میں چمگادڑ کی اڑان اور ٹڈی دل کی تگاپو کی تصویر کشی کی ہے وہاں صانع عالم کے حسن آفرینش کا نقشہ نظروں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ حسن زیات نے آپؑ کی ان نگارشات کے بارے میں لکھا ہے کہ۔

تعد من معجزات اللسان العربی۔ (تاریخ الادب العربی)

ان کا شمار عربی ادب کے معجزوں میں ہوتا ہے۔

اسی طرح ہر دور کے ادباء و فصحاء نے آپؑ کی غیر معمولی قدرت اظہار اور زبان و بیان اور طرز ادا کی ندرت کا اعتراف کرتے ہوئے کلام خدا و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپؑ کے کلام کو ہر کلام سے فصیح تر قرار دیا اور عظیم قلمکاروں نے آپؑ کے طرز نگارش کے تتبع سے تحریر و انشاء کا سلیقہ سیکھا۔ چنانچہ عبدالحمید ابن یحییٰ متوفی ۱۳۲ھ، ابن نفع متوفی ۱۴۲ھ، ابن نباتہ متوفی ۳۷۴ھ ایسے بلند پایہ انشاء پردازوں نے اپنی اعلیٰ ادبی صلاحیتوں کا سرچشمہ آپ کے خطبات و تحریرات کو قرار دیا اور آپ کے اسلوب نگارش کی رہنمائی سے ادبی شاہکار تخلیق کئے۔ ابن ابی الحدید تحریر کرتے ہیں۔

ومنہ تعلم الناس الخطابۃ والکتابۃ۔

آپ ہی سے لوگوں نے خطابت و انشاء پردازی کا فن سیکھا۔

علماء ادب نے نثر کی چار قسمیں کی ہیں! مرصع، مسجع، مرجز اور عاری ذیل میں ان قسموں کے اصطلاحی معنی اور حضرتؑ کے کلام سے ان کی ایک ایک مثال درج کی جاتی ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ آپؑ ان چاروں قسموں پر یکساں اقتدار رکھتے تھے۔

نثر مرصع یہ ہے کہ دو فقروں کے تمام الفاظ متحد الوزن اور آخری الفاظ ہم قافیہ ہوں۔ حضرت فرماتے ہیں۔

بعید الجولہ عظیم الصولہ۔

وہ دور تک بڑھ جانے والا اور بڑے زور سے حملہ کرنے والا ہے۔

اس جملہ میں بعید اور عظیم ہموزن اور جولہ اور صولہ ہم قافیہ ہیں۔

نثر مسجع یہ ہے کہ دو فقروں کے اکثر الفاظ ہم قافیہ ہوں جیسے

اخلاقکم دقاق و عهد کم شقاق۔ تم پست اخلاق اور عہد شکن ہو۔

اس میں دقاق اور شقاق ہم قافیہ ہیں۔

نثر مرجز یہ ہے کہ دو فقروں کے اکثر الفاظ ہم وزن ہوں جیسے۔

سرج لمع ضوئہ و شھاب سطع نورہ۔ وہ ایسا چراغ ہے جس کی روشنی لو دیتی ہے اور ایسا روشن ستارہ ہے جس کا نور ضیا پاش ہے۔

اس میں سراج اور شہاب لمع اور سطع ہم وزن ہیں۔

نثر عاری وہ ہے جس میں وزن و قافیہ کی پابندی نہ کی گئی ہو جیسے۔

ولیکن احب الامور الیک اوسطھا فی الحق و اعمھا واجمعھا فرضی الرعیتہ۔ تمہیں سب طریقوں میں سے وہ طریقہ پسند ہونا چاہئے جو حق کے اعتبار سے بہترین انصاف کے لحاظ سے سب کو شامل اور رعایا کے زیادہ سے زیادہ افراد کی مرضی کے مطابق ہو۔

حضرت کے نثری کلمے جو آپؑ کی زبان سے سنے گئے یا قلم سے صفحہ قرطاس پر آئے متعدد کتابوں میں جمع کئے گئے ہیں ان میں سے اہم مجموعے یہ ہیں۔

نہج البلاغہ۔ علامہ شریف رضی متوفی ۴۰۶ھ کی مشہور ترین تالیف ہے جس میں حضرتؑ کے خطبات، مراسلات اور کلمات حکمیہ، منتخب کر کے ترتیب دئے ہیں۔

مستدرک نہج البلاغہ۔ اس کے جامع شیخ ہادی ابن شیخ عباس نجفی ہیں۔

دستور موالم الحکم۔ اس کے جامع ابو عبداللہ محمد ابن سلامہ قضاعی ہیں۔

نثرا للالی۔ اس کے جامع ابو علی الطبرسی صاحب تفسیر مجمع البیان ہیں۔

عزرا الحکم و درر الحکم۔ اس کے جامع عبدالواحد آمدی تمیمی ہیں۔

قلائد الحکم و فرائد الحکم۔ اس کے جامع قاضی ابو یوسف اسفرائنی ہیں۔

تحف العقول۔ یہ ابو سعد حسن ابن علی ابن شعبہ کی تالیف ہے اس میں امیرالمومنین علیہ السلام کے خطبات و کلمات کے علاوہ دوسرے آئمہ اطہار کے ارشادات بھی درج ہیں۔

کتاب مطلوب کل طالب من کلام علی ابن ابی طالب علیہ السلام۔ اس کے جامع ابو اسحاق وعودہ انصاری ہیں۔

صحیفہ علویہ۔ اس کے مرتب عبداللہ ابن صالح امین جمعہ متوفی ۱۱۳۵ھ ہیں۔

الف کلمہ۔ اس کے جامع ابن ابی الحدید معتزلی شارح نہج البلاغہ ہیں۔

مائتہ کلمہ۔ اس کے جامع ابو عثمان جاحظ ہیں۔

نظم الغرر و نضد الدرر۔ اس کے جامع میرزا عبدالکریم ابن محمد یحییٰ قزوینی ہیں۔

عیون الحکم والمواعظ۔ اس کے جامع شیخ علی ابن محمد واسطی ہیں۔

اکسیر السعادتین۔ اس کے جامع اسعد ابن عبدالقاہر اصفہانی ہیں۔

علم القراۃ والکتابہ

حرفوں کی ترکیبی و غیر ترکیبی شکلوں اور مختلف الاشکال حروف کی امتیازی علامتوں کو پہچاننے کا نام علم القراۃ اور انہیں قلم بند کرنے کے طریق کار کا نام علم الکتابہ ہے۔ اس نوشت و خواند کی ایجاد ضرورت کے زیر اثر ہوئی اور اپنی افادیت کی بنا پر دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی۔ تحریر ہی سے علوم و فنون کو بقاء و دوام حاصل ہوتا ہے اور دانشمندوں کے تجربات و مشاہدات دستبرد زمانہ سے محفوظ کئے جاتے ہیں۔ابتداء میں تصاویر و نقوش کے ذریعہ مختلف واقعات ظاہر کئے جاتے تھے اور یہ تصویریں حروف تہجی کا کام دیتی تھیں۔ یہ تصویری تحریریں آشور بابل اور مصر میں ہیکلوں، معبدوں اور مقبروں پر ثبت کی جاتی تھیں اور اس طرح اہم واقعات تاریخی اعتبار سے محفوظ کر لئے جاتے تھے۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے بھی اس تصویری رسم الخط کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ چنانچہ آپؑ سے دریافت کیا گیا کہ اہرام[1] مصر کی بنا کب رکھی گئی۔ آپ نے فرمایا کہ کیا اس پر کوئی تصویر بنی ہوئی ہے بتایا گیا کہ اس پر گدھ کی تصویر ہے جس کے پنجہ میں کیکڑا جکڑا ہوا ہے فرمایا۔

بنی الھرمان والنسرفی السرطان۔ (غیاث اللغات ص ۴۹۴) اہرام کی بنیاد اس وقت رکھی گئی جب ستارہ نسر برج سرطان میں تھا۔

---

[1] اہرام مصر فراعنہ مصر کے مقبرے ہیں ان میں بڑا اہرام خوفو نے اپنے دفن کے لئے تعمیر کیا تھا۔ یہ ایک وسیع رقبہ میں ۴۸۵ فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور اس کے قریب خافراع اور منکاؤ راع کے دو اہرام ہیں جو بلندی اور پھیلاؤ میں اس سے چھوٹے ہیں۔ اہرام کبیر کی تعمیر ایک لاکھ انسانوں کی محنت شاقہ کے نتیجہ میں بیس سال کے عرصہ میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔

ستارہ نسر کی صورت نسر (گدھ) کی سی ہوتی ہے اس لئے اسے گدھ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور برج سرطان کی صورت سرطان (کیکڑا) سے ملتی جلتی ہے۔ نسر دو ہزار سال میں ایک برج سے دوسرے برج میں منتقل ہوتا ہے لہٰذا یہ دیکھ کر کہ ستارہ نسر کس برج میں ہے اس کے زمانۂ تعمیر کی مدت متعین کی جا سکتی ہے۔ اس تصویری خط کے بعد مختلف آوازوں کے لئے مختلف علامتیں وضع کی گئیں جنہیں حروف کہا جاتا ہے۔ ان حروف کے ذریعہ تحریر کا کام آسان اور مختصر ہو گیا اور تصویری خط کی ضرورت ختم ہو گئی۔ اس حروفی تحریر میں مصریوں اور چینیوں کو تقدم حاصل ہے مصریوں نے یہ فن فیسقیوں سے سیکھا۔ جو شام کے مغربی سواحل پر حکمران تھے انہی سے فرمایا مغربی دنیا نے سیکھا۔ اور یونانیوں نے ان کے حروف تہجی پر اپنے ہاں کے حروف کی بنیاد رکھی۔ ظہور اسلام سے کچھ عرصہ قبل حجاز میں تحریر و کتابت کا رواج تھا۔ جب وہ تجار تجارت کے سلسلہ میں شام و عراق جاتے تھے اور وہاں نوشت و خواند کا رواج پایا تو ان میں سے چند لوگوں کو تحریر کی ضرورت کا احساس ہوا اور انہوں نے وہاں کے لوگوں سے نبطی و سریانی خط سیکھا اور بعد میں محدود پیمانے پر تحریری کام ہونے لگا اس خط نبطی سے خط نسخ نے جنم لیا اور خط سریانی سے ایک دوسرے خط کی بنیاد پڑی جو کوفہ میں نشوونما پانے کی وجہ سے خط کوفی کے نام سے موسوم ہوا۔

امیرالمومنین علیہ السلام فن تحریر میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ آیات قرآنیہ کی کتابت اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بیشتر تحریری خدمات آپ ہی سے متعلق تھے۔ آپ نے جہاں اعرابی علامتوں اور نقطوں کی طرف رہنمائی فرمائی وہاں کتابت کے اصول بھی وضع کئے۔ حرفوں کے جوڑ ملانے تحریر کے نوک پلک سنوارنے اور واضح و خوشخط لکھنے کی طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ اپنے کاتب عبداللہ ابن ابی رافع سے فرمایا۔

الق دواتک واطل جلفتہ قلمک و فرج بین اسطور و قرسط بین الحروف لان ذلک اجدی بصباحہ الخط۔

دوات میں صوف ڈالا کرو اور قلم کی زبان لانبی رکھو سطروں کے درمیان فاصلہ زیادہ چھوڑو اور حرفوں کے جوڑ ساتھ ملا کر لکھو کہ یہ خط کی دیدہ زیبی کے لئے مناسب ہے۔

خط کی عمدگی و پاکیزگی کی ترغیب دلاتے ہوئے فرمایا۔

علیکم بحسن الخط فان من مفاتیح الرزق۔

خوشخط لکھو اس لئے کہ خط کی زیبائی رزق کی کنجی ہے۔

خوشخطی ہر طبقہ کے لئے نتیجہ خیز و ثمر آور ہے حضرت فرماتے ہیں۔

حسن الخط للفقیر مال و للغنی جمال و للعالم کمال۔

خط کی پاکیزگی فقیر کے لئے مال، دولتمند کے لئے جمال، اور عالم کے لئے کمال ہے۔

بچوں کو لکھنے کی تعلیم دینے کے بارے میں فرمایا۔

علمو اولاد کم الکتابۃ۔ اپنے بچوں کو لکھنے کی تعلیم دو۔

علم معانی

علم معانی وہ علم ہے جو الفاظ کو معنی سے ہم آہنگ بنانے کے اصولوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے تاکہ دوسروں کے ذہنوں تک صحیح طریق سے معانی منتقل کئے جا سکیں۔ انہی اصولوں پر فصاحت و بلاغت کو پرکھا اور فصیح وغیر فصیح میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ فصاحت کا تعلق الفاظ سے ہوتا ہے اور بلاغت کا تعلق معنی سے۔ وہ کلام جو لسانی قواعد کے مطابق ثقیل و ناموس الفاظ سے مبرا اور ترتیب کے الجھاؤ سے پاک ہو فصیح کہلاتا ہے اور اگر ان اوصاف کے ساتھ مخاطب کی ذہنی کیفیت اور موقع و محل کی مطابقت بھی ملحوظ رکھی گئی ہو تو اسے بلیغ کہا جاتا ہے۔ مخاطب کی ذہنی کیفیت مختلف موارد پر مختلف ہوتی ہے۔ کبھی وہ خالی الذہن ہوتا ہے' کبھی متردد اور کبھی منکر۔ لہٰذا ان موقعوں کے لحاظ سے کلام کا انداز بھی مختلف ہونا چاہیئے۔ چنانچہ مخاطب خالی الذہن ہو تو کلام میں تاکیدی الفاظ سے زور پیدا کرنے کی ضرورت نہ ہو گی۔ جیسے امیرالمومنین علیہ السلام کا یہ ارشاد۔

مراوہ الدنیا حلاوۃ الآخرۃ وحلاوۃ الدنیا مراۃ الاخرۃ۔ دنیا کی تلخی آخرت کی خوشگواری ہے اور دنیا کی خوشگواری آخرت کی تلخی ہے۔

اگر مخاطب تردد و شک کی حالت میں ہو تو تاکید کا لانا مستحسن ہے تاکہ اس کا شک برطرف ہو جائے۔ جیسے حضرتؑ کا یہ ارشاد۔

اما واللہ ما اتیتکم اختیارا ولکن جئت الیکم سوقا۔ بخدا میں تمہاری طرف بخوشی نہیں آیا بلکہ حالات سے مجبور ہو کر آگیا۔

اگر مخاطب کو سرے سے انکار ہو تو تاکید کا لانا ضروری ہے تاکہ اس کے انکار کو اقرار میں بدلا جا سکے جیسے حضرتؑ کا یہ قول۔

انہم واللہ لم ینفروا امن ولم یلحقوا بعدل۔ خدا کی قسم وہ ظلم سے نہیں بھاگے اور عدل سے جا کر نہیں چمٹے۔

اگر مخاطب کا انداز منکر کا سا ہو۔ اگرچہ اسے انکار نہ ہو تو اسے بھی منکر قرار دے کر کلام میں تاکید لائی

جاتی ہے جیسے حضرت کا یہ ارشاد۔

واعلموا عباد اللہ انکم وما انتم فیہ من ھذہ الدنیا علی سبیل من قد مضیٰ۔

اے خدا کے بندو اس بات کو جان لو کہ تمہیں اور اس دنیا کی چیزوں کو جن میں تم ہو انہی لوگوں کی راہ پر گزرنا ہے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔

یہ کلام موکد ہے حالانکہ کوئی بھی اس سے انکاری نہیں ہے کہ پہلے لوگوں کی طرح بعد میں آنے والوں کو بھی مرنا ہے مگر ان لوگوں کی غفلت اور دنیا طلبی میں انہماک یہ ظاہر کرتا ہے کہ گویا انہیں ہمیشہ دنیا میں رہنا ہے اور موت سے دو چار ہونا نہیں ہے۔ لہٰذا ان کے طور طریقہ کو ایک طرح کا انکار قرار دے کر تاکید لائی گئی ہے۔

کبھی منکر کو غیر منکر قرار دے لیا جاتا ہے جبکہ وہ ایک ایسی حقیقت ثابتہ کا انکار کرے جو ہر شک و شبہہ سے بالاتر ہو تو ایسے موقع پر اگرچہ کلام کو موکد ہونا چاہیئے مگر ایسے انکار کو بے وزن اور ناقابل اعتناء ٹھہراتے ہوئے تاکید ترک کر دی جاتی ہے جیسے اہل بیت علیہ السلام کے بارے میں حضرت کا یہ ارشاد۔

وفیھم الوصیۃ والوراثۃ۔

انہی کے بارے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت اور انہی کے لئے وراثت ہے۔

غرض الفاظ کی موزوں ترتیب کے ساتھ مقتضائے حال کی مطابقت وہم آہنگی کا نام بلاغت ہے اگر مقتضائے حال کی رعایت ملحوظ نہ رکھی گئی ہو تو خواہ اجزائے کلام کی ترتیب شگفتہ' بندش عمدہ اور الفاظ سلیس و سادہ کیوں نہ ہوں کلام میں بلاغت پیدا نہ ہو گی۔

علم معانی کی رعایت سے کلام کو مقتضائے حال کے مطابق ڈھالا اور لفظوں کی تقدیم و تاخیر اور حسن ترتیب سے بلاغت کا جوہر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ان بلاغت کے اصولوں کا سرچشمہ فصحاو بلغاء کا کلام ہے۔ چنانچہ قدیم فصحائے عرب کے کلام میں بلاغت کے اصناف و اسالیب کارفرما تھے حالانکہ اس وقت نہ معانی و بیان کا فن وجود میں آیا تھا اور نہ بلاغت کے اصول ترتیب دیئے گئے تھے۔ ان کا ذوق سلیم خود ہی فصیح و غیر فصیح میں امتیاز اور بلاغت اور اس کے مراتب کی تشخیص کر لیتا تھا دور اسلام کے ادیبوں اور انشاء پردازوں نے انہی اسالیب کی روشنی میں فن بلاغت کی تدوین کی اور کلام کے لفظی و معنوی محاسن کے پرکھنے کے پیمانے مقرر کئے۔

عرب کے مختلف علاقوں میں اگرچہ عربی ہی بولی جاتی تھی مگر ہر علاقہ کا تلفظ' طرز ادا اور لب ولہجہ مختلف ہوتا تھا اور ہر ملک میں ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے کہ ہر تھوڑے فاصلہ پر معاشرت کی تبدیلی کے ساتھ زبان بھی قدرے بدل جاتی ہے اور تلفظ' اسلوب بیان اور لب و لہجہ میں فرق آ جاتا ہے۔ مگر ہر علاقہ اور خطہ کی زبان مستند معیاری اور فصیح نہیں سمجھی جاتی بلکہ جو لہجہ کی لطافت و شیرینی لفظوں کی سلاست وروانی اور جملوں کی ترکیب و ساخت کے اعتبار سے

سبک و دلآویز ہوتی ہے وہی زبان مستند قرار پاتی ہے۔ چنانچہ عرب میں سات زبانیں رائج تھیں جو قریش ہذیل، ثقیف، ہوازن، کنانہ، تمیم اور یمن کی طرف منسوب تھیں مگر ان تمام لہجوں اور زبانوں میں قریش کی زبان کو معیاری سمجھا جاتا تھا اور انہی کی زبان تمام عرب میں فصیح و بلیغ سمجھی جاتی تھی۔ بلکہ نزول قرآن کے بعد اپنی صحت و بلند معیاری کی بنا پر جزیرہ نمائے عرب میں عام ہو گئی اور دوسرے لہجے رفتہ رفتہ متروک قرار پا گئے۔ قریش اور عرب کے دوسرے قبائل کے لہجوں میں ذیل کی چند مثالوں سے فرق واضح ہو جاتا ہے۔ قریش مرد سے خطاب کے موقع پر کاف مفتوح اور عورت سے خطاب کے موقع پر کاف مکسور کلمہ کے آخر میں لاتے تھے اور قبیلہ ربیعہ و مضر کاف مفتوح کے آخر میں سین کا اور کاف مکسور کے آخر میں شین کا اضافہ کر دیتے تھے۔ قبیلہ قضاعہ یائے نسبتی کے آخر میں جیم بڑھا دیتا تھا اور مصری کی جگہ مصریج بولتا تھا قبیلہ ازد اور ہذیل عین ساکن کو نون سے بدل دیتے تھے اور اعرابی کی جگہ انرابی کہتے تھے۔ قبیلہ مازن و ربیعہ باکو میم سے اور میم کو با سے تبدیل کر دیتے تھے اور بکر کی جگہ مکر اور مااسمک کی جگہ بااسمک بولتے تھے۔ قبیلہ حمیر الف لام کو الف میم سے بدل دیتا تھا اور السلام کی جگہ امسلام بولتا تھا اور بنی طے بعض الفاظ کا ادھورا تلفظ کرتے تھے مثلاً" السلطان کہنا ہو تو السلطا کہتے۔ ان مثالوں سے قریش کی زبان کے اعلی معیار کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ قریش کو اگرچہ تجارت کے سلسلہ میں شام، یمن، حبشہ اور فارس تک جانا پڑتا تھا اور مختلف زبانوں سے مختلف الفاظ سنتے تھے اور حج و طواف کے لئے آنے والے قبائل کی زبانوں سے بھی اجنبی اور نامانوس الفاظ ان کے گوش گزار ہوتے تھے مگر وہ اپنے لہجہ اور زبان کے معیار کو برقرار رکھتے اور الفاظ کی صحت و سلاست اور لہجے کی نفاست کو اجنبی آوازوں سے متاثر نہ ہونے دیتے اور اگر دوسری زبان کی لفظیں استعمال کرنے کی انہیں ضرورت محسوس ہوتی تو وہ اپنے ذوق سلیم اور لب و لہجہ کے مطابق ان کے نوک پلک کی درستی اور اصلاح کر کے استعمال کرتے اور جو الفاظ ثقیل و ناتراشیدہ ہوتے اور ان کے معیار پر پورے نہ اترتے انہیں اپنی زبان پر نہ آنے دیتے اس طرح زبان کی نفاست و رعنائی بھی برقرار رہتی اور الفاظ کا سرمایہ بھی بڑھتا رہتا۔ قریش کو زبان کے نکھارنے میں ان میلوں ٹھیلوں سے بھی بڑی مدد ملی جو مکہ کے اطراف میں عکاظ، ذوالمجاز اور ذوالمجنہ میں ہوتے تھے۔ ان میلوں میں خرید و فروخت کے علاوہ ادبی و ثقافتی اجتماعات بھی ہوتے تھے اور مختلف قبیلوں کے خطباء و شعراء زبان آوری کے جوہر دکھاتے اور اظہار و ابلاغ کے نئے اسلوب سننے میں آتے۔ ان اجتماعات میں قریش بھی شریک ہوتے اور ادبی محفلوں میں پوری سرگرمی سے حصہ لیتے اور اس طرح مکہ میں زبان پرورش پاتی اور پھلتی پھولتی رہی اور جہاں زبان نشو و نما پاتی اور نکھرتی، سنورتی ہے وہیں کی زبان مستند اور معیاری سمجھی جاتی ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے بھی مکہ کی لسانی برتری کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے آپؑ سے کہا کہ ہم نے آپؑ سے بڑھ کر فصیح اور زبان آور نہ دیکھا ہے نہ سنا ہے۔ آپؑ نے فرمایا۔

وما یمنعنی وانا مولدی بمکہ۔ ایسا کیوں نہ ہو جبکہ میرا مولد مکہ ہے۔

جورج جرداق مسیحی نے تحریر کیا ہے۔

قد نشاء فی المحیط الذی تسلم فیہ الفطرہ و تصفو۔ (الامام علیؑ) حضرت نے ایک ایسے خطہ میں نشو و نما پائی جس میں طبیعت نکھرتی اور سنورتی ہے۔

اس علم و ادب کی بہار آفریں سرزمین پر نشو و نما پانے کا یہ اثر تو ہونا ہی تھا کہ آپؑ میں زبان و بیان کی وہ تمام خوبیاں موجود ہوں جو اہل زبان کی زبان کا جوہر ہیں۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے علاوہ آپؑ نے اپنے ذوق اور وجدان سلیم سے ادب کے مزید خدو خال نکھارے اور ایسے اسلوب وضع کئے جن سے بلاغت کی نئی راہیں کھلیں اور زبان و بیان میں ادبی لہریں رواں دواں ہوئیں۔ آپؑ ہی کے زور بیان نے قریش کا ادبی معیار بلند کیا اور بلاغت کے نئے اسلوب ان کے ذہن نشین کئے۔ معاویہ ابن ابی سفیان کا قول ہے کہ۔

واللہ ما سن الفصاحتہ لقریش غیرہ۔ خدا کی قسم قریش کے لئے فصاحت کی راہیں آپؑ ہی نے ہموار کیں۔

آپؑ کی طبیعت میں فصاحت و بلاغت اس طرح رچی بسی ہوئی تھی کہ آپؑ کی ہر تقریر مختصر ہو یا طویل' بلاغت کا نادر نمونہ ہوتی تھی اور ہر تحریر ادب کا لافانی پارہ' نہ کبھی تراش خراش کی نوبت آئی اور نہ کانٹ چھانٹ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بلکہ جو کہا اجمالاً" کہا اور جو لکھا قلم برداشتہ لکھا۔ اس کے باوجود فصاحت کا وہ معیار قائم کیا جو فصحائے عالم کی پرواز سے بلند تر رہا محمد حسن الزیات لکھتے ہیں۔

لا نعلم بعد رسول اللہ فیمن سلف و خلف افصح من علی۔ (تاریخ الادب العربی) رسول اللہؐ کے بعد اگلے پچھلے لوگوں میں علی علیہ السلام سے فصیح تر کوئی تھا نہ ہے۔

ہر وہ شخص جو اسلوب کلام عرب سے واقف ہو آپؑ کے خطبات و تحریرات پر نظر کرنے کے بعد فیصلہ کر سکتا ہے کہ آپؑ کا کلام لفظوں کی شگفتگی' جملوں کی برجستگی' اسلوب کی لطافت اور مقتضائے حال کی رعایت میں مثل و نظیر نہیں رکھتا اور عرب کے بلند پایہ ادیبوں اور انشاپردازوں نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے حضرتؑ کے خطب و مکاتیب سے استفادہ کر کے تحریر کے اسلوب سیکھے اور آپؑ کے طرز نگارش سے بلاغت کے اصول اخذ کئے۔

علامہ شریف رضی نے تحریر کیا ہے۔

كان امیرالمومنين مشرع الفصاحة و موردها و منشاء البلاغة و مولدها ومنه علیہ السلام ظهر مكنونها واخذت قوانينها۔

امیرالمومنین علیہ السلام فصاحت کا سرچشمہ اور بلاغت کا مخرج و منبع تھے فصاحت و بلاغت کی چھپی ہوئی باریکیاں آپ ہی سے ظاہر ہوئیں اور آپ ہی سے اس کے اصول و قواعد سیکھے گئے۔

علم بیان

علم بیان وہ علم ہے جس میں معنی مجازی کے استعمال کے مختلف پیرائے اور اسلوب زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ اگرچہ وضع الفاظ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لفظوں کو ان کے حقیقی و وضعی معنی میں استعمال کیا جائے مگر بعض معانی و افکار اتنے دقیق و لطیف ہوتے ہیں کہ الفاظ اپنے وضعی معنی کے ذریعہ انہیں اپنی گرفت میں نہیں لے سکتے اس لئے معنی مجازی کا سہارا لینا پڑتا ہے اس سے جہاں دقیق معانی کی نقاب کشائی ہوتی ہے وہاں اظہار بیان میں تفنن و بوقلمونی بھی پیدا ہوتی ہے۔ جس سے کلام کا حسن اور اس کی تاثیر یہ نکھر جاتی ہے۔ اس علم میں تشبیہ' استعارہ، مجاز' مرسل اور کنایہ سے بحث کی جاتی ہے۔

تشبیہ یہ ہے کہ ایک چیز کی کسی صفت کو دوسری چیز کی صفت کے مثل و مانند ظاہر کیا جائے جس کو تشبیہ دی جائے اسے مشبہ جس سے تشبیہ دی جائے اسے مشبہ بہ اور جو وصف مشبہ و مشبہ بہ میں مشترک ہوتا ہے اسے وجہ شبہ اور جس کے ذریعہ مشابہت کا اظہار کیا جاتا ہے اسے حرف تشبیہ کہا جاتا ہے۔

مشبہ اور مشبہ بہ میں سے جو کسی ظاہری حاسہ سے معلوم کیا جا سکے اسے حسی اور جو حاسوں کے بجائے عقل سے جانا جائے اسے عقلی کہا جاتا ہے کبھی دونوں حسی ہوں گے کبھی دونوں عقلی اور کبھی مشبہ عقلی اور مشبہ بہ حسی ہو گا اور کبھی مشبہ حسی اور مشبہ بہ عقلی۔ ان کی مثالیں حضرت کے کلام سے درج کی جاتی ہیں۔

(۱) ومخرج عنقه كالابريق۔

مور کی گردن کا پھیلاؤ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے صراحی۔

مور کی گردن مشبہ اور صراحی مشبہ بہ ہے اور یہ دونوں حسی ہیں۔

(۲) انتقم من الحرص بالقناعة كما تنتقم من العدو بالقصاص۔

قناعت کے ذریعہ حرص سے اس طرح انتقام لو جس طرح قصاص کے ذریعہ دشمن سے انتقام لیتے ہو۔

قناعت کے ذریعہ حرص کے دبانے کو قصاص کے ذریعہ دشمن کو کچلنے سے تشبیہ دی ہے اور یہ چیزیں عقلی

ہیں۔

(۳) سیاتی علیکم زمان یکفاء فیہ الاسلام کما یکفاء الاناء بما فیہ۔

وہ زمانہ تمہارے سامنے آنے والا ہے جس میں اسلام کو اس طرح اوندھا کر دیا جائے گا جس طرح برتن کو ان چیزوں سمیت جو اس میں ہوں۔

اس میں مشبہ اسلام کی واژگوں کیفیت ہے جو عقلی ہے اور مشبہ بہ وہ برتن ہے جسے اوندھا کر دیا گیا اور وہ حسی ہے۔

(۴) اشھود کغیاب۔

کیا تم موجود ہوتے ہوئے غائب ہونے والوں کے مانند ہو۔

یہاں حاضر مشبہ اور غائب مشبہ بہ ہے مشبہ حسی اور مشبہ بہ عقلی ہے۔

مشبہ اور مشبہ بہ کے اعتبار سے تشبیہ کی کئی قسمیں ہیں۔

(۱) مشبہ اور مشبہ بہ دونوں مفرد ہوں اس کی چند صورتیں ہیں۔

پہلی صورت یہ ہے کہ دونوں ہر قسم کی تقیید سے آزاد ہوں جیسے حضرتؑ کا ارشاد۔

الکاھن کالساحر۔

کاہن مثل جادوگر کے ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ معنی کی تکمیل کے لئے دونوں میں کوئی قید ہو۔ جیسے امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد۔

الولد العاق کالا صبع الزائد ان ترکت شانت وان قطعت اطت۔

نافرمان بیٹا زائد انگلی کے مانند ہے اگر اسے رہنے دیا جائے تو بدزیب معلوم ہوتی ہے اور کاٹا جائے تو تکلیف دیتی ہے۔

اس جملہ میں فرزند کے ساتھ عاق کی اور انگلی کے ساتھ زائد کی قید لگی ہوئی ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ مشبہ آزاد ہو اور مشبہ بہ مقید ہو جیسے حضرتؑ کا ارشاد۔

مادوا کما یمید الشجر یوم الریح العاصف۔

وہ اس طرح کانپتے رہتے تھے جس طرح تیز جھکڑ والے دن درخت تھرتھراتے ہیں۔

خوف سے کانپنا مشبہ اور درخت کا ہلنا مشبہ بہ ہے جس کے ساتھ طوفانی ہوا کی قید ہے۔

(۲) مشبہ اور مشبہ بہ دونوں مرکب ہوں جیسے حضرت ؑ کا یہ قول۔

كثرة الآراء مفسده كالقدر لا تطيب اذا كثر طباخولها۔

رایوں کی کثرت اس ہنڈیا کے مانند ہے جس کے پکانے میں بہتوں کا ہاتھ ہو نہ وہ رائیں خرابی سے بچتی ہیں اور نہ ہنڈیا خوش ذائقہ ہوتی ہے۔

اس میں مشبہ اور مشبہ بہ دونوں کی ہیئت مرکب ہے۔

(۳)۔ مشبہ اور مشبہ بہ میں سے ایک مفرد ہو اور ایک مرکب جیسے مور کی تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا۔

فهو كفصوص ذات الوان نطقت بالجين المكل۔

وہ رنگ برنگ کے ان نگینوں کی طرح ہے جو مرصع بجواہر چاندی میں دائروں کی صورت میں پھیلا دئے گئے ہوں۔

اس میں مشبہ مفرد اور مشبہ بہ مرکب ہے۔

تشبیہ کی ایک تقسیم یہ ہے کہ مشبہ متعدد اور مشبہ بہ ایک ہو یا مشبہ ایک اور مشبہ بہ متعدد ہوں جیسے حضرت ؑ کا یہ ارشاد۔

المصطنع انى الليكم كمن طوق الخنزير تبرا و قرط العكب در او البس الحمار و شيا والقم الافعى شهدا

کسی دنی و ذلیل سے نیکی کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے خنزیر کی گردن میں سونے کا ہار ڈالنے والا یا کتے کے کانوں میں موتی لٹکانے والا یا گدھے کو بیل بوٹے دار لباس پہنانے والا یا سانپ کو شہد چٹانے والا۔

اس میں مشبہ ایک اور مشبہ بہ چار ہیں۔

وجہ شبہ یعنی وصف مشترک کے اعتبار سے تشبیہ کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) وہ وصف مشبہ و مشبہ بہ میں واقعاً ثابت ہو جیسے۔

وایم اللہ لتجد ن بنی امیہ لکم ارباب سوء بعدی کالناب الضرد س۔ — خدا کی قسم میرے بعد تم بنی امیہ کو اپنے لئے بدترین حکمران پاؤ گے وہ ایک بوڑھی اور سرکش اونٹنی کے مانند ہیں۔

اس میں بنی امیہ کو کاٹنے والی بوڑھی ناقہ سے تشبیہ دی ہے اور وجہ شبہ منہ زوری و تند خوئی ہے اور یہ صفت دونوں میں واقعاً" پائی جاتی تھی۔

(۲) وہ وصف مشترک مشبہ و مشبہ بہ دونوں میں یا ایک میں فرض کر لیا گیا ہو جیسے۔

فتن کقطع اللیل المظلم۔ — وہ ایسے فتنے ہوں گے جیسے اندھیری رات کے ٹکڑے۔

اس میں فتنے مشبہ اور تاریک رات مشبہ بہ ہے اور وجہ شبہ تاریکی ہے جو مشبہ میں فرض کر لی گئی ہے

حرف تشبیہ کے اعتبار سے تشبیہ کی دو قسمیں ہیں موکد اور مرسل۔

تشبیہ موکد کی ایک صورت یہ ہے کہ حرف تشبیہ محذوف ہو جیسے۔

لاضطربتم اضطراب الا رشیتہ فی الطوی البعیدہ۔ — تم اس طرح پیچ و تاب کھانے لگے جس طرح گہرے کنوؤں میں رسیاں لرزتی اور تھرتھراتی ہیں۔

اس میں لوگوں کی بے چینی کو کنوئیں میں رسیوں کے لڑکھڑانے سے تشبیہ دی ہے اور حرف تشبیہ محذوف ہے

دوسری صورت یہ ہے کہ حرف تشبیہ کو حذف کر کے مشبہ بہ کو مشبہ کی طرف مضاف کر دیا جائے جیسے۔

وصابیح کو اکبھا۔ — چراغوں کی طرح چمکتے ہوئے ستارے آویزاں کئے۔

ستارے مشبہ اور چراغ مشبہ بہ جو مشبہ کی طرف مضاف ہیں۔

تشبیہ مرسل یہ ہے کہ حرف تشبیہ مذکور ہو جیسے۔

انداعی بلاعمل کالرامی بلا وتر۔ — جو عمل نہیں کرتا اور دعا مانگتا ہے وہ ایسا ہے جیسے بغیر چلہ کمان کے تیر چلانے والا۔

استعارہ یہ ہے کہ کسی لفظ کو اس کے اصل معنی کے بجائے کسی اور معنی میں استعمال کیا جائے جبکہ ان

دونوں معنوں میں تشبیہ کا تعلق ہو۔ تشبیہ اور استعارہ میں فرق یہ ہے کہ تشبیہ میں مشبہ و مشبہ بہ دونوں کا ذکر ہوتا ہے مگر استعارہ میں مشبہ کا ذکر نہیں ہوتا بلکہ مشبہ بہ کا ذکر کر کے اس سے مشبہ مراد لیا جاتا ہے اس میں مشبہ کو مستعارلہ مشبہ بہ کو مستعار منہ اور وجہ شبہ کو وجہ جامع کہا جاتا ہے۔ مستعارلہ' مستعار منہ اور وجہ جامع کے اعتبار سے استعارہ کی چھ قسمیں ہیں۔ یہ اقسام اور ان کے امثلہ حضرتؑ کے کلام سے درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) مستعارلہ' مستعارمنہ اور وجہ جامع سب حسی ہوں جیسے۔

فاجری فیھا سراجا مستطیرا۔ ان میں ضو پاش چراغ رواں کیا۔

اس میں سورج مستعارلہ' چراغ مستعارمنہ اور روشنی و ضیاء وجہ جامع ہے اور یہ سب حسی ہیں۔

(۲) طرفین استعارہ حسی ہوں اور وجہ جامع عقلی ہو جیسے۔

احتجوا بالشجرۃ واضاعوا الثمر۔ انہوں نے شجرہ ایک ہونے سے تو استدلال کیا لیکن اس کے پھلوں کو ضائع و برباد کردیا۔

اس میں مستعارلہ آپؑ کی ذات اور مستعارمنہ ثمر ہے اور وجہ جامع تعلق اور لگاؤ ہے یعنی جس طرح ثمر کو شجر سے لگاؤ ہوتا ہے اسی طرح آپ کو پیغمبر اکرمؐ سے تعلق اور لگاؤ تھا اس میں طرفین استعارہ حسی اور وجہ جامع عقلی ہے۔

(۳) طرفین استعارہ عقلی ہوں اور وجہ جامع بھی عقلی ہو جیسے۔

وفی ضیق المضجع وحیدا۔ اسے خوابگاہ کے ایک تنگ گوشہ میں تنہا چھوڑ دیا گیا۔

اس میں قبر کو خوابگاہ سے تعبیر کر کے خواب سے موت کا استعارہ کیا ہے۔ موت مستعارلہ اور خواب مستعارمنہ اور وجہ جامع بے حسی و بے حرکتی ہے اور یہ سب چیزیں عقلی ہیں۔

(۴) مستعارلہ عقلی اور مستعارمنہ حسی اور وجہ جامع عقلی ہو جیسے۔

ظفقت ارتای بین ان اصول بید جذاء۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ اپنے کٹے ہوئے ہاتھوں سے حملہ کروں۔

اس میں دست شکستہ ہونا مستعارمنہ ہے جو حسی ہے اور بے یار و مددگار ہونا مستعارلہ اور کمزوری و ناتوانی وجہ جامع ہے اور یہ دونوں عقلی ہیں۔

(۵) مستعارلہ حسی اور مستعارمنہ اور وجہ جامع عقلی ہو جیسے۔

وردت من نخوة باوه واعتلائه و شموخ انفه و سمو غلوائه۔

اس کے اٹھلانے اور سر اٹھانے کے غرور اور تکبر سے ناک اوپر چڑھانے اور بہاؤ میں تفوق و سربلندی دکھانے کا خاتمہ کر دیا۔

اس میں مستعارلہ موجوں کی طغیانی ہے جو حسی ہے اور مستعارمنہ فخرو سربلندی ہے اور وجہ جامع تکبرو ترفع ہے اور یہ دونوں عقلی ہیں۔

(٦) مستعارلہ اور مستعارمنہ دونوں حسی ہوں اور وجہ جامع مرکب ہو یعنی ایک پہلو سے حسی اور ایک پہلو سے عقلی ہو جیسا کہ آل محمد علیہم السلام کے بارے میں حضرتؑ کا یہ ارشاد۔

اذا خوی نجم طلع نجم۔

جب ایک ستارہ ڈوبتا ہے تو دوسرا ستارہ ابھر آتا ہے۔

اس میں آل محمد علیہم السلام مستعارلہ اور ستارہ مستعارمنہ ہے اور یہ دونوں حسی ہیں اور وجہ جامع منظر کی دلکشی اور مرتبہ کی بلندی ہے۔ حسن منظر حسی اور بلندیٔ مرتبت عقلی ہے۔

مستعارلہ اور مستعارمنہ کے اعتبار سے استعارہ کی دو قسمیں ہیں وفاقیہ اور عنادیہ

استعارہ وفاقیہ وہ ہے جس میں مستعارلہ اور مستعارمنہ کا ایک شے میں اجتماع ممکن ہو جیسے۔

البصیر منها ستزود و الا عمی لها ستزود۔

بابصیرت اس دنیا سے آخرت کے لئے زاد حاصل کرتا ہے اور بے بصیرت اسی کے سروسامان میں لگا رہتا ہے۔

اس میں لفظ بصیر سے عاقل کا اور لفظ اعمی سے جاہل کا استعارہ کیا ہے اور بصارت و عقل کا اجتماع ممکن ہے اس طرح کہ ایک شخص دیکھ بھی سکتا ہو اور عقل بھی رکھتا ہو اسی طرح اندھے پن اور جہل کا اجتماع ممکن ہے اس طرح کہ ایک شخص اندھا بھی ہو اور جاہل بھی ہو۔

استعارہ عنادیہ وہ ہے جس میں مستعارلہ اور مستعارمنہ کا اجتماع ناممکن ہو جیسے۔

فذلک میت الاحیاء۔

وہ تو زندوں میں (چلتی پھرتی ہوئی) لاش ہے۔

اس میں زندہ کو مردہ سے استعارہ کیا ہے اور موت و حیات کا اجتماع ناممکن ہے۔

وجہ جامع کے اعتبار سے استعارہ کی چار قسمیں ہیں۔

پہلی قسم یہ ہے کہ وجہ جامع، مستعارلہ اور مستعارمنہ کے معنی کا جزو ہو جیسے۔

ان شرار الناس طائرون الیک باقاویل السوء۔

شریر لوگ بری باتیں تم تک پہنچانے کے لئے اڑ کر پہنچا کریں گے۔

یہاں دوڑنا مستعارلہ اور اڑنا مستعارمنہ ہے اور وجہ جامع قطع مسافت ہے جو دونوں کے مفہوم میں داخل ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ وجہ جامع، مستعارلہ اور مستعارمنہ کے مفہوم سے خارج ہو جیسے اشعث ابن قیس کے بارے میں حضرتؑ کا ارشاد۔

حائک ابن حائک۔

جولاہا جولاہے کا بیٹا۔

اس میں مستعارلہ مرد احمق اور مستعارمنہ حائک ہے اور وجہ جامع حماقت ہے جو دونوں کے مفہوم سے خارج ہے اس لئے کہ حائک موضوع ہے اس کے لئے جس کا پیشہ کپڑا بننا ہو اور مرد موضوع ہے مذکر کے لئے اور حماقت دونوں کے مفہوم میں داخل نہیں ہے۔

تیسری قسم یہ ہے کہ وجہ جامع ظاہر و واضح ہو اور اس کے سمجھنے میں غور و فکر کی احتیاج نہ ہو جیسے۔

وایم اللہ لا فرطن لھم حوضا انا ماتحہ۔

خدا کی قسم میں ان کے لئے ایک ایسا حوض چھلکاؤں گا جس کا پانی نکالنے والا میں ہوں۔

اس میں لشکر کی جمع آوری کا استعارہ حوض کے چھلکانے سے کیا ہے اور وجہ جامع سمیٹنا اور یکجا کرنا ہے اور ابتدائے نظر میں اسے سمجھا جا سکتا ہے۔

چوتھی قسم یہ ہے کہ وجہ جامع کو غور و فکر کے بغیر سمجھا نہ جا سکے جیسے۔

لو وھب ما تنفست عنہ معادن الجبال۔

وہ چیزیں جنہیں باہر نکالنے کے لئے پہاڑوں کے معدن سانسیں لیتے ہیں بخش دے۔

یہاں کانوں سے سونا چاندی کے نکلنے کا پہاڑوں کے سانس لینے سے استعارہ کیا ہے اس میں وجہ جامع وہ حرکت ہے جو کسی شے کو اندر سے باہر نکالنے میں ہوتی ہے یہ استعارہ سطحی نظر میں سمجھ میں نہیں آتا بلکہ غور و فکر کے بعد ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

استعارہ میں وجہ جامع کبھی مفرد ہوتی ہے جیسے۔

تدفی الارض قدمک۔ اپنے قدم زمین میں گاڑ دینا۔

اس میں مضبوطی سے قدم جمانے کا استعارہ قدموں کے گاڑنے سے کیا ہے اور وجہ جامع ثبات و استقرار ہے جو امر واحد ہے۔

اور کبھی وجہ جامع چند چیزوں کی مجموعی ہیئت سے متخرج ہوتی ہے جیسے۔

فان الشیطان کامن فی کسرہ للوثبتہ ید ا و اخر للنکوص رجلا۔ شیطان اسی کے ایک گوشہ میں چھپا بیٹھا ہے جس نے ایک طرف تو حملے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہوا ہے اور دوسری طرف بھاگنے کے لئے قدم پیچھے ہٹا رکھا ہے۔

اس میں امیر شام یا عمرو ابن عاص کی متردوانہ کیفیت کو اس شخص کی متذبذبانہ حالت سے تشبیہ دی ہے جو کسی کام کے کرنے میں متردد ہو اور کبھی آگے بڑھتا ہو اور کبھی قدم پیچھے ہٹاتا ہو۔

ان اقسام کے علاوہ استعارہ کی تین قسمیں اور ہیں مطلقہ' مجردہ اور مرشحہ

استعارہ مطلقہ یہ ہے کہ اس میں نہ مستعارلہ کے مناسبات مذکور ہوں اور نہ مستعارمنہ کہ جیسے۔

حائک ابن حائک۔ جولاہا جولاہے کا بیٹا۔

اس میں مرد احمق مستعارلہ اور حائک مستعارمنہ ہے اور ان دونوں کے مناسب کوئی لفظ نہیں ہے۔

استعارہ مجردہ یہ ہے کہ اس میں مستعارلہ کے مناسبات مذکور ہوں جیسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں حضرتؑ کا ارشاد۔

ارسلہ بالدین المشھور والعلم الماثور۔ انہیں شہرت یافتہ دین منقول شدہ نشان کے ساتھ بھیجا۔

اس میں شرع مستعارلہ اور علم (پہاڑ) مستعارمنہ ہے اور لفظ ماثور (منقول) شرع کے مناسبات سے ہے

استعارہ مرشحہ یہ ہے کہ اس میں مستعارمنہ کے لوازم و مناسبات مذکور ہوں جیسے۔

ان بنی تمیم لم یغب لھم نجم الا طلع لھم نجم آخر۔ بنی تمیم تو وہ ہیں کہ جب بھی ان کا کوئی ستارہ ڈوبتا ہے تو اس کی جگہ دوسرا ابھر آتا ہے

اس میں قبیلہ بنی تمیم کے سرداروں کو ستاروں سے استعارہ کیا ہے۔ ستارہ مستعارمنہ ہے اور طلوع و غروب

اس کے مناسبات سے ہے۔

استعارہ کی ایک قسم استعارہ بالکنایہ ہے اس میں مستعارلہ (مشبہ) مذکور اور مستعارمنہ (مشبہ بہ) محذوف ہوتا ہے اور مشبہ بہ کے بعض لوازم مشبہ کے لئے ثابت کئے جاتے ہیں جیسے۔

وعضت الفتنہ ابناء ھا بانیا بھا۔ فتنوں نے اپنے دانتوں سے دنیا والوں کو کاٹنا شروع کر دیا۔

اس میں فتنہ کو درندہ جانور سے تشبیہ دی ہے جو محذوف ہے اور مشبہ کو مشبہ بہ کی جنس میں سے قرار دے کر مشبہ بہ کا لازمہ یعنی دانتوں سے کاٹنا مشبہ کے لئے ثابت کیا ہے۔

مجاز مرسل یہ ہے کہ لفظ کو غیر وضعی معنی میں استعمال کیا جائے اور معنی وضعی میں تشبیہ کے علاوہ کوئی اور علاقہ پایا جائے اس لئے کہ اگر تشبیہ کا علاقہ ہو گا تو وہ استعارہ ہو گا اور کوئی علاقہ نہ ہو گا تو لفظ کا غیر وضعی معنی میں استعمال غلط ہو گا یہ علاقے کئی طرح کے ہوتے ہیں ان میں سے چند علاقے حضرتؑ کے کلمات سے درج کئے جاتے ہیں۔

لفظ کل کے لئے وضع ہو اور اس سے جز مراد لیا جائے جیسے۔

لاتخاصمھم بالقران۔ تم ان سے قرآن کی رو سے بحث نہ کرنا۔

لفظ قرآن تمام آیات کے مجموعہ کے لئے وضع ہے اور یہاں وہ آیات مراد ہیں جن سے اثبات مدعا کیا جا سکتا ہے۔

لفظ جز کے لئے وضع ہو اور اس سے کل مراد لیں جیسے۔

ووحدتہ الشفاہ۔ ہونٹ اس کی یکتائی کا اقرار کرتے ہیں۔

یہاں ہونٹ سے مراد منہ ہے اور ہونٹ منہ کا ایک جز ہے۔

سبب سے مسبب مراد لیں جیسے۔

اجھز علیہ عملہ و کبت بہ بطنتہ۔ اس کی بداعمالیوں نے اس کا کام تمام کر دیا اور شکم پری نے اسے منہ کے بل گرایا۔

ہلاکت کی نسبت بد عملی و شکم پری کی طرف دی ہے اور یہ دونوں ہلاکت کا سبب ہیں۔

محل و ظرف بول کر وہ چیز مراد لیں جو اس میں واقع ہے جیسے۔

حتی اسھرت لیالیھم واظماء ت ھواجرھم۔ یہاں تک کہ ان کی راتیں جاگتی رہیں اور تپتی ہوئی دوپہریں پیاسی رہیں۔

اس میں بیداری کی نسبت راتوں کی طرف اور پیاس کی نسبت دوپہروں کی طرف دی ہے اس لئے کہ یہ بیداری راتوں میں ہوئی اور پیاس گرم دنوں میں جھیلی گئی۔

کسی چیز کے واسطہ کا ذکر کریں اور اس سے وہ چیز مراد لیں جس کا وہ واسطہ ہے جیسے۔

لم یدفعوا عنہ بلسان۔ زبان سے اس کی روک تھام نہ کی۔

زبان اصل وضع کے اعتبار سے آلہ گویائی کا نام ہے اور یہاں حرف و سخن مراد ہے جو زبان کے واسطہ سے گوش گزار ہوتی ہے۔

کنایہ یہ ہے کہ کسی لفظ سے اس کے لازم معنی مراد لئے جائیں۔ کنایہ اور مجاز میں فرق یہ ہے کہ کنایہ میں حقیقی معنی کے خلاف قرینہ نہیں ہوتا اس لئے حقیقی معنی بھی مراد لئے جا سکتے ہیں اور مجاز میں حقیقی معنی مراد نہیں لئے جا سکتے کیونکہ اس میں حقیقی معنی کے خلاف قرینہ قائم ہوتا ہے۔ کنایہ کی مثال یہ ہے۔

وثقلت فی الارض و طاتہ۔ زمین میں اس کی پامالیاں سخت سے سخت ہو گئیں۔

زمین کی پامالی کنایہ ہے ظلم و جور سے لیکن حقیقی معنی بھی مراد لئے جا سکتے ہیں۔

کنایہ کی چار قسمیں ہیں تعریض، تلویح، رمزاور ایماؤ اشارہ۔

تعریض یہ ہے کہ کنایہ میں موصوف مذکور نہ ہو لیکن ایسا قرینہ موجود ہو جس سے وہ واضح طور پر سمجھ میں آجائے جیسے۔

دلیلھا کمیث الکلام بطئی القیام سریع اذا قام۔ اس پرچم کی طرف رہنمائی کرنے والا وہ ہے جو بات کہنے میں جلد بازی نہیں کرتا اور نہ اقدام میں تاخیر کرتا ہے اور جب کسی امر کو لے کر کھڑا ہو جائے تو پھر تیز گام ہے۔

اگرچہ ان صفات کے موصوف کا صراحۃً ذکر نہیں ہے مگر محل و مقام سے سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرتؑ نے اپنی ذات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تلویح یہ ہے کہ لازم سے ملزوم تک کثرت سے وسائط ہوں جیسے۔

لود معاویہ انہ مابقی من بنی ھاشم نافخ ضرمتہ الاطعن فی نیط۔ معاویہ تو یہ چاہتا ہے کہ بنی ہاشم میں سے کوئی آگ میں پھونکنے والا نہ رہے مگر یہ کہ اس کے دل کی رگوں کو نیزہ کا نشانہ بنا دیا جائے۔

یہ کنایہ ہے بنی ہاشم کے مکمل خاتمہ سے اس طرح کہ جب کوئی آگ میں پھونکنے والا نہ رہے گا تو آگ کے جلنے کی نوبت نہ آئے گی اور آگ جلنے کی نوبت اس لئے نہیں آئے گی کہ کوئی باقی رہا ہی نہیں کہ آگ جلائے اور کھانا پکائے۔ اس میں ملزوم تک متعدد وسائط ہیں۔

رمز یہ ہے کہ اس میں وسائط زیادہ نہ ہوں مگر تھوڑی بہت پوشیدگی ہو جیسے۔

ھذا الشخص المعکوس والجسم المرکوس۔ یہ ٹیڑھا ڈھانچہ اور اوندھا جسم۔

یہ معاویہ کی بے راہروی سے کنایہ ہے اس طرح کہ راست قامت ہونا انسان کا اور سرا فگندہ ہونا حیوان کا وصف ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں راست رو کو راست قامت اور کج رو کو سرنگوں ہو کر چلنے والا کہا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

افمن یمشی کمبا علی وجھہ اھدی امن یمشی سویا علی صراط مستقیم۔ کیا وہ شخص زیادہ ہدایت یافتہ ہو گا جو اپنے منہ کے بھل چلے یا وہ شخص جو برابر سیدھے راستے پر چل رہا ہو۔

اس آیت کے پیش نظر راست قامتی کے لئے ہدایت اور سرا فگندگی کے لئے ضلالت کو لازم قرار دیتے ہوئے جسم کی کجی سے عقیدہ کی بے راہروی کی طرف اشارہ فرمایا ہے

ایماء و اشارہ یہ ہے کہ نہ متعدد واسطے ہوں اور نہ کوئی پوشیدگی ہو جیسے۔

نافجا حضیہ بین نثیلہ و معتلفہ۔ وہ پیٹ پھلائے سرگین اور چارے کے درمیان کھڑا ہوا۔

یہ اشارہ ہے شکم پری اور بسیار خوری کی طرف اور اس میں کوئی پوشیدگی نہیں ہے۔

علم بدیع

بدیع وہ علم ہے جس میں ان امور کو بیان کیا جاتا ہے جو کلام میں حسن و دلاویزی پیدا کرتے ہیں۔ یہ حسن اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جب کلام بلاغت کے معیار پر پورا اترتا ہو۔ اگر بلاغت کے جوہر سے عاری ہوگا تو ان چیزوں سے حسن پیدا نہ ہوگا بلکہ اس کی مثال اس بوسیدہ عمارت کی سی ہوگی جس پر مینا کاری کی گئی ہو یا اس کریہہ و بدصورت کی سی ہوگی جسے سامان زیبائش سے نظر فریب بنانے کی کوشش کی گئی ہو۔ یہ حسن و خوبی الفاظ میں بھی ہوتی ہے اور معنی میں بھی۔ اس لئے اس کی دو قسمیں ہوں گی، معنوی اور لفظی، معنوی خوبیوں کو بدائع معنویہ کہا جاتا ہے۔ اور لفظی خوبیوں کو ضائع لفظیہ۔ بعض اوقات پوری توجہ ضائع پر مرکوز کر دی جاتی ہے اور اس کثرت سے ان کو برتا جاتا ہے کہ مقصد و مدعا صنعتوں کے انبوہ میں گم ہو کر رہ جاتا ہے اس سے کلام میں حسن تو کیا پیدا ہوگا معانی کا سرشتہ بھی ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں۔

من اشتغل بتفقد اللفظته و طلب السجعة نسی الحجة۔ جو شخص لفظ کی فکر اور سجع کی تلاش میں کھو جاتا ہے وہ دلیل و برہان بھول جاتا ہے۔

حضرتؑ کے کلام میں جہاں معانی و مطالب کی گہرائیاں اور حسن بیان کی نادرہ کاریاں اپنے انتہائی عروج پر نظر آتی ہیں وہاں موقع و محل پر لفظی و معنوی ضائع بھی کار فرما ہیں اور یہ ضائع اس برجستگی سے استعمال ہوئے ہیں کہ نہ آورد کا شائبہ ہے اور نہ تکلف کی جھلک۔ ذیل میں ضائع کی یہ دونوں قسمیں اور ان کے امثلہ حضرت کے کلام سے تحریر کئے جاتے ہیں۔ ضائع معنویہ ہیں۔

طباق

صنعت طباق یہ ہے کہ کلام میں دو ایسے لفظ یکجا کئے جائیں جو متضاد و مخالف ہوں خواہ دونوں اسم ہوں۔ جیسے:

الصادق علی شرف منجاۃ و کرامۃ راست گفتار نجات اور بزرگی کی بلندیوں پر ہے۔

و الکاذب علی شفا مھواۃ و مھانۃ اور دروغ گو پستی و ذلت کے کنارے پر ہے۔

اس میں صادق اور کاذب متضاد ہیں اور کرامت اور مہانت میں تضاد ہے اور یہ سب اسم ہیں خواہ دونوں فعل ہوں، جیسے

یعیشون جھا لا ویموتون ضلالا وہ زندہ رہے تو جاہل اور مر گئے تو گمراہ

اس میں یعیشون اور یموتون میں تضاد ہے اور یہ دونوں فعل ہیں۔

خواہ ایک اسم اور ایک فعل ہو جیسے:

قد امرفیھا ما کان حلوا دنیا کے شیریں (مزے) تلخ اور صاف و شفاف (لمحے)

و کدر ما کان صفوا مکدر ہو گئے۔

اس میں امر اور حلوا میں کدر اور صفوا میں تضاد ہے۔ امر اور کدر فعل اور حلوا اور صفوا دونوں اسم ہیں۔ خواہ دونوں حرف ہوں جیسے:

ما یدریک ما علی مما لی تجھے کیا معلوم کہ کونسی چیز میرے حق میں ہے اور کونسی چیز میرے خلاف۔

علی ضرر کے لئے اور لام انتفاع کے لئے ہوتا ہے اور ضرر و انتفاع میں تضاد ہے۔

کبھی دو لفظوں میں حقیقی معنی کے اعتبار سے تضاد ہوتا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا مثالوں سے ظاہر ہے اور کبھی حقیقی معنی کے اعتبار سے بھی تضاد ہوتا ہے۔ اور مجازی معنی کے اعتبار سے بھی جیسے۔

فالبصرے منھا شاخص والاعمی الیھا شاخص دیکھنے والا اس سے نکلنا چاہتا ہے اور اندھا اسی پر نظریں جمائے رہتا ہے۔

اس میں بصیر اور اعمی میں اپنے حقیقی معنی کے اعتبار سے بھی تضاد ہے اور مجازی معنی کے اعتبار سے بھی۔ اس طرح کہ بصیر کے مجازی معنی عالم و دانا کے ہیں اور عمیٰ کے معنی جاہل و بے خبر کے ہیں اور علم و جہل میں تضاد ہے۔

اثبات و نفی کے اعتبار سے طباق کی دو قسمیں ہیں ایجابی اور سلبی' طباق ایجابی وہ ہے جس میں حرف نفی نہ ہو۔ مذکورہ بالا مثالیں اسی طباق ایجابی کی ہیں اور طباق سلبی وہ ہے جس میں ایک مصدر کے دو فعل اس طرح ذکر کئے جائیں کہ ایک مثبت ہو اور ایک منفی جیسے:

و تغزون ولا تغزون۔ وہ تم سے لڑ بھڑ رہے ہیں اور تم جنگ سے جی چراتے ہو۔

یا ایک امر ہو اور ایک نہی جیسے:۔

فکونو امن ابناء الاخرۃ ولا تکونوا من ابناء الدنیا۔ تم فرزندان آخرت بنو ابناء دنیا نہ بنو۔

کبھی تضاد کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دو متقابل لفظوں میں سے ایک دوسرے لفظ کے متضاد بایں معنی ہوتا ہے۔

کہ وہ معنی متضاد کا سبب ہے جیسے:

فالهدی خامل والعمی شامل۔ ہدایت گمنام اور کور چشمی ہمہ گیر تھی

اس میں ہدایت اور اندھے پن میں اگرچہ تضاد نہیں ہے مگر یہ اندھا پن گمراہی کا سبب ہے اور ہدایت و گمراہی میں تضاد ہے۔

یا تضاد کی یہ صورت ہوتی ہے کہ ایک لفظ دوسرے لفظ کے متضاد معنی سے لزوم کا تعلق رکھتا ہے جیسے۔

فانه والله الجد لا اللعب والحق لا الكذب خدا کی قسم وہ چیز سراسر حقیقت ہے ہنسی کھیل نہیں اور سرتاپا حق ہے جھوٹ نہیں۔

حق و کذب متقابل الفاظ نہیں ہیں بلکہ صدق و کذب متقابل ہیں مگرچوں کہ حق صدق کے لئے لازم ہے اس لئے لازم معنی کے اعتبار سے حق و کذب میں تضاد ہوگا۔ یہ تضاد و طباق خفی کے نام سے موسوم ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ لفظی اعتبار سے تضاد نہ ہو بلکہ معنوی اعتبار سے تضاد ہو جیسے۔

من سقف فوقهم مرفوع و مهاد تحتهم موضوع۔ ان کے سروں پر بام بلند اور ان کے نیچے بچھا ہوا گہوارہ۔

اس میں بام اور گہوارہ میں اگرچہ لفظی اعتبار سے تضاد نہیں ہے مگرچوں کہ چھت اوپر ہوتی ہے اور گہوارہ نیچے اور فوق و تحت متضاد ہیں لہذا معنوی اعتبار سے ان میں تضاد ہوگا۔

مقابلہ وہ صنعت ہے جس میں دو یا دو سے زیادہ متوافق الفاظ لائے جائیں اور پھر علی الترتیب ان کے متضاد الفاظ ذکر کئے جائیں جیسے:

لعن الله الامرين بالمعروف التاركين له و الناهين عن المنكر العالمين به۔ خدا ان لوگوں پر لعنت کرے جو اوروں کو بھلائی کا حکم دیں اور خود اسے چھوڑ بیٹھیں اور دوسروں کو بری باتوں سے روکیں اور خود ان پر عمل کرتے رہیں۔

اس میں امر، معروف اور ترک کے مقابلہ میں نہی، منکر اور عمل کے الفاظ ہیں۔

مراعاة النظیر یہ ہے کہ کلام میں چند متناسب چیزیں جمع کر دی جائیں جیسے:

الحمد لله غير مقنوط من رحمته ولا مخلو من نعمته ولا مايوس من مغفرته۔ تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جس کی رحمت سے نا امیدی نہیں اور جس کی نعمتوں سے کسی کا دامن خالی نہیں اور نہ اس کی مغفرت سے کوئی مایوس ہے۔

اس میں رحمت اور نعمت اور مغفرت متناسب الفاظ ہیں۔

صنعت تسبیغ یہ ہے کہ پہلے جملہ کی آخری لفظ سے دوسرے جملہ کی ابتداء کی جائے جیسے۔

الحمد للّٰہ الواصل الحمد بالنعم والنعم بالشکر۔ تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جو حمد کا پیوند نعمتوں سے اور نعمتوں کا سلسلہ شکر سے ملانے والا ہے۔

صنعت عکس یہ ہے کہ پہلے ایک چیز کو کسی پر مقدم کریں اور پھر اسے بدل کر مؤخر کر دیں جیسے:

فبالایمان یستدل علی الصالحات و بالصالحات یستدل علی الایمان. ایمان سے نیکیوں پر استدلال کیا جاتا ہے اور نیکیوں سے ایمان پر دلیل لائی جاتی ہے۔

صنعت رجوع یہ ہے کہ پہلے ایک بات کہی جائے اور پھر کسی خاص نکتہ کے پیش نظر سے اس کی تردید کر کے دوسری بات کہی جائے جیسے:

کانھم لم یسمعوا اللّٰہ یقول تلک الدار الاخرۃ نجعلھا للذین لا یریدون علوا فی الارض و لا فسادا و العاقبۃ للمتقین بلی و اللّٰہ لقد سمعوھا و وعوھا یہ آخرت کا گھر ہم نے ان لوگوں کے لئے قرار دیا ہے جو دنیا میں نہ بلندی چاہتے ہیں اور نہ فساد پھیلاتے ہیں اور اچھا انجام پرہیز گاروں کے لئے ہے ہاں ہاں خدا کی قسم ان لوگوں نے اس آیت کو سنا تھا اور یاد کیا تھا۔

پہلے تو یہ فرمایا کہ فتنہ انگیز لوگوں نے اس آیت کو سنا نہ تھا اور پھر یہ کہہ کر کہ انہوں نے سنا تھا پہلی بات سے رجوع کیا۔ اس بنا پر کہ سننے کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ حشر انگیز و فتنہ پردازی سے باز رہتے اور جب وہ باز نہ رہے تو گویا انہوں نے سنا ہی نہ تھا اور اس طرح انہیں تنبیہ و سرزنش کی کہ انہوں نے سننے کے باوجود اس سے قطعاً" کوئی فائدہ حاصل نہ کیا۔

صنعت ارصادیہ ہے کہ جب یہ معلوم ہو پہلے جملہ کے آخر میں فلاں لفظ ہے تو دوسرے فقرہ کے آخری لفظ کی طرف فوراً" ذہن منتقل ہو جائے جیسے:

ھبو طھا و صعودھا و نحوسھا و سعودھا۔ کبھی اتار ہو کبھی ابھار اور کسی میں نحوست ہو اور کسی میں سعادت

صنعت جمع یہ ہے کہ چند مختلف اشیاء کو ایک حکم کے تحت جمع کر دیا جائے جیسے:

ان امال و البنین حرث الدنیا مال اور اولاد دنیا کی کھیتی ہے۔

اس میں مال اور اولاد کو جو دو الگ الگ چیزیں ہیں دنیا کی کھیتی قرار دیا ہے کیوں کہ یہ دونوں چیزیں دنیا ہی میں مفید ثابت ہوسکتی ہیں اور آخرت میں کام نہ آئیں گی۔

صنعت تفریق یہ ہے کہ ایک ہی طرح کی دو چیزوں میں فرق ظاہر کیا جائے جیسے۔

غیرۃ المراۃ کفر و غیرۃ الرجال ایمان عورت کی غیرت کفر اور مرد کی غیرت ایمان ہے۔

اس میں مرد و عورت کی غیرت میں تفریق کی گئی ہے ایک کی غیرت کو ایمان کہا گیا ہے۔

صنعت تقسیم یہ ہے کہ پہلے چند چیزوں کو بیان کیا جائے پھر ہر چیز کا تعین کرکے اس کے مناسب حال چیز کا ذکر کیا جائے جیسے:

کل نفس منها سائق و شهید سائق یسوقها الی محشرها و شاهد یشهد علیها بعملها۔ ہر نفس کے ساتھ ایک ہنکانے والا ہوتا ہے اور ایک شہادت دینے والا۔ ہنکانے والا اسے میدان حشر تک ہنکا لے کر جائے گا اور گواہ اس کے عملوں کی شہادت دے گا۔

پہلے سائق اور شہید کا ذکر ہے اور پھر ہر ایک کا تعین کرکے اس کے مناسب حال چیز کا ذکر فرمایا ہے۔ صنعت جمع و تفریق یہ ہے کہ پہلے چند چیزوں کو ایک حکم میں جمع کیا جائے اور پھر ان میں تفریق پیدا کی جائے جیسے۔

حتی یقوم الباکیان باک یبکی للدینه و باک یبکی لدنیاه یہاں تک کہ دو قسم کے رونے والے کھڑے ہو جائیں گے۔ ایک دین کے لئے رونے والا اور ایک دنیا کے لئے۔

پہلے دو شخصوں کو گریہ و بکا کے عمل میں شریک کیا ہے اور پھر ایک کو دین کے لئے اور ایک کو دنیا کے لئے رونے والا قرار دے کر ان میں تفریق کی ہے۔

صنعت جمع و تقسیم یہ ہے کہ پہلے چند چیزوں کو ایک حکم کے تحت جمع کیا جائے اور پھر ہر ایک کا الگ الگ حکم بیان کیا جائے جیسے۔

شعل من الجنة و النار امامه ساع سریع نجا و طالب بعطیرجا و مقصر فی النار ھوی۔

جس کے پیش نظر جنت و دوزخ ہو اس کی نظر کسی اور طرف نہیں اٹھ سکتی جو تیز قدم دوڑنے والا ہے وہ نجات یافتہ ہے اور جو طلب گار ہو مگر ست رفتار اسے بھی توقع ہوسکتی ہے مگر جو ارادۃً کوتاہی کرنے والا ہو اسے دوزخ میں گرنا ہے۔

پہلے ان لوگوں کو جن کے پیش نظر انجام کار ہے ایک حکم کے تحت جمع کیا ہے اور پھر انہیں تین قسموں میں تقسیم کیا ہے تیز رو ست قدم اور بے عمل

صنعت جمع و تقسیم یہ ہے کہ پہلے چند چیزوں کو ایک حکم کے تحت جمع کیا جائے' پھر ان میں تفریق کی جائے پھر ہر ایک کے مناسب حال چیز کا ذکر کیا جائے جیسے۔

فجعلھم فریقین انعم علی ھولاء و انتقم من ھو لاء فاما اھل الطاعۃ فاثابھم فی جوارہ و خلدھم فی دارہ و اما اھل المعصیۃ فانزلھم شر دار۔

انہیں دو گروہوں میں بانٹ دے گا۔ ایک کو وہ انعام و اکرام دے گا اورایک سے انتقام لے گا۔ جو فرمانبردار تھے انہیں جزا دے گا کہ وہ اس کے جوار رحمت میں رہیں اور اپنے گھر میں انہیں ہمیشہ کے لئے ٹھہرا دے گا اور جو نافرمان ہوں گے انہیں ایک برے گھر میں اتار دے گا۔

پہلے لوگوں کو حکم موت کے تحت جمع کیا پھر ان میں تفریق کی بعض کو انعام یافتہ اور بعض کو قابل تعزیر قرار دیا پھر ان میں سے ہر ایک کے مناسب حال چیز کا ذکر فرمایا۔

صنعت و افتنان یہ ہے کہ کلام میں مداح و ہجو تہنیت و تعزیت وغیرہ مختلف مضامین جمع کر دیے جائیں جیسے:

زرعوا الفجور و سقوہ الغرور و حصدوا الثبور ولا یقاس لال محمد من ہذہ الامۃ احد

انہوں نے فاسق و فجور کی کاشت کی غفلت و فریب کے پانی سے اسے سینچا اور اس سے ہلاکت کی جنس حاصل کی۔ اس امت میں کسی کو آل محمدؐ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

اس میں معاندین آل محمدؐ کی مذمت کے ساتھ آل محمدؐ کی مدح و ستائش بھی ہے۔

صنعت مذہب کلامی یہ ہے کہ کلام دلیل برہان پر مشتمل ہو جیسے:

ولم یلد فیکون مولود اولم یولد فیصیر محدودا۔
اس کی کوئی اولاد نہیں کہ وہ بھی کسی کی اولاد قرار پائے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے ورنہ محدود ہو کر رہ جائے گا۔

اس میں دعویٰ یہ ہے کہ اللہ کی کوئی اولاد نہیں ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر اس کی اولاد ہوگی تو وہ بھی حادث و مولود ہوگا اور اگر وہ کسی کی اولاد ہوگا تو محدود قرار پائے گا حالاں کہ وہ نہ حادث ہے اور نہ محدود۔

مبالغہ یہ ہے کہ کسی وصف کی شدت یا ضعف کا اس حد تک دعویٰ کیا جائے کہ اس تک پہنچنا بعید یا محال ہو تاکہ دوسروں کو یہ تاثر دیا جائے کہ اس وصف کا اب کوئی درجہ باقی نہیں ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔

پہلی قسم یہ ہے کہ اس وصف کا وقوع عقلاً اور عادۃً ممکن ہو اسے تبلیغ کہتے ہیں جیسے:

حتی ارتاب الناصح بنصحه و ضن الزند بقدحه۔
یہاں تک کہ ناصح خود اپنی نصیحت کے متعلق شک میں پڑ گیا اور طبیعت اسی چقماق کی طرح بجھ گئی جس نے شعلے بھڑکانا بند کر دیئے ہوں۔

ناصح کا نصیحت کے بارے میں شک کرنا اور چقماق کا ٹھنڈا پڑ جانا دونوں عقلاً اور عادۃً ممکن ہیں۔ دوسری قسم یہ ہے کہ عقلاً ممکن ہو اور عادۃً ایسا نہ ہوتا ہو اسے اغراق کہتے ہیں۔ جیسے:

ینحدر عنی السیل ولا یرقی الا الطیر۔
میں وہ (کوہ بلند) ہوں جس پر سے سیلاب کا پانی گزر کر نیچے گر جاتا ہے اور مجھ تک پرندہ پر نہیں مار سکتا۔

عقلاً تو یہ ممکن ہے کہ انسان ایسے بلند مقام پر پہنچ جائے جہاں تک پرندہ پرواز نہ کر سکے مگر عادۃً ایسا نہیں ہوتا

تیسری قسم یہ ہے کہ عقل اور عادت دونوں کے اعتبار سے محال ہو اسے غلو کہتے ہیں۔ غلو کو اگرچہ بنظر استحسان نہیں دیکھا جاتا لیکن اس کے ساتھ اگر ایسی لفظ لائی جائے جو استبعاد کو کم کر دے تو اس میں حسن پیدا ہو جاتا ہے جیسے:

فکان ما هو کائن من الدنیا عن قلیل لم یکن و کان ما هو کائن من الاخرة عما قلیل لم یزل
دنیا کی ساری موجود چیزیں معدوم ہو جائیں گی گویا کہ وہ موجود تھیں ہی نہیں اور آخرت میں پیش آنے والی چیزیں جلد ہی موجود ہو جائیں گی گویا کہ وہ ابھی سے موجود ہیں۔

اس میں دنیا کے جلد نا پذیر ہونے اور یوم آخرت کے قریب تر آنے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ جو ہے، وہ نہیں ہے اور جو نہیں ہے، وہ ہے ظاہر ہے کہ موجود کا غیر موجود ہونا غیر موجود کا موجود ہونا عقلاً اور عادۃً ناممکن ہے مگر

لفظ "گویا کہ" سے اسے تمثیلی صورت دے کر امر غیر واقع کو وقوع سے قریب کر دیا ہے۔

تجاہل العارف یہ ہے کہ امر معلوم کو ایسے پیرایہ میں بیان کیا جائے گویا وہ غیر معلوم ہے جیسے:

این اخوانی الذین رکبوا الطریق و مضوا علی الحق
کہاں ہیں وہ میرے بھائی کو جو سیدھی راہ پر چلتے رہے اور حق پر گزر گئے۔

اعتراض یہ ہے کہ کلام میں کسی خاص نکتہ کے پیش نظر ایسا جملہ لایا جائے جس کے بغیر بھی کلام تمام ہو سکتا ہو جیسے:

فیا عجبا و اللہ یمیت القلب و یجلب الھم من اجتماع ھولاء القوم علی باطلھم و تفرقکم عن حقکم۔
ان لوگوں کا باطل پر ایکا کر لینا اور تمہاری جمیعت کا حق سے منتشر ہو جانا تعجب خیز ہے۔ یہ امر خدا کی قسم دل کو مردہ کر دیتا ہے اور رنج و اندوہ بڑھا دیتا ہے۔

اس میں "خدا کی قسم دل کو مردہ کر دیتا ہے اور رنج و اندوہ بڑھا دیتا ہے" جملہ معترضہ ہے جو اظہار مصیبت و غم کے لئے ہے۔

تکرار یہ ہے کہ کلام میں کسی لفظ کو دہرایا جائے اس کا فائدہ عموماً تاکید و تنبیہ ہوتا ہے جیسے:

فالحذر الحذر ایھا المستمتع
اے سننے والو ڈرو ڈرو۔

شجاعۃ الفصاحہ یہ ہے کہ مخاطب کے علم و فہم پر اعتماد کرتے ہوئے کلام کے ضروری اجزاء میں سے کسی جز کو چھوڑ دیا جائے جیسے۔

اما و اللہ لقد تقمصھا ابن ابی قحافۃ
خدا کی قسم فرزند ابو قحافہ نے پیراہن خلافت پہن لیا۔

اس میں **تقمصھا** کی ضمیر کا مرجع خلافت محذوف ہے جسے محل و مقام سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ تفسیر یہ ہے کہ پہلے ایسی چیز بیان کی جائے جس میں پوشیدگی خفاہو اور پھر اس کی تشریح و توضیح کی جائے جیسے:

اوصیکم عباد اللہ بتقوی اللہ التی ھی الزاد و بھا المعاد زاد مبلغ و معاد منجح۔
اے اللہ کے بندو میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کی نصیحت کرتا ہوں۔ یہی تقویٰ زادراہ ہے اور اسی کو لے کر پلٹنا ہے۔ یہ زادراہ منزل تک پہنچانے والا اور یہ پلٹنا کامیاب پلٹنا ہے۔

اس میں پہلے زاد و معاد کا ذکر کیا ہے اور پھر اس کی تشریح و تفصیل کی ہے۔

توریہ یہ ہے کہ ایک لفظ کے دو معنی ہوں۔ ایک معنی قریب اور ایک معنی بعید اور مقصود معنی بعید ہوں۔ اس کی تین قسمیں ہیں پہلی قسم یہ ہے کہ دونوں کے مناسبات میں سے کوئی لفظ مذکور نہ ہو اسے توریہ مجردہ کہاجاتاہے۔ جیسے:

حائک ابن حائک۔ جولاہا جولاہے کا بیٹا۔

حائک کے معنی قریب جولاہے کے ہیں اور معنی بعید جھوٹے کے ہیں اور ان دونوں معنوں میں کسی معنی کے مناسب کوئی لفظ مذکور نہیں ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ معنی قریب کے مناسب کوئی لفظ مذکور ہو اسے توریہ مرشحہ کہا جاتا ہے جیسے:

والباسط فیهم بالجود یده۔ وہ مخلوقات میں اپنا دست کرم بڑھائے ہوئے ہے۔

ید کے معنی قریب ہاتھ کے ہیں اور معنی بعید نعمت کے اور پہلے معنی کے مناسب لفظ .بسط (پھیلانا) مذکور ہے

تیسری قسم یہ ہے کہ معنی بعید کے مناسب کوئی لفظ مذکور ہو اسے توریہ مبینہ کہا جاتا ہے جیسے

فاجری فیها سراجا مستطیرا ان میں ضو پاش چراغ رواں کیا۔

سراج کے معنی قریب چراغ کے معنی بعید سورج کے ہیں اور لفظ اجری جس کے معنی چلانے اور حرکت دینے کے ہیں سورج کے مناسب ہے۔

صنعت استخدام یہ ہے کہ لفظ کے ذریعہ ایک معنی مراد لئے جائیں اور جو ضمیر اس کی طرف پلٹتی ہے اس سے دوسرے معنی کا ارادہ کریں یا ایک ضمیر سے ایک معنی اور دوسری ضمیر سے دوسرے معنی مراد لئے جائیں جیسے:

وخلق الاجال فاطالها و قصرها و قدمها و اخرها۔ اس نے زندگی کی مختلف مدتیں مقرر کی ہیں کسی کو زیادہ اور کسی کو کم کسی کو آگے اور کسی کو پیچھے کر دیا ہے۔

اجل کے ایک معنی مدت کے ہیں اور دوسرے معنی ہنگامی موت کے ہیں۔ پہلی دو ضمیروں سے مراد مدت عمر ہے اور آخری دو ضمیروں سے مراد ہنگام موت ہے۔

صنعت توجیہہ یہ ہے کہ ایسا کلام کیا جائے جس سے دو متضاد معنی نکلتے ہوں اور یہ نہ معلوم ہوسکے کہ کی مراد کیا ہے جیسے:

قتله الله و انا معه اسے اللہ نے مارا ہے اور میں اس کے ساتھ ہوں۔

یہ جملہ اس شخص کے جواب میں فرمایا جس نے یہ پوچھا کہ آپ نے عثمان کو قتل کیا ہے۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ انہیں اللہ نے مارا ہے اور میں اللہ سے الگ نہیں ہوں اور ایک معنی یہ ہیں کہ انہیں اللہ نے مارا ہے اور

جس طرح انہیں موت آئی ہے اسی طرح مجھے بھی ایک دن موت آئے گی۔ ایسا کلام اس موقع پر کیا جاتا ہے جہاں الجھنے کے بجائے ذو معنی جواب دے کر خاموش کرنا مقصود ہوتا ہے۔

صنعت تعدید یہ ہے کہ اسماء مفرہ ایک نہج و اسلوب پر لائے جائیں جیسے:

الحمد للہ الکائن قبل انیکون کرسی او عرش او سماء اوارض اوجان اوانس

تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جو عرش و کرسی زمین و آسمان اور جن و انس سے موجود تھا۔

حسن نسق کی دو صورتیں ہیں ایک صورت یہ ہے کہ کسی چیز کی صفت پر صفت پر گنواتے چلے جائیں جسے:

فاحذروا الدنیا فانھا غدارۃ غرارۃ خدوع معطیۃ منوع طبسۃ نزوع۔

دنیا سے ڈرو کہ غدار، دھوکہ باز، فریب (کار ہے) دینے والی اور پھر اسے لے لینے والی ہے لباس پہنانے والی اور اتروا لینے والی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایسے جملے لائے جائیں جو مستقل معانی کے حامل ہونے کے ساتھ ایک دوسرے سے مرتبط ہوں جیسے:

وجعل لکل شی قدر او لکل قدر اجلا و لک اجل کتابا۔

اس نے ہر شے کا ایک اندازہ اور ہر اندازے کی ایک مدت ہر مدت کے لئے ایک نوشتہ قرار دیا ہے۔

صنعت مشاکلہ یہ ہے کہ دو چیزوں کا ذکر ایک جا کریں اور جس لفظ سے پہلے چیز کو تعبیر کیا ہے اسی لفظ سے دوسری چیز کو تعبیر کریں جیسے:

ان فررتم من سیوف العاجلۃ لا تسلمون من سیوف الاجلۃ

اگر تم دنیا کی تلواروں سے بھاگے تو آخرت کی تلواروں سے بچ نہیں سکتے۔

دنیا کی تلواروں کی مناسبت سے آخرت کی طرف بھی تلواروں کی نسبت دی ہے۔

صنعت تلمیح یہ ہے کہ کلام میں حدیث مثل یا کسی مشہور واقعہ کی طرف اشارہ کیا جائے جیسے:

فما اتی علی اخر القول حتی اراکم متفرقبن ایادی سبا۔

ابھی میری بات ختم بھی نہیں ہوتی کہ میں دیکھتا ہوں کہ تم اولاد سبا کی طرح تتر بتر ہوگئے۔

یہاں لفظ ایادی سبا سے اولاد سبا کے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب عمرو ابن عامر نے ایک کاہنہ کی

زبان سے یہ سنا کہ یمن سیلاب کی زد میں آیا چاہتا ہے تو وہ اپنے باغات زمین اور مکان بیچ کر اپنے قبیلہ کے ہمراہ نکل کھڑا ہوا۔ ان میں سے کچھ حجاز میں کچھ شام میں اور کچھ عراق میں بس گئے اور پھر ان کے یکجا ہونے کی کوئی صورت نہ رہی۔

صنعت توشیع یہ ہے کہ جملہ کے آخر میں تثنیہ کی صورت میں ایک لفظ لایا جائے اور پھر ان دو کی تفصیل بیان کی جائے جیسے:

ان اخوف ما اخاف علیکم اثنتان الحرص و طول الامل

مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ دو باتوں کا ڈر ہے ایک حرص اور دوسرے امیدوں کا پھیلاؤ

صنعت التفات یہ ہے کہ کلام میں تنوع پیدا کرنے کے لئے کلام کے طرق سہ گانہ تکلم خطاب اور غیبت میں سے کسی ایک طریق سے دوسرے طریق کی طرف رجوع کیا جائے جیسے:

والذی نفس ابن ابی طالب بیدہ لا لف ضربة بالسیف اھون علی من میتة علی فراش۔

اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں ابن ابی طالبؑ کی جان ہے کہ بستر پر اپنی موت مرنے سے تلوار کے ہزار وار کھانا مجھے آسان ہیں۔

یہ غیبت سے تکلم کی طرف التفات ہے۔

لف و نشر یہ ہے کہ پہلے چند چیزیں ذکر کی جائیں اور پھر ان چیزوں کے مناسبات و متعلقات بلاتعین بیان کیے جائیں۔ ان اشیاء کو لف اور انکے تعلقات کو نشر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر نشر کی ترتیب لف کے مطابق ہو تو اسے لف و نشر مرتب کہتے ہیں جیسے:

ولیختبر بذلک الشکر و الصبر من غنیھا و فقیرھا۔

تاکہ وہ اس طرح مالدار اور فقیر کے شکر اور صبر کو جانچے۔

شکر کا تعلق غنی سے اور صبر کا تعلق فقیر سے ہے اور دونوں کی ترتیب یکساں ہے۔ اگر ترتیب میں فرق ہو تو اسے لف و نشر غیر مرتب کہتے ہیں جیسے:

خلق الخلق حين خلقهم غنيا عن طاعتهم آمنا من معصيتهم لانه لا تضره معصية من عصاه ولا تنفعه طاعة من اطاعه۔

اللہ نے مخلوقات کو جب پیدا کیا تو ان کی اطاعت سے بے نیاز اور ان کے گناہوں سے بے خطر ہو کر انہیں پیدا کیا کیوں کہ اسے نہ کسی معصیت کار کی معصیت سے نقصان اور نہ کسی فرماں بردار کی اطاعت سے فائدہ پہنچتا ہے۔

اطاعت کا تعلق اللہ کی بے نیازی سے اور معصیت کا تعلق بے خوفی سے ہے۔ یہاں لف و نشر میں ترتیب نہیں ہے۔

تاکید المدح بما یشبہ الذم یہ ہے کہ صفت مدح کے بعد جب حرف استثناء لا کر ایک اور صفت مدح کا ذکر کیا جائے اس سے مدح میں زور پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ کہ مدح کے بعد جب حرف استثناء آئے گا تو یہ خیال پیدا ہوگا کہ اب کوئی صفت دم آئے گی مگر جب صفت ذم کے بجائے صفت مدح آتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تلاش و تفحص کے باوجود کوئی صفت ذم نہیں مل سکتی اور اس طرح مدح بالائے مدح سے مدح میں تاکید پیدا ہوجاتی ہے جیسے محمد ابن ابی بکر کی خبروفات سن کر فرمایا:

ان حزننا عليه على قدر سرورهم به الا انهم نقصوا بغيضا و نقصنا حبيبا۔

ہمیں ان کے مرنے کا اتنا ہی رنج و قلق ہے جتنی دشمنوں کو اس سے خوشی ہے مگر یہ کہ ان کا ایک دشمن کم ہوا اور ہم نے ایک دوست کو کھو دیا۔

صنعت تجرید یہ ہے کہ کسی موصوف سے اسی کے مانند دوسرے موصوف کا استخراج کیا جائے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ اس صفت میں ایسا کامل ہے کہ اس سے اس کے مانند ایک دوسرا حاصل ہو سکتا ہے۔ جیسے:

يا اہل الكوفة منيت منكم بثلاث و اثنين صم ذووا اسماع و بكم ذوو اكلام و عمی ذووا ابصار لا احرار صدق ولا اخوان ثقة۔

اے اہل کوفہ میں تمہاری تین اور ان کے علاوہ دو باتوں میں مبتلا ہوں وہ یہ کہ تم کان رکھتے ہوئے بہرے ہو اور بولنے چالنے کے باوجود گونگے ہو اور آنکھیں رکھتے ہوئے اندھے ہو اور پھر یہ کہ نہ تم جنگ کے موقعہ پر جوانمرد ہو اور قابل اعتماد بھائی ہو۔

حضرت نے اہل کوفہ سے بہرے گونگے اور اندھے لوگوں کا انتزاع کیا ہے۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ ان میں اوصاف سے پوری طرح متصف ہیں۔

تعریض یہ ہے کہ کلام اپنے ظاہری معنی کے علاوہ ایک دوسرے معنی کی طرف بھی مبہم سا اشارہ کرے۔ جیسے:

لم تکن بیعتکم ایای فلتۃ۔ تم نے میری بیعت اچانک بے سوچے سمجھے نہیں کی تھی۔

یہ حضرت ابوبکر کی بیعت پر تعریض ہے جن کے بارے میں حضرت عمر نے کہا تھا۔

ان بیعۃ ابی بکر کانت فلتۃ ابوبکر کی بیعت بے سوچے سمجھے ناگہانی طور پر ہوئی

اقتباس یہ ہے کہ عبارت میں آیت یا جزو آیت کو اس طرح لایا جائے کہ وہ عبارت کا جز شمار ہونے لگے جیسے:

وانتم الا علون و اللہ معکم ولن یترکم اعمالکم۔ تم ہی غالب ہو اور خدا تمہارے ساتھ ہے وہ تمہارے اعمال کو ضائع و برباد نہیں ہونے دے گا۔

ایجاز یہ ہے کہ اظہار مقصد کے لئے کم از کم الفاظ استعمال کئے جائیں بشرطیکہ ادائے مقصد میں خلل پیدا نہ ہوتا ہو۔ امیرالمومنینؑ کا قول ہے کہ:

اذا کان الایجاز کافیا کان الاکثار عیا و اذا کان الایجاز مقصرا کان الاکثار و اجبا۔ جب اختصار کافی ہو تو طول زبان پر اقتدار کی کمزوری ہے اور اختصار ادائے مطلب سے قاصر ہو تو الفاظ میں اضافہ ضروری ہے۔

حضرت کے کلام کی یہ خصوصیت ہے کہ تھوڑے لفظوں میں بہت سے معانی و مطالب سمٹ آتے تھے جیسے:

تخففوا تلحقوا۔ ہلکے پھلکے رہو تاکہ آگے بڑھنے والوں کو پاسکو

علامہ سید رضی نے اس جملہ پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی جملہ سننے میں نہیں آیا جس کے الفاظ کم اور معنی بہت ہوں۔

براعت استہلال یہ ہے کہ ابتداء کلام میں ایسے الفاظ لائے جائیں جن سے بیان کئے جانے والے مضمون کی طرف اشارہ ہوتا ہو۔ جیسے:

الحمد للّٰہ و ان اتی الد ھر بالخطب الفادح و الحدث الجلیل۔ ہر حالت میں اللہ کے لئے حمد و ثنا ہے اگرچہ زمانہ ہمارے لئے مصیبتیں اور صبر آزما حادثے لے کر آیا ہے۔

اس ابتداء سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آگے بیان ہونے والا مضمون حوادث و آلام زمانہ کے سلسلہ میں ہے ایغال یہ ہے کہ کسی نکتہ کے پیش نظر کلام کو ایسے الفاظ پر ختم کیا جائے جس کے بغیر بھی کلام ناتمام نہیں رہتا۔

جیسے

نحن علی موعود من اللہ و اللہ منجز وعدہ ہم سے اللہ کا ایک وعدہ ہے اور وہ اپنا وعدہ پورا کرنے والا ہے۔

اس میں یہ جملہ کہ اللہ اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا ہے۔ صرف مزید اطمینان کے لئے ہے کیوں کہ یہ امر واضح و ظاہر ہے کہ اللہ اپنے وعدہ کو پورا کرتا ہے۔

ضائع لفظیہ یہ ہیں۔

تجنیس یہ ہے کہ کلام میں ایسے دو مختلف المعنی لفظ لائے جائیں جو تلفظ یا کتابت میں متشابہ و ہم شکل ہوں اس کی متعدد قسمیں ہیں ان میں سے چند قسمیں یہ ہیں :

تجنیس تام یہ ہے کہ دونوں لفظوں کے حروف عدد و ترتیب اور حرکت و سکون میں یکساں ہوں۔ جیسے:

فالبصیر منھا شاخص و الاعمی الیھا شاخص۔ نگاہ رکھنے والا اس سے نکلنا چاہتا ہے اور اندھا اسی پر نظریں جمائے رہتا ہے۔

پہلے شاخص کے معنی کوچ کرنے والے کے ہیں اور دوسرے شاخص کے معنی ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے والے کے ہیں۔

تجنیس محرف یہ ہے کہ دونوں لفظوں کی ہیئت میں فرق ہو۔ یہ فرق یا اختلاف حرکات کی بنا پر ہوگا جیسے:

فان التقوی فی الیوم الحرز و الجنۃ و فی غد الطریق الی الجنۃ۔ تقویٰ آج (دنیا میں) پناہ و سپر ہے اور کل (آخرت میں) جنت کی راہ ہے۔

پہلی لفظ جنۃ بضم جیم ہے اور دوسری بفتح جیم ہے۔

یا یہ فرق حرکت و سکون کی بنا پر ہوگا اس طرح کہ ایک لفظ میں حرف متحرک ہو اور دوسری میں ساکن جیسے:

لا تری الجاھل الامضرطا او مفرطا۔ تم جاہل کو حد سے بڑھا ہوا پاؤگے یا حد سے پیچھے ہٹا ہوا۔

پہلی لفظ میں ف ساکن ہے اور دوسری میں متحرک۔

تجنیس ناقص یہ ہے کہ دونوں لفظوں میں سے ایک لفظ میں ایک آدھ حرف زیادہ ہو یہ زیادتی یا پہلی لفظ کے شروع میں ہوگی۔ جیسے:

اصبحت بیوتھم قبورا وما جمعوا بورا۔ ان کے گھر قبروں میں تبدیل ہوگئے اور ان کی جمع جتھا تباہ ہوگئی۔

یا دوسری لفظ کی شروع میں ہوگی جیسے:

من باح فلد مه اباح جس نے زبان کھولی اس نے اپنی موت کا ساماں کیا۔

یا پہلی لفظ کے وسط میں ہوگی جیسے:

لا یضره المنع والجود ولا یکدیه الاعطاء و الجود وہ فیض و عطا کے روکنے سے مال دار نہیں ہو جاتا۔ اور جود و عطا سے کبھی عاجز و قاصر نہیں ہوتا۔

یا دوسری لفظ کے وسط میں ہوگی جیسے:

اذا حبط عمله الطویل و جهده الجهید اس کی طویل عبادتوں اور بھرپور کوششوں کو اکارت کر دیا۔

تجنیس مطرف یہ ہے کہ دونوں لفظوں میں سے ایک لفظ کے آخر میں ایک حرف زیادہ ہو جیسے:

و مدار رحاها تبدوا فی مدارج خفیة فتنے ہمیشہ چھپے ہوئے راستوں سے ظاہر ہوا کرتے ہیں۔

تجنیس مضارع یہ ہے کہ دونوں لفظوں میں ایک حرف کا فرق ہو اور وہ حرف ہم مخرج یا قریب المخرج ہوں یہ حرف یا لفظ کے شروع میں ہوگا جیسے:

فی قرار خبرة و دار عبرة اس مقام آزمائش اور محل عبرت میں

خبرہ اور عبرہ میں تجنیس ہے اور خ اور ع کا مخرج ایک ہے یا یہ حرف لفظ کے وسط میں ہوگا جیسے:

عباد مخلوقون اقتدارا و مربون اقتسارا۔ یہ بندے اس کے اقتدار کا ثبوت دینے کے لئے وجود میں آئے اور غلبہ و تسلط کے ساتھ ان کی تربیت ہوئی ہے۔

اقتدار اور اقتسار میں تجنیس ہے اور "د" اور "س" دونوں کا مخرج زبان کا کنارہ ہے۔

یا یہ حرف لفظ کے آخر میں ہوگا جیسے:

الخیر منه مامول موانشر منه مامون۔ اس سے بھلائی ہی کی توقع ہو سکتی ہے اور اس سے گزند کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔

مامول اور مامون میں تجنیس ہے اور لام اور نون دونوں قریب المخرج ہیں۔

تجنیس لاحق یہ ہے کہ دونوں لفظوں میں ایک حرف کا فرق ہے اور وہ دونوں حرف قریب المخرج یا ہم مخرج نہ ہوں۔ اس کی بھی تین صورتیں ہیں۔ یہ حرف یا لفظ کے شروع میں ہوگا جیسے:

داع دعا و راع رعی دعوت دینے والے نے پکارا اور نگہداشت کرنے والے نے نگہداشت کی

یا یہ حرف لفظ کے وسط میں ہوگا جیسے:

ما کنت الا کقارب ورد و طالب وجد میں ایسا تھا جیسے رات بھر چلنے والا چشمہ پر پہنچ جائے اور ڈھونڈنے والا پالے۔

یا یہ حرف لفظ کے آخر میں ہوگا جیسے:

مرمة لمعاش او خطوة فی معاد۔ معاش کے بندوبست کے لئے یا آخرت کی طرف قدم اٹھانے کے لئے۔

تجنیس مقلوب یہ ہے کہ دونوں لفظوں کے حرف تو ایک ہوں مگر ان کی ترتیب مختلف ہو، جیسے:

مثل الدنیا مثل الحیة لین و قاتل سمها۔ دنیا کی مثال سانپ کی سی ہے جو چھونے میں نرم ہے مگر اس کا زہر قاتل ہے۔

تجنیس مصحف یہ ہے کہ دونوں لفظ تحریر میں یکساں ہوں لیکن ان کے تلفظ اور نقاط میں فرق ہو جیسے:

فاتعظوا بالعبر و اعتبروا بالغیر۔ عبرتوں سے پند و نصیحت اور زمانہ کے الٹ پھیر سے عبرت حاصل کرو۔

صنعت اشتقاق یہ ہے کہ کلام میں چند ایسے الفاظ لائے جائیں جن کا مصدر یا مادہ ایک ہو جیسے:

و اللہ لا سلمنی ما سلمت امور المسلمین۔ خدا کی قسم جب تک مسلمانوں کے امور کا نظم و نسق برقرار رہے گا میں خاموشی اختیار کئے رہوں گا۔

شبہ اشتقاق یہ ہے کہ کلام میں ایسے الفاظ لائے جائیں جو بظاہر ایک ہی مصدر یا مادہ سے نکلے ہوئے معلوم ہوں مگر دراصل ایسا نہ ہو جیسے۔

و اھلھا علی ساق و سیاق۔ اس کے رہنے والے پادر رکاب چل چلاؤ کے منتظر

ساق کے معنی پنڈلی کے ہیں اور سیاق ساق کا مصدر ہے۔

ردالعجز علی الصدر یہ ہے کہ جو لفظ اول کلام میں ہو وہی آخر کلام میں ہو یا ان دونوں لفظوں میں تجنیس ہو یا صنعت اشتقاق یا شبہ اشتقاق جیسے:

و استهديه قريبا هاديا

اس سے ہدایت چاہتا ہوں چونکہ وہ قریب تر اور ہادی ہے۔

سجع مرصع یہ ہے کہ دونوں جملوں کے تمام یا اکثر الفاظ ہموزن اور آخری الفاظ ہم قافیہ ہوں جیسے:

الحمد لله الذی علا بحوله و دنا بطوله۔

تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جو اپنی طاقت کے اعتبار سے بلند اور اپنی بخشش کے لحاظ سے قریب ہے۔

سجع مطرف یہ ہے کہ دونوں جملوں کے آخری الفاظ متوافق اور وزن عروضی میں مختلف ہوں، جیسے:

۔اتخذوا الشيطان لا مرهم ملاكا واتخذهم له اشراكا

انہوں نے اپنے کاموں کا کرتا دھرتا شیطان کو بنا رکھا ہے اور اس نے ان کو اپنا آلہ کار بنا لیا ہے۔

سجع متوازی یہ ہے کہ دونوں جملوں کے صرف آخری الفاظ وزن و قافیہ میں متفق ہوں جیسے:

من جری فی عنان امله عشر باجله

لزوم مالایلزم یہ ہے کہ آخری لفظ کے حرف آخر سے پہلے کسی حرف معین کا التزام کیا جائے جیسے:

فانه ارجح ما وزن و افضل ماخزن۔

اس کا پلہ ہر وزن کی جانے والی چیز سے بھاری اور ہر گنج گرانمایہ سے بہتر و برتر ہے۔

اس میں ز کا التزام کیا ہے حالاں کہ اس کی پابندی کے بغیر بھی کلام میں سجع پیدا کیا جاسکتا ہے۔

حذف یہ ہے کہ متکلم اپنے کلام میں کسی ایک حرف کو ترک کرنے کا التزام کرے۔ چناں چہ اس سلسلہ میں امیرالمومنین علیہ السلام کا ایک طویل خطبہ ہے جو آپ نے ارتجالا" فرمایا۔ اس خطبہ میں الف نہیں ہے، اس کی ابتداء اس طرح ہے:

حمدت من عظمت منة و وسعت نعمته و سبقت رحمته غضبه و تمت كلمته و بلغت مشيته۔

اس کی حمد کرتا ہوں جس کا احسان عظیم نعمت وسیع اور جس کی رحمت اس کے غضب سے سبقت لے گئی ہے۔ اس کی بات پوری اور مشیت نافذ ہے۔

صنعت غیر منقوطہ یہ ہے کہ کلام ایسے الفاظ پر مشتمل ہو جو نقطوں سے خالی ہو، اس سلسلہ میں بھی حضرت کا

ایک طویل خطبہ ہے اس کے ابتدائی کلمات یہ ہیں۔

الحمد للّٰہ الملک المحمود و المالک الودود مصور کل مولود و مال کل مطرود

تمام حمد اس اللہ کے لئے جو ذی اقتدار اور قابل ستائش ہے مالک اور دوست رکھنے والا ہے مولود کا صورت گر اور ہر دھتکارے ہوئے کا سرمایہ ہے۔

صنعت تعمیہ یہ ہے کہ الفاظ یا حروف میں کوئی نام اس طرح پوشیدہ کیا جائے کہ اس کی طرف لفظی اشارہ تو ہو مگر بظاہر معلوم نہ ہو مثلاً" یہ شعر

چشم بکشا زلف بشکن جان من
بہر تسکین دل بریان من !

اس شعر کے ظاہر معنی یہ ہیں کہ آنکھ کھول زلف لہرا تاکہ میرے دل تپیدہ کو سکون و قرار حاصل ہو۔

اس میں تعمیہ کیصورت یہ ہے کہ چشم بکشا کا عربی ترجمہ افتح العین ہے جس کے ایک معنی یہ ہیں کہ آنکھ کھول کر اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ حرف عین کو فتح (زبر) دو اور زلف بشکن کے ایک معنی یہ ہیں کہ زلف لہرا اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ زلف سے لام مراد لیا جائے اس لیے کہ جب زلف بل کھاتی ہے تو اس کی ہیت لام کی سی ہو جاتی ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

لام نستعلیق کا ہے اس بت خوش خط کی زلف !
ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے

اور بشکن کا عربی میں ترجمہ اکسر ہے اور اکسر کے ایک معنی یہ ہیں کہ کسرہ (زیر) دو اور دوسرے مصرع میں دل بریاں سے مرادی' ہے کیوں کہ وہ لفظ بریاں کے وسط میں واقع ہے اور تسکین کے ایک معنی تسلی دینے کے ہیں اور دوسرے معنی ساکن کرنے یعنی جزم دینے کے ہیں۔ لہٰذا اس معنی مضمر کی رو سے جب عین کو زبر ل کو زیر اور ی کو جزم دی جائے گی تو یہ علی کے نام کا معما ہو جائے گا۔

امیرالمومنینؑ اس صنعت تعمیہ سے بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ آپ سے کسی نے پوچھا کہ کیا قرآن مجید میں تعمیہ پایا جاتا ہے۔ فرمایا کہ ہاں سورہ ہود میں ارشاد ہے:

ما من دابة الا هو آخذ بنا صيتها۔

روئے زمین پر چلنے پھرنے والے جتنے ہیں ان سب کی پیشانی اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔

اس میں معما کی صورت یہ ہے کہ لفظ دابہ کا ناصیہ (پیشانی) دال ہے اور جب ھوا سے اپنی گرفت میں لے گا تو ھو دال کے ملنے سے "ھود" ہو جائے گا اور سورہ ہود کی یہ آیت حضرت ہود کے نام کا معما بن جائے گا۔

فن خطابت

خطابت اس طرز بیان کا نام ہے جس کے ذریعہ خطیب اپنے افکار و خیالات کو دوسروں کے سامنے موثر پیرایہ میں پیش کرتا ہے اور لفظوں کے حسن و شکوہ اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے متاثر کرکے عوام کا رخ ادھر موڑ دیتا ہے جدھر وہ موڑنا چاہتا ہے۔ خطابت کی داغ بیل انسان کی اجتماعی زندگی کے ساتھ پڑی جس نے تدریجاً ترقی کی راہیں طے کرکے ایک فن کی حیثیت حاصل کرلی۔ اسے فنی حیثیت دینے میں یونانیوں نے بھی حصہ لیا اور ارسطو نے کتاب الخطابہ تصنیف کرکے اس کے اثر انگیز پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ قبل اسلام عربوں میں بھی بلند پایہ خطیب پیدا ہوئے۔ چنانچہ قیس ابن ساعدہ ایادی، اکثم بن صیفی، ذوالاصبع عدوانی، قیس ابن خارجہ، خویلد ابن عمرو، حاجب ابن زرارہ، حارث ابن عباد، قیس ابن مسعود، خالد ابن جعفر، علقمہ ابن علاثہ، عامر ابن طفیل، عمرو ابن شرید، عمرو ابن معدیکرب اور حارث ابن ظالم مری عرب کے شہرہ آفاق خطیب ہو گزرے ہیں جن کی خطابت و خوش بیانی کا آوازہ مدتوں تک گونجتا رہا اور ان کی ادبی عظمت کا اعتراف کیا جاتا رہا۔ اسلام میں خطابت کی ابتداء اسلام کے ابتدائی دور ہی میں ہو چکی تھی۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے جو خود بھی بہت بڑے خطیب تھے۔ قرآن مجید کی اعجازی نثر سے دعوت اسلام کا آغاز کیا اور خطبوں اور تقریروں کے ذریعہ اسلامی احکام بیان فرمائے اور اصلاحی و اخلاقی درس دیئے اور جن لوگوں کو تبلیغ و ہدایت کے لئے مختلف مقامات پر بھیجا جاتا تھا وہ بھی نطق و خطابت کے ذریعہ اسلام کا پیغام دوسروں تک پہنچاتے اور اسلامی تعلیمات نشر کرتے تھے اور اس طرح اسلام کے ذریعہ خطابت کو فروغ حاصل ہوا۔ شعر و شاعری کے جمگھٹے خطبوں میں اجتماعات میں بدل گئے اور شاعروں کی جگہ خطیبوں نے لے لی۔ ان خطباء میں پیغمبر اکرم ﷺ کے بعد امیرالمومنینؑ سب سے فصیح تر اور با اثر خطیب تھے۔ آپ کے آباء و اجداد میں بھی متعدد خطباء ہو گزرے تھے چنانچہ آپ کے جد اعلیٰ کعب ابن لوی خطبائے عرب میں بڑے نامور خطیب تھے اور حج کے ایام میں ان کے خطبات عمومی اجتماعات میں گونجا کرتے تھے۔ اسی طرح قصی، ہاشم، عبدالمطلب اور آپ کے پدر بزرگوار حضرت ابو طالب بلند پایہ خطبائے عرب میں شمار ہوتے تھے۔ اس خاندانی ورثہ کے ساتھ آپ میں وہ تمام صفات بھی موجود تھیں جو ایک مؤثر خطابت کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک خطیب کے لئے ذہنی استحضار، فکر کی گہرائی، علم و نظر کی وسعت اور جذبات شناسی کے ساتھ قوت بیان پر اعتماد اور زبان پر اقتدار از بس ضروری ہوتا ہے اور امیرالمومنینؑ میں یہ تمام جوہر بدرجہ اتم موجود تھے۔ آپ مفکر، حاضر دماغ، نکتہ رس، ادا شناس، بلاغت علم نبوت کے ورثہ دار اور انسانی نفسیات کے ماہر تھے اور ذہن میں الفاظ کا لامتناہی ذخیرہ رکھتے تھے، جنہوں نے جس صورت سے چاہتے گردش دیتے اور جس موضوع کو چاہتے زبان کے سانچوں میں ڈھالتے اور جس موقع پر جو لفظ رکھتے یہ معلوم ہوتا کہ ایک ترشا ہوا نگینہ

ہے۔ جسے کسی مرصع کار نے کمال صنعت سے جڑ دیا ہے جس سے جلال و جمال اور زبان و بیان کے جوہر پوری تابانیوں کے ساتھ ابھر آتے، کبھی لفظوں کے ٹھہراؤ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ افق کے ماتھے پر شفق کی رنگینیاں مچل رہی ہیں اور کبھی جملوں کے اتار چڑھاؤ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شبنم کے قطروں سے شعلے برس رہے ہیں اور راکھ کی تہوں سے چنگاریاں لو دے رہی ہیں۔ آپ کی خطابت کا خاص جوہر آمد و بے ساختگی ہے۔ رزم ہو یا بزم، نہ تسلسل وروانی میں فرق آتا ہے نہ اسلوب کی بلند آہنگی میں بلکہ ہر موقع پر حسن خطابت سے ایک سحر آگیں فضا پیدا کرکے دل و دماغ کو مسحور کر دیتے اور زبان آوری کا جوہر دکھانے والوں کو حیرت کی وادی میں سرگرداں چھوڑ دیتے۔ آپ کا زور خطابت ان خطبات سے ظاہر ہے جو مختلف مواقع پر بیان فرمائے اور نہج البلاغہ، مستدرک نہج البلاغہ، تحف العقول وغیرہ کتب میں درج ہیں۔ ان خطبوں کی انفرادیت و بلند معیاری کا ہر دور کے فصحاؤ) دباء نے اعتراف کیا ہے اور آپ کے زور بیان اور **خطیبانہ** قوت کا لوہا مانا ہے۔ اس سلسلہ میں دور حاضر کے چند ادباء کے آراء نقل کئے جاتے ہیں۔

احمد حسن الزیات تحریر کرتے ہیں:

لا نعم بعد رسول اللہ فیمن سلف و خلف افصح من علی فی المنطق ولا ابل منہ ریقا فی الخطابۃ کان حکیما تتفجر الحکمۃ من بیانہ و خطیبا تتدفق البلاغۃ علی لسانہ و واعظامل السمع والقلب و مترسلا بعید غور الحکمۃ و متکلما یضع لسانہ حیث شاء وھو بالاجماع اخطب المسلمین و امام المنشئین۔

ہمارے علم میں نہیں ہے کہ رسول اللہؐ کے بعد پہلے لوگوں اور بعد میں آنے والوں میں علیؑ سے بڑھ کر کوئی فصیح البیان اور ان سے زیادہ کوئی زبان آور ہو۔ وہ ایسے حکیم تھے جن کے بیان سے حکمت کے سوتے پھوٹتے تھے اور ایسے خطیب تھے جن کی زبان سے بلاغت کے سیلاب اُمڈتے تھے اور ایسے واعظ تھے جن کے کلمات کانوں میں گونجتے اور دلوں میں اتر جاتے تھے اور ایسے خطیب تھے جن کے صاف ورواں بیان میں حکمت کی باریکیاں مضمر ہوتی تھیں اور ایسے متکلم تھے کہ جس موضوع پر چاہتے لب کشائی کرتے وہ تمام مسلمانوں میں سب سے بڑھ کر خطیب اور انشاء پردازوں کے امام و سرکردہ تھے۔

(تاریخ الادب العربی ص ۱۷۴)

احمد زکی صفوت تحریر کرتے ہیں:

لایماری احد فی انه رضی اللّٰه عنه کان امام الخطباء و مقدم البلغا بعد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم

اس میں کسی کو کلام نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد علیؑ خطیبوں کے امام اور اہل بلاغت کے پیشرو تھے۔

(ترجمہ علی ابن ابی طالبؑ ص ۱۰۷)

محمد سید کیلانی تحریر کرتے ہیں:

ومن اشهر خطباء ذلک العصر الامام علی الذی امتاز بمضاء لسانه و علوبیانه و قوة منطقه وسطوع حجته و مواتاة البلاغة له فی خطبه و کتبه و رسائله و سوابغ حکمه و جوامع کلمه۔

اس دور کے خطیبوں میں سب سے زیادہ شہرہ آفاق شخصیت حضرت علیؑ کی تھی جو زبان کی روانی، بیان کی بلند معیاری گویائی کی طاقت، استدلال کی تابندگی اور خطبوں، تحریروں اور خطوط میں بلاغت کی کار فرمائی اور حکمت آفرین کلموں اور پر معانی جملوں امتیاز رکھتے تھے۔

(اثر التشیع فی الادب العربی ص ۲۵)

شیخ احمد اسکندری تحریر کرتے ہیں:

هو امام الخطباء من العرب علی الاطلاق بعد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم

آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد عرب کے تمام خطیبوں کے امام مطلق تھے۔

(الوسیط ص ۱۱۴)

السید احمد الہاشمی تحریر کرتے ہیں:

کان رحمه اللّٰه افصح الناس بعد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم و اکثرهم علما و زهدا و اشدة فی الحق و هو امام الخطباء من العرب علی الاطلاق بعد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم

حضرت علیؑ رسول اللہؐ کے بعد تمام لوگوں سے زیادہ فصیح البیان اور علم زہد اور امر حق کی پابندی میں بڑھے ہوئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد تمام خطبائے عرب کے امام و پیشرو تھے۔

(جواہر الادب ص ۳۶۸)

جورج جرداق مسیحی تحریر کرتے ہیں:

انه لمن الصعب ان تجد فی شخصیات التاریخ من اجتمعت لدیه کل هذه الشروط التی تجعل من صاحبها خطیبا فذا غیر علی ابن ابی طالب۔ (الامام علی ج ۳ ص ۷۰۹)

تم علی ابن ابی طالبؑ کے علاوہ مشکل ہی سے تاریخی شخصیتوں میں وہ تمام اوصاف یک جا پاؤ گے جو ایک منفرد خطیب کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔

ابن میسم نے حضرت کے خطبات کو غرض غیات کے اعتبار سے تین قسموں پر تقسیم کیا ہے، مشاورہ، منافرہ اور مشاجرہ۔

مشاورہ یہ ہے کہ انسان کو نیکی اور بدی کی قدروں سے آگاہ کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ اور کیا نہ کرنا چاہئے کہ وہ اپنی سود و بہبود کے پیش نظر اچھائی کی راہ اختیار کرے اور برائی سے بچ کر رہے اور اس طرح اپنی زندگی کو بامقصد بنانے میں کامیاب ہوسکے۔ حضرت کے وہ خطبات جو حکم و نصائح، اور امرو نواہی، تذکیرو تنبیہ نصرت دین و تقویت اسلام اور دنیا سے گریز اور اللہ سے وابستگی کے سلسلہ میں ہیں اسی قبیل سے ہیں۔

منافرہ یہ ہے کہ اچھوں کی مدح و توصیف اور بروں کی مذمت و تنقیص کی جائے یہ نہ صرف اس لئے کہ اچھوں کا حق ہے کہ ان کی مدح کی جائے اور برے اس لائق ہیں کہ ان کی مذمت کی جائے بلکہ اس لئے بھی کہ اچھوں کی مدح سے دوسروں میں اچھے صفات کے حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور بروں کی تنقیص سے لوگوں کے دلوں میں برائیوں کی طرف سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ حضرت نے جہاں جہاں اوصاف حسنہ سے متصف افراد کی توصیف کی ہے اور صفات مذمومہ کے حامل افراد کی مذمت کی ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ شجاعت عفت، مروت، علم، صبر ایسے اخلاق فاضلہ کے اکتساب کی دعوت دیں اور بزدلی بخل و نایت و پست ہمتی ایسے صفات رذیلہ سے اجتناب کی تلقین کریں۔

مشاجرہ یہ ہے کہ اہل دنیا کے مظالم پر شکوہ اور ناگواری کا اظہار کیا جائے یا جو الزامات تراشے جائیں ان کی تردید یا توجیہ کی جائے چنانچہ دنیا والوں کی بے رخی، ناقدر شناسی، غصب حقوق وغیرہ کے سلسلہ میں آپ کے ملفوظات اسی مشاجرہ کے ذیل میں آتے ہیں اور اس میں وہ خطبات بھی داخل ہیں جن میں ان الزامات کے جوابات دئے ہیں جو مزاح و شوخی، حرص اقتدار، قتل عثمان اور تحکیم کو تسلیم کرنے کے سلسلہ میں آپ پر عائد کیے گئے تھے۔ اس قسم کے خطبات کا مقصد ان لوگوں کو پہچان کروانا ہے جو ظلم غضب اور الزام تراشی ایسے افعال کے مرتکب ہوتے رہے ہیں تاکہ ان سے نفرت کے ساتھ ان کے اعمال و افعال سے بھی نفرت کا احساس پیدا ہو اور حضرت کے خطبات کا بنیادی مقصد ہی برائیوں سے نفرت دلا کر سیرت و کردار کی درستی اور پاکیزہ معاشرہ کی تشکیل ہے چنانچہ آپ نے اللہ کے صفات و جلال و جمال پیغمبر اکرمؐ کی عظمت و رفعت بزرگان دین سے خلوص و محبت خیر و شر کی تمیز، دنیا کی بے ثباتی،

اخلاق و عمل کی اہمیت اور اسلام کے پاکیزہ تعلیمات ایسے موضوعات کو اپنے خطبات کی اساس بنایا ہے۔

حضرت کے خطبات کی اثر آفرینی بھی مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ جب الفاظ فصاحت و بلاغت کے سانچوں میں ڈھل کر زبان سے نکلتے تو دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے اور جذب و تاثیر سے وارفتگی کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی علامہ رضی نے لکھا ہے کہ بعض خطبات کے دوران لوگوں کے بدن لرزنے لگتے' رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے اور دل کانپ اٹھتے۔ ایک مرتبہ متقین کے اوصاف پر مشتمل خطبہ دے رہے تھے کہ ہمام ابن عبادہ نے اتنا اثر لیا کہ دم توڑ دیا۔

حضرت کے خطبات میں سے چند مشہور خطبوں کے نام یہ ہیں:

الشقشقیه القاصعه الغراء الزہرا الاشباح الناطقه الدامغه الفاضحه الدیباج الوسیله اللولوء و الطالوتیه المونقه الطاوسیه غیر معجه

ایک خطبہ جسے البیان کا نام دیا گیا ہے حضرت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے مگر علامہ مجلسی نے بحار میں' شیخ عباس قمی نے سفینتہ البحار اور دوسرے اعلام شیعہ نے اس کی صحت سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ یہ خطبہ نہ نہج البلاغہ میں ہے اور نہ مستدرک نہج البلاغہ میں شیخ جو ادنعینہ نے اس کی وضیعت پر دلائل کرنے کے بعد تحریر کیا ہے۔

لا اعرف اسم الشخص الذی وضع خطبة البیان و لکنها بالاسرائیلیات اشبه۔ مجھے اس شخص کا نام معلوم نہیں جس نے خطبہ البیان وضع کیا۔ البتہ یہ اسرائیلی روایات سے بہت مشابہہ ہے۔

(مجلہ الهادی سال ۲ نمبر ۴ صفحہ ۶۴)

تصنیف و تالیف

قبل اسلام عربوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا اور نہ اسے اچھی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ اس لئے نہ معلومات کو تحریری صورت میں لانے کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ جمع و تالیف کا۔ ان کا سرمایہ معلومات جو انساب عرب و قائع و حوادث اور نظم و نثر کے ادب پاروں تک محدود تھا ان کے ذہنوں میں محفوظ رہتا تھا۔

ظہور اسلام کے بعد خطوط و مراسلات اور قرآنی آیات کو ضبط تحریر لانے کے لئے اس کی ضرورت کا احساس ہوا

اور کچھ لوگوں نے ادھر توجہ کی۔ اس کے علاوہ دینی علوم اور اسلامی احکام کے تحفظ کے لئے بھی ضروری تھا کہ انہیں ضبط تحریر میں لا کر محفوظ کر لیا جائے اور عوام کے حافظہ پر نہ چھوڑا جائے۔ پیغمبر اکرمؐ نے جہاں قرآن مجید کے قلمبند کرنے کا سامان کیا وہاں دوسرے علوم کی تدوین و تحریر کی طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے۔

العلم صید و الکتابة قید قیدو احمکم اللّٰہ علومکم بالکتابة

علم شکار ہے اور تحریر زنجیر ہے۔ خدا تم پر رحم کرے اپنے علوم کو کتابت کی زنجیروں میں جکڑ لو۔

(کشف الظنون ج ۱ ص ۲۲)

امیرالمومنینؑ بھی اسلامی تعلیمات کے حفظ و بقا کے لئے تدوین و تالیف کو بڑی اہمیت دیتے تھے اسی اہمیت کے پیش نظر جمع قرآن و تدوین حدیث کو دوسرے امور پر ترجیح دی اور دوسروں کو بھی اس کی ضرورت و افادیت کی طرف توجہ دلاتے رہتے۔

ابن سعد نے طبقات میں تحریر کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؑ نے خطبہ کے دوران فرمایا کہ تم میں کون ہے جو ایک درہم صرف کرکے علم کا ذخیرہ حاصل کرے۔ حارث ابن عبد اللہ اعور نے یہ سنا تو ایک درہم کے کاغذ خرید کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان پر مختلف علمی مطالب تحریر فرمائے اور اس طرح تحریر علوم کی افادیت کو واضح کیا۔ حضرت دنیائے اسلام کے پہلے مصنف ہیں اور آپ ہی کے ہاتھوں تصنیف و تالیف کی بنیاد پڑی۔ ابن شہر آشوب نے تحریر کیا ہے:

ان اول من صنف فی الاسلام امیرالمومنین علی علیہ السلام

جس نے سب سے پہلے اسلام میں تصنیف کا آغاز کیا' وہ امیرالمومنین علیہ السلام تھے۔

(مناقب)

حضرت کے چند تصنیفات یہ ہیں۔

کتاب علی :۔ یہ کتاب مسائل و احکام پر مشتمل تھی اگرچہ کتابی صورت میں موجود نہیں ہے مگر اس کے مندرجات کتب احادیث میں متفرق طور پر پائے جاتے ہیں۔ محمد ابن اسماعیل بخاری نے بھی اپنی صحیح باب کتابتہ العلم میں اس کا ذکر کیا ہے۔

کتاب الجفر و کتاب الجامعه :۔ یہ دونوں کتابیں بھی حضرت کی تصنیف کردہ ہیں۔ بستانی نے تحریر کیا ہے:

الجفر و الجامعة كتابان لعلی کرم اللّٰہ وجهه۔ جفر اور جامعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تصنیف کردہ دو کتابیں ہیں۔

(دائرۃ المعارف ج ٦ ص ٤٧٨)

تفسیر نعمانی:۔ یہ ایک تفسیری تبصرہ ہے جو اپنے راوی محمد ابن ابراہیم ابن جعفر النعمانی کی نسبت سے تفسیر نعمانی کہلاتا ہے۔ یہ تفسیر بحارالانوار کی انیسویں جلد میں مرقوم ہے۔

امیرالمومنینؑ نے خود بھی تصنیف و تالیف کا کام انجام دیا اور اپنے اصحاب و تلامذہ میں سے بھی مصنّفین کی ایک جماعت پیدا کردی جنہوں نے آپ کے خطب و قضایا قلمبند کرنے کے ساتھ مختلف اسلامی موضوعات پر کتابیں لکھیں ان کتب کا تذکرہ رجال نجاشی، رجال کشی اور فہرست ابن ندیم میں موجود ہے۔ ان مصنّفین میں سے چند قلمکار یہ ہیں:

ابورافع: پیغمبر اکرم ﷺ کے آزاد کردہ غلام، امیرالمومنینؑ کے کاتب اور بیت المال کے خازن تھے انہوں نے کتاب السنن والاحکام و القضایا مرتب کی۔

عبید اللّٰہ ابن ابی رافع:۔ انہوں نے ایک کتاب ترتیب دی جو ان لوگوں کے اسماء اور اجمالی تعارف پر مشتمل تھی جنہوں نے امیرالمومنین کے ہمراہ مختلف غزوات میں شرکت کی تھی۔ یہ علم رجال کی پہلی کتاب تھی جو عالم اسلام میں ظاہر ہوئی۔

علی ابن ابی رافع:۔ انہوں نے فقہ کے مختلف ابواب تحریر کئے۔

ربیعه ابن سمیع:۔ انہوں نے حضرت علیؑ سے جو مسائل زکوۃ سنے انہیں تحریری صورت لائے۔

سلیم ابن قیس ہلالی:۔ حضرت کے رواۃ حدیث میں سے تھے انہوں نے رسول اللہ کے بعد پیش آنے والے واقعات کے سلسلہ میں ایک کتاب لکھی جو کتاب سلیم کے نام سے مشہور اور مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔

اصبغ ابن نباته:۔ انہوں نے حضرت کے مرتب کردہ دستور حکومت اور وصیت نامہ کو جو اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہے قلمبند کیا۔ یہ دونوں تحریریں نہج البلاغہ میں درج ہیں۔

سلمان فارسی:۔ انہوں نے امیرالمومنینؑ کے احتجاجات قلمبند کئے۔

ابو ذر غفاری:۔ ان کی ایک کتاب وصایا النبی ہے جس کی شرح علامہ محمد باقر مجلسی نے عین الحیاۃ کے نام سے تحریر کی ہے۔

ابوالاسود دئلی:۔ انہوں نے حضرت سے نحو کے ابتدائی قواعد سن کر انہیں تحریر صورت میں منضبط کیا۔

علم الطب

اسلام سے قبل کچھ لوگ امراض کو ارواح خبیثہ کی اثر اندازی کا نتیجہ سمجھتے تھے اور ان کے دفعیہ کے لئے کاہنوں، جادوگروں اور جھاڑ پھونک کرنے والوں کی طرف رجوع کرتے تھے اور کچھ لوگ علاج معالجہ بھی کرتے تھے۔ یہ علاج معالجہ داغنے، پچھنے لگانے، ٹونے ٹوٹکوں اور چند جڑی بوٹیوں تک محدود ہوتا تھا جن کے خواص تجربہ سے معلوم کئے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ ان تجربات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور صدیوں کے مسلسل تجربوں اور مشاہدوں کی اساس پر جو علم مدون ہوا اسے علم طب کہا گیا۔ طب کے لغوی معنی زیرکی و دانائی اور سحر و جادو کے ہیں اور اصطلاحاً" اس علم کو کہتے ہیں جو انسانی مزاج کے تعدیل۔ ازالہ امراض اور حفظ صحت کی تدابیر کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ یہ علم اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ مختلف امراض کا ازالہ اسی پر منحصر ہے اور اسی کے ذریعہ صحت و تندرستی بحال کی جاسکتی ہے۔ امیرالمومنین، بھی اسی علم کی افادیت کی بناء پر اسے بڑی اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے :

العلم علمان علم الادیان و علم الابدان علم دو ہیں ایک علم دین اور دوسرا علم طب

علم طب کے چند شعبے ہیں۔ تشریح و منافع اعضاء تشخیص امراض، دستور معالجات، تدابیر حفظان صحت، اور خواص مفرادات۔

تشریح اعضاء

جسم کے مختلف اعضاء اور ان کے افعال کے علم کا نام تشریح اعضاء یا علم بدن ہے خداوند عالم نے انسانی جسم میں ۲۴۸ ہڈیاں، ۵۱۸ عضلات، ۵۷ اعصاب، ۱۸۰ متحرک اور ۱۸۰ ساکن رگیں اور مختلف اعضاء اور ان میں گوناگوں حواس و قویٰ ودیعت کئے ہیں جو ہمہ وقت اپنے وظائف کی انجام دہی میں مصروف رہتے ہیں۔ اگر جسم کی ساخت اور اس کے نظام پر نظر کی جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک عظیم کائنات اس کے اندر سمٹ آئی ہے۔ امیرالمومنینؑ نے جسم کی ساخت اور اعضا کے نظم و ارتباط پر نظر کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

اتزعم انک جرم صغیر وفیک انطوی العالم الاکبر

کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ تو ایک چھوٹا سا جسم ہے حالانکہ تیرے اندر ایک بڑا عالم سمودیا گیا ہے

انسانی جسم کی بنیاد غیر مرئی خلیوں پر قائم ہے۔ ان خلیوں کے اجتماع سے بافت بنتے ہیں اور بافتوں سے اعضاء کی تشکیل ہوتی ہے اور اعضا کا مجموعہ جسم کہلاتا ہے۔ گویا انسانی جسم ایک کتاب ہے جس میں خلئے حرف کی اور بافت

الفاظ کی اور اعضا جملوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں:

و انت الکتب المبین الذی با حرفه یظهر المضمر

تو وہ روشن کتاب ہے جس کے حرفوں سے چھپی ہوئی چیزیں ظاہر ہوتی ہیں۔

انسان کے جسم میں قدرت نے مختلف قسم کے حاسے اور قویٰ ودیعت کئے ہیں جب یہ حاسے اپنے مخصوص محرکات کے ذریعہ متحرک و متاثر ہوتے ہیں تو ان سے مختلف اثرات ظہور میں آتے ہیں۔ امیرالمومنینؑ نے ان قوتوں اور حاسوں کو کمیل ابن زیاد کے ایک سوال کے جواب میں بیان فرمایا ہے۔ انہوں نے حضرت سے نفس کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے فرمایا کہ کس نفس کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہو۔ کہا کہ کیا ایک نفس کے علاوہ اور بھی نفس ہیں فرمایا کہ ہاں نفس کی متعدد قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک نفس نامیہ ہے جس سے جسم کی نشو ونما وابستہ ہے اور ایک نفس حیوانیہ ہے جو اس حواس ظاہرہ کا مرکز ہے۔ نفس نامیہ پانچ قوتوں کا سرچشمہ ہے ماسکہ' جاذبہ' ہاضمہ' دافعہ اور مربیہ' قوت ماسکہ وہ ہے جو فضلات کو روکے رکھتی ہے۔ قوت جاذبہ وہ ہے جو غذا کو اندر کی طرف جذب کرتی ہے۔ قوت ہاضمہ وہ ہے جو غذا کو ہضم کرکے جزو بدن بننے کے قابل بناتی ہے۔ قوت دافعہ وہ ہے جو فضلات کو باہر نکالتی ہے اور قوت مربیہ وہ ہے جو جوہر غذا کو تمام اعضاء میں حسب ضرورت تقسیم کرتی ہے۔

یونہی نفس حیوانیہ میں پانچ قوتیں کار فرما ہیں۔ سامعہ' باصرہ' شامہ' ذائقہ اور لامسہ' قوت سامعہ وہ ہے جس کے ذریعہ انسان مختلف آوازیں سنتا ہے۔ قوت باصرہ وہ ہے جس کے ذریعہ دیکھتا اور مختلف اشیاء کے اشکال و الوان میں امتیاز کرتا ہے۔ قوت شامہ وہ ہے جس کے ذریعہ سونگھتا اور خوشبودار بدبو میں تمیز کرتا ہے۔ قوت ذائقہ وہ ہے جس کے ذریعہ مختلف اشیاء کی شیرینی' تلخی وغیرہ ذائقوں کا احساس ہوتا ہے اور قوت لامسہ وہ ہے جس کے ذریعہ گرمی و سردی اور سختی و نرمی محسوس کرتا ہے۔

مختلف اعضاء کے افعال و خواص کے سلسلہ میں فرمایا:

العقل فی الدماغ و الضحک فی الکبد و الرافة فی الطحال و الصوت فی الرئة۔

عقل کا تعلق دماغ سے' ہنسی کا جگر سے' نرمی و رافعت کا تلی سے اور آواز کا پھیپھڑے سے ہے۔

(عقد الفرید)

تشخیص امراض

علم طب میں تشخیص مرض کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کیوں کہ اسی پر علاج کے مئوثر و کارگر ہونے کا انحصار ہے۔ اگر تشخیص صحیح نہ ہوگی تو علاج بھی مفید ثابت نہ ہوگا۔ اگرچہ بعض امراض کے علائم واضح ہوتے ہیں مگر بعض امراض کی علامتیں مشترک نوعیت کی ہوتی ہیں جن میں خفیف سا فرق ہوتا ہے اور ایک حاذق و ماہر طبیب کی دور رس نظریں ہی اس فرق کو محسوس کر سکتی ہیں اس لئے طبیب کے لئے فراست و دانائی اور نظر کی گہرائی از بس ضروری ہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام اگرچہ رسمی طبیب نہ تھے مگر فصل خصومات کے سلسلہ میں مختلف عوارض کے جو علامات بیان کئے ہیں اس سے فن تشخیص میں آپ کی حذاقت و فنی مہارت کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ ذیل میں اس سلسلہ کے چند واقعات درج کئے جاتے ہیں۔

عرب کی ایک بادیہ نشین لڑکی جوہڑ میں نہا رہی تھی کہ اثنائے غسل میں ایک جونک اس کے شکم میں داخل ہوگئی اور اس کے بڑھاؤ سے پیٹ بھی بڑھنے لگا جب اس لڑکی کے بھائیوں نے یہ دیکھا تو اسے بدچلن سمجھ کر قتل کرنا چاہا مگر انہی میں سے دو ایک نے کہا اسے امیرالمومنینؑ کے سامنے پیش کرنا چاہئے تاکہ وہ اسے مناسب سزا دیں۔ چنانچہ اسے حضرت کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ نے جب شکم کے بڑھاؤ کے علاوہ کوئی اور علامت حمل کی نہ پائی تو ایک طشت میں گیلی مٹی منگوائی اور فرمایا کہ اسے علیحدگی میں اس پر بیٹھا دیا جائے چنانچہ اسے بٹھا دیا گیا ابھی اسے بیٹھے ہوئے کچھ دیر گزری ہوگی کہ جونک مٹی کی بو پا کر باہر آگئی اور پیٹ کا بڑھاؤ ختم ہوگیا۔ جب اس کی پاکدامنی ظاہر ہو گئی تو وہ خوش خوش اپنے بھائیوں کے ساتھ چلی گئی جن جن لوگوں نے یہ واقعہ سنا وہ حضرت کی حذاقت و فراست پر دنگ رہ گئے۔

اس قسم کا ایک واقعہ مشہور طبیب ابوبکر رازی متوفی ۳۱۱ھ کو بھی پیش آیا۔ ہوا یہ کہ ایک شخص بغداد سے رے آرہا تھا کہ اس کے منہ سے خون آنا شروع ہوگیا۔ جب وہ رے پہنچا تو رازی کے پاس علاج کے لئے آیا اس نے نبض اور قارورہ دیکھنے اور مرض کا جائزہ لینے کے بعد کوئی ایسی علامت نہ پائی جس سے سل یا اندرونی زخم کا فیصلہ کرتا اس نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد پوچھا کہ تمہیں راستہ میں کن کن جگہوں سے پانی پینا پڑا۔ اس نے کہا صاف و شفاف پانی کے علاوہ تالابوں اور جوہڑوں کا گدلا پانی بھی پیتا رہا ہوں۔ وہ سمجھ گیا کہ کسی جوہڑ سے پانی پیتے ہوئے جونک اس کے پیٹ میں داخل ہوگئی جس کی وجہ سے منہ سے خون آرہا ہے۔ کہا کہ میں اس شرط پر تمہارا علاج کروں گا کہ تم اپنے غلاموں سے کہو کہ وہ علاج کے سلسلہ میں میرا ہر حکم مانیں۔ اس نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا اور دوسرے دن اپنے غلاموں کو لیکر وہاں پہنچ گیا۔ رازی نے کائی کے بھرے ہوئے دو لگن منگوائے اور اسے کھانے کیلئے کہا۔ اس نے جبر

کر کے تھوڑی سی کائی چکھی اور پھر ہاتھ کھینچ لیا اور کہا کہ اب اس سے زیادہ نگل نہیں سکتا۔ رازی نے اس کے غلاموں کو حکم دیا کہ وہ اسے زمین پر لٹا کر زبردستی اس کے منہ میں ٹھونستے جائیں۔ جب کائی کا ایک بھرا ہوا لگن اس کے پیٹ میں ٹھونس دیا گیا تو اسے قے آئی اور کائی میں لپٹی ہوئی جونک باہر آگئی اور وہ شفایاب ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کیا بعید ہے کہ رازی کے پیش نظر امیرالمومنین کا مذکورہ بالا واقعہ رہا ہو اور اسی سے اس کا ذہن ادھر متوجہ ہوا ہو کہ جوہڑوں سے پانی پیتے ہوئے جونک بھی پیٹ میں داخل ہو سکتی ہے۔

آنکھوں کی بینائی کا جدید طریقہ تشخیص یہ ہے کہ مریض کے سامنے ساڑھے چار فٹ کے فاصلہ پر ایک چارٹ لٹکا دیا جاتا ہے جس میں اوپر کی سطر جلی اور اسی طرح بعد کی سطریں بالترتیب خفی ہوتی جاتی ہیں اور آنکھوں پر مختلف نمبر کے شیشے لگا کر بینائی کی جانچ کی جاتی ہے۔ اگر ایک آنکھ کا امتحان لینا ہو تو دوسری آنکھ کے آگے سیاہ شیشہ لگا دیا جاتا ہے۔ یہ چارٹ سنیلن کی ایجاد ہے اس لئے اسے سنیلن چارٹ کہا جاتا ہے۔ امیرالمومنینؑ کے دور میں نہ سینلن چارٹ ایجاد ہوا تھا اور نہ جدید آلات ہی تھے اس وقت آپ نے بینائی کے امتحان کے سلسلہ میں جو طریق کار اختیار کیا اسے موجودہ ترقی پذیر صورت کا نقطہ آغاز کہا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں دو واقعے درج کئے جاتے ہیں۔

دو شخص آپس میں لڑ پڑے اور ایک نے دوسرے کی آنکھ پر ضرب لگائی جس سے اس کی آنکھ کی بینائی میں فرق آگیا۔ یہ معاملہ حضرتؑ کے سامنے پیش ہوا تو آپؑ نے فرمایا کہ اس کی صحیح آنکھ پر پٹی باندھو اور ایک انڈا لے کر اس کے سامنے کھڑے ہو جاؤ اس سے دریافت کرو کہ انڈا اسے نظر آتا ہے اگر وہ ہاں کہے تو اور پیچھے ہٹ کر دریافت کرو یہاں تک کہ اتنے فاصے پر پہنچ جاؤ کہ وہ یہ کہے کہ اب نظر نہیں آتا پھر صحیح آنکھ کھول کر مضروب آنکھ پر پٹی باندھو اور اسی طرح انڈا اس کے بالمقابل کرکے دریافت کرو یہاں تک کہ اتنے فاصلے پر پہنچ جاؤ کہ یہ کہے کہ اب نظر نہیں آتا۔ اس کے بعد دونوں فاصلوں کو ناپ لو اور جتنا فرق نکلے اس کے مطابق بینائی کم ہوئی ہوگی اور اسی حساب سے دیت کا حقدار ہوگا۔

ایک شخص نے دوسرے شخص کی آنکھوں پر ضرب لگائی جس سے اس کی دونوں آنکھوں کی بنائی میں فرق آگیا۔ حضرت نے اس کے سامنے انڈا رکھ کر دریافت کیا کہ تمہیں یہ نظر آتا ہے اس نے کہا کہ ہاں پھر اتنی دور پیچھے ہٹ گئے کہ اس نے کہا کہ اب نظر نہیں آتا۔ یونہی چاروں سمت کی طرف گھوم کر اس سے پوچھا اور پھر چاروں سمتوں کے فاصلہ کو ناپا جب ہر سمت کا فاصلہ یکساں نکلا تو فرمایا کہ تم نے صحیح کہا ہے اور غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ پھر اسی سن وسال کے ایک شخص کو بلایا اور اسی طرح اس کی بنائی کو جانچا اور دونوں شخصوں کے فاصلہ میں جو تفاوت نکلا اس کے مطابق اس کی بصارت کی کمی کا فیصلہ کیا۔

ایک شخص نے دوسرے شخص کے سر پر چوٹ لگائی جس سے اس کی بینائی اور قوت گویائی جاتی رہی اور قوت

نی جواب دے گئی۔ حضرت کے سامنے یہ قضیہ پیش ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اگر یہ سچ کہتا ہے تو ان تینوں چیزوں کی الگ الگ دیت پانے کا حقدار ہوگا۔ لوگوں نے کہا کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ سچ کہتا ہے۔ فرمایا کہ قوت شامہ کا امتحان اس طرح لو کہ شدید قسم کی کوئی بدبو دار چیز اس کی ناک کے قریب لے جاؤ اگر یہ سر کو پیچھے کی طرف جھٹکا دے اور اس کی آنکھوں میں پانی بھر آئے تو یہ جھوٹا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو یہ سچا ہے اور بینائی کو اس طرح جانچو کہ اسے سورج کے سامنے کھڑا کرو۔ اگر اس کی آنکھیں بند ہو جائیں تو یہ جھوٹا ہے اور کھلی رہیں تو سچا ہے اور گویائی کا امتحان اس طرح لو کہ اس کی زبان میں سوئی چبھو کر دیکھو۔ اگر سرخ خون نکلے تو جھوٹا ہے اور سیاہ خون نکلے تو سچا ہے۔

ایک شخص نے یہ ادعا کیا کہ وہ ازالہ بکارت پر قادر نہیں۔ حضرت نے اس سے کہا کہ تم نرم زمین پر پیشاب کرو اور قنبر سے فرمایا کہ دیکھو اگر پیشاب سے زمین میں گڑھا سا پڑ گیا ہو تو یہ جھوٹا ہے اور اگر گڑھا نہ پڑا ہو تو سچا ہے۔

ایک شخص کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا کہ وہ نامرد ہے۔ حضرت نے قنبر سے فرمایا کہ اسے نہر میں اتارو اگر سرد پانی سے اس کا عضو سکڑ جائے تو یہ نامرد نہیں ہے اور اگر نہ سکڑے تو یہ نامرد ہے۔ اطباء قدیم و جدید کی یہ متفقہ رائے ہے کہ اگر سرد پانی سے عضو سکڑے تو قابل علاج ہے ورنہ ناقابل علاج کیونکہ سرد پانی کی ٹھنڈک سے متاثر نہ ہونا اس کی علامت ہے کہ حس اعصابی ختم ہو چکی ہے۔

دستور معالجات

اصل معالج انسانی طبیعت ہے جو اپنی قوت مقاومت سے مرض کو دباتی اور قوائے بدنی کو ان کی اصلی حالت کی طرف پلٹاتی ہے۔ چنانچہ بقراط کا قول ہے **ان الطبیعة فی التی تشفی المریض** ”طبیعت ہی بیمار کو صحت بخشتی ہے“ ابن ازہر اندلسی نے تجربہ کے ذریعہ ثابت کیا کہ طبیعت ہی تمام جسمانی افعال پر حکمران ہے اور وہی بدن کی اصلاح اور مرض کا ازالہ کرتی ہے۔ یہ طبیعت ہی کی اثر اندازی کا کرشمہ ہے کہ اگر ایک تندرست انسان اس وہم میں مبتلا ہو جائے کہ وہ مریض ہے تو اس کا واقعی مریض ہو جانا کچھ بعید نہ ہوگا۔ چنانچہ بعض بیماریاں بیماری کے خیال میں ڈوبے رہنے سے پیدا ہوتی ہیں اور اکثر کمزور طبیعت افراد اس کی زد میں آجاتے ہیں اس کے برعکس اگر کوئی بیمار اپنے آپ کو تندرست خیال کرے تو یہ ذہنی تاثر طبیعت کا رخ صحت کی طرف موڑ دے گا اور بعید نہیں کہ وہ اسی تصور کے زیر اثر تندرست ہو جائے یا کم از کم مرض بڑھنے نہ پائے۔

امیرالمومنینؑ بھی مریضوں کو یہ ہدایت کرتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو تندرست تصور کریں تاکہ یہ تصور مرض کے

مقابلہ میں طبیعت کی قوت مدافعت بحال رکھے۔ چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے:

امش بدائک ما مشی بک مرض میں جب تک ہمت ساتھ دے چلتے پھرتے رہو۔

مقصد یہ ہے کہ چلتے پھرتے رہنا طبیعت کا رخ موڑنے کا ایک مؤثر ترین ذریعہ ہے اور بستر پر پڑے رہنے سے بیماری کا خیال گھیرے رہتا ہے اور یہ پریشان خیالی مرض کی تقویت کا باعث ہوتی ہے لہٰذا دواؤں کے بجائے بیماری کے خدشہ سے دل و دماغ کو خالی رکھنے اور ارادہ کی مضبوطی سے بیماری پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

اطباء کی متفقہ رائے ہے کہ اگر غذا سے علاج ہو سکتا ہو تو دوا کا استعمال نہ کیا جائے اور اگر دوا کی ضرورت پڑ جائے تو مفرد دوا استعمال کی جائے اور جہاں تک ہو سکے مرکب ادویہ سے پرہیز کیا جائے۔ ابوبکر محمد ابن زکریا رازی کا قول ہے:

مهما قدرت ان تعالج بالاغذية فلا تعالج بالا دوية و مهما قدرت ان تعالج بدواء مفرد فلا تعالج بالدواء المركب۔ اگر غذا سے علاج کرنا تمہارے لئے ممکن ہو تو دوا سے علاج نہ کرو اور جہاں مفرد دوا سے علاج ہو سکے وہاں مرکب دوا استعمال نہ کرو۔

حکماء قدیم حتی الامکان مفرد ادویہ ہی سے علاج کرتے تھے اور دوسری ادویہ سے ترکیب دیتے تھے تو اس کی غرض یہ ہوتی تھی کہ دوا کی اصلاح کی جائے یا اس کی قوت کو بڑھایا جائے یا اس کے ضرر کو کم کیا جائے یا مرض کی نوعیت اور مریض کے مزاج کا تقاضا یہ ہو کہ مرکب دوا استعمال کی جائے۔ دوا کا کام تو بس اتنا ہے کہ جس مرض کے لئے وہ استعمال کی جا رہی ہے طبیعت کو اس کے ازالہ پر آمادہ کر دے مگر اس افادی پہلو کے ساتھ دوسرے اعتبار سے مضر و نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ دوا کا استعمال بہر حال غیر طبعی ہے جو مرض کے لحاظ سے مفید اور عمومی صحت کے اعتبار سے مضر ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے مشہور موجد ایڈیسن کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک مرتبہ بیمار ہوا تو اس کے دوستوں نے اصرار کیا کہ کسی معالج کی طرف رجوع کرنا چاہئے چنانچہ وہ ایک معالج کو لے آئے اس نے دیکھا بھالا اور دوا تجویز کی جب وہ چلا گیا تو ایڈیسن نے دوا زمین پر پھینک دی۔ اس کی وجہ پوچھی گئی تو کہا کہ معالج کو زندگی کی ضرورت تھی اس لئے میں آمادہ ہوگیا کہ اسے بلا لیا جائے اور اس سے دوا خرید لی جائے اور میں بھی جینا چاہتا ہوں اس لئے دوا کو استعمال کرنے کے بجائے پھینک دیا ہے۔

آرتھر شوپنہار بھی اس کا قائل تھا کہ صحت و تندرستی عطاروں اور ویدوں سے خریدی نہیں جا سکتی چنانچہ اس نے زندگی بھر کبھی دوا استعمال نہیں کی۔

امیرالمومنینؑ کے طبی کلمات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ علاج بالغذاء کو علاج بالدواء پر ترجیح دیتے اور ضرورت کے مواقع پر مفرد دوا تجویز کرتے اور ناگزیر صورت کے علاوہ دوا کے استعمال کی اجازت نہ دیتے تھے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے:

لا یتداوی المسلم حتی یغلب مرضہ صحتہ۔ جب تک مرض صحت پر غالب نہ آجائے کوئی مسلمان دوا استعمال نہ کرے۔

طب کا یہ کلیہ ہے کہ امراض حارہ کا علاج اشیاء باردہ سے کیا جائے اور امراض باردہ کا علاج اشیاء حارہ سے کیا جائے حضرتؑ کا دستور علاج بھی یہی تھا۔ چنانچہ اس دستور کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے فرمایا:

اکسر و احر الحمی بالعناب والماء البارد بخار کی گرمی کو بنفشہ عناب اور ٹھنڈے پانی سے توڑو عناب اور بنفشہ کا مزاج سرد ہے جو بخار کی حرارت کو فرد کرتے ہیں اور ٹھنڈا پانی بھی مفید ہے۔ خصوصاً اس بخار میں جو دھوپ میں چلنے پھرنے کی وجہ سے ہو۔

تدابیر حفظان صحت

حکماء یونان کے نزدیک حفظان صحت کے اصولوں کو علاج پر فوقیت حاصل ہے اگر ان اصولوں کی پابندی کی جائے تو ان بیماریوں سے تحفظ ہو سکتا ہے۔ جو بے اعتدالی کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں کیونکہ کہ طبیعت کی قوت مقاومت مضمحل نہیں ہوتی اور مولد امراض جراثیم کے مقابلہ کی طاقت بحال رہتی ہے بلکہ جہاں علاج کارگر ثابت نہیں ہوتا وہاں احتیاطی تدابیر کے ذریعہ مرض پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ امیرالمومنینؑ کا ارشاد ہے:

لا تنال الصحة الا بالحمیة تم پرہیز ہی سے صحت یاب ہو سکتے ہو

حفظان صحت کا اولین اصول یہ ہے کہ مضر صحت اشیا سے پرہیز کیا جائے اور کھانے پینے میں احتیاط برتی جائے کیونکہ اکثر بیماریاں کھانے پینے میں بے احتیاطی سے پیدا ہوتی ہیں۔ حضرتؑ فرماتے ہیں:

المعدة بیت الداء والحمیة راس الدواء معدہ بیماریوں کا گھر ہے اور پرہیز سو دواؤں کی ایک دوا ہے

معدہ کے عمل کو متوازن رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ بے ضرورت نہ کھایا جائے اور جب کھانے بیٹھے تو نہ زیادہ پیٹ بھرے اور نہ بھوکا رہے اس لئے کہ زیادہ خوری پھیپھڑوں کے لئے مضر ہے اور بھوک قوت حیات کو کم کر دیتی ہے۔

حضرتؑ کا ارشاد ہے:

لا تجلس علی الطعام الا وانت جائع ولا تقم عن الطعام الا وانت تشتهیه وجود المضغ و اذا نمت فاعرض نفسک علی الخلاء فاذا استعملت ہذا استغنیت عن الطب۔

جب بھوک ہو اس وقت کھانے کے لئے بیٹھو اور ابھی کچھ بھوک باقی ہو کہ اٹھ کھڑے ہو۔ کھانا خوب چبا کر کھاؤ اور سونے سے پہلے حوائج ضروریہ سے فارغ ہو جاؤ۔ جب اس پر عمل کروگے تو علاج معالجہ سے مستغنی ہو جاؤ گے۔

کھانے کی ابتداء نمک سے کرنا چاہئے۔ حضرت فرماتے ہیں:

ابدو ا بالملح فی اول طعامکم فلو یعلم الناس ما فی الملح لا ختار علی الدریاق المجرب۔

کھانے کی ابتدا نمک سے کرو۔ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس میں کیا فائدے ہیں تو اسے تریاق آزمودہ پر ترجیح دیں۔

نمک انسانی جسم کی نشوونما کے لئے ضروری ہے جب یہ معدہ میں پہنچتا ہے تو اس سے نمک کا تیزاب بنتا ہے جو دوسرے اجزا کے ساتھ مل کر کھانے کو ہضم کرتا ہے۔

رات کو خالی شکم نہ سونا چاہئے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے۔

ترک العشاء خراب البدن۔

رات کو نہ کھانا خرابی بدن کا باعث ہوتا ہے۔

کھانا ٹھنڈا ہونے پر کھانا چاہئے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں:

اقروا الحار حتی یبرد۔

کھانے کو رکھا رہنے دو یہاں تک کہ ٹھنڈا ہو جائے۔

ایک وقت میں مختلف کھانوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔

حضرتؑ کا ارشاد ہے:

الالوان یعظمن البطن۔

رنگا رنگ کے کھانوں سے پیٹ بڑھ جاتا ہے۔

گوشت کثرت سے استعمال نہ کرنا چاہئے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

لا تجعلوا بطونکم قبور الحیوان

اپنے شکموں کو جانوروں کا گورستان نہ بناؤ

دن کو کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرنا چاہئے۔ اس سے اعصابی کھچاؤ کم ہوتا ہے اور قوت عمل عود کرتی آتی ہے اور رات کے کھانے کے بعد چہل قدمی کرنا چاہئے اس لئے کہ چلنا پھرنا ہضم طعام میں معین ہوتا ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں:

یتمدد بعد الغداء و یتمشی بعد العشاء۔ دوپہر کے کھانے کے بعد لیٹ جانا چاہئے اور رات کے کھانے کے بعد چلنا پھرنا چاہئے۔

شکم سیر ہونے کے بعد غسل کرنا مضر صحت ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں :

دخول الحمام علی البطنة من شر الداء شکم سیر ہو کر حمام میں جانا مرض کا باعث ہے۔

تمام مشروبات میں پانی سب سے بہتر مشروب ہے۔ حضرتؑ کا ارشاد ہے :

الماء سید الشراب فی الدنیا و الاخرة۔ پانی دنیا و آخرت میں تمام مشروبات کا سردار ہے۔

پانی کم مقدار میں پینا چاہئے کیونکہ زیادہ پانی پینے سے معدہ کے رطوبات بڑھ جاتے ہیں جس سے نظام ہضم میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں۔

اشرب علی ظماء و لیقل من شرب الماء۔ پیاس ہو تو پانی پیو اور پانی کم پینا چاہئے۔

پانی انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے پانی اس حرارت کو جو خون کی آمد و شد سے پیدا ہوتی ہے حد اعتدال پر رکھتا ہے۔ اگر دوران خون سے پیدا ہونے والی گرمی بڑھ جائے تو زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ اگرچہ تنفس حرارت کو فرو کرنے میں معین ہوتا ہے مگر اس حد تک تسکین نہیں ہوتی جو زندگی کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ یہ مقصد پانی ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ پانی ایک طرف حرارت کو فرو کرتا ہے اور دوسری طرف پسینہ اور پیشاب کے ذریعہ غلیظ مادوں کے اخراج کا باعث ہوتا ہے۔ اگر ان سمی مواد کا اخراج نہ ہو تو انسان ہلاکت سے دو چار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن یہ فوائد صحیح طور پر اسی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں جب پانی پاک و صاف اور اپنی اصلی حالت پر ہو۔ کنوئیں، جوہڑوں اور تالابوں کا پانی عموماً کثافت سے آلودہ ہوتا رہتا ہے۔ بلکہ نہروں اور دریاؤں میں بھی ایسی چیزوں کی آمیزش ہو جاتی ہے جو صحت کے لئے مضر ہوتی ہیں۔ البتہ بارش کا پانی تمام کثافتوں اور موالد امراض جراثیم سے پاک ہوتا ہے اس لئے بارش کا پانی دوسرے پانیوں سے بہتر ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں:

اشربوا ماء السماء فانه یطهر البدن و یدفع الاسقام۔ بارش کا پانی پیو، یہ بدن کا تطہیر اور امراض کو دور کرتا ہے۔

دانتوں کی صفائی کے لئے مسواک کرنا چاہئے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں:

السواک یجلو البصر

مسواک سے آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔

دانتوں کی بیماریوں سے تحفظ کے لئے دانتوں کی صفائی از بس ضروری ہے اور صفائی کے لئے مسواک سے بہتر اور

کوئی ذریعہ نہیں۔ اس سے دانتوں کی صفائی بھی ہوتی ہے۔ اور منہ کے غلیظ رطوبات بھی خارج ہو جاتے ہیں۔ مسواک دائیں جانب بائیں جانب اور بائیں جانب سے داہنی جانب کے بجائے اوپر کے دانتوں میں اوپر سے نیچے اور نیچے کے دانتوں میں نیچے سے اوپر کی جانب کرنا چاہئے تاکہ دانتوں کی ڈاڑوں سے غذا کے ذرات نکل آئیں اور ذرات کے تعفن سے جو امراض پیدا ہوتے ہیں ان سے محفوظ رہیں۔ امیرالمومنینؑ کے مسواک کرنے کا یہی طریقہ تھا اور آپ طولا" مسواک کرنے کے بجائے عرضا" مسواک کرتے تھے۔

دھوپ میں زیادہ دیر بیٹھنے سے جسم کمزور پڑ جاتا ہے۔ اگر بیٹھنا ہی ہو تو سورج کی طرف پیٹھ کرکے بیٹھو موسم سرما کے آغاز میں سردی سے بچنا چاہئے اور آخر سرما میں سردی سے بچاؤ کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

تو توا البرد فی اولہ و تلقوہ فی اخرہ فانہ یفعل فی الابدان کفعلہ فی الا شجار اولہ یحرق و آخرہ یورق۔

شروع سردی میں سردی سے احتیاط کرو اور آخر میں اس کا خیر مقدم کرو کیونکہ سردی جسموں میں وہی اثر کرتی ہے جو درختوں میں کرتی ہے ابتداء میں درختوں کو جھلس دیتی ہے اور آخر میں سرسبز و شاداب کرتی ہے۔

زرا بن جیش کہتے ہیں:

قال امیرالمومنین اربع کلمات فی الطب لوقالها بقراط او جالینوس لقدم امامها مائة ورقة ثم زینها بهذه الکلمات۔

امیرالمومنین نے طب کے بارے میں یہ چار کلمے ایسے فرمائے ہیں کہ اگر بقراط یا جالینوس کہتے تو ان جملوں کے شروع میں سو ورق پیش لفظ کے طور پر تحریر کرتے اور پھر ان جملوں سے صفحہ کتاب کو آراستہ کرتے۔

(بحار الانوار ج ۱۴ ص ۵۴۷)

خواص مفردات

مفردات کے خواص و افعال کا علم بھی طب کا ایک اہم باب ہے اسی سے مختلف چیزوں کے امزجہ و اثرات کا علم ہوتا ہے اور مختلف طبائع کے اعتبار سے ان کے فائدہ بخش یا ضرر رساں ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے۔ ذیل میں چند چیزوں کے خواص کے بارے میں حضرت کے ارشادات درج کئے جاتے ہیں۔

العسل شفاء من کل داء لا دواء فیه یقل البلغم و یجلو القلب۔

شہد ہر مرض کی بے ضرر دوا ہے جو بلغم کو چھانٹتی اور دل کو جلا بخشتی ہے۔

الخل یکسر المره و یطفی الصفراء

سرکہ سودا کا زور توڑتا اور صفرا کا جوش کم کرتا ہے۔

اکل السفرجل قوة للقلب الضعیف و تطیب المعده

بہی کمزور دل کو تقویت دیتی اور معدہ کی اصلاح کرتی ہے۔

کلوا التفاح فانه نصوح المعده

سیب کھاؤ یہ معدہ کو قوی کرتا ہے۔

الکمثری یجلو القلب و یسکن اوجاع الجوف

ناشپاتی دل میں جلا پیدا کرتی اور درد شکم کو دور کرتی ہے۔

کلوا الرمان بشحمه فانه دباغ للمعده۔

انار کو اس کی باریک جھلی کے ساتھ کھاؤ کیوں کہ یہ معدہ کو تقویت دیتی ہے۔

علیکم باکل التین فانه نافع للقولنج۔

انجیر کھاؤ یہ قولنج کے لئے مفید ہے۔

العدس یرق القلب و یسرع الدمع کلوا الدبا فانه یزید فی الدماغ

مسور دل کو نرم کرتا ہے اور آنسو لاتا ہے۔ کدو کھاؤ یہ دماغی قوت کو بڑھاتا ہے۔

لحم البقر داء و بسنها شفاء و سمنها دواء۔

گائے کا گوشت مرض، دودھ شفا اور گھی دوا ہے۔

لاتدمنوا اکل السمک فانه ینهک الجسد

بلاناغہ مچھلی نہ کھاؤ۔ اس سے جسم کمزور ہو جاتا ہے۔

مضغ اللبان یشد الاضراس

کندر کا چبانا دانتوں کو مضبوط کرتا ہے۔

الزبیب یشید القلب و یذهب بالمرض و یطفی الحرارة ویطیب النفس۔

منقی دل کو قوی مرض کو زائل حرارت کو کم اور دل میں خوشی پیدا کرتا ہے۔

اکل الجوز فی شدۃ الحر یهیج الحر فی الجوف و یهیج القروح علی الجسد و اکله فی الشتاء یستخن الکیتین و یدفع البرد

سخت گرمی میں اخروٹ کھانے سے اندرونی حرارت جوش مارتی ہے اور بدن پر پھوڑے پھنسیاں نکل آتی ہیں اور سردی میں کھانے سے گردوں کی حرارت بڑھتی اور سردی دور ہوتی ہے۔

کلوا التمر فان فیه شفاء من الادواء

خرما کھاؤ یہ بہت سی بیماریوں سے شفا دیتا ہے۔

خرما بہت سی بیماریوں کی روک تھام کرتا ہے کیوں کہ اس میں وٹامن اے کافی مقدار میں پایا جاتا ہے اور وٹامن اے کا خاصہ ہے کہ قوت مدافعت کو کمزور نہیں ہونے دیتا۔ اگر جسم میں اس کی کمی ہو جائے تو خرما اس کمی کو پورا کرکے قوت دفاع کو بحال کر دیتا ہے اس کے علاوہ اس میں وٹامن بی اور سی بھی تھوڑی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ وٹامن بی ہضم کی خرابی کو دور کرتا ہے اور وٹامن سی کمزور رگوں کو تقویت دیتا ہے اور ہڈیوں اور دانتوں کی بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

ان دیکھی مخلوق

ایک دور وہ تھا جب اس کرہ ارضی اور اس پر بسنے والی مخلوق ہی کو کل کائنات سمجھا جاتا تھا مگر جدید انکشافات نے بتایا ہے کہ یہ کرہ خاکی کل کائنات کے مقابلے میں ایسا ہے جیسے بحر زخار کی سطح پر ایک لہر اور صحرائے وبسیط میں ایک ذرہ' اس وسیع کائنات کی حدود کا پھیلاؤ اس میں بسنے والی دیکھی اور ان دیکھی مخلوق کا نہ شمار ہو سکتا ہے اور نہ حساب اسے اپنی گرفت میں لے سکتا ہے اگرچہ انسان نے زمین کی تہوں کو چیر کر اور فلک بوس پہاڑوں کو کھود کر مختلف دھاتوں اور پتھروں کا تجزیہ کیا ان کے گوناگوں اقسام گنوائے۔ نباتات کی قسموں کو بھی شمار کیا اور پرندوں اور چوپاؤں اور مختلف جانوروں کی قسمیں بھی گنوائیں ۔ چنانچہ نباتات کی چار لاکھ قسمیں شمار کی جا چکی ہیں جن میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور حیوانات کی کم از کم دس لاکھ قسمیں دریافت کی جا چکی ہیں مگر وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے جماد' نبات اور حیوانی کی تمام قسموں کا احاطہ کر لیا ہے کیونکہ کچھ مخلوق دیکھی جا سکتی ہے اور کچھ احاطہ بصری سے باہر ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

فلا اقسم بما تبصرون و مالا تبصرون۔

مجھے ان چیزوں کی قسم ہے جو تمہیں دکھائی دیتی ہیں اور جو تمہیں دکھائی نہیں دیتیں۔

امیرالمومنینؑ نے بھی ایک خطبہ میں غیر مرئی مخلوق کا تذکرہ فرمایا ہے:

و رب ہذہ الارض التی جعلھا قرارا للانام و مدر جاللھوام و الانعام و مالا یحصی مما یری ولا یری۔

اے اس زمین کے پروردگار جسے تو نے انسانوں کی قیام گاہ اور حشرات الارض اور چوپاؤں اور دیکھی اور ان دیکھی مخلوق کے چلنے پھرنے کا مقام قرار دیا ہے۔

اس ان دیکھی مخلوق میں وہ جراثیم بھی داخل ہیں جو ہمیشہ نظروں سے اوجھل رہنے کے بعد اب جدید آلات کے ذریعہ مشاہدے میں آچکے ہیں ان جراثیم کی دریافت سے پہلے کسی کو یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ایک جیتی جاگتی مخلوق ایسی بھی موجود ہے جو الگ سے اپنی دنیا بسائے ہوئے ہے مگر جب الیکٹرک خورد بین ایجاد ہوئی تو اس نے انسان کو اس ان دیکھی مخلوق سے روشناس کیا یہ جراثیم لمبائی میں ۵۰۰/۱ انچ سے لے کر ۴/۵۰۰۰ انچ تک ہوتے ہیں انہیں سب سے پہلے وان لیون ہوک نے جو ہالینڈ کے ایک قصبہ ڈیلف میں کپڑے کا کاروبار کرتا تھا دریافت کیا اور لوئی پاسچر اور ڈاکٹر رابرٹ نے مسلسل تجربات سے ثابت کیا کہ متعدی امراض کی تولید کا باعث یہی جراثیم ہوتے ہیں مگر مولد امراض جراثیم کی تعداد ان جراثیم سے کم ہوتی ہے جو زندگی کے لئے کار آمد اور زمین میں اجزائے حیاتیہ شامل کرکے اسے زرخیز بناتے ہیں۔ یہ جرثومے عموماً ہرشے میں ہوتے ہیں اور پانی کے ایک قطرے اور ہوا کے ایک جھونکے میں بڑی تعداد میں دوڑتے پھرتے رہتے ہیں۔ امیرالمومنینؑ نے اس دور میں کہ جب جراثیم کا کوئی تصور نہ تھا پانی اور ہوا اور ان کی موجودگی کا پتہ دیا ہے۔ چنانچہ پانی میں اور کھلی چھت پر جہاں ہوا بے روک ٹوک چلتی ہے پیشاب کرنے سے منع کرنے کے بعد فرمایا:

فان للماء اھلا و للھواء اھلا۔ (تحف العقول ص ۲۲)

اس لئے کہ پانی میں بھی مخلوق بستی ہے اور ہوا میں بھی۔

تحقیق جدید نے پیشاب کے تجزیہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس میں مختلف مواد اور نمکیات ہوتے ہیں جو ترکیبی صورت میں زہریلے اثرات کے حامل ہوتے ہیں خصوصاً یورک ایسڈ (تیزابی مادہ) اپنے اندر اتنی شدید سمیت رکھتا ہے کہ اگر اسے چھوا جائے تو زخم پڑ جائے اور کسی سنگین چیز پر ڈالا جائے تو اس میں سوراخ ہو جائے۔ جب تک پیشاب مثانہ کے اندر رہتا ہے اس کے سمی اثرات کمزور بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں اور جب جسم سے نکل کر ہوا سے مس ہوتا ہے تو سمی اثرات شدید ہو جاتے ہیں۔ یہ سمی اثرات پانی اور ہوا پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں کیوں کہ جب پانی اور ہوا میں تیزابی مادے کی آمیزش ہوگی تو ہوا کے جراثیم بھی متاثر ہوں گے اور پانی کے جراثیم بھی کیوں کہ ایسڈ (تیزاب) ہو یا الکی (سوڈا) اس میں جاندار زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس کے علاوہ اگر پانی میں کمر تک ڈوب کر پیشاب کیا جائے تو پانی کے وہ جراثیم جو ایک قطرہ میں ہزاروں کی تعداد تک ہوتے ہیں پیشاب کی نالی میں داخل ہو کر تولید

مرض کا باعث ہوں گے کیوں کہ پانی کے جراثیم کا خاصہ یہ ہے کہ وہ پانی کے بہاؤ کی مخالف سمت تیرتے ہیں۔

علم نفسیات

انسان کے خارجی اعمال اس کی باطنی کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں اور اس کے شعور یا لاشعور میں پوشیدہ میلانات اس کی زبان کے قلموں چشم و ابرو کے اشاروں اور ہاتھ پیر کی حرکتوں سے ظاہر ہو جاتے ہیں انہی افعال و اعمال کے حرکات و سکنات سے ذہنی کیفیت کے پرکھنے کا نام علم نفسیات ہے۔ یہ نفسیاتی حقائق تجربات سے حاصل کئے جاتے ہیں اور انسان اپنے ذہن اور اس کی کیفیات کو سامنے رکھ کر دوسروں کی ذہنی کیفیت پر حکم لگاتا اور ان کے افعال و حرکات سے ان کی اندرونی حالت کا جائزہ لیتا ہے چنانچہ ایک مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ خوش و خرم ہے اور ایک پژمردہ چہرے کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ کسی ذہنی تشویش میں مبتلا ہے۔ امیرالمومنینؑ کا ارشاد ہے:

ما اضمرا حدیثا" الا ظهر فی فلتات لسانه و صفحات وجهه

جب کسی نے کوئی بات دل میں چھپا کر رکھنا چاہی تو وہ اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اور چہرے کے آثار سے نمایاں ہو جاتی ہے۔

امیرالمومنینؑ کے زمانہ میں اگرچہ علم نفسیات رسمی طور پر مدون نہ ہوا تھا مگر آپ اس میں بصیرت نامہ رکھتے تھے۔ اور انسان کے حرکات و سکنات سے اس کے مخفی جذبات و عواطف کی تہ تک پہنچ جایا کرتے تھے۔ علامہ عقاد تحریر کرتے ہیں۔

کان یفهم اخلاق الناس فهم العالم المراقب لخفایا الصدور و یشرحها فی عظاته و خطباته شرح الادیب اللبیب۔

العبقریات ص ۸۵۶

حضرت علیؑ ایک عالم و بالغ نظر کی طرح لوگوں کے اخلاق و عادات کو سمجھتے تھے اور ان کے سینوں میں چھپے ہوئے جذبات ان کے سامنے آئینہ تھے۔ جن پر اپنے خطبات و مواعظ میں روشنی ڈالتے تھے۔

اس سلسلہ میں چند واقعات درج کئے جاتے ہیں جس سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ آپ کس سرعت ذہنی کے ساتھ اصل حقیقت کو بھانپ لیا کرتے تھے۔

ایک شخص اپنے غلام کو ساتھ لے کر سفرحج پر روانہ ہوا راستے میں غلام نے کوئی نا زیبا حرکت کی جس پر مالک نے اسے سزا دی وہ غلام طیش میں آگیا اور مالک سے کہنے لگا کہ میں تیرا غلام نہیں ہوں بلکہ تو میرا غلام ہے۔ اس پر

دونوں میں تکرار شروع ہو گئی اور وہ لڑتے جھگڑتے کوفہ میں امیرالمومنینؑ کے پاس آئے اور یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کیا آپ نے فرمایا کہ تم واپس جاؤ اور آپس میں تصفیہ کرنے کی کوشش کرو۔ اگر تصفیہ نہ کر سکو تو کل میرے پاس آنا۔ ان کے جانے کے بعد حضرت نے قنبر سے فرمایا کہ دیوار میں دو سوراخ اتنے بڑے کر دو کہ ہر سوراخ میں ایک سر باسانی آسکے۔ دوسرے دن وہ لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کو جھٹلاتے ہوئے آئے اور کہا کہ ہم آپس میں کوئی تصفیہ نہیں کر سکے۔ حضرتؑ نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنے سر ان سوراخوں کے اندر داخل کریں۔ جب انہوں نے اپنے سر اندر داخل کئے تو قنبر سے کہا کہ میری تلوار لاؤ تاکہ میں اس غلام کی گردن اڑا دوں کیوں کہ اس نے آقا ہونے کا غلط دعویٰ کیا ہے۔ حضرت یہ سمجھتے تھے کہ ان میں سے جو غلام ہو گا وہ نفسیاتی طور پر مطمئن نہ ہو گا اس لئے وہ حکم قتل سنتے ہی سر باہر نکال لے گا چنانچہ یہی ہوا اور غلام نے فوراً سر باہر نکال لیا اور مالک بدستور اپنا سر سوراخ میں رکھے رہا۔ حضرتؑ نے اس غلام سے کہا کہ تو تو یہ کہتا تھا کہ میں مالک ہوں پھر تو نے جلدی سے سر باہر کیوں نکالا۔ جب اسے کوئی جواب نہ سوجھا تو اس نے غلامی کا اعتراف کر لیا اور حضرت نے اسے مالک کے حوالے کر دیا۔

ایک بچہ جو ابھی گھٹنوں چلنے پایا تھا چھت پر کھیلتے ہوئے پرنالے میں سے نیچے جھانکنے لگا۔ ماں نے اس خیال سے کہ اگر بچے کو پیچھے ہٹانے کے لئے آگے بڑھی تو بچہ بھی آگے بڑھے گا اور زمین پر گر کر ہلاک ہو جائے گا اس نے چند آدمیوں کو مدد کے لئے بلایا انہوں نے باہر کی جانب زینہ لگایا مگر پرنالے کی بلندی تک نہ پہنچ سکے۔ وہ کوئی تدبیر سوچ ہی رہے تھے کہ امیرالمومنینؑ ادھر تشریف لے آئے۔ آپ نے یہ صورت دیکھی تو اسی سن و سال کا ایک بچہ طلب کیا اور اسے چھت پر لے جا کر اس بچے کے سامنے بٹھا دیا۔ جب اس نے اپنے ہم سن بچے کو دیکھا تو فوراً پرنالے سے باہر نکل آیا اور اس کی طرف لپکا اور اس طرح موت کے منہ سے بچ نکلا۔ حضرت نے بچے کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ وہ اپنے ہم عمر بچوں سے مانوس ہوتا ہے اور ان کی طرف بڑھتا ہے۔ اسی کی عمر کے بچے کو اس کے سامنے رکھ کر اسے ہلاکت سے بچا لیا۔

حضرت عمر کے دور حکومت میں دو عورتیں ایک بچے کو لے کر دربار خلافت میں آئیں اور ان میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ تھا کہ یہ بچہ اس کا ہے مگر کسی کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ حضرت عمر کوئی فیصلہ نہ کر سکے اور امیرالمومنینؑ کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا جب وہ دونوں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ نے انہیں سمجھایا بجھایا اور آخر میں انہیں ڈرایا دھمکایا مگر ان میں سے کوئی بھی اپنے دعویٰ سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوئی۔ جب سمجھانے بجھانے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو آپ نے حکم دیا کہ ایک آری لائی جائے۔ ان عورتوں نے پوچھا کہ آری کا کیا ہو گا۔ فرمایا کہ میں اس بچے کے دو ٹکڑے کروں گا اور تم دونوں میں آدھا آدھا تقسیم کر دوں گا۔ ان میں سے ایک تو چپ رہی اور دوسری نے چیخ کر کہا کہ یا امیرالمومنینؑ میں اپنے دعویٰ سے دست بردار ہوتی ہوں یہ بچہ اس کے حوالہ کر دیجئے۔

حضرتؓ نے یہ سنا تو فرمایا کہ یہ بچہ تمہارا ہی ہے اگر اس کا بچہ ہوتا تو یہ چپ نہ رہتی بلکہ اس کا دل بھی تڑپتا اور ماتا کا تقاضا ایسا کرنے سے مانع ہوتا۔ حضرتؓ نے ایک ماں کی نفسیات کو سمجھ لیا تھا وہ یہ گوارا کرے گی کہ بچہ دوسرے کو مل جائے مگر یہ گوارا نہ کرے گی کہ اس کے دو ٹکڑے کئے جائیں۔ چنانچہ آپ نے یہی نفسیاتی طریقہ اختیار کیا جس سے صحیح اور غلط دعویٰ کا فوراً پتہ چل گیا۔

حضرت عمر کے سامنے ایک عورت کو پیش کیا گیا جو زنا کی مرتکب ہوئی تھی۔ حضرت عمر نے اس سے پوچھا تو اس نے بے جھجک اس کا اقرار کیا۔ حضرت علیؓ اس موقع پر موجود تھے۔ آپؓ نے فرمایا کہ یہ اس طرح بابنگ دہل اقرار کر رہی ہے جیسے اسے معلوم ہی نہیں ہے کہ زنا حرام ہے اور اس کی سخت سزا ہے لہٰذا اس لا علمی کی بنا پر اس پر حد جاری نہیں ہو سکتی۔ حضرت نے جب اس کو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اقرار کرتے ہوئے دیکھا تو نفسیاتی حیثیت سے فوراً سمجھ گئے کہ یہ زنا کی حرمت سے بے خبر ہے ورنہ اس طرح کھل کر اقرار نہ کرتی ابن قیم نے اس واقعہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ:

ھذا من دقیق الفراسة۔ یہ انتہائی دور رس فراست کا فیصلہ ہے۔

(الطرق الحکمیہ ص ۵۵)

اس قسم کا ایک واقعہ سلطان محمود شاہ بہمنی کے عہد حکومت میں بھی پیش آیا۔ چنانچہ صاحب تاریخ فرشتہ نے لکھا ہے کہ ایک عورت کو زنا کے جرم میں گرفتار کر کے عدالت میں لایا گیا۔ جب اس سے دریافت کیا گیا تو اس نے کہا میں یہ سمجھی تھی کہ جس طرح ایک مرد چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے اسی طرح عورت کو بھی یہ حق ہے کہ وہ چار مردوں سے تعلق رکھے مگر مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ یہ بات شرعاً ناجائز ہے لہٰذا میں آئندہ اس کی مرتکب نہیں ہوں گی۔ اس عذر لا علمی کی بنا پر قانون اسے اپنی گرفت میں نہ لا سکا اور اسے چھوڑ دیا گیا۔

ایک شخص نے حضرت عمر سے اپنی ماں کی شکایت کی کہ وہ ماں ہونے سے انکاری ہے۔ حضرت عمر نے اس سے پوچھا کہ تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے جس سے تم یہ ثابت کر سکو کہ وہ تمہاری ماں ہے اس نے کہا کہ میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور جب اس عورت سے دریافت کیا تو اس نے کئی گواہ پیش کئے کہ اس کی شادی ہی نہیں ہوئی کہ اس کے ماں بننے کا سوال پیدا ہو۔ حضرت عمر نے حکم دیا کہ اس نوجوان کو زیر حراست رکھا جائے تاکہ اسے افتراء پردازی کی سزا دی جا سکے۔ جب اسے زنداں کی طرف لے چلے تو امیرالمومنینؓ نے دیکھ کر دریافت کیا کہ اس کا جرم کیا ہے۔ جب اس نے واقعہ بیان کیا تو آپ نے اس عورت کو بلا کر پوچھا کہ کیا یہ تمہارا بیٹا نہیں ہے، کہا کہ یہ میرا بیٹا نہیں ہے۔ حضرت نے اس نوجوان سے کہا کہ تم بھی اس کے ماں ہونے سے انکار کر دو۔ اس نے کہا کہ یا ابوالحسنؓ یہ میری ماں ہے میں کیسے انکار کر دوں فرمایا کہ تم زبان سے کہہ دو کہ یہ میری ماں نہیں ہے۔ اس نے کہہ

دیا کہ یہ میری ماں نہیں اور میں اس کا بیٹا نہیں اس کے بعد حضرت نے اس عورت کے بھائیوں سے کہا کہ تم اس عورت کی ترویج کا مجھے اختیار دیتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ آپ مختار ہیں جو چاہیں کریں اور اس عورت نے بھی اپنی رضا مندی کا اظہار کیا۔ حضرتؑ نے قنبر سے فرمایا کہ فلاں جگہ پر کچھ درہم رکھے ہیں وہ لے آؤ۔ جب قنبر درہم لائے تو آپؑ نے وہ درہم اس عورت کو دیے اور اس مجمع کو گواہ کرکے فرمایا کہ میں اس مہر پر اس کا عقد اس نوجوان سے کرتا ہوں۔ اس عورت نے یہ سنا تو چیخ کر کہا کہ :

یا ابا الحسن انه و الله ابنی۔ اے ابوالحسنؑ خدا کی قسم یہ میرا بیٹا ہے۔

اس کا باپ عجمی تھا۔ میرے بھائیوں نے اس سے میرا نکاح کر دیا تھا۔ اس بچے کی ولادت کے موقع پر اس کا باپ ایک جنگ میں مارا جا چکا تھا۔ میں نے اسے ایک دوسرے قبیلہ میں بھیج دیا جہاں اس نے پرورش پائی۔ اب میرے بھائی مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میں اس کے بیٹا ہونے سے انکار کر دوں چنانچہ میں انکار کرتی رہی مگر اب صورت ایسی ہے کہ مجھے اعتراف حقیقت کی سوا چارہ نہیں ہے۔

امیرالمومنینؑ عورت کی اس فطرت کو سمجھتے تھے کہ وہ اپنی اولاد کے اولاد ہونے سے کسی دباؤ یا مصلحت کی بنا پر انکار تو کر سکتی ہے مگر اس ترویج پر کسی صورت میں آمادہ نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ آپ نے وہی طریق کار اختیار کیا جو اس کی فطرت کو جھنجھوڑ کر اسی امرواقع کے اعتراف پر مجبور کر دیا۔

علم الحساب

ابتدائی دور میں جب چیزوں کے شمار کی ضرورت محسوس کی گئی تو ہاتھ کی انگلیوں سے مدد لی جاتی تھی اور چوں کہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں دس ہیں اس لئے گنتی کی بنیاد دس پر رکھی گئی اور جب اس سے حساب و شمار کی ضرورت پوری نہ ہو سکی تو انگلیوں کی پوروں سے گنتی کا کام لیا جانے لگا۔ ان پوروں کی تعداد اٹھائس ہے جن سے ایک ہزار تک کی گنتی پوری کی جاتی تھی۔ جیسے حروف تہجی ابجد ہوز وغیرہ سے جو تعداد میں اٹھائیس ہیں ایک ہزار تک کی گنتی کی جاتی ہے۔ ان پوروں پر شمار کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ داہنے ہاتھ کی چھنگلیاں کی پہلی پور پر ایک دوسری پور پر دو، تیسری پور پر تین اسی طرح شمار کرتے ہوئے انگشت شہادت کی پہلی پور پر دس تک کی گنتی پوری ہو جاتی ہے پھر انگشت شہادت کی دوسری پور پر بیس، تیسری پور پر تیس، انگھوٹے کی پہلی پر چالیس اور آخری پور پر پچاس شمار کئے جاتے پھر بائیں ہاتھ کی پہلی پور پر ساٹھ، دوسری پور پر ستر، تیسری پور پر اسی، چوتھی پور پر نوے اور پانچویں پور پر سو تک کی گنتی ختم ہوتی ہے، پھر چھٹی پور پر دو سو، ساتویں پور پر تین سو اور اسی طرح آخری پور پر ہزار تک کی گنتی تمام ہو

جاتی ہے۔ اس طریقہ شمار سے ایک ہزار تک کی گنتی کا کام تو نکل آتا تھا مگر طویل گنتی کے لئے یہ طریقہ ناکافی تھا۔ اس کے علاوہ عکائیوں، دھائیوں اور سینکڑوں کو الگ الگ بتانا پڑتا تھا۔ اس دشواری کو دیکھتے ہوئے مصریوں نے تصویروں کے ذریعہ تحریر اعداد کی بنیاد ڈالی اور ایطالیہ والوں نے عددوں کو حرفوں کی صورت میں ظاہر کیا۔

عرب میں پہلی صدی ہجری کے اواخر میں ہندسوں کو حروف تہجی لکھنے کا رواج ہوا جو یونان میں پہلے سے رائج تھا اس طرح کہ جہاں ایک لکھنا ہوتا وہاں ا (الف) جہاں دو لکھنا ہوتا وہاں ب اور جہاں تین لکھنا ہوتا وہاں ج لکھ دیتے اور اسی طرح غ تک گنتی کو اختتام تک پہنچاتے۔ یہ طریقہ عرصہ تک مرسوم رہا اور اب بھی کہیں کہیں عددوں کے بجائے حروف لکھ دیئے جاتے ہیں مگر عموماً عددوں کو ہندسوں کی صورت میں ہی لکھا جاتا ہے۔ جو آریہ قوم کی ایجاد ہے۔

عربوں کا علم حساب گنتی تک محدود تھا اور ان میں سے بھی بعض سو سے اوپر کی گنتی سے ناآشنا تھے۔ چنانچہ ابن طقطقی نے تاریخ فخری میں لکھا ہے کہ جب لشکر اسلام عجمیوں سے بر سرپیکار تھا تو ایک عرب کے ہاتھ ایک گلوبند لگا جس کی قدر و قیمت سے وہ ناواقف تھا ایک عجمی نے وہ ہار دیکھا تو اس سے پوچھا کہ اسے فروخت کرو گے اس نے کہا کہ ہاں جب قیمت دریافت کی تو اس عرب نے ایک سو رائج الوقت سکہ مانگا اس نے فوراً وہ رقم نکال کر دے دی اور ہار لے لیا۔ جب وہ سو روپیہ لے کر خوش خوش اپنے ساتھیوں کے پاس آیا اور واقعہ بیان کیا تو اس کے ساتھیوں نے کہا کہ تم نے سو سے زیادہ کیوں نہ مانگے۔ اگر تم زیادہ مانگتے تو وہ زیادہ دے دیتا۔ کہا کہ کیا سو سے اوپر بھی گنتی ہوتی ہے۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو سو سے زائد مانگتا۔

ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے کہ ابوہریرہ دوسی، ابو موسیٰ اشعری کے ہاں سے آٹھ لاکھ درہم لائے۔ حضرت عمر نے پوچھا کہ کتنی رقم لائے کہا آٹھ لاکھ۔ حضرت عمر نے بار بار اس رقم کو دہرایا اور پوچھا کہ کتنے آٹھ سو ہوں تو یہ رقم بنتی ہے ابوہریرہ نے سو ہزار کو آٹھ مرتبہ دہرایا کہ آٹھ لاکھ کا مفہوم سمجھایا۔ حضرت عمرؓ اس تفصیل سے سمجھے کہ بڑی کثیر رقم ہے۔ اسی حساب و کتاب کے لئے حضرت عمر کو ایک حساب داں کی ضرورت محسوس ہوئی اور انہوں نے والی شام کو لکھ کر روم کے ایک عیسائی کو مدینہ میں طلب کیا جو میراث کے مقررہ حصص کی تقسیم کر سکے۔ اسی طرح معاویہ نے بھی حساب کے نظم و انضباط کے لئے دفتر خراج کا افسر اعلیٰ ایک رومی عیسائی سرجون کو مقرر کر رکھا تھا۔

ان چند شواہد سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس دور میں علم حساب جس کے جاننے والے معدودے چند افراد تھے ابتدائی مراحل میں تھا اور تدریجی ترقی کرکے موجودہ مقام تک پہنچا ہے۔ اس وقت حساب کی باریکیوں کو سمجھنا اور انہیں حل کرنا آسان کام نہ تھا مگر امیرالمومنینؑ سے جو حسابی حل وارد ہوئے ہیں وہ اس امر کا روشن ثبوت ہیں کہ آپؑ اس علم میں حیرت انگیز حد تک دستگاہ رکھتے تھے بلکہ اس زمانہ پر نظر کرتے ہوئے آپؑ کی یہ فنی مہارت ایک معجزہ سے کم

نہ تھی۔ ملا عصمۃ اللہ سہارنپوری تحریر کرتے ہیں:

کان علی فارھا فی علم الحساب غایة الفراهة ولذا قیل انه کان معجزة من معجزات نبوة نبینا۔

حضرت علیؑ علم حساب میں انتہائی درجہ تک مہارت رکھتے تھے اسی لئے کہا گیا ہے کہ وہ ہمارے نبی کی نبوت کے معجزات میں سے ایک معجزہ تھے۔

(شرح خلاصۃ الحساب)

ذیل میں چند واقعات درج کئے جاتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ آپ کا ذہن رسا حسابی گتھیوں کو کس آسانی سے سلجھا لیتا تھا۔

ایک یہودی نے حضرت سے دریافت کیا کہ وہ کونسا عدد ہے جس سے کسور تسعہ بغیر کسر کے نکل آئیں۔ فرمایا کہ ہفتہ کے دنوں کو سال کے دنوں میں ضرب دو تمہارا عدد مطلوب حاصل ہو جائے گا چنانچہ ۷ کو ۳۶۰ میں ضرب دی جائے تو حاصل ضرب ۲۵۲۰ ہوگا۔ یہ عدد دو پر تقسیم ہوگا کیونکہ یہ عدد زوج ہے اور تین پر بھی تقسیم ہوگا کیونکہ ۲۵۲۰ کا مجموعہ نو ہوتا ہے۔ اور نو تین پر قابل تقسیم ہو جاتا ہے لہٰذا عدد مذکور بھی چار پر تقسیم ہو جائے گا۔ اور پانچ پر بھی تقسیم ہوگا کیونکہ یہ عدد صفر پر ختم ہوتا ہے اور صفر پر ختم ہونے والا عدد سات کو تین سو ساٹھ میں ضرب دینے سے حاصل ہوا ہے لہٰذا یہ سات پر بھی تقسیم ہوگا اور جب اس عدد کے سمت راست کے تین ہندسے (۵۲۰) آٹھ پر تقسیم ہو جاتے ہیں، تو یہ عدد بھی آٹھ پر قابل تقسیم ہوگا اور چونکہ اس عدد کے ہندسوں کا مجموعہ ۹ ہے اور جس کا مجموعہ ۹ ہو وہ ۹ پر تقسیم ہو جاتا ہے لہٰذا یہ عدد بھی نو پر تقسیم ہوگا اور چونکہ یہ عدد صفر پر ختم ہوتا ہے لہٰذا دس پر بھی تقسیم ہوگا۔

ایک یہودی نے آپ سے دریافت کیا کہ وہ کون سا عدد ہے جو دو سے لے کر دس تک ہر عدد پر تقسیم ہو جاتا ہے اور اس عدد کا خارج قسمت بھی دو سے لے کر دس تک ہر عدد پر قابل تقسیم ہے مگر اس کا ۱/۸ چار پر ۱/۴ آٹھ پر اور ۱/۷ سات پر اور ۱/۹ نو پر اور ۱/۸ آٹھ پر تقسیم نہیں ہوتا۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر میں یہ عدد بتادوں تو تم اسلام قبول کر لوگے کہا کہ ہاں میں مسلمان ہو جاؤں گا فرمایا کہ تم ہفتہ کے دنوں کو مہینہ کے دنوں میں ضرب دو اور حاصل ضرب کو سال کے دنوں میں ضرب دو تمہیں عدد مطلوبہ مل جائے گا۔ چنانچہ ہفتہ کے سات دنوں کو مہینہ کے تیس دنوں میں ضرب دیا جائے تو حاصل ضرب ۲۱۰ ہوگا اور ۲۱۰ کو سال کے دنوں ۳۶۰ میں ضرب دیا جائے تو حاصل ضرب ۷۵۶۰۰ ہوگا اور اس سے کسور تسعہ نکل آئیں گے لیکن اس کا ۱/۸ یعنی ۹۴۵۰ چار پر تقسیم نہیں ہوگا اور ۱/۴ یعنی ۱۸۹۰۰ آٹھ پر تقسیم نہیں ہوگا اور ۱/۷ یعنی ۱۰۸۰۰ سات پر تقسیم نہیں ہوگا اور ۱/۹ یعنی ۸۴۰۰ نو پر تقسیم نہیں ہوگا اور ۱/۸ یعنی ۹۴۵۰ آٹھ پر تقسیم نہیں ہوگا۔

دو اعرابی جن میں سے ایک کے پاس تین اور دوسرے کے پاس پانچ روٹیاں تھیں۔ ایک ساتھ کھانے کے لئے بیٹھے۔ اتنے میں ایک شخص آیا جسے انہوں نے کھانے میں شریک کر لیا۔ جب کھا چکے تو اس شخص نے ان دونوں کو آٹھ درہم دیے جو ان روٹیوں کا معاوضہ تھا جو اس نے کھائی تھیں۔ جب وہ چلا گیا تو پانچ روٹیوں والے نے کہا کہ میں پانچ درہم لوں گا اور تین روٹیوں والے نے کہا کہ اس نے ہم دونوں کو یہ درہم دیے ہیں لہٰذا چار تم لو اور چار مجھے دو جب آپس میں کوئی فیصلہ نہ کر سکے تو تصفیہ کے لئے حضرت کے پاس آئے۔ آپ نے تین روٹیوں والے سے کہا کہ تمہارا ساتھی تمہیں جو دیتا ہے وہ لے لو یہ تمہارے حق سے زیادہ ہے کیونکہ تمہارا حق صرف ایک درہم بنتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ کیسے۔ فرمایا کہ روٹیاں آٹھ تھیں اور کھانے والے تین تھے لہٰذا ہر روٹی کے تین ٹکڑے قرار دے کر انہیں آٹھ میں ضرب دو۔ یہ کل چوبیس ٹکڑے ہوئے۔ ان چوبیس ٹکڑوں میں سے ہر ایک کے حصہ میں آٹھ آٹھ ٹکڑے آئے۔ تمہاری تین روٹیوں کے نو ٹکڑے ہوئے جن میں سے آٹھ تم نے خود کھائے اور ایک اس تیسرے آدمی نے اور تمہارے ساتھی کی پانچ روٹیوں کے پندرہ ٹکڑے ہوئے جن میں سے آٹھ اس نے کھائے اور سات تیسرے شخص نے لہٰذا ایک ٹکڑے کے عوض ایک درہم تمہارا ہوا اور سات ٹکڑوں کے عوض سات درہم تمہارے ساتھی کے ہوئے۔ اس نے کہا یا امیرالمومنین آپ کا فیصلہ صحیح ہے' میں ایک درہم پر راضی ہوں۔

اسی طرح کا ایک واقعہ سلطان آلپ ارسلان کو پیش آیا اس نے حلب سے پانچ سو من سنگ رخام اصفہان بھیجنا چاہا۔ دو شتربان اونٹوں پر بوجھ لاد کر اصفہان جا رہے تھے۔ سلطان نے یہ پتھر بھی انہیں لاد لینے کے لئے کہا۔ ان میں سے ایک کے چھ اونٹ تھے اور دوسرے کے چار اور ان دونوں نے پانچ پانچ سو من بوجھ پہلے سے اپنے اونٹوں پر لاد رکھا تھا۔ انہوں نے یہ پتھر بھی اس طرح لاد لیا کہ ہر اونٹ کا بوجھ برابر ہوگیا۔ جب اصفہان پہنچے تو سلطان نے ان دونوں کو ایک ہزار دینار دینے کا حکم دیا۔ اس کے وزیر نظام الملک طوسی نے چھ اونٹوں والے کو چھ سو اور چار اونٹوں والے کو چار سو دینار دیے۔ حسن ابن صباح ان ایام میں وہیں موجود تھا اس نے کہا کہ یہ تقسیم صحیح نہیں ہے۔ چھ اونٹوں والے کو آٹھ سو دینار اور چار اونٹوں والے کو دو سو دینار دینا چاہئیں۔ یہ بات سلطان کے کانوں تک پہنچی تو اس نے حسن ابن صباح کو بلا کر پوچھا کہ تم نے یہ فیصلہ کس بنا پر کیا ہے۔ اس نے کہا کہ ان دونوں کے اونٹوں پر ایک ہزار من بار پہلے سے لدا ہوا تھا اور پانچ سو من پتھر لادا گیا۔ یہ کل وزن پندرہ سو من ہوا اور اونٹ دس تھے لہٰذا ہر اونٹ پر ڈیڑھ سو من بوجھ ہوگا۔ چار اونٹوں والے کو اونٹوں پر چھ سو من بوجھ ہوا' پانچ سو من پہلا بوجھ اور ایک سو من پتھر اور چھ اونٹوں والے کے اونٹوں پر نو سو من ہوا پانچ سو من پہلا بوجھ اور چار سو من پتھر جب پانچ سو من پر ایک ہزار دینار دیئے گئے ہیں تو جس نے ایک سو من لادا اسے دو سو اور جس نے چار سو من لادا اسے آٹھ سو دینار دینا چاہئیں۔ سلطان نے اس فیصلہ کو سراہا اور اسے صحیح قرار دیا۔ اس فیصلے کو حسن ابن صباح کی ذہانت و فراست کا

نتیجہ قرار دینا چاہئے کیونکہ امیرالمومنینؑ اسی نوعیت کا فیصلہ روٹیوں کے بارے میں فرما چکے تھے جو اپنی شہرت کی بنا پر یقیناً" حسن ابن صباح کے کانوں تک پہنچا ہوگا اور حضرت کے فیصلہ ہی سے اس کا ذہن اس فیصلہ کی طرف منتقل ہوگا فرق یہ ہے کہ امیرالمومنینؑ کا فیصلہ ایک اور سات کے تناسب سے تھا اور یہ فیصلہ ایک اور چار کے تناسب سے ہے۔

حضرتؑ کے پاس تین شخص آئے اور کہا کہ ہمارے پاس سترہ اونٹ ہیں ہم میں سے ایک کا نصف دوسرے کا ایک تہائی اور تیسرے کا نواں حصہ ہے ہم ان کی تقسیم سے قاصر ہیں لہٰذا حصہ رسدی ہم میں تقسیم کر دیجئے مگر قطع و برید کی نوبت نہ آئے۔ آپ نے ان اونٹوں میں ایک اونٹ اور شامل کرکے اٹھارہ اونٹ کر لئے اور نصف کے حصہ دار کو نو ایک تہائی کے حصہ دار کو چھ اور نویں حصہ کے حصہ دار کو دو اونٹ دیے اور اس طرح سترہ اونٹ ان میں تقسیم کر دیئے اور اٹھارواں اونٹ الگ کر لیا۔

یہ تقسیم بظاہر شرکاء کے اصل حصص کے مطابق نہیں ہے اس لئے کہ جسے نو اونٹ ملے ہیں اس کا حصہ ساڑھے آٹھ ہے اور جسے چھ اونٹ ملے ہیں اس کا حصہ پونے چھ ہے اور جسے دو اونٹ ملے ہیں اس کا حصہ ۸/۹ ہے ان حصص کی مجموعی تعداد ۱۶/۱۸ ہوتی ہے اور سترہ اونٹوں میں سے ۱۷/۱۸ حصص بچ رہتے ہیں۔ اگر انہیں بھی شرکاء کے بقدر حصص تقسیم کیا جائے تو ایک اونٹ کو نحر کرنا پڑتا ہے اور شرکاء یہ نہیں چاہتے تھے۔ اگر اونٹوں کو مذکورہ بالا طریق پر تقسیم نہ کیا جائے بلکہ تناسب حصص کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے تو یہ ایرا دوارد نہیں ہوتا۔ تقسیم تناسب کا طریقہ یہ ہوگا کہ پہلے کل حصہ داروں کے حصص کو جمع کیا جائے۔ یہ حصص تین ہیں ۱/۲، ۱/۳ اور ۱/۹ ان تینوں کا حاصل جمع ۱۷/۱۸ ہوگا پھر پہلے کل حصہ داروں کے حصص کو جمع کیا جائے۔ یہ حصص تین ہیں ۱/۲، ۱/۳ اور ۱/۹ ان تینوں کا حاصل جمع ۱۷/۲ ہوگا ۱/۳ کا حاصل ضرب ۱۷/۳ ہوگا اور ۱/۹ کا حاصل ضرب ۱۷/۹ ہوگا پھر ہر ایک کے حاصل ضرب کو کل حصہ داروں کے حاصل جمع پر تقسیم کردیا جائے تو ۱/۲ کے حصہ دار کو نو اور ۱/۳ کے حصہ دار کو چھ اور ۹/۱ کے حصہ دار دو اونٹ ملیں گے اور اس طرح سترہ اونٹ پورے تقسیم ہو جائیں گے اور باقی کچھ نہ بچے گا۔ حضرت نے اسی قاعدہ تناسب سے ان کے حصص نکالے ہیں مگر چونکہ اس وقت لوگ اس اصول تقسیم سے نا آشنا تھے۔ اس لئے آپ نے اٹھارواں اونٹ شامل کر کے تقسیم کی تاکہ ان کے حصص باآسانی ان کے ذہن نشین ہو جائیں۔

یہ روایت اس طرح بھی ہے کہ تین شخص حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ہمارے پاس انیس اونٹ ہیں ہم میں سے ایک کا نصف دوسرے کا ایک چوتھائی اور تیسرے کا پانچواں حصہ ہے انہیں بغیر قطع و برید کے ہم میں تقسیم کر دیجئے۔ حضرت نے حکم دیا کہ بیت المال میں سے ایک اونٹ لا کر ان اونٹوں میں شامل کر دیا جائے جب اونٹ بیس ہوگئے تو آپ نے نصف کے حصہ دار کو دس چوتھے حصہ کے حقدار کو پانچ اور پانچویں حصہ کے حقدار چار اونٹ دلائے۔ اس طرح انیس اونٹ ان میں تقسیم کر کے بیسواں اونٹ بیت المال میں واپس بھیج دیا۔

یہ تقسیم بھی سابقہ تقسیم کے مانند قاعدہ تناسب پر مبنی ہے اور اس کا طریقہ تقسیم بھی وہ ہی ہے جو سابقہ تقسیم میں تحریر ہوا ہے۔ حضرت نے جس طرح سترہ یا انیس اونٹوں کو ان کے شرکاء میں تقسیم کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ نسبتوں کے اختصار اور تقسیم بہ اجزائے تناسبہ پر کامل دسترس رکھتے تھے اور یہ دیکھتے ہوئے آپ نے یہ فیصلہ اس دور میں کیا جب عرب حساب کے مبادیات سے بھی نا آشنا تھے تو آپ کے اس فیصلہ کو سرچشمہ الہام سے سیرابی ہی کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

علم ہیئت

انسان نے جب سے اس کرہ خاک پر قدم رکھے وہ سورج کے طلوع و غروب' چاند کے گھٹاؤ بڑھاؤ اور ستاروں کی سیر و حرکت کے مناظر دیکھتا چلا آیا ہے۔ ان مناظر کی زیبائی و دلکشی نے اس کی متجسس نگاہوں کو اپنی طرف جذب کیا اور اس نے ان اجرام ارضیہ و فلکیہ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس تحقیقی مشاہدہ کے نتیجہ میں علم ہیئت وجود میں آیا جس میں اجرام سماویہ کے مقادیر و حرکات اور ان کے طبعی خواص و آثار سے بحث کی جاتی ہے۔ یہ علم تاریخی لحاظ سے قدیم ترین علوم میں شمار ہوتا ہے چنانچہ چینیوں کا دعویٰ ہے کہ طوفان نوح سے ایک سو برس پہلے ان کے ہاں رصدگاہیں تعمیر ہو چکی تھیں اور کلدانیوں میں بھی جو چار ہزار برس پیشتر ہو گزرے ہیں۔ ستارہ بینی کا شغف پایا جاتا تھا۔ انہوں نے سیاروں کو نظر غائر سے دیکھا ان کی گردش کا مشاہدہ کیا اور چاند کی منزلیں مقرر کیں۔ قدیم مصریوں سے یونانیوں نے یہ علم سیکھا اور اس کی ترقی و ترویج کے لئے درس گاہیں تشکیل دیں۔ چنانچہ فیثاغورث نے جو ۵۰۰ قبل مسیح یونان میں علم ہیئت کا مشہور معلم ہو گزرا ہے کرتونا میں ہیئت کی تعلیم و تدریس کے لئے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد بطلیموس قلوذی نے جو تقریباً" ۱۴۰ قبل مسیح متولد ہوا۔ سکندریہ میں ایک مدرسہ قائم کیا اور شاہ یونان کے لئے اپنی مشہور کتاب مجسطی تصنیف کی جس کی نظریات صدیوں تک ذہنوں پر چھائے رہے۔ یہ نظریات ہیئت بطلیموسی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ عباسین کے دور میں جو علوم یونانی زبان سے عربی زبان میں منتقل ہوئے ان میں ایک ہیئت بطلیوسی ہے۔

جب یحییٰ ابن خالد برمکی متوفی ۱۹۱ھ کے حکم سے ابو حسان اور مسلم نے مجسطی کے ترجمے کئے تو ان تراجم کی بدولت عربوں کی ہیئت قدیم سے واقفیت حاصل کی اور بغداد قاہرہ اور اندلس میں اس کی تعلیم و تدریس کے لئے مدارس کھول دیئے گئے یہ قدیم نظریات تک حرف آخر سمجھے جاتے رہے اور آنکھ بند کرکے ان پر اعتماد کیا جاتا رہا۔ آخر سولھویں صدی مسیحی میں ہیئت قدیم کے نقوش دھندلے پڑ گئے اور ہیئت بطلیموسی کی جگہ ہیئت نیرٔ کا پرنیکی سے پر پرزے نکالے۔

امیرالمومنینؑ نے قدرت کی عجائب آفرینی کے سلسلہ میں جو زمین و آسمان کی خلقت آفتاب و مہتاب کی جگمگاہٹ اور ستاروں کی نقل و حرکت کو تذکرہ کیا ہے اس سے جہاں قانون قدرت و مظاہر فطرت کی نقاب کشائی ہوتی ہے وہاں علم ہیئت کا بھی استفادہ ہوتا ہے اور آپ کے پیش کردہ نظریات ان انکشافات سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں جو صدیوں کے مشاہدات اور فلک پیما آلات کے مرہون منت ہیں حالانکہ اس وقت نہ دور بینیں تھیں اور نہ رصد گاہیں' نہ لیبارٹریاں تھیں نہ تجربہ گاہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آپ نہ قدیم ہیئت دانوں کے نظریات سے متاثر تھے اور نہ ان کے خوشہ چین بلکہ یہ علم موہبی کا کرشمہ تھا جس کی روشنی میں کائنات کی حقیقتوں پر نظر رکھتے تھے ذیل میں ارضی و سماوی اجرام کے بارے میں آپ کے چند نظریات درج کئے جاتے ہیں۔

حرکت زمین

قدیم ہیئت دانوں کا زمین کے متعلق یہ نظریہ تھا کہ وہ کائنات کے مرکز پر واقع ہے اور تمام فلکی اجسام سورج' چاند' ستارے اور سیارے اس کے گرد گردش کرتے ہیں لہٰذا اس مرکزیت کی بنا پر اس کیلئے ٹھہراؤ ضروری ہے کیونکہ جب دائرہ گھومتا ہے تو مرکز اپنے مقام پر ساکن و برقرار رہتا ہے اگرچہ اس دور میں اس کے خلاف بھی آوازیں اٹھیں۔ چنانچہ ۵۰۰ قبل مسیح فیثا غورث نے حرکت زمین کا نظریہ پیش کیا اور اس کے دو سو برس بعد استرخوس نے سورج کے گرد زمین کی سالانہ حرکت کا انکشاف کیا اور اس کے تیس برس بعد کیانتوس نے زمین کے لئے دو حرکتیں تجویز کیں مگر یہ نظریہ فروغ نہ پا سکا کیوں کہ ایک تو مشاہدہ اس کے خلاف تھا اور دوسرے حکیم ارسطو (۳۸۴۔ ۳۲۲' ق۔ م) حرکت زمین کا شدت سے مخالف تھا اور اس کے خلاف کوئی نظریہ پنپ نہ سکتا تھا اور جب بطلیموس نے بھی ارسطو کے نظریہ کی تائید کی تو یہ نظریہ ذہنوں میں راسخ ہوگیا اور جو نظریہ جڑ پکڑ لیتا ہے اس کے خلاف سننا تو درکنار کچھ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ چنانچہ صدیوں تک اس نظریہ کی عملداری رہی اور زمین کو ساکن اور مرکز کائنات سمجھا جاتا رہا۔ ۱۴۴۰ء میں کوسا کے ایک پادری نکولس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ زمین بھی ایک سیارہ ہے جو دوسرے سیاروں کی طرح اپنے مدارس میں حرکت کرتا ہے مگر اس نظریہ کو کوئی اہمیت نہ دی گئی اور اس کی آواز دب کر رہ گئی۔ پھر پولینڈ کے ماہر فلکیات کاپرنیکس (۱۴۷۳ء ۱۵۴۳ء) نے فلکیات کا گہرا مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ زمین اپنے محور پر گھومتی اور سورج کے گرد چکر لگاتی ہے لیکن اس سے کلیسا کے نظریات پر زد پڑتی تھی اور کلیسائی نظریات کے خلاف زبان کھولنا موت کو دعوت دینا تھا۔ اس لئے اس نے "مصلحۃ" خاموشی اختیار کرلی اور اپنے نظریہ کا اعلانیہ اظہار نہ کر سکا۔ کلیسا کے زیر عتاب آنے والوں میں ایک گیورڈانو برونو (۱۵۴۸ء ۱۶۰۰ء) بھی تھا جو کاپرنیکس کے نظریہ گردش

زمین سے متفق تھا۔ اس نے اپنے خیالات کا اعلانیہ اظہار کیا تو اس جرم کی پاداش میں اسے سات برس قید کی سزا دی گئی اور پھر زندہ جلا دیا گیا۔ آخر ۱۶۰۹ء میں **گلیلیو** نے دور بین ایجاد کی اور اپنے مشاہدہ سے کاپر نیکس کے نظریہ کی کھلم کھلا تصدیق کی اور دلائیل سے یہ ثابت کر دیا کہ کرہ زمین اپنے چاند سمیت سورج کے گرد گھومتا ہے مگر کلیسا نے اس کی صحت سے قطعی انکار کر دیا اور اسے مجرم قرار دے کر روم کی مذہبی عدالت میں مقدمہ چلایا اس نے کلیسا کے عتاب سے بچنے کے لئے عدلیہ کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور کہا کہ یہ محض ایک مفروضہ تھا۔ میرا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ زمین گردش میں ہے۔ اس اعتراف پر اسے چھوڑ تو دیا گیا مگر اس نظریہ کو بطور مفروضہ بیان کرنے سے بھی اسے روک دیا گیا اور خلاف ورزی کی صورت میں اسے سخت سزا کی دھمکی دی گئی۔ کلیسا نے اس آواز کو اگرچہ قوت و طاقت سے دبانا چاہا مگر یہ آواز دب نہ سکی۔ رفتہ رفتہ مخالفت کا زور ٹوٹ گیا اور حرکت زمین کا نظریہ ہمہ گیر قرار پا گیا۔ اس نظام حرکت ارضی کو نظام شمسی سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں زمین کی بجائے سورج کو مرکز قرار دیا گیا ہے۔

علماء ہیئت کے نزدیک زمین کی متعدد حرکتیں ہیں مگر دو حرکتیں اپنے حسی اثرات کی بناء پر زیادہ نمایاں ہیں۔ پہلی حرکت وضیعہ ہے جو مغرب سے مشرق کی طرف زمین کے محور میں ہوتی ہے اور ۲۳ گھنٹے ۵۸ منٹ اور ۴۹ سیکنڈ میں ایک چکر پورا ہو جاتا ہے اور زمین کی سالانہ حرکت کی وجہ سے ایک منٹ اور گیارہ سیکنڈ کا اس میں اضافہ ہو جاتا ہے جس سے یہ گردش پورے چوبیس گھنٹوں میں تمام ہوتی ہے۔ اس گردش سے رات اور دن کا ظہور ہوتا ہے اس طرح کہ جتنا حصہ سورج کے سامنے ہوتا ہے وہاں دن رہتا ہے اور باقی حصے پر رات ہوتی ہے۔ اس شب و روز کی مدت ۲۴ گھنٹے ہے جو اس گردش کی مدت کے برابر ہے۔ دوسری حرکت انتقالیہ ہے جو سورج کے گرد مدار ارضی پر ہوتی ہے چنانچہ یہ زمین ۱۰۸۰ میل فی منٹ کی رفتار سے مسلسل سورج کے گرد رواں دواں ہے۔ اور ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے اور ۴۶ سیکنڈ میں ۵۸۰،۰۰۰،۰۰۰ میل کی طویل مسافت طے کر کے اپنا دورہ تمام کرتی ہے اس حرکت سے فصول اربعہ یعنی گرما سرما بہار اور خزاں ظہور میں آتے ہیں۔

امیرالمومنینؑ کے ان کلمات پر جو تخلیق کائنات کے سلسلے میں ہیں نظر کی جائے تو یہ واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ زمین کو ساکن تصور نہ کرتے تھے بلکہ اسے متحرک قرار دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت کا ارشاد ہے:

فسکنت علی حرکتھا من ان تمید باھلھا او تسیخ بحملھا او تزول عن مواضعھا۔

وہ ہچکولے کھانے کے بعد تھم گئی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے رہنے والوں کو لے کر جھک پڑے یا اپنے بوجھ کی وجہ سے دھنس جائے یا اپنی جگہ چھوڑ دے۔

(نہج البلاغہ)

اس ارشاد میں **سکنت** (وہ ٹھہری ہوئی ہے) کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس میں ٹھہراؤ پایا جاتا ہے اور وہ ایک جگہ پر ساکن و برقرار ہے اس لئے کہ اگر یہ معنی ہوں تو **علی حرکتھا** (حرکت کے ساتھ) بے معنی ہو جاتا ہے لہٰذا سکون سے مراد یہ ہے کہ اس کی حرکت میں یکسانیت پائی جاتی ہے اور وہ ادھر ادھر لڑھکتی اور لڑکھڑاتی نہیں ہے اس عبارت میں لفظ مواضع موضع کی جمع ہے جس کے معنی جگہ کے ہیں۔ اگر حضرت کے نزدیک زمین ساکن ہوتی تو وہ جمع کے بجائے واحد کا لفظ لاتے اس لئے کہ جو چیز ساکن ہوتی ہے وہ ایک ہی جگہ گھیرتی ہے اور متعدد حرکتیں حرکت انتقالی ہی کی صورت میں ہو سکتی ہیں۔ حضرت نے نہ صرف زمین کی حرکت کا ذکر کیا ہے بلکہ اس کی متعدد حرکات کی طرف بھی واضح اشارات کیے ہیں۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے:

وعدل حرکا تھا بالراسیات من جلا صید ھا و ذوات الشناخیب الشحم من صیاخیدھا (نہج البلاغہ)

پتھروں کی مضبوط چٹانوں اور بلند چوٹیوں والے پتھریلے پہاڑوں سے اس کی حرکتوں میں اعتدال پیدا کیا۔

اس جملہ میں لفظ حرکات جو حرکت کی جمع ہے زمین کی متعدد حرکتوں کو ظاہر کرتی ہے۔ قدرت نے ان حرکات کو پہاڑوں کے ذریعہ نقطہ اعتدال پر رکھا ہے اس طرح کہ اگر پہاڑوں کی جڑیں زمین میں پیوست نہ ہوتیں تو اس کے اجزاء متفرق و پراگندہ ہو جاتے اور حرکات میں یکسانیت نہ رہتی کیونکہ جسم مدور میں یکسانیت اسی صورت میں پیدا ہوتی ہے جب مرکز ثقل کے مقابلہ میں وہ اپنے محور پر واقع ہو۔

زمین کی شکل و ہیئت

قدیم مصریوں اور یونانیوں کا یہ خیال تھا کہ زمین مسطح اور چپٹی ہے جس کے گرد اگر پانی اور اوپر سقف آسمان ہے مگر اب مشاہدہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ زمین ایک گول جسم ہے صرف قطبین پر کچھ اندر کو دھنسی ہوئی ہے۔ اگرچہ زمین پر فلک بوس پہاڑ اور گہرے کھڈ ہیں مگر زمین کے وسیع و عریض پھیلاؤ کو دیکھتے ہوئے اتنے نشیب و فراز سے زمین کی گولائی میں چنداں فرق نہیں پڑتا۔ اس وسعت اور پھیلاؤ کی بنا پر جو حصہ بھی نظر آتا ہے مسطح اور ہموار دکھائی دیتا ہے۔ زمین کے گول ہونے پر مختلف دلائل دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک مشاہداتی دلیل یہ ہے کہ چوں کہ زمین مغرب سے مشرق کی سمت گھومتی ہے اس لئے مشرقی مقامات پر سورج پہلے دکھائی دیتا ہے اور مغربی مقامات پر بعد میں نظر آتا ہے۔ اگر زمین چپٹی ہوتی تو مشرقی و مغربی تمام مقامات پر ایک وقت میں نظر آتا اور ایک ہی مشرق اور ایک ہی مغرب ہوتا حالانکہ نہ ایک وقت میں ہر جگہ نظر آتا ہے اور نہ ایک وقت میں ہر جگہ غروب ہوتا ہے۔

امیرالمومنینؑ نے بھی سورج کے متعدد مشرقوں اور مغربوں کا ذکر فرمایا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ زمین کو مدور اور کروی الشکل سمجھتے تھے چنانچہ عبد اللہ ابن ابی حامد سے روایت کی ہے حضرتؑ سے ارشاد **رب المشرق و المغارب** کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

لها ثلثمائة و ستون مشرقا و ثلثماته و ستون مغربا فيو مها الذى تشرق فيه لا تعودفيه الامن قابل و يومها الذى تغرب فيه لا تعودفيه الامن قابل۔

سورج کے تین سو ساٹھ مشرق اور تین سو ساٹھ مغرب ہیں جس دن میں وہ طلوع کرتا ہے اس کی طرف ایک سال کے بعد پلٹ کر آتا ہے اور جس دن میں وہ غروب ہوتا ہے اس کی طرف سال کے بعد پلٹتا ہے۔

(معانی الاخبار ص ۴۶)

حضرتؑ نے سورج کے تین سو ساٹھ مشرق اور تین سو ساٹھ مغرب بیان فرمائے ہیں۔ حالانکہ ہر آن اس کا نقطہ طلوع و غروب بدلتا رہتا ہے چنانچہ ان لوگوں کے لئے جو مغرب میں ہیں اس کا ہر لفظ مشرق اور ان لوگوں کے لئے جو مشرق میں ہیں ہر نقطہ مغرب ہے اس لحاظ سے اس کے مشارق و مغارب کا شمار نہیں ہو سکتا۔ پھر اس حد بندی کے کیا معنی اس کی وجہ یہ ہے کہ سمیری دائروں کو تین سو ساٹھ درجوں میں تقسیم کرتے ہیں اور آج بھی دائرے کو تین سو ساٹھ درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کرہ زمین کو بھی تین سو ساٹھ خطوط پر تقسیم کر لیا گیا ہے لہٰذا ان درجوں کے اعتبار سے تین سو ساٹھ مشرق اور تین سو ساٹھ مغرب ہوں گے۔ اصل مقصد تو مشرق و مغرب کا تعداد بتانا ہے

جو حضرتؑ کے کلام سے ظاہر ہے اور اس تعداد کا لازمی نتیجہ زمین کا مدور ہونا ہے کیوں کہ مدور و کروی الشکل ہونے کی صورت ہی میں متعدد مشرق و مغرب ہوسکتے ہیں۔

سیار کرے

زمانہ سابق میں عموماً" یہی سمجھا جاتا تھا کہ یہی ایک زمین ہے جس پر ہم رہتے سہتے اور انسان کے قافلے چلتے پھرتے دیکھتے ہیں اگرچہ انیکسی کورس (۵۰۰۔ ۴۲۸) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اس دنیا کے علاوہ اور دنیائیں بھی ہیں جن کے الگ الگ چاند سورج ہیں مگر کسی طرف سے اس کی تائید میں آواز بلند نہ ہوئی بلکہ اس کے خلاف دلائل دیئے گئے اور اس نظریہ کو باطل ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ پھر سولھویں صدی عیسوی میں گیورڈانوبرو نونے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہماری زمین ایسے اور کرے بھی ہیں اور ہر کرہ کا ایک سورج ہے جس کے گرد وہ گردش کرتا ہے لیکن اس وقت بھی یہ نظریہ' نظریہ کے حدود سے آگے نہ بڑھ سکا اور نہ اسے مسلمہ حیثیت حاصل ہو سکی اور اب یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ سیارے بھی زمین کے مانند کرے ہیں جن پر ہماری زمین کی طرح کوہسار ریگزار گہرے کھڈ اور سربلند ہیں۔

امیرالمومنینؑ نے بھی جدید نظریات کے مطابق زمینوں کی تعداد کا نظریہ پیش کیا ہے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے۔

الحمد للّٰہ الذی لا یواری عنہ سماء سماء ولا ارض ارضا۔ (نہج البلاغہ)

تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جس سے ایک آسمان دوسرے آسمان کو اور ایک زمین دوسری زمین کو نہیں چھپاتی۔

اس آیت میں سات طرح زمینوں سے ہفت کرہ سیار مراد ہیں اگرچہ ان کے علاوہ بھی سیارے ہیں چنانچہ ترقی یافتہ دور بینوں کے ذریعہ ۱۸۴۶ء میں نیپچون سیارہ کا انکشاف ہوا اور ۱۹۳۰ء میں پلاٹو دریافت ہوا اور اٹھارویں صدی کے اواخر سے کچھ پہلے تک یورنیس کو ساکن سمجھا جاتا رہا کیوں کہ اس کی روشنی کے مدہم ہونے کی وجہ سے اس کی حرکت کا احساس نہ ہوتا تھا مگر ۱۷۸۱ء میں معلوم ہوا کہ وہ بھی دوسرے متحرک سیاروں کی طرح کا ایک متحرک سیارہ ہے مگر یہ سایرے چوں کہ کھلی آنکھ سے عادی طور پر نظر نہ آتے تھے اس لئے ان کا ذکر ضروری نہیں سمجھا گیا صرف ان سیاروں کی گنتی بیان کی ہے جو ہر دور میں دکھائی دیتے رہے ہیں۔

آسمان یا کرہ بخاری

آسمان فارسی زبان کا لفظ ہے جو آس اور مان سے مرکب ہے آس آسیا کا مخفف ہے جس کی معنی چکی ہیں اور مان کے معنی مانند کے ہیں یعنی وہ چیز جو چکی کے مانند گھومتی ہے۔ یہ نام اس بناء پر تجویز ہوا کہ اس سقف نیلگوں کے بارے میں یہ عمومی خیال تھا کہ وہ ایک جرم شفاف ہے جو زمین کے گرد چکی کی طرح گھوم رہا ہے اسی لئے اسے گنبد گرداں و چرخ گرداں کے ناموں سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ عربی زبان میں اس کے لئے لفظ سماء ہے۔ سماء سمو سے ماخوذ ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے :

و انزلنا من السماء ماء طهورا۔ ہم نے سماء (بلندی) سے پاک و پاکیزہ پانی اتارا۔

اس آیت میں سماء سے مراد بلندی ہے اور آسمان کو سماء اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ وہ بلندی کی سمت پر نظر آتا ہے امیرالمومنینؑ نے خلقت سماء کے بارے میں فرمایا ہے۔

فرمها بتصفیق الماء الزخارو اثارة موج البحار فمخضته مخض السقاء و عصفت عصفها بالفضاء ترد اوله الی اخره و ساجیه الی مائره حتی عب عبابه و رمی بالزبد رکامه فرفعه فی هواء منفتق و جومنفهق فسوی منه سبع سموات

پھر اس ہوا کو مامور کیا کہ وہ پانی کے ذخیرے کو تھپیڑے دے اور بحر بے کراں کی موجوں کو اچھالے۔ اس ہوا نے پانی کو یوں متھ دیا جس طرح دہی کے مشکیزے کو متھا جاتا ہے اور اسے دھکیلتی ہوئی تیزی سے چلی جس طرح خالی فضا میں چلتی ہے اور پانی کے ابتدائی حصے کو آخری حصے پر اور ٹھہرے ہوئے پانی کو چلتے ہوئے پانی پر پلٹانے لگی یہاں تک کہ اس متلاطم پانی کی سطح بلند ہوگئی اور وہ تہ بہ تہ پانی جھاگ دینے لگا۔ اللہ نے وہ جھاگ کھلی ہوا اور کشادہ فضا کی طرف اٹھائی اور اس سے ساتوں آسمان پیدا کئے۔

(نہج البلاغہ)

ایک شامی نے حضرتؑ سے آسمان کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے فرمایا:

اسم السماء الدنیا رقیع وہی من دخان و ماء۔ نیچے والے آسمان کا نام رقیع ہے اور وہ دھوئیں اور پانی سے بنا ہے۔

(علل الشرائع ص ۱۹۷)

پھر اس شامی کے دوبارہ دریافت کرنے پر فرمایا **من بخار الماء** (پانی کے بخارات سے) قرآن مجید میں بھی آسمان کو دھوئیں سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد الٰہی:

ثم استوی الی السماء وھی دخان۔ پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور دھواں تھا۔

اس آیت میں دھوئیں سے مراد بخارات ہیں جو تہ بہ تہ ہونے کی صورت میں دھوئیں کے مانند نظر آتے ہیں چنانچہ امام راغب نے مفرادت میں لفظ دخان کی تشریح مثل الدخان سے کی ہے یعنی وہ چیز جو دھوئیں کے مانند تھی اور وہ بخارات ہی ہو سکتے ہیں جو دھوئیں کے مشابہ ہوتے ہیں۔ اسی ظاہری مشابہت کی بناء پر بخارات کا دھوئیں کا اطلاق کیا گیا ہے۔ اس کی تائید امیرالمومنینؑ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔

ان اللّٰہ بدالہ ان یخلق الخلق قصرب بامواج البحور فثار منھا مثل الدخان کاعظم مایکون من خلق اللّٰہ فبنا بھا سماء رتقا۔ خداوند عالم نے چاہا کہ وہ مخلوقات کو پیدا کرے تو سمندروں کی موجوں میں تلاطم پیدا کیا جس سے دھوئیں کے مانند ایک عظیم تر غبار اٹھا اسی سے اس نے مضبوط آسمان کو بنایا۔

(بحار الانوار)

ظاہر ہے کہ مثل الدخان سے مراد بخارات ہیں کیوں کہ پانی سے بخارات ہی اٹھتے ہیں۔ حضرت نے انہی بخارات کو آسمانوں کا مادہ تخلیقی قرار دیا ہے اور جدید سائنسی تحقیق بھی اسی نتیجہ پر پہنچی ہے کہ اجرام سماوی کہر اور بادل ایسے گیسی مواد سے جسے نیبولا کہا جاتا ہے وجود میں آئے ہیں اور انہی گیسی مادوں کو دھوئیں اور بخار کی لفظوں سے تعبیر کیا گیا ہے علامہ ہبتہ الدین شہرستانی نے کتاب الھیتہ والسلام میں تحریر کیا ہے کہ جب سماء کا اطلاق بلندی پر واقع ہونے والی چیز پر ہوتا ہے تو بعید نہیں ہے جسے آسمان سمجھتے ہیں وہ کرہ بخاری ہو جو زمینی ہوا کے گرد محیط ہے اور جس طرح سات زمینوں سے مراد کرات سیارہ ہیں اسی طرح سات آسمانوں سے مراد کرات بخاریہ ہیں جو اپنے اپنے کرہ سیارہ کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔

حرکت اجرام فلکیہ

قدیم حکما کا نظریہ تھا کہ کرہ زمین کائنات کا مرکز ہے اور اس کے گرد گھومنے والے آسمانوں میں چاند سورج اور ستارے جڑے ہوئے ہیں۔ اس طرح کہ پہلے آسمان میں چاند دوسرے میں عطارد' تیسرے میں زہرہ' چوتھے میں آفتاب' پانچویں میں مریخ' چھٹے میں مشتری اور ساتویں میں زحل پیوست ہے اور چوں کہ آسمان حرکت میں ہیں اس لئے یہ بھی حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر اب یہ نظریہ باطل ہو چکا ہے اور ہیئت جدید نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ تمام سیارے جن میں زمین بھی شامل ہے۔ سورج کی قوت جاذبہ کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے سورج کے گرد گھوم رہے ہیں۔

سورج اگرچہ زمین اور دیگر سیارات کا مرکز ہے مگر وہ خود بھی اپنے محور میں گھوم رہا ہے اور تقریباً" پچیس دن ۷ گھنٹے اور ۴۸ منٹ میں ایک گردش تمام کرتا ہے اس کے علاوہ ایک اور حرکت بھی اس میں پائی جاتی ہے جو دوسرے سیاروں کی گردش کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ پہلی حرکت کو وضعیہ اور دوسری حرکت کو انتقالیہ کہا جاتا ہے۔ یہ اجرام جن راہوں پر رواں دواں ہیں انہیں فلک سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انہی گزر گاہوں پر وہ اپنی تلی ہوئی رفتار سے حرکت کر رہی ہیں۔ نہ ان کی مقررہ رفتار میں فرق آتا ہے اور نہ ان کی گزرگاہ میں۔ قرآن مجید میں بھی سیارات سبعہ کے افلاک کو طرائق (راستوں) سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد الہی ہے:

ولقد خلقنا فوقكم سبع طرائق

ہم نے تمہارے اوپر سات راستے بنائے۔

امیرالمومنینؑ کے کلمات سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ فلک مدار نجوم و مجری کواکب کا نام ہے جن پر شمس و قمر اور سیارے ہمہ وقت راہ پیما ہیں۔ چنانچہ حضرتؑ کا ارشاد ہے:

اللهم رب السقف المرفوع والجو المكفوف الذی جعلته مغيضا لليل والنهارو مجری الشمس والقمر ومختلفا للنجوم السيارة۔

اے اللہ اے اس بلند آسمان اور تھمی ہوئی فضا کے پروردگار جسے تو نے شب و روز کے سر چھپانے اور چاند اور سورج کے گردش کرنے اور چلنے پھرنے والے ستاروں کی آمد و رفت کی جگہ بنایا ہے۔

(نہج البلاغہ)

اس ارشاد میں لفظ مجری اور سیارہ سے صاف ظاہر ہے کہ آفتاب و مہتاب اور سیارے گردش میں ہیں اور ان کی حرکت کسی دوسرے جسم کی حرکت کی تابع نہیں ہے بلکہ وہ خود اپنے مدار میں سیرو حرکت کر رہے ہیں اور اسی مدار کا نام فلک ہے جو فضا میں خط موہوم کی صورت میں پھیلا ہوا ہے۔

اس ارشاد میں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت نے فضا کو مغیض کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ **مغیض** کے معنی **الموضع الذی یغیض فیه الماء** کے ہیں یعنی وہ جگہ جس میں پانی جذب ہو جاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح پانی زمین کی تہ میں جذب ہوتا ہے۔ اسی طرح روشنی اور تاریکی فضا میں جذب ہو جاتی ہے۔ ان کلمات میں نہار سے مراد روشنی اور لیل سے مراد ظلمت ہے جدید تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ تمام کرہ زمین کو جو سورج سے روشنی حاصل ہوتی ہے اس کی مقدار سورج کی روشنی سے وہی نسبت رکھی ہے جو ایک سیکنڈ کو ۴۷ سال سے ہوتی ہے اور زمین کی روشنی سے دس گنا زائد روشنی اجسام فلکی میں بٹتی ہے اور باقی فضا میں جذب ہو جاتی ہے۔ امیرالمومنینؑ نے ان تمام تحقیقات کا خلاصہ ایک لفظ مغیض میں سمو دیا ہے جو صدیوں بعد ہیئت دانوں کی مسلسل محنت و عرق ریزی کے نتیجہ میں ظہور میں آئیں حالاں کی اس دور میں نہ روشنی کا تجزیہ کیا جاسکا تھا اور نہ فضا میں روشنی کے جذب ہونے کا تصور پیدا ہوا تھا۔

سورج سرچشمہ حرارت ہے

حکمائے قدیم کا خیال تھا کہ سورج صرف روشنی کا منبع ہے اور جب اس کی شعاعیں زمین سے ٹکرا کر منعکس ہوتی ہیں تو اس سے حرارت کی تولید ہوتی ہے خود سورج میں روشنی ہی روشنی ہے حرارت نہیں ہے مگر اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سورج روشنی اور حرارت دونوں کا منبع ہے اور وہ اپنی شعاعوں کے ذریعہ دوسرے کروں میں روشنی کے ساتھ گرمی بھی پہنچاتا ہے چنانچہ جدید تحقیق کی رو سے سورج کی بیرونی سطح کر درجہ حرارت ۶۰۰۰ اور اندرونی حصہ کا درجہ حرارت ۲۲۰۰۰،۰۰۰ ڈگری ہے اور فی منٹ ۲۵ کروڑ ٹن گیسی مواد اس سے خارج ہوتے رہتے ہیں جو روشنی اور حرارت دونوں کے حال ہوتے ہیں۔ اگر حرارت کے یہ شعلہ بار مواد زمین میں رہ جائیں تو تمام زمین جل کر راکھ ہو جائے مگر یہ نظام قدرت کی کارفرمائی ہے کہ زمین حسب ضرورت روشنی و حرارت لے لیتی ہے اور باقی فضا اور دوسرے کروں میں جذب ہو جاتی ہے۔ امیرالمومنینؑ کے کلمات سے بھی اسی نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ سورج خود سرچشمہ حرارت ہے شعاعوں کے انعکاس سے حرارت کی تولید نہیں ہوتی۔ چنانچہ آپؑ کا ارشاد ہے:

لو کان وجهها لاهل الارض لا حرقت الارض و من علیها من شدة حرها

(بحارالانوار ج ۱۴ ص ۱۴۴)

اگر سورج کا پورا رخ اہل زمین کی طرف ہوتا تو زمین اور زمین پر بسنے والوں کو اپنی تپش و حرارت کی شدت سے جلا دیتا۔

سورج اور چاند کا محیط

سورج زمین سے نو کروڑ تیس لاکھ میل کے فاصلہ پر اور چاند دو لاکھ چالیس ہزار میل کی دوری پر واقع ہے اسی قرب و بعد مسافت کی بناء پر چاند اور سورج کے حجم میں تھوڑا ہی سا فرق نظر آتا ہے۔ اسی لئے زمانہ سابق میں سورج کو چاند سے زیادہ بڑا نہ سمجھا جاتا تھا اور اب جب کہ فلک پیما آلات کے ذریعہ سورج اور چاند کا قطر و محیط ناپا جا چکا ہے دونوں کے حجم کا تفاوت نمایاں ہوگیا ہے اور یہ قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ سورج چاند سے بدرجہا بڑا ہے۔ یہ پیمائش سائنسی آلات کی مرہون منت ہے مگر اس دور میں کہ جب نہ دوربینیں تھیں نہ فلک پیما آلات تھے اور نہ اجرام فلکیہ کی پیمائش کا کوئی ذریعہ تھا۔ امیرالمومنینؑ نے سورج اور چاند کا جو محیط بیان فرمایا وہ جدید تحقیق سے بڑی حد تک مطابقت رکھتا ہے چنانچہ آپ سے سورج کا محیط دریافت کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا :

تسعمائة فرسخ فی تسعمائة فرسخ۔ نو سو ضرب نو سو فرسخ

(علل الشرائع ص ۱۹۷)

۹۰۰ کو ۹۰۰ میں ضرب دینے سے ۸۱۰۰۰۰ فرسخ ہوں گے اور ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے لہٰذا کل ۲۴۳۰۰۰۰ میل ہوں گے اور موجودہ تحقیق یہ ہے کہ سورج کا محیط ۲۷۸۴۵۰۰ میل ہے اور چوں کہ شرعی میل موجودہ میل سے ۲۴۰ گز بڑا ہوتا ہے لہٰذا اس محیط میں جب یہ مقدار بڑھا دی جائے گی تو موجود تحقیق اور حضرت کے بیان کردہ محیط میں تھوڑا سا ہی فرق رہے گا جو قابل اعتنیا نہیں ہے اور اس قسم کا فرق تو خود ہیئت دانوں کے بیان کردہ محیط میں بھی پایا جاتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ان کے تخمینوں اور اندازوں میں کمی بیشی کی گنجائش نہ ہو۔ ممکن ہے کہ آئندہ تحقیقات کے نتیجہ میں یہ تھوڑا سا تفاوت بھی ختم ہو جائے۔

اسی طرح چاند کے محیط کے بارے میں آپ سے دریافت کیا گیا تو فرمایا:

اربعون فرسخا فی اربعین فرسخا چالیس ضرب چالیس فرسخ

(تفسیر قمی ص ۳۷۹)

۴۰ x ۴۰ فرسخ ۱۶۰۰ فرسخ ہوں گے جن کے میل ۴۸۰۰۰ ہوں گے اور موجودہ نظریہ یہ ہے کہ چاند کا محیط ۶۰۰۰ میل ہے مگر شرعی اور جدید میلوں کے تفاوت کو دیکھنے کے بعد قریب قریب وہی محیط ہوگا جو جدید تحقیق نے ثابت کیا ہے۔

ستاروں میں آبادی

یہ دمکتے جھلکتے ستارے جو فضائے بسیط میں پھیلے ہوئے ہیں ایک زمانہ وہ تھا کہ انہیں دیوتاؤں کی آرامگاہ تصور کیا جاتا تھا یا آسمان کی نیلگوں چھت میں ڈوری سے بندھے ہوئے رنگین قمقمے یا گڑی ہوئی سنہری کیلیں سمجھا جاتا تھا مگر انسان کی فلک پیمائی نے اس فریب نظر کا پردہ چاک کر دیا ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ ستارے اور سیارے اس کرہ ارضی کے مانند مادی کرے ہیں جن کی اپنی فضا ہے اور اپنا سماء اور اپنی مخصوص سمتوں میں دوڑے چلے جا رہے ہیں۔

شنید ستم کہ ہر کو کب جہاں است　　　جداگانہ زمین و آسماں است

ان ستاروں میں کوئی مخلوق بستی ہے یا آبادی سے خالی ہیں ابھی کوئی حتمی نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکا۔ بعض ہیئت دانوں نے بتایا ہے کہ ہماری کہکشاں میں ایک کروڑ سیاروں کے نظام قائم ہیں جن میں کم از کم ایک لاکھ سیارے ایسے ہیں۔ جن میں زندگی کا امکان پایا جاتا ہے اور جہاں زندگی ممکن ہو وہاں زندہ مخلوق کا پایا جانا بعید از قیاس نہیں ہے۔ اور مریخ کے بارے میں ان کا نظریہ یہ ہے کہ اس میں پانی اور روئیدگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ ستاروں میں آبادی کا امکان دور جدید کی تحقیقی کاوش کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر امیرالمومنینؑ نے صدیوں پیشتر کہ جب انسان یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ کہ زمین کے علاوہ کہیں اور بھی زندگی کے پائے جانے کا امکان ہو سکتا ہے۔ ان ستاروں میں شہروں اور بستیوں کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

لحنه النجوم التی فی السماء مدائن مثل المدائن التی فی الارض مربوط کل مدینة الی عمود من نور۔

ان آسمانی ستاروں میں تمہارے شہروں کے مانند شہر ہیں۔ اور ہر شہر دوسرے شہر سے ایک عمود نور کے ذریعہ وابستہ و منسلک ہے۔

(تفسیر قمی ص ۵۵۴)

اس عمود نور سے مراد قوت جاذبہ ہے جس کے زیر اثر یہ سیارے ایک دوسرے سے وابستہ و مربوط ہیں اور اپنے اپنے مدار پر یکساں رواں دواں ہیں۔

S.No. 1866

V.No. II

Date 14-10-2001

ملنے کا پتہ :-

العصر اسلامک بک سنٹر

۳۵۔ حیدر روڈ اسلام پورہ لاہور